هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۷ نمبر (۱)

بابتہ ماہ محرم سنہ ۱۳۶۹ھ

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!

"الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں

لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!

دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

نمونہ کا پرچہ اٹھ آنہ

جلد (۱۷) بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۹ھ مطابق نومبر ۱۹۴۹ء نمبر (۱)

یہاں ☐ سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارہ پر ختم ہوگئی ہے، لہٰذا آئندہ کیلئے اپنا چندہ بذریعۂ منی آرڈر روانہ فرمائیے، کیونکہ اس میں آپ کو فائدہ اور ہمیں بہت سہولت ہے۔

اگر اگلے پرچہ تک آپ کا چندہ وصول نہ ہوا تو حسب قاعدہ اگلا پرچہ حاضرِ خدمت ہوگا جس کا وصول کرنا آپ کا فرض ہوگا۔

اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے آپ کا ارادہ آئندہ خریداری جاری رکھنے کا نہیں ہے تو براہِ کرم پہلی فرصت میں ایک کارڈ سے مطلع فرمائیے، ہم ہر صورت میں آپکے ممنون ہوں گے۔

نیازمند:- ناظم "الفرقان" لکھنؤ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاح جلد ہفدہم ۱۷

الحمد للہ رب العلمین ٥ الرحمن الرحیم ٥ ملک یوم الدین ٥ ایاک نعبد و ایاک نستعین ٥

اھدنا الصراط المستقیم ٥ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین٥

رب کریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے ایک ناتواں بندہ اور اُس کے کمزور رفیقوں اور معاونین کو کاغذ کے شیرازہ اور اس قلم اور سیاہی سے جو اسکی توفیق کے بغیر جہل و ظلم کی اشاعت و دعوت میں صرف ہوتی، دین کی دعوت اور حق کی اشاعت کا کام لینے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ یہ قوت جو دنیا میں ہر خیر کا ذریعہ بن سکتی ہے محض اُس کا عطیہ ہے، اور اُس کے خیر میں صرف ہونے کی توفیق بالکل اسی طرح محض اُس کا عطیہ ہے، ان دونوں گرانقدر عطایا کے لئے "الفرقان" اپنے ربِ کریم کی بارگاہ میں سربسجود ہے۔

اس جلد سے الفرقان کی زندگی کا سترھواں ۱۷ سال شروع ہو رہا ہے، یہ کوئی بڑی طویل مدت نہیں، لیکن اپنی بے بسی و بے سروسامانی اور اس کے حقیر آغاز کو دیکھتے ہوئے یہ بھی محض فضلِ رب ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی سولہ ۱۶ منزلیں طے کرلیں۔ اس مدت میں بارہا ملک کے ملک زیر و زبر ہوئے، بڑے بڑے مستحکم ادارے خاک میں مل گئے، لیکن اس طوفانی دور اور پُر تلاطم دریا میں کاغذ کی یہ ناؤ سولہ برس تک چلتی رہی۔ جس مالک نے اس کو چلا کر اپنی قدرت کا تماشہ دکھایا ہے اُسی سے اسکی زندگی، اور توفیق کی دُعا ہے۔

ربنا آتنا من لدنک رحمۃ وھیئ لنا من امرنا رشدا

"مدیر"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں!

پچھلے مہینہ مصر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہمارے لئے بڑی عبرت اور دین کے خدمت گذاروں کے لئے سیکھنے کے بہت سے سبق ہیں۔ مصر ترکی کے بعد تمام عالم اسلام میں نئی اصطلاح کے مطابق سب سے زیادہ "روشن خیال و آزاد" اور مغربی تہذیب و تمدن کا پرجوش پیرو اور کامیاب نقال ہے۔ عورتوں کی آزادی اپنے مشرقی و اسلامی حدود سے کہیں آگے گذر چکی ہے۔ مخلوط تعلیم، بے پردگی، یورپ کے مقابلۂ حسن میں شرکت، تعلیمی وفود (بعثات) میں رفاقت اور اعلیٰ تعلیم کے لئے طالبات کا یورپ کا سفر روزمرہ کے واقعات میں سے ہیں جن پر اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ سیاسی و تعلیمی زندگی میں، ورزشوں اور تفریحات میں، طبقۂ اناث طبقۂ ذکور کے دوش بدوش ہے۔ نیم برہنہ لباس، ساحل سمندر کا غسل شمسی، فلم کمپنیوں میں تمثیل (ایکٹنگ) اور مصری روزناموں اور رسائل کی عریاں تصویریں، روزانہ زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن پر چند باحمیت مسلمانوں اور بعض دینی جماعتوں کے سوا کوئی چیں بجبیں بھی نہیں ہوتا۔ نگاہیں ان تمام مناظر کی عادی، اور ذہن ان تمام واقعات کا خوگر ہو چکا ہے، اب ان میں استعجاب کا کوئی پہلو اور اعتراض کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ قاسم امین نے المرأۃ المصریۃ کے ذریعہ مصر کی شاداب زمین میں جو بیج ڈالے تھے اور سیاسی جماعتوں اور قائدوں نے اپنے سیاسی مصالح سے انکی آبیاری، اور مصر کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے انکی پرورش کی تھی، وہ کھیتی اب پک کر تیار ہوئی ہے۔

اس عرصہ میں حسین سری پاشا کی عبوری وزارت بنتی ہے اور وزارت تعلیم کا قلمدان احمد مرسی بدر بے کے سپرد ہوتا ہے، یہ صاحب یقیناً مصر کے جدید تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ہوں گے جنھوں نے مصر اور

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہوگی اس لئے کہ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا نمائندہ اور ایک ترقی یافتہ ملک کا وزیر تعلیم کوئی قدیم عالم یا معمولی تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ معلوم نہیں مصر کی حد سے بڑھی ہوئی بے حجابی اور اخلاقی انحطاط سے وزیر صاحب کا دل کب سے دکھا ہوا تھا، اور کتنے عرصہ سے وہ موقع کے منتظر تھے کہ انھوں نے وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالتے ہی چند نہایت اہم احکام صادر کئے، جنھوں نے سارے ملک کی نگاہیں اور توجہ ان کی طرف منعطف کر دی، اور سارے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک معلّمہ کو اس جرم میں ملازمت سے برخواست کر دیا کہ اُس نے چلتی ہوئی ٹرین میں بعض نوجوانوں کی فرمائش سے رقص کیا تھا۔ سابق وزیر تعلیم نے معلّمہ پر معمولی سا جرمانہ کیا تھا، وزیر صاحب کی نگاہ میں یہ فعل خلاف اسلام اور غیر اخلاقی تھا، اور ایسی معلّمہ فرائض تدریس و تربیت ادا کرنے اور مسلمان لڑکیوں کے لئے نمونہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی، اس لئے وہ اپنے معزز عہدہ پر برقرار رہنے کے قابل نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تمام تعلیم گاہوں کے منتظمین کے نام حکم جاری کیا کہ معلّمات و طالبات کو ایسے لباس میں آنے کی اجازت نہ دی جائے جو غیر ساتر ہو، مدرسہ کی اُستانیوں اور طالبات کو ہدایت کی جائے کہ مدرسوں میں آنے کے وقت اُن کی قمیصوں کی آستینیں لانبی، اور لباس ڈھیلا ڈھالا ہو، اور ہدایت کی کہ سختی کے ساتھ اس حکم کی پابندی کی جائے۔

تیسرا حکم جس نے مصر کے ترقی پسند حلقوں میں سب سے زیادہ غم و غصہ اور ناراضگی کی لہر پیدا کی، یہ تھا کہ آئندہ سے مصر کی طالبات اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ نہیں جائیں گی، اس لئے کہ نوجوانوں کیلئے یورپ کا سفر اور وہاں کا قیام اخلاقی حیثیت سے سخت قابلِ اعتراض اور مشتبہ ہے، اس حکم نے آگ پر تیل کا کام دیا اور سارے مصر میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ مصر کا ترقی پسند اور آزاد خیال پریس وزیر صاحب کی جان کو آ گیا۔ ادیبوں اور نوجوانوں نے اس رجعت پسند اور تاریک خیال وزیر کے خلاف "مقدس جنگ" شروع کر دی۔ دریہ شفیق جیسی بے حجاب مقرر خواتین نے "مظلوم مصری عورت" کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین بے نے جو جدید طبقہ کے مقبول ادیب اور مصنف ہیں پیرس میں بیٹھ کر مصر کے "الاھرام" میں اس رجعت پسندانہ اقدام کے خلاف مسلسل مضامین لکھے اور مصر کی عالمی شہرت اور اس کی ترقیوں کا واسطہ دیکر اس قدامت پرستی سے باز آنے کی تبلیغ کی۔ غرض معلوم ہوتا تھا کہ شائد مصر نے کوئی نہایت خطرناک قدم اٹھایا ہے، یا خودکشی کا ارادہ کیا ہے، یا برطانوی سامراج کو

دوبارہ دعوت دی ہے۔ پورے مصر میں صرف چند سنجیدہ اشخاص اور "شباب سیدنا محمدؐ" جیسی خالص دینی جماعت نے وزیر تعلیم کے ان احکام کی حمایت اور ان کی اخلاقی جرأت اور دینی خدمت کی تحسین و ترحیب کی اور انکو مبارکباد کے تار بھیجے، اور ان کی تائید میں مضامین شائع کئے۔

وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بے اس طوفان کے مقابلہ میں اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور انھوں نے پامردی اور جرأت سے اس کا مقابلہ کیا، قریب تھا کہ یہ سرکاری احکام اور وزیر تعلیم کی استقامت مصر کی تعلیمی و تمدنی زندگی پر خوشگوار اثر ڈالے اور بے حیائی و بے حجابی کے سیلاب میں کسی حد تک پشتہ کا کام دے اور رفتہ رفتہ غم و غصہ میں سکون پیدا ہو اور ان نئے احکام سے فائدہ حاصل ہو، لیکن خدا بھلا کرے اس جمہوری نظام کا جو کسی کام کرنے والے کو بھی پورے طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیتا اور جس نے انسانوں کی سنجیدہ مملکت کو بچوں کا گھروندا بنا دیا ہے جو کسی ایک حال پر نہیں رہنے پاتا۔ آنے والے انتخابات کے سلسلے میں کسی اختلاف کی بناء پر وزارت نے استعفاء دیا، نئی وزارت بنی، اور احمد مرسی بدر بے کی جگہ پر نئے وزیر تعلیم منتخب ہوئے۔ نئے وزیر صاحب نے سب سے پہلے اپنی ترقی پسندی اور آزاد خیالی کا ثبوت دیا اور وزارت تعلیم میں قدم رکھتے ہی پیشرو وزیر کے سب احکام منسوخ کئے، اور مصر کو وہ تمام آزادیاں مرحمت فرمائیں جو اس کو پہلے حاصل تھیں۔ عورتوں اور اُن کے "چست گواہوں" نے اپنی مسرت و رضامندی کا پرجوش مظاہرہ کیا، اظہارِ مسرت کیلئے جلوس نکلے، جلسے ہوئے اور آئندہ کے لئے بھی یہ ظاہر کر دیا گیا کہ کسی وزیر کو رائے عامہ کو ناراض کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے، اور اپنے کو غیر مقبول نہیں بنانا چاہئے۔ اس طرح گویا مرسی بدر بے اور اُن کے ہمخیالوں کے لئے کسی حلقہ سے منتخب ہونے اور وزارت میں آنے کے امکانات بھی کم رہ گئے، اور ظاہر ہو گیا کہ مصر کا مقبول خیال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مصر کی سب سے بڑی طاقتور سیاسی جماعت وفد پارٹی برابر اعلان کر رہی ہے کہ وہ اپنی حکومت میں مصری عورتوں کے حقوق کی پوری حمایت و حفاظت کرے گی، اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ ان حقوق کے حدود کیا ہیں؟

مصر کے ان واقعات سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہماری غفلت نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو

دین سے کس قدر بیگانہ اور اسلامی تہذیب سے نہ صرف ناآشنا بلکہ متوحش بنادیا ہے، اور جدید نظام تعلیم وتمدن نے مغربی نظریات وافکار کا کس قدر حلقہ بگوش اور پرجوش حامی بنادیا ہے، اپنی تعلیمی صلاحیتوں عصری واقفیت اور سیاسی جدوجہد کی وجہ سے آج یہی طبقہ تمام عالم اسلام میں ہر اسلامی ملک کی دستوری، سیاسی اور تعلیمی زندگی پر حاوی، اور حکومت کی کرسیوں پر فائز ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون معاشرت وسیاست ان تمام ممالک سے بے دخل ہے اور باوجود مسلمان حکومتوں کے اسلامی نظام معاشرت وتمدن کے لئے ان ممالک میں کوئی جگہ نہیں، قوم کا ذوق اتنا غیر اسلامی ہوچکا ہے کہ اسلام کے اخلاقی ومعاشرتی اصلاحات اور ضوابط اس کی قوتِ برداشت سے باہر اور اُس کے ذہن کے لئے ناقابل ہضم ہیں۔ ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، ایران اور پاکستان، سب جگہ وہی طبقہ برسراقتدار ہے، جو خالص مغربی تہذیب وتعلیم کا پروردہ اور اپنے ذہن وذوق کے لحاظ سے ٹھیٹھ مغربی ہے۔ اس کو جب کبھی اپنے صحیح خیالات اور ذوق کے اظہار اور آزاد قانون سازی کا موقع ملتا ہے وہ اپنی مغربی روح اور اصلی رجحانات ومعتقدات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے مذہبی گروہ کو اس موقع پر صدمہ بھی ہوتا ہے اور استعجاب بھی، حالانکہ کم سے کم استعجاب کا کوئی موقع نہیں، یہ طبقہ قلبی ودماغی طور پر اسلام اور اس کی تہذیب سے جس حد تک غیر متأثر اور اندرونی طور پر غیر معتقد رہا ہے اس کا قدرتی ولازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ جب اس طبقہ کا دل ودماغ ڈھل رہا تھا اور اس کے ذہن وطبیعت کا سانچہ تیار ہو رہا تھا تو اُس وقت اسلامی اثرات کہیں آس پاس بھی نہ تھے، کوئی چیز ان کے پاس ایسی نہ آنے پائی جو اُن کے دل ودماغ پر اسلامی تعلیمات کی عظمت کا نقش قائم کرتی، اور اس کی وقعت ان کے دل میں پیدا کرتی۔ اب جب وہ اقتدار کی کرسی پر آگئے اور ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی، تو ہم اُن سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن، اپنی ساری تعلیم وتربیت اور اپنے عمر بھر کے خیالات اور ذوق کے خلاف کسی دینی ادارہ یا جماعت کی مروت سے ایک اسلامی ضابطۂ معاشرت یا اخلاقی قانون کو نافذ کریں بلکہ اُس قانون کو جو اتفاقاً باقی رہ گیا ہے یا نافذ ہوگیا ہے منظور کرلیں۔ اس لئے اہم ترین کام یہ ہے کہ اس طبقہ کا ذہن بدلنے کی امکانی کوشش کی جائے اور اُس کو ذہنی وعلمی وقلبی طور پر دین سے متأثر کرنے کی کوشش کی جائے، اور جو طبقہ مستقبل میں اس کی جگہ لے گا اُس سے غفلت برتنے کا دوبارہ جرم نہ کیا جائے

اور ابھی سے اس میں اسلامی ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دین کی عام فضا پیدا کرنے کے لئے اور صحیح اسلامی ماحول تیار کرنے کے لئے عمومی کوشش نہایت ضروری ہے، یہ گویا زمین کی تیاری ہے جس کے بغیر باغ نہیں لگ سکتا۔ خواص اور اہل حکومت کا کوئی طبقہ عام فضا سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا، کسی بڑی سی بڑی طاقت اور سیاسی جماعت کیلئے عوام کے رجحان اور جمہور کے مطالبہ کو نظر انداز کرنا اور اس کے معتقدات و مسلمات کو رد کرنا ممکن نہیں، دیرپا انقلاب اور مستحکم و متوازن تعمیر کے لئے یہ شرط ہے کہ قوم کے سب طبقے اس کے لئے تیار ہو چکے ہوں اور ان میں اس کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو چکی ہو۔ مصر کے وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بے کی پشت پر اگر ملک کی رائے عامہ اور مصری قوم کی تائید ہوتی تو اُن کا جانشین اُن کے احکام کو منسوخ اور بیک جنبشِ قلم ان کو کالعدم قرار نہیں دے سکتا تھا، اس لئے بیک وقت دونوں کوششوں کو جاری رہنا چاہئے۔ حالات اس طرح حد سے گذر گئے ہیں اور خطرات اس طرح سر پر منڈلا رہے ہیں کہ کسی ایک کوشش کے لئے دوسری کوشش کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی عمومی اشاعت و تبلیغ اور عوام کی تعلیم و تربیت کو خواص کے انقلاب و اصلاح تک کے لئے موقوف نہیں رکھا جا سکتا، کہ مسئلہ کسی سیاسی اصلاح و ترقی اور کسی معمولی تبدیلی کا نہیں ہے بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کی ہلاکت و نجات کا ہے، اور چند افراد کے لئے لاکھوں انسانوں کو جہالت و ضلالت میں نہیں چھوڑا جا سکتا، دوسرے یہ کہ خود خواص کے انقلاب و تغیر کے لئے عوام کی اصلاح اور بیداری ضروری ہے، دوسری طرف عوام کے کام کے لئے خواص کی ذہنی تبدیلی اور انقلاب حال کی کوشش کو ایک دن کے لئے ملتوی نہیں کیا جا سکتا، کہ زندگی ان سے برابر متاثر ہو رہی ہے اور ان کی تھوڑی توجہ مسلمانوں کی زندگی میں محسوس و نمایاں دینی انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور ان کی بے راہ روی اور دین سے بغاوت برسوں کی کوششوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ اسی لئے حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے اپنے لئے یہ میدان تجویز کیا، وہ ارکانِ سلطنت اور اہلِ رسوخ و وجاہت کو دین سے متاثر کر کے ان کے ذریعہ احکامِ شریعت کا اجراء کراتے اور دین کو رواج دینے کی کوشش کرتے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے زمانہ میں حد سے گذری ہوئی حالت کو دیکھ کر یہی راستہ اختیار کیا، انھوں نے بادشاہ اور اسکے اعیانِ دولت اور

امرائے دربار کو دین کا حلقہ بگوش بنا کر سلطنت مغلیہ کے رجحانات اور ذہن میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جو بالآخر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی شکل میں ظاہر ہوا، دینی رجحان کا وہ تدریجی ارتقاء جو جہانگیر سے شروع ہو کر عالمگیر پر ختم ہوتا ہے مجدد صاحبؒ کا دینی کارنامہ ہے جس کا اثر ہندوستان میں آج تک کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے، جن ملکوں میں برائے نام سہی لیکن اسلامی سلطنتیں ہیں، وہاں کام کرنے والوں کو مجدد صاحبؒ کی سیرت اور مکتوبات اور اُنکے طریقِ کار کا ضرور مطالعہ و تجربہ کرنا چاہئے۔

دوسری طرف امت کے سوادِ اعظم میں اس ایمان و یقین میں برابر انحطاط جاری ہے جو اس امت کا اصل سرمایہ اور اصلی طاقت تھی، اور ساری زندگی اس کی تابع تھی۔ اللہ پر یقین، اس سے خوف و محبت، رسولؐ سے تعلق، آخرت کا کھٹکا، جہنم کا خوف، جنت کا شوق، رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ، یہ مزاج براہِ راست پیغمبروں کی کوشش اور تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، اور صحابۂ کرامؓ کے حالات پڑھ کر ہم کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ ان کی عام سیرت اور مزاج یہی تھا، اس مزاج کا تغیر اور ان اوصاف میں زوال و انحطاط سب سے زیادہ تشویشناک واقعہ ہے، ایمان و احتساب (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے انعامات کی لالچ میں زندگی کے کام انجام دینا) یہ وہ قوتِ محرکہ تھی جو اس امت کی گاڑی کیلئے پہیہ کا کام دیتی تھی، اگر یہ قوت محرکہ جواب دے جائے تو کوئی چیز اس کے قائمقام نہیں ہوسکتی، صدیوں سے یہ قوت ضعیف ہوتی جارہی ہے اور خصوصیت سے اس پچھلے عرصہ میں یہ قوت بہت مضمحل اور کمزور ہوگئی ہے، اس قوت کی حفاظت اور اگر ضرورت ہو تو اس کا اعادہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے جس کو ایک دن کیلئے بھی مؤخر نہیں کیا جاسکتا۔ صاحبِ علم و صاحبِ اقتدار طبقہ کے ذہن کے اسلامی بننے سے پہلے بھی یہ کام ضروری ہے اور اس کے بعد بھی درحقیقت نہ وہ کام اس کام کے قائمقام ہوسکتا ہے اور نہ یہ کام اس کام کا بدل ہوسکتا ہے، ان دونوں کاموں کو بیک وقت جاری رہنا چاہئے، ان دونوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں، جو لوگ ان دونوں میں کوئی تضاد یا الگ الگ کام کرنے والوں میں کوئی مخالفت محسوس کرتے ہیں یہ صرف ان کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی ہے۔

مکتوبِ حرم

قارئین کو جناب مدیر "الفرقان" کے سفرِ حج کی اطلاع ہو چکی ہے۔ بہت سے احباب کو مولانا کی خیریت اور وہاں کے حالات کا انتظار و اشتیاق ہوگا۔ الفرقان کے پڑھنے والوں اور اس سے تعلق رکھنے والوں کی بھی ایک برادری اور گویا خاندان ہے اور یہ تعلق مادی و جسمانی تعلق سے کم نہیں، اس بناء پر مولانا کی خیریت اور حالات سے دلچسپی بالکل قدرتی امر ہے۔ یہاں مولانا کے چند خطوط شائع کئے جاتے ہیں، جو اس ناچیز کے نام ہیں۔　　"ابوالحسن علی"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمدی جہاز　　مابین عدن و کامران
۱/۱۲/

محبِ گرامی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم!

ارادہ تھا کہ قابلِ ذکر کوائف و تاثرات لکھنے کا حتی الوسع اہتمام کروں گا، لیکن لکھنؤ سے روانگی سے اب تک طبیعت کی ناسازی اور کچھ دوسرے مشاغل کا اتنا ہجوم رہا کہ اس کے لئے بالکل وقت نہ نکل سکا، کل عدن گذر گیا آج انشاء اللہ کامران کی باری ہے، اس وقت ارادہ کر کے بیٹھا ہوں کہ کچھ واقعات اور تاثرات قلم بند کراؤں، میں بول رہا ہوں اور مولوی محمد ثانی صاحب لکھ رہے ہیں۔

بمبئی تک کا راستہ الحمد اللہ بہت اچھا گذر گیا تھا اگرچہ میری طبیعت گھر ہی سے خراب تھی مگر بحمداللہ تکلیف نہیں ہوئی، سب دوست و احباب بھی آرام سے پہونچ گئے، راستے میں نماز باجماعت کا اہتمام رہا، تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا، مولوی محمد ثانی صاحب سے اللہ تعالیٰ نے بہت کام لیا، کاش!

یہ رواج عام ہو جائے کہ ریل کے ڈبہ میں جب چند مسلمان مسافر جمع ہوں تو فضول اور بیکار باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے دین سیکھنے سکھانے میں اور دینی مذاکرات میں اپنا وقت صرف کیا کریں۔

بمبئی "عمر ہال" میں ہمارا قیام ۱۲، ۱۳ دن رہا، الحمد للہ تعلیم کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ مولانا قاری عبد الوہاب صاحب (ناظم مدرسۂ فرقانیہ گونڈہ) تمام رفقاء کو بقدرِ ضرورت تجوید کی تعلیم دیتے رہے اور صحیح قرأت کی مشق کراتے رہے۔ مولانا محمد ثانی صاحب کے سپرد مناسک کی تعلیم رہی صبح کو بعد نمازِ فجر ایک مختصر تقریر کا میرا بھی معمول رہا۔

۱۷ کو ہم لوگ محمدی جہاز میں سوار ہو گئے تھے اگلے ہی دن سے بیشتر مسافروں کی طبیعت خراب ہو گئی، میں بھی بیکار ہو کر پڑ گیا اور جب بخار ایک دن زیادہ ہو گیا تو ہسپتال میں داخل ہو جانا مناسب معلوم ہوا، طبیعت بالکل صحیح ہو جانے پر کل صبح باہر آیا، بعد نمازِ ظہر ۲ بجے کے قریب جہاز کامران پر ٹھہرا، علاقہ کے لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر ہمارے جہاز کے ارد گرد آ گئے خوب خرید و فروخت کا بازار گرم رہا، غوطہ خور سائل عربوں کی حالت دیکھ کر بڑا رنج ہوا، ایک ایک پیسہ کے لئے کیسی محنت کرتے ہیں کیسی عبرت کی بات ہے، چند پیسوں کی مانگ پر یہ لوگ اتنی طاقت اور کیسا ہنر صرف کرتے ہیں اکاش! یہ قوتیں اب بھی اللہ کے اُس کام پر صرف ہوتیں جس پر ان کے آبا و اجداد نے صرف کی تھیں۔ شام کے قریب جہاز کامران سے روانہ ہوا اور اعلان ہوا کہ کل ۵ بجے انشاء اللہ جہاز یلملم پہونچے گا۔

اس وقت جبکہ یہ خط لکھوا رہا ہوں قریباً ۳ بجے کا وقت ہے، جہاز کے بیشتر مسافر ظہر سے پہلے ہی احرام باندھ چکے ہیں میں نے ابھی احرام باندھ کر ظہر کی نماز پڑھی ہے، تلبیہ کی آوازیں ہر طرف بلند ہو رہی ہیں۔ اوپر عرض کر نا رہ گیا کہ جہاز میں پڑھے لکھوں کی بھی خاصی تعداد ہے، بہت سے حضرات ایسے ہیں جنھیں میں نہیں پہچانتا ہوں مگر وہ مجھے غائبانہ جانتے ہیں۔ باوجودیکہ اس جہاز کے مسافروں کی حالت مجموعی طور پر غنیمت بلکہ بہت اچھی بتلائی جا رہی ہے لیکن کیا عرض کروں میری طبیعت پر اس مجمع کی حالت کے مشاہدے سے یہ اثر پڑا کہ امت کی گراوٹ اور دین سے دوری کا جو اندازہ اب تک ہم کر رہے تھے بات اس حد سے بھی آگے بڑھ چکی ہے لہذا احیاءِ دین و اصلاحِ امت کی جد و جہد کے سلسلے میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس میں غیر معمولی اضافہ کی ضرورت ہے۔

سب سے زیادہ تکلیف اس سفر میں بے پردگی کے مناظر سے ہو رہی ہے۔ جہاز میں قریباً چودہ سَو

مسافر ہیں، ان میں تہائی نہیں تو چوتھائی تعداد عورتوں کی ضرور ہے، ان میں بہت کم اللہ کی بندیاں ہیں جن میں اسلامی حیا ہے ورنہ بے پردگی اتنی بے باکی کے ساتھ ہے کہ گویا یہ غیر مسلم عورتیں ہیں پھر بے پردگی کے ساتھ تبرج بھی ہے، کبھی یہ وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مسلمان کہلانے والی عورتیں حج کا سفر بھی اس بے باکی اور بے پردگی کے ساتھ کرتی ہوں گی، یہ قیامت دولت مند اور اونچے گھرانوں کی عورتوں میں زیادہ ہے۔ بس کیا عرض کیا جائے اپنے جس حصۂ جسم کو دیکھا جاتا ہے وہی رستا ہوا ناسور نظر آتا ہے اور عقل حیران رہتی ہے کہ کس کا علاج کیا جائے۔ ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

انشاء اللہ عنقریب یلملم آنے کا اعلان ہونے والا ہے، اب سب جہازی احرام باندھ چکے ہیں کوئی غیر محرم نظر نہیں آتا، اُمید ہے کل صبح انشاء اللہ تعالیٰ جہاز جدہ پہونچ جائے گا، کل ہی مکہ معظمہ پہونچ جانے کی توقع کم ہے پرسوں بروز سہ شنبہ انشاء اللہ العزیز الکریم ہم لوگ بیت اللہ کی زیارت وطواف وغیرہ سے مشرف ہوں گے۔ اکثر ساتھیوں نے قران کا احرام باندھا ہے، بدل والے حضرات نے حسب قاعدہ صرف حج کی نیت کی ہے۔ اب یہ خط انشاء اللہ کل جدہ سے ہوائی ڈاک سے روانہ ہو سکے گا، اگر کچھ اضافہ کرنا ہوا تو کل کر دیا جائے گا ورنہ اسی کو بس سمجھئے گا۔

۲۶ر ستمبر
سہ شنبہ

[بعد کا اضافہ جدہ پہونچ کر: بلکہ ایک رات گذار کر]

محبی وصدیقی! سلام ورحمت

بحمد اللہ کل ۲۵ر ستمبر دوشنبہ کی صبح کو ہمارا جہاز جدہ پہونچ گیا، اترنے میں بہت دیر لگی اور پاسپورٹ وغیرہ دے کر باہر نکلنے میں ظہر کا وقت ہو گیا۔ پھر بعد مغرب اپنے معلم کے وکیل محمود صالح بسیونی کے یہاں پہونچے، کل چونکہ مختلف ممالک سے ۱۰ جہاز آئے ہیں اس لئے حاجیوں کی بیحد کثرت ہے کہیں بھی انتظامات پر قابو نہیں ہے اس لئے بیچارے معلم یا وکیل کی شکایت بے جا ہو گی ـــــ بہرحال جیسے تیسے رات گذاری، صبح ہوئی، صبح سے دوپہر ہوئی اور اب عصر کا وقت قریب ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شائد بعدِ مغرب لاری سے ہم مکہ معظمہ روانہ کئے جائیں گے ـــــ اگر اپنا بس ہوتا تو ہم دن کے اُجالے میں

مکہ معظمہ میں داخل ہونا بہتر سمجھتے۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ مخلص رفیق قاری عبدالوہاب صاحب نے آکر اطلاع دی کہ لاری انشاء اللہ مغرب سے پہلے ہی روانہ ہو جائے گی، کاش کوئی صورت ایسی ہوتی کہ مغرب سے پہلے ہی ہم داخلِ حرم ہو جاتے۔

بحمد اللہ سب رفیق بعافیت ہیں، افسوس! میں ہی اپنے اندر بہت سی کوتاہیاں اور محرومیاں دیکھ رہا ہوں۔ فالی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

ہاں یہ لکھنا بالکل بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی مدد سے جہاز میں بھی تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ چل پھر کے چند تعلیمی حلقے قائم کرائے گئے اور نمازوں کے بعد تعلیمی و تبلیغی تقریروں کا بھی تسلسل رہا۔ نماز کی جماعتیں مختلف مقامات پر ہوتی تھیں۔ سب سے اوپر ایک سب سے بڑی جماعت ہوتی تھی گویا جہاز کی مسجدوں میں وہ جامع مسجد تھی، اس میں کئی سو نمازی شریک ہوتے تھے۔ ہر روز بعد نماز فجر و عصر پابندی سے یہاں تقریر بھی ہوتی تھی۔ جن دنوں میری طبیعت خراب رہی، رفیق محترم مولنا عبید اللہ صاحب بلیاوی، مولنا سراج الحق صاحب الہ آبادی وغیرہ تقریریں فرماتے رہے، ان دونوں حضرات کو حج کے مسائل پر عبور بھی ہے اور بحمد اللہ تجربہ کار بھی ہیں۔ اللہ کے بندوں کو ان حضرات کے بیانوں سے بہت نفع ہوا، اور سیکڑوں نے گویا حج کرنا ان حضرات کی تقریروں سے سیکھ لیا۔ مجھے جب موقع ہوا میں نے اکثر آداب اور کیفیات کے موضوع پر کہا۔ اپنے کسی عمل سے تو کچھ اُمید نہیں ہوتی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی اور بندے کو توفیق دی کہ جو کچھ اس نے میری زبان سے سنا اس کو اس نے اپنا لیا اور اس پر وہ لگ گیا تو شائد اس کی برکت اور اس کے طفیل سے میرا بھی بیڑا پار ہو جائے۔ کاش! اللہ نے جتنی حقیقتوں کا علم اپنے فضل سے دیدیا ہے اور کہنے کے لئے جیسی زبان بخشدی ہے، ایسے ہی اپنے فضل و کرم سے وہ اس علم اور قال کو حال بھی بنا دے۔ دما ھو علی اللہ بعزیز۔ والسلام

دُعاگو۔ دُعا کا طالب:۔ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہٗ

۵ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۹ء یوم شنبہ

مکۃ المکرمہ
چہارشنبہ ۶ ذی الحجہ - ۲۷ ستمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجبی وصدیقی! سلام ورحمت

اللہ تعالیٰ کے خاص الخاص فضل وکرم نے شب گذشتہ نماز عشاء کے بعد مکہ معظمہ میں داخلہ نصیب فرمایا لاری نے معلم صاحب کے مکان کے قریب جاکر اتارا، سامان اُتارنے اور فوری حوائج سے فارغ ہونے کے بعد مولوی محمد ثانی صاحب کو ساتھ لے کر یہ عاجز اسی وقت مسجد حرام میں آگیا۔ باب السلام سے داخل ہوکر عمر میں پہلی دفعہ سر کی آنکھوں سے اللہ کے گھر کو دیکھا اور عرض کیا:-

"اللھم زد بیتک ھذا تشریفاً وتعظیماً وتکریماً ومھابۃ. وزد من شرفہ وعظمہ وکرمہ ممن حجہ او اعتمرہ تشریفاً وتکریماً وتعظیماً وبراً -

اعوذ برب البیت من الدین والفقر وضیق الصدر وعذاب القبر وعذاب النار -

اللھم انت السلام ومنک السلام حینا ربنا بالسلام"

پھر عمرہ کا طواف کیا، اور طواف سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ نے مقام ابراہیمؑ میں رکعتیں طواف ادا کرنا آسان فرمادیا اس کے بعد ملتزم سے خوب چمٹنا بھی نصیب ہوگیا، وہاں سے آکر زمزم شریف سے تازہ تازہ نکلتا ہوا پانی پیا - ان سب مواقع پر اللہ تعالیٰ نے کچھ دعائیں مانگنے کی بھی توفیق دی، پھر اسی وقت سعی کی اور سعی کے دوران میں اور فراغ پر بھی دعا مانگی، اور جہانتک ہوسکا قصد کے ساتھ آپ کو، اور شفقت ومحبت کے حقوق رکھنے والے دوسرے اکابر واحباب کو یاد کیا۔

اس سب سے فارغ ہوکر چند دوستوں کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی ـــــ رات کا بیشتر حصہ ان ہی مشاغل میں گذر گیا، تھوڑی دیر لیٹے تھے کہ صبح کی اذان ہوگئی اور ہم وضو کرکے حاضر ہوگئے، نماز سے فارغ ہوکر تبلیغی جماعت کے مستقر پر آئے، یہاں مدتوں کے بچھڑوں کو دیکھ کر دوسری عید ہوگئی - مولنا سعید خاں صاحب، حاجی فضل عظیم صاحب، میاں جی محراب خاں، ارشد صاحب، بابو بشیر احمد صاحب، بابو عبدالوہاب صاحب، اور ان کے علاوہ ہندوستان وپاکستان کے اور بھی بہت سے تبلیغی رفقاء وہاں مل گئے ـــــ مولوی سعید خاں صاحب نے تقریر کی اس کے بعد اسی مضمون پر اس عاجز نے کچھ عرض کیا۔ مولوی سعید خاں صاحب کی تقریر سن کر حضرت رحمۃ اللہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب موصوف کو حضرتؒ کی نسبت (علوم ومعارف اور حقائق رسی) سے خاص حصہ نصیب فرمادیا ہے، اُن کی اس تقریر سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔

نماز فجر سے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد یہ مجلس خیر برخواست ہوئی، میں نے نوافل پڑھے اور طواف کیا اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر اب پھر مسجد حرام کے ایک گوشہ ہی میں آبیٹھا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مسجد حرام قبل ظہر ۶ر ذی الحجہ ۶۸ھ

ایک بات عرض کرنی رہ گئی محمدی جہاز کے پڑھے لکھے مسافروں میں کم ایسے تھے جو "حج نمبر" نہ دیکھ چکے ہوں، یا اس کا تذکرہ سُن کر اس کے مشتاق نہ ہوں —— معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کوشش شائد قبول فرمالی۔ نعمانی غفرلہ

---

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکہ معظمہ ۱۸ر ذی الحجہ ۶۸ھ

مدرسۂ فخریہ باب ابراہیمؑ ۱۱ر اکتوبر ۴۹ء

محب گرامی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ ومرضاتہ

۷ر ذی الحجہ کو جو خط یہاں سے روانہ کیا تھا اُمید ہے کہ موصول ہوا ہوگا۔ ۶ر ذی الحجہ تک کے کچھ کوائف اس میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد سے اب تک کے حالات مختصراً اب عرض کرتا ہوں۔

۷ر ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا، ہم لوگ یہاں کے حساب سے ۳ بجے کے بعد ہی (یعنی ہندوستان کے حساب سے ۹ بجے کے بعد) حرم میں پہنچ گئے، اگر اتنی جلدی نہ کرتے تو جگہ ملنی مشکل ہوجاتی، خطیب نے خطبہ دیا جس میں اچھی خاصی تفصیل سے مناسکِ حج بیان کئے، خطبہ بڑا مؤثر اور بڑا مفید تھا۔

پھر شام ہی سے منیٰ جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں، ہم لوگوں نے پیدل جانے کا فیصلہ کیا اور

صبح کو چا وغیرہ سے فارغ ہو کر بنام خدا چل دیئے، ڈیڑھ دو گھنٹے میں منیٰ پہونچ گئے، سب سے پہلے مسجد خیف میں حاضر ہوئے، تبلیغی جماعت کے کچھ احباب ہم سے پہلے پہونچ چکے تھے، ان کی وجہ سے بحمد اللہ اس مبارک مقام پر جگہ مل گئی جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ حجۃ الوداع میں رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہیں قیام فرمایا تھا۔ اس مقدس مسجد میں بھی یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ حجاج کی بہت بڑی تعداد اُس ادب اور اُس احساسِ عظمت اور اُس فکر سے خالی نظر آتی تھی جو یہاں ہونی چاہئے۔ نمازوں تک میں سخت بے ترتیبی اور بے پروائی دیکھی، بہت سی ٹولیاں اپنی اپنی نمازیں الگ الگ پڑھنے والی تھیں اس لئے جیسی باقاعدہ جماعت اس اہم مقام پر ہونی چاہئے تھی ایک وقت بھی میسر نہ آئی، نویں کی صبح کو عرفات جانا تھا یہ مناسب سمجھا کہ یہ سفر پیدل طے نہ کیا جائے تاکہ تھکے ہارے وہاں نہ پہونچیں۔ چنانچہ تین ریال فی کس دیکر لاری سے عرفات پہونچے اور اپنے خیمے میں مقیم ہو گئے۔ پانی کی کمی نہ منیٰ میں تھی اور نہ الحمد اللہ عرفات میں، زوال سے پہلے اکثر ساتھیوں نے غسل بھی کیا اور اللہ نے جس کو جیسی توفیق دی ذکر، تلاوت یا دعا میں مشغول رہا۔ سورج کی گرمی جب کچھ کم ہوئی تو دعا کیلئے جبلِ رحمت کے قریب بھی گئے اور اس وقت جیسی اللہ نے توفیق دی ہر ایک نے دعائیں کیں، اُس وقت کا منظر عجیب تھا۔ غروب آفتاب کے بعد عرفات سے مزدلفہ کو پیدل روانہ ہوئے اور الحمد اللہ مشعر حرام کے بالکل قریب رات گذاری پھر صبح کو وہاں سے پیدل ہی منیٰ روانہ ہوئے، یہاں پہونچ کر جمرۂ عقبہ کی رمی کی، وہاں سے سیدھے منحر گئے اور قربانیاں کیں۔ ذبح کرنے والے صرف ذبح کرنے کی اُجرت فی جانور ایک ریال مانگتے تھے، اتفاق سے اپنے ساتھیوں میں قاری عبدالوہاب صاحب کے پاس ایک چھوٹا سا قلم تراش چاقو تھا، نو عمری میں شکار سے بھی کچھ دلچسپی رہی تھی آج وہ کچھ کام آئی اور میں نے اُسی چاقو سے دس بارہ بکرے اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالے۔ قربانی سے فارغ ہو کر ساتھیوں نے حلق یا قصر کرایا، اور جس کو موقع ملا نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر طواف زیارت کیلئے ہم سب لاری سے مکۂ مکرمہ روانہ ہوئے۔ طواف سے فارغ ہو کر پھر منیٰ واپسی ہوئی اور رات وہیں گزاری۔ اکثر حجاج بارہ[۱۲] کو منیٰ سے مکۂ معظمہ آگئے، ہم لوگوں نے مناسب سمجھا کہ کل یعنی تیرہ[۱۳] کو روانہ ہوں تاکہ تیرھویں رات اور تیرہ کا دن ذرا کچھ سکون و اطمینان سے گزرے۔ اژدہام چونکہ کم ہو چکا تھا اور اندازاً نوے فی صدی حجاج مکۂ معظمہ جا چکے تھے اس لئے توقع کے مطابق یہ ایک رات اور اگلا دن سکون سے گذرا، اور تیرہ[۱۳] کی

شام کو رمی کر کے ہم لوگ مکہ معظمہ آ گئے۔

ادائے مناسک میں بے قاعدگی اور بے پرواہی کے مناظر یہاں منیٰ میں بھی بہت دیکھے اور دل بہت دکھا۔ گیارہ اور بارہ کو زوال سے پہلے رمی کرنے والے تو ہزاروں تھے، علیٰ ہذا قربانی سے پہلے ہزاروں نے حلق کرا لیا۔ اللہ کی شان ہے یہ بندے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے اپنے وطنوں سے آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس مکہ مدینہ جانے اور آنے سے حج ہو جاتا ہے۔ معلوم کرنے اور سیکھنے کی فکر رکھنے والے بہت کم ہیں اور بے فکر اور بے پرواہ بہت زیادہ۔ اور اللہ ہدایت دے "معلموں" کو ان میں شاذ و نادر اکثر وہ ہیں جو اپنی دینی ذمہ داریوں کا احساس بالکل نہیں کرتے، ہم نے خود دیکھا کہ اپنی سہولت کے لئے حاجیوں کو منیٰ و عرفات بھیجنے میں انھوں نے اوقات کا بالکل خیال نہیں کیا نیز بعض معلموں کو دیکھا گیا کہ انھوں نے عورتوں اور بہت سے مردوں کو بھی مشورہ دے دیا کہ تم نیابتاً کسی دوسرے سے رمی کرا دو ——— خیر یہ داستان تو بہت طویل ہے کس کس چیز کا ذکر کیا جائے اور کس کس کو رویا جائے۔ ؎

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

اب تیرہ کی شام سے ہم لوگوں کا قیام مکہ معظمہ میں ہی ہے اس کا بڑا قلق اور افسوس ہے کہ یہاں کی چیزوں کا شایانِ شان ادب خود اپنے سے نہیں ہو رہا ہے۔ معلوم ہے کہ جو اوقات یہاں میسر ہیں یہ اللہ کی خاص نعمت ہیں، ورنہ کہاں ہم ہندی اور کہاں یہ سرزمینِ مقدس، معلوم نہیں اس کے بعد کبھی حاضری مقدر میں ہے یا نہیں، مگر اس کے باوجود قدر نہیں ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اب تک کی تقصیروں کو معاف فرمائے، اور بقیہ دنوں میں شایانِ شان ادب اور قدر کی توفیق دے۔

یہاں پہونچ کر برسوں کے بچھڑوں سے ملنا بھی نصیب ہو گیا۔ . . . . حاجی عبدالجبار صاحب احمد شاہ صاحب، بابو بشیر صاحب، سید جمیل صاحب سب آئے ہوئے ہیں الحمد للہ دعوت کے کام میں اچھی فکر سے حصہ لے رہے ہیں۔ حضرت سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ) دعوت کی طرف بہت متوجہ ہیں، عام و خاص اجتماعات میں اکثر سید صاحب ہی کی تقریریں ہوتی ہیں۔ یہاں کے مقیم دوستوں میں مولوی سعید خاں صاحب، مولوی زین العابدین صاحب، مولوی عبدالملک اور حاجی

فضل عظیم صاحب (اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عظیم فضل فرمائے) خوب فکر سے کام میں لگے ہیں ان کا انہماک اور دل کی فکر مجھ جیسوں کے لئے بڑی قابلِ رشک اور سبق آموز ہے۔

مولوی عبدالرشید صاحب اور مولوی محمد معین صاحب بھی الحمد للہ اپنا کام فکر سے کر رہے ہیں، اور توقع ہے کہ جس مقصد کے لئے ان کا قیام یہاں تجویز کیا گیا ہے انشاء اللہ اس کیلئے یہ حضرات مفید ثابت ہوں گے۔ ان کے کام کے متعلق میرے ذہن میں چند باتیں ہیں جو انشاء اللہ العزیز زبانی عرض کروں گا۔

جن بچھڑے ہوئے دوستوں کے ملنے سے یہاں خاص خوشی ہوئی اُن میں مولٰنا مسعود عالم صاحب ندوی اور بھائی عبدالعزیز شرقی کا ذکر رہ گیا۔ مولٰنا مسعود عالم صاحب سے کئی دفعہ ملاقات ہو چکی ہے، شرقی صاحب سے صرف ایک دفعہ ملنا ہو سکا، میں بھی ان کی تلاش میں ہوں اور وہ بھی مجھے ضرور تلاش کرتے ہوں گے لیکن اس بے حساب اژدہام میں کسی کا دوسرے کو پالینا آسان نہیں ہے۔

آج ذی الحجہ کی ۱۸ ہو چکی ہے، کل سنا ہے کہ انشاء اللہ مدینہ جانے والے تمام حجاج ۲۹ تک روانہ کر دیئے جائیں گے، گویا آخری کھیپ ۲۸، ۲۹ کو جائے گا۔ ہم لوگ چونکہ آخری جہاز سے آئے ہیں اس لئے ہمارا نمبر بھی آخر میں آئے گا اور اس حساب سے توقع یہ ہے کہ انشاء اللہ العزیز الکریم اوائلِ محرم میں ہم لوگ مدینۂ طیبہ حاضری کی سعادت حاصل کر سکیں گے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ واپسی بھی اب کے جلد ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کو آخری جہاز ۱۶ نومبر کو روانہ ہو جائے گا اگر یہ خبر صحیح ثابت ہوئی تو ہم قریباً دو ہفتے مدینۂ طیبہ رہ سکیں گے، اور آخر نومبر میں انشاء اللہ ہندوستان پہونچ سکیں گے۔ لیکن یہ سب تخمینے ہیں جن کی بنیاد مسموعات پر ہے، فی الحقیقت ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں طے ہے "یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید"

معلوم ہوا ہے کہ آج سید جمیل صاحب جدہ روانہ ہو رہے ہیں اور وہاں سے پرسوں غالباً ہوائی جہاز سے کراچی روانہ ہو جائیں گے۔ یہ خط اس امید پر لکھ رہا ہوں کہ ان کے حوالہ کر دوں گا تاکہ وہ اس کو وہاں سے روانہ کر دیں، اس طرح انشاء اللہ یہ جلدی پہونچ جائے گا۔ اب اس کے بعد دوسرا خط

انشاء اللہ اُس وقت لکھوں گا جبکہ یہاں سے مدینۂ طیبہ کی روانگی کی تاریخ متعین اور معلوم ہو جائیگی۔

منیٰ میں، عرفات میں، اور ملتزم پر آپ کو اور دوسرے اکثر محسنوں اور محبوں کو اور عزیزوں کو نام بنام یاد کرنے کی کوشش ابتک الحمد للہ برابر رہی اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گی، اور اجمالاً سب ہی کو یاد کرتا ہوں۔ کل آپ کی طرف سے پہلا طواف کرنے کی سعادت بھی حاصل کی، اللہ تعالیٰ اپنی شانِ کریمی کے مطابق بہترین جزا دے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہم العالی کو میرے یہاں پہونچنے سے اگلے ہی روز حضرت کا والا نامہ ملا جس میں ملتزم پر دعا کی طرف خاص توجہ دلائی گئی تھی، اگر حضرت کا یہ والا نامہ نہ ملتا تو ملتزم پر حاضری اور دعا کرنے کے اتنے اہتمام کی غالباً توفیق نہ ہوتی جتنی کہ الحمد للہ حضرت کے اس نامۂ گرامی کی برکت سے اب حاصل ہو رہی ہے۔

اکثر کوشش کرتا ہوں کہ ہر طواف کے ختم پر ملتزم پر حاضر ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس کوشش میں اکثر کامیابی ہی ہوتی ہے۔ انشاء اللہ باقی آئندہ۔ والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

---

(۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسۂ فخریہ باب ابراہیمؑ
حرم شریف مکۂ مکرمہ

۲ محرم الحرام ۶۹ھ ۲۴ اکتوبر ۴۹ء
یوم سہ شنبہ

محبِ گرامی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہاں آ ہونچ کر پہلا خط ۷ ذی الحجہ جمعہ کو روانہ کیا تھا، دوسرا پچھلے ہفتہ سید جمیل صاحب کے حوالہ کر دیا تھا جو انھوں نے پہونچ کر روانہ کر دیا ہوگا، خدا کرے یہ دونوں خط مل چکے ہوں ——
کس زبان سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے کہ اس ناپاک وجود کو اس پاک شہر میں ایک مہینہ قیام کا موقع مل چکا ہے۔ رب کریم کی طرف سے تو یہ عطا اور یہ انعام ہے کہ قیام بھی مسجد حرام ہی کے ایک گوشہ میں

نصیب ہے، لیکن اپنی تقصیر اور محرومی کا حال یہ ہے کہ کچھ نہیں ہو رہا ہے ــــ طواف اگر روزانہ پچاس سو بھی ہو جایا کرتے تو زیادہ نہ تھے۔ اگر رات بھر نماز اور طواف ہی میں گزرا کرتی تو حق تھا لیکن ہائے بدنصیبی اور محرومی کہ اوقات کا زیادہ بہت زیادہ حصہ یہاں بھی کھانے پینے اور لیٹنے سونے ہی میں گزرتا ہے۔

حجاج کی بہت بڑی تعداد اپنے اپنے وطن یا مدینۂ طیبہ روانہ ہو چکی ہے اس لئے اب اژدہام کی وہ کیفیت نہیں رہی ــــ مغرب سے پہلے مغرب کے بعد اور فجر کے بعد تو مطاف اگرچہ اب بھی طائفین سے بھرا رہتا ہے، لیکن دوسرے اوقات میں ہجوم نہیں رہتا۔ اطمینان اور سہولت سے طواف کرنا میسر ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذا حطیم میں اور مقام ابراہیمؑ کے پیچھے نماز پڑھنا بھی اب آسانی سے نصیب ہو جاتا ہے ــــ ملتزم کی اہمیت کا غالباً بہت کم لوگوں کو علم ہے اس لئے وہاں حاضر ہونے اور دیر تک حاضر رہنے کا موقع زیادہ سے زیادہ اژدہام کے دنوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے ملتا رہا، اور الحمد للہ کوئی حاضری شائد ایسی نہ ہوگی جس میں رب کریم سے اپنے ساتھ آپ کیلئے اور دوسرے چند محسنوں مخلصوں محبتوں کیلئے نام کے ساتھ نہ مانگا ہو ــــ اور مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آپ حضرات کے حق میں اس سیہ کار کی کوئی معروض قبول فرمائی ہوگی تو اس کی رحمت اس ناپاک کو بھی بالکل محروم نہ رکھے گی۔

یہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کی دو نعمتوں کی قدر و عظمت کا احساس پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے ایک علم دین کی نعمت اور دوسرے اللہ کے بعض مخلص و صالح بندوں سے تعلق و محبت۔ دوسروں کے بارہ میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے متعلق تو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ دو انعام اگر پہلے نہ ہو چکے ہوتے تو میری محرومی اب سے بیسیوں گنا زیادہ ہوتی ــــ دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے سفر حج میں تین چار مہینے یوں ضرور لگ جاتے ہیں اگر اس سے پہلے چند مہینے وہ کسی اچھے مؤثر دینی ماحول میں رہ کر دین کی کچھ تعلیم و تربیت حاصل کر لیا کریں اور کسی بندۂ خدا کی صحبت سے اُن میں دین کا کچھ ذوق اور رنگ پیدا ہو جایا کرے تو پھر اُن کا حج انشاء اللہ دوسری ہی طرح کا حج ہوا کرے۔

مکۂ معظمہ میں تمام عالمِ اسلامی کا نمونہ دیکھ لیا، افسوس ہے کہ کسی ایک ملک کے مسلمان بھی ایسے نظر نہ آئے جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوا ہوتا کہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی حالت اچھی ہے۔ معلوم نہیں مستقبل کیلئے قضا، وقدر کے فیصلے کیا ہیں —— بظاہر تو کُل دنیائے اسلام کے مسلمان دین سے اتنے ہٹ چکے اور اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اصلاح حال کی کوئی صورت پیدا فرمائے تو کچھ ہو سکتا ہے۔

۸، محرم الحرام ۶۹ھ
۲۹، اکتوبر ۴۹ء

یوم یکشنبہ

یکم محرم سہ شنبہ کو ایک خط لکھنا شروع کیا تھا لیکن لکھتے لکھتے غالباً اذان ہو گئی اور اس کے بعد پھر اس کو پورا کرنے کی آج تک نوبت نہیں آئی۔ ۶۰۵ دن کے بعد آج موقع ملا ہے۔

آج انشاء اللہ مدینۂ طیبہ کو ہماری روانگی ہے اگر دیر یا جلدی کی کوئی اور وجہ پیش نہ آئی تو اپنا ارادہ دو ہفتے وہاں قیام کا ہے، اس طرح اُمید ہے کہ وسط نومبر ہی میں مدینۂ طیبہ سے واپسی ہو جائے گی اور خدا نے چاہا تو نومبر کے اواخر یا اوائل دسمبر میں ہم لوگ لکھنؤ پہونچ سکیں گے۔ بحمد اللہ ہم سب بعافیت ہیں۔ مولوی محمد ثانی صاحب کا آنا جس درجہ مفید اور موجب اطمینان و راحت ہوا اس کا بالکل اندازہ نہ تھا، دراصل اللہ تعالیٰ کی یہ ہمارے ساتھ بڑی رحمت ہوئی۔ آپ کی طرف سے طواف بھی کئے اور ایک عمرہ بھی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

گویا مکہ معظمہ ۳۴، ۳۵ دن قیام نصیب رہا، افسوس ہے کہ یہ وقت جس طرح گزرنا چاہئے تھا بالکل نہ گزر سکا اللہ تعالیٰ توفیق دیں کہ مدینۂ طیبہ کا وقت اچھا گزر جائے اگرچہ اپنی تن آسانی اور قسمت کی محرومی سے بڑا خطرہ ہے۔
مجھے اس کے بعد شائد مدینۂ طیبہ سے ایک خط لکھنے کا اور موقع ملے گا۔

اللہ خیرٌ حافظاً و ھو ارحم الراحمین ؕ

والسلام۔ محمد منظور نعمانی (عفا اللہ عنہ)

انبیاء کا طریق دعوت و اصلاح

(سید ابوالحسن علی ندوی)

مترجمہ :- مولوی سید محمد رابع حسنی

—(۲)—

قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو اللہ نے اپنے رسولؐ کو اور آپ کے اصحابؓ کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی، یہ لوگ یثرب کو ہجرت کر گئے اور اسلام ان سے بھی پہلے یثرب پہونچ چکا تھا۔

اہلِ مکہ یثرب والوں سے خوب گھل مل گئے حالانکہ ان کے درمیان کی کڑی صرف یہ نیا مذہب تھا، تاریخ نے دین کی طاقت و اثر کا یہ انوکھا منظر پیش کیا۔ اوس و خزرج نے جنگ بعاث سے ابھی اپنا دامن بھی نہ جھاڑا تھا اور ان کی خوں آشام تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا ایسے حالات میں اسلام نے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی۔ اس مصالحت کے لئے اگر کوئی شخص پوری دنیا کا خزانہ خرچ کر دیتا تو بھی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ اس کے بعد نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا ایسا بھائی چارہ جس کے سامنے سگے بھائیوں کی محبت گرد اور دنیا کی ساری دوستیاں اس سے شرمندہ تھیں، تاریخ میں ایسی محبت و خلوص کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نوزائیدہ جماعت جو مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ پر مشتمل تھی ایک عظیم الشان اسلامی اُمت کی اساس اور اسلام کا سرمایہ تھی۔ اس جماعت کا ظہور ایسی کٹھن گھڑی میں ہوا جبکہ دنیا موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس جماعت نے آکر اس کی زندگی کا پلہ اچھا کا دیا اور ان تمام خطرات کو دور کر دیا جو اس کو درپیش تھے، اس جماعت کا ظہور پھر اس کا استحکام انسانیت کی بقا کیلئے ضروری تھا، اسی لئے جب اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کی اخوت و محبت پر زور دیا تو فرمایا (اگر ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا)۔ ادھر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) مسلسل نہایت دقیق

اور درس تربیت فرماتے تھے، اور اُدھر قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی مجالس سے ان کو دینی استحکام خواہشات نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی۔ وہ لوگ چستی و سستی میں رسُول کی اطاعت کرتے، جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں اٹھ کھڑے ہوتے، یہ لوگ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی معیت میں دس سال کے اندر ستائیس بار جہاد کے لئے نکلے اور آپ کے حکم سے سو مرتبہ سے زائد کمر بستہ ہوکر میدانِ جنگ کی طرف گئے۔ ان کے لئے دنیا سے بےتعلقی آسان بن گئی تھی، اہل و عیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ قرآن کی آیات وہ بے شمار احکام لائیں جو ان کے لئے پہلے سے مانوس نہ تھے۔ نفس و مال، اولاد و خاندان کے بارے میں احکام نازل ہوئے جن کی تعمیل کچھ ہنسی کھیل نہ تھی، لیکن خدا اور رسول کی ہر بات ماننے کی عادت پڑ گئی تھی۔ شرک و کفر کی گتھی جب سلجھ گئی تو ساری گتھیاں ہاتھ لگاتے ہی سلجھ گئیں۔ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک بار ان کے ایمان کے لئے کوشش فرمائی۔ پھر ہر ہر امر و نہی اور ہر نئے حکم کے لئے مستقل کوشش اور جد و جہد کی ضرورت نہ رہی۔ اسلام و جاہلیت کے پہلے معرکہ میں اسلام نے جاہلیت پر فتح حاصل کرلی۔ پھر تو ہر موقع کے لئے ہر مرتبہ نئے معرکہ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ وہ لوگ مع اپنے قلوب کے مع اپنے ہاتھ پاؤں کے مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آگئے، ان پر جب حق واضح ہوگیا تو رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے کوئی کشاکش باقی نہ رہی۔ آپ کے فیصلہ پر ان کے سینے کبھی نہ بھنچتے جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے روبرو اپنے چھپے قصوروں کا اقرار کیا، اور اگر کسی گناہ میں مبتلا ہوگئے تو اپنے جسموں کو حدود اور سزاؤں کیلئے پیش کردیا۔ شراب کی حرمت کا نزول ہوا اور چھلکتے ہوئے جام ہتیلیوں پر تھے، اللہ کا حکم ان کے بھڑکتے ہوئے جگر آلودہ لبوں اور شراب کے پیالوں کے درمیان حائل ہوگیا، پھر کیا تھا ہاتھ کو ہمت نہ تھی کہ اوپر اٹھ سکے اور لبوں کی تمنائیں دہیں خشک ہوگئیں، شراب کے برتن توڑ دیئے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں اور نالیوں میں بہہ رہی تھی۔

جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے دھل گئے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جب ان کے

نفوس کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ لوگ اپنے نفسوں سے ویسا ہی برتاؤ کرنے لگے جیسا وہ دوسرے سے کرتے تھے۔ دنیا میں رہتے ہوئے مردانِ آخرت اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے والے بن گئے نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا، دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا، بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہو سکتا تھا، لوگوں کیلئے وہ میزانِ عدل تھے، وہ انصاف کے علمبردار، اللہ تعالیٰ کے گواہ تھے خواہ اپنے نفس کے خلاف گواہی دینی پڑے خواہ والدین اور اعزہ کے مخالف جانا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا اور دنیا کو ان کیلئے مسخر کر دیا، وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنا جانشین بنایا، اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان لیکر رفیقِ اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے۔

مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دستِ مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا، اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی، اس کی سرعت اس کا عمق اس کی وسعت و ہمہ گیری، اس کی وضاحت اور فہم انسانی سے قرب، یہ سب اس محیر العقول واقعہ کے نرالے پہلو تھے۔ یہ انقلاب دوسرے خارق عادت واقعات کی طرح کوئی پیچیدہ مسئلہ یا ناقابلِ فہم معمہ نہ تھا، علمی طریقے سے اس انقلاب کی تحقیقات کیجئے، تاریخِ انسانی اور معاشرۂ انسانی میں اس کے اثرات کا مطالعہ کیجئے۔

تمام لوگ خواہ عرب ہوں یا عجمی نہایت مسخ شدہ زندگی گذار رہے تھے، ہر وہ ہستی جو ان کیلئے وجود میں لائی گئی تھی، اور جو ان کے تصرفات کے تابع تھی، امر و نہی اور سزا و جزا کی طاقت سے محروم تھی اس کی وہ پرستش کرنے لگے تھے۔ وہ ایک بالکل سطحی اور اتھلی مذہبیت رکھتے تھے جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع، ارواح اور قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔

اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متاثر نہ تھے اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان ایسا تھا جیسا کہ ایک صانع اپنا کام پورا کر کے کنارہ کش اور گوشہ نشین ہو گیا ہو اور اس نے اپنی مملکت ان لوگوں کے حوالے کر دی ہو جن کو اس نے خلعت ربوبیت سے سرفراز کیا ہو اور وہ حکومت پر قابض ہوں اور سیاہ و سفید ان کے ہاتھ میں ہو۔ غذا کی تقسیم ملک کا نظم و نسق ان کے اختیار میں ہو، غرض ایک منظم حکومت کے جتنے شعبے اور محکمے ہوتے ہیں وہ سب ان کے انتظام میں ہوں۔

اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان ایک تاریخی واقفیت سے زیادہ نہ تھا، اللہ کو پروردگار سمجھنا اور اس کو زمین و آسمان کا خالق ماننا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر ہے؟ وہ جواب دے کہ فلاں بادشاہ کی! اس بادشاہ کے نام سے اس کے قلب پر خوف و ہراس کی کوئی لہر نہ دوڑے نہ اس کے دماغ پر کوئی اثر پڑے۔ ان لوگوں کا دین اللہ تعالیٰ کے خوف اور تضرع و دعا سے خالی تھا۔ اللہ کی صفات سے وہ بالکل بے خبر تھے اس لئے ان کے دل میں اس کی محبت کا کوئی جذبہ اور اس کی عظمت و کبریائی کا کوئی نقش نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کو بہت مبہم، مجمل اور عامیانہ و سطحی سا علم تھا جس میں کوئی گہرائی اور قوت نہ تھی۔

یونانی فلسفہ نے خدائے تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے سلسلہ میں زیادہ تر نفی سے کام لیا۔ اس نے صفات کی نفی کی اور نفی کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا جس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مثبت تعریف اور کوئی ایجابی صفت نہیں ہے، نہ اس کی قدرت کا ذکر آتا ہے نہ اس کی ربوبیت، اسکی بے پایاں بخشش، اس کی محبت و رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس فلسفہ نے خلق اول کو تو ثابت کیا تھا لیکن علم، اختیار و ارادہ اور صفات کی نفی کی اور اپنی طرف سے ایسے کلیات و اصول وضع کئے جو اس ذات عالی کی تنقیص اور مخلوقات پر قیاس تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر سیکڑوں نفی جمع ہو جائیں تو ایک ایجاب کا فائدہ بھی نہیں دے سکتیں۔

ہمارے علم میں آج تک ایسا کوئی نظام ایسا کوئی تمدن اور ایسی کوئی سوسائٹی بھی وجود میں نہیں آئی جو محض نفی پر قائم ہو، یونانی فلسفہ کے حلقۂ اثر میں دین و مذہب خشوع، تضرع حوادث میں رب العالمین کی طرف توجہ قلبی محبت و الفت کی روح سے یکسر خالی تھا۔ اسی طرح اس دور کی مذہبیت روح کھو بیٹھی اور صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں دنیا میں رہ گئیں۔

مسلمان امت اور عرب قوم اس بیمار غیر واضح اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدہ تک پہونچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا، معاشرت کو متاثر کرنے والا اور زندگی اور متعلقات زندگی پر حاوی تھا۔ وہ لوگ اس خدائے قدوس پر ایمان لائے جس کے بہترین نام ہیں، جس کی شان سب سے اونچی ہے۔ وہ لوگ ایسے رب العالمین پر ایمان لائے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ قیامت کے دن کا تنہا مالک و مختار شہنشاہ پاک،

هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب والشهادة هو الرحمٰن الرحیم (الی آخر الآیات)

جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی۔ جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، اور وہ تمام صفات جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، جنت اُس کا انعام ہے، اور دوزخ اس کی سزا جس کیلئے چاہتا ہے رزق میں کشائش کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے، آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار کو خوب جانتا ہے، اور جو کچھ اس کے تصرفات کے متعلق قرآن نے بتایا ہے۔

اس گہرے وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہوگئیں، جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی گواہی دیتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا، ایمان اس میں پیوست ہوجاتا، یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا، اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا، جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اسکی جڑوں کو اکھاڑ کے پھینک دیتا، دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے اور وہ شخص پہلا آدمی باقی نہ رہتا، اس شخص سے صبر و شجاعت ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہیں، قوت ایمان کے سوا کسی اور چیز سے اس کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔

یہ ایمان ایک کامیاب اخلاقی [illegible] اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی، محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی۔ تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا جو نفس کی ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ

فتح حاصل کرلیتی۔

اگر کسی وقت صفت بہیمی زور کرتی اور انسان سے غلطی ہو جاتی، اور یہ ایسا موقع ہوتا جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور وہ شخص قانون کی دسترس سے باہر ہوتا تو یہی ایمان نفس لوامہ بن جاتا، دل کی پھانس چین نہ لینے دیتی۔ پریشان کن خیالات کا سیلاب اُمنڈنے لگتا، اس گناہ کی یاد میں چین حرام ہو جاتا۔ حتیٰ کہ وہ شخص خود قانون کے سامنے اقرارِ جرم کرتا اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیتا اور پھر اس سزا کو برضا و رغبت جھیلتا تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکے اور آخرت کی سزا کی جگہ دنیا کی سزا لے لے۔

ہمارے سامنے معتبر مؤرخین نے اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی نظیر اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مِل سکتی۔ ان ہی واقعات میں سے ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ بھی ہے جس کو امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے (یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کروادیں) آپ نے اُن کو واپس کر دیا دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے (یا رسول اللہ میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں) آپ نے دُبارہ پھر واپس کر دیا اور ان کے گھرانے سے دریافت کرایا کہ ان کی سمجھ میں کسی قسم کی کوئی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ سمجھ دار اور اچھے خاصے آدمی ہیں۔ پھر تیسری بار ماعز بن مالک آئے، آپ نے دوبارہ دریافت کرایا جواب یکساں ملا، چوتھی بار جب وہ آئے تو آپ نے نصف دفن کرواکر سنگسار کر دینے کا حکم دیا۔

اسکے بعد غامدیہ آئیں کہنے لگیں۔ یا رسول اللہ مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہو گئی ہے طاہر کروا دیجئے۔ آپ نے ان کو واپس کر دیا، دوسرے روز پھر آئیں اور کہنے لگیں آپ ہمیں کیوں واپس کرتے ہیں شائد اسی طرح جس طرح ماعز کو واپس کرتے تھے، ہاں میں حاملہ بھی ہوں۔ آپ نے فرمایا پھر تو نہیں جاؤ جب ولادت ہو جائے تو آنا۔ ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں، لڑکا کپڑے میں لپٹا ہوا تھا کہنے لگیں یہ میرا بچہ ہے۔ آپ نے فرمایا جاؤ دودھ پلاؤ جب کچھ کھانے لگے تو لانا، جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں اور لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، کہنے لگیں :- اے اللہ کے نبیؐ لیجئے، میں دودھ

پلانے سے بھی فارغ ہو گئی اور یہ کھانا بھی کھانے لگا۔ آپ نے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا اور حد قائم کرنے کا حکم فرمایا، ان کے سینے تک گڑھا کھودا گیا اور آپ نے حکم فرمایا لوگوں نے سنگسار کر دیا۔ خالد بن ولید نے ایک پتھر مارا تو خون کی چھینٹیں ان پر آکر پڑیں تو انھوں نے مذمت کے لفظ کہے، آپؐ نے یہ الفاظ سُن لئے اور فرمایا:۔ ہائیں خالد اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ چنگی والا کرتا تو بخش دیا جاتا۔ پھر آپ نے حکم دیا نماز پڑھی گئی اور ان کو دفن کر دیا گیا۔

مذہب یا تہذیب؟ کِس کی دعوت صحیح ہے؟

(سید ابوالحسن علی ندوی)

آج کل پرانی تہذیبوں کے زندہ کرنے کا شوق ہر ملک اور ہر قوم میں عام ہے، کوئی دو ہزار برس پہلے کی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتا ہے کوئی چار ہزار برس قبل مسیح کے دور کو واپس لانا چاہتا ہے جن ملکوں کو نئی نئی آزادی ملی ہے وہاں ہر طرف یہی نعرہ بلند ہے کہ اپنے ملک کی ہزاروں سال کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنے میں اب کیا رکاوٹ ہے۔ کہیں اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہماری تہذیب دنیا کی سب سے پرانی تہذیب ہے۔ کہیں کہا جا رہا ہے کہ ہماری زبان اور تہذیب کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے ہزاروں سال تک بیرونی اثرات قبول نہیں کئے، اور وہ ہزاروں سال پہلے کی شکل وصورت پر قائم ہیں۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس جذبہ اور مطالبہ کا محرک اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا کسی بہتر نئی زندگی کی تلاش مٹی ہوئی اور کھوئی ہوئی اخلاقی خوبیوں کی بازیافت ایک صالح تر نظامِ زندگی اور ایک بہتر معاشرہ کا احیاء جس میں زیادہ روحانیت ومعنویت، امن واطمینان، سکونِ قلب، خلوص ومحبت، حقوق باہمی کی ادائیگی، خداترسی اور احساسِ ذمہ داری تھا، اور کم سے کم نفسانیت و خود غرضی مادیت وبداخلاقی، خدا فراموشی ونفس پرستی تھی، ہم جب پرانی تہذیب کو زندہ کرنے کی دعوت و مطالبہ کی علمی تنقید وتحلیل کرتے ہیں اور اس دعوت کے علمبرداروں اور پرجوش وکیلوں کی زندگی اور اخلاق کا ان کی دعوت سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اُن کی تقریروں اور تحریروں میں اخلاق اور اس کی بنیادوں، روحانیت اور ایمان واعتقاد کا سرے سے تذکرہ اور اہمیت نہیں، محض تمدن کے سطحی مظاہر اور فنونِ لطیفہ زبان دکلچر کا تذکرہ ہے جن کو اخلاق ومعاشرت سے زیادہ

سروکار نہیں، ان کے ادب میں ہمیں موجودہ مادہ پرست نظامِ زندگی پر کوئی گہری تنقید اور اس سے بیزاری نظر نہیں آتی، اور نہ زندگی کی ان گہری بنیادوں سے دلچسپی جن پر زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پرانی تہذیب کے احیاء کی دعوت کے ساتھ ساتھ اس غلط نظامِ زندگی کے تماشا جگہ جگہ ساز باز کئے ہوئے ہیں، جابجا اس کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، اور کہیں اس سے انحراف یا بغاوت کرتے نظر نہیں آتے، انھوں نے اسی ڈھنگ پر آئین سازی کا کام جاری رکھا، نظامِ تعلیم کو اس کی لادینی اور غیر اخلاقی روح کے ساتھ قبول کیا، غیر مذہبی ریاست کا اعلان کیا، مملکت کی ساری تنظیم غیر دینی اور غیر اخلاقی بنیادوں پر کی، مسائل زندگی اور ان کے حل کی کوشش میں بے نظمیوں، بدعنوانیوں، رشوت، چور بازاری اور نفع خوری اور دوسری خرابیوں کے دور کرنے میں ان کا ذہن بیسویں صدی کے مادہ پرست مغربی ذہن سے کسی طرح مختلف اور بہتر طریقہ پر سوچنے والا نہیں، اور کہیں بھی اس گہرے تفکر کا ثبوت نہیں دیتا جو مشرق کی قدیم مذہبی قوموں کی خصوصیت ہے مشکلات اور نئی نئی الجھنوں کی وہی تعبیر اور ان کو دور کرنے اور سلجھانے کی وہی اوچھی تدابیر جو یورپ وامریکہ میں سوچی اور آزمائی جاتی ہیں، نئی کمیٹیوں کی ترتیب، تحقیقاتی کمیشنوں، انسداد رشوت ستانی کے لئے نئے افسروں کا تقرر، غلہ کی نایابی کے لئے راشننگ، قیمتوں کی افزونی کا علاج، قیمتوں کا کنٹرول وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ پرانی تہذیبوں کے قدردانوں اور ویدک تہذیب اور پراچین ہندوستان کے داعیوں کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہو کہ عوام میں اخلاقی احساس اور مذہبی رُوح کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، اور ان میں پرانے زمانے کا ایمان واعتقاد پیدا کیا جائے۔ جزا وسزا کے مذہبی عقیدہ اور یقین کو دوبارہ زندہ کیا جائے جس کے بغیر آدمی جرائم اور بداخلاقیوں سے اجتناب نہیں کرسکتا، یورپ کے مادی فلسفہ کی تردید کی جائے، دولت پرستی کی بحرانی کیفیت کو جو ساری قوم پر طاری ہوگئی ہے، کم کرنے کی کوشش کی جائے، اخلاق وروحانیت کی منظم و مؤثر طریقہ پر تلقین کی جائے، ہم کہیں اس کا کوئی ذکر وفکر نہیں پاتے، ہر طرف پرانی تہذیب کے ایک مبہم لفظ اور زبان وکلچر کی صدا بلند ہے جس کے پیچھے نہ کوئی روحانی خواہش ہے نہ کوئی اخلاقی جذبہ۔

اس بناء پر ہم جب تہذیب قدیم کے احیاء کی دعوت کو جانچتے ہیں اور اس کے ذہنی وقلبی محرکات کو تلاش کرتے ہیں تو ہم کو ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی تہہ میں صرف قوم پرستی اور نسلی غرور کا

جذبہ کام کر رہا ہے، یا اس تہذیب کے خلاف ردِ عمل کا جذبہ جو اس پچھلے ہزار برس میں ہندوستان میں برسرِ عروج رہی ہے اور اس کا جرم یہ ہے کہ اس کا بہت سا حصہ ہمالیہ کی دیواروں کے مغربی یا شمالی جانب سے آیا ہے، درحقیقت ان میں سے کوئی چیز بھی کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں رکھتی اور محض طفلانہ احساسات اور عامیانہ جذبات پر مبنی ہے، قوم پرستی اور نسلی غرور و تکبر دنیا کے سب سے بڑے تخریبی عناصر رہے ہیں جنھوں نے بار بار سکندر و چنگیز کے لباس میں دنیا کو تہہ و بالا کیا ہے، کسی قدیم تہذیب کے مٹے ہوئے نشانات سے کسی ملک و قوم کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ تعمیر کیلئے صرف صحیح مذہب کی بنیادیں ہیں جو زندگی کے حدود متعین کر کے زندگی کی پوری وسعت اس کی لچک اور اس کی ترقی کو تسلیم کرتا ہے، اور ان حدود کے اندر زندگی کو پورے طور پر پھلنے پھولنے اور دوڑنے بھاگنے کا حق دیتا ہے، خواہ دس ہزار برس کی مقدس تہذیب ہو یا دو ہزار برس کا تمدن، وہ ایک خاص قطع کا لباس ہے جو عصر جدید اور ایک نوخیز قوم کے جسم پر سلامت نہیں رہ سکتا۔ پرانی تہذیب ہمیں ایک سلا ہوا لباس دیتی ہے، دو ہزار برس قبل مسیح یا چار سو برس بعد مسیح کا لباس بیسویں صدی عیسوی کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے۔ مذہب ہمیں لباس کے اصول و حدود عطا کرتا ہے، اور زندگی کی اشیاء خام سے ہمیں سامان تیار کرنے کے اخلاقی ضوابط بخشتا ہے، وہ ایک خاص طرح کی آستین، خاص شکل کا دامن، خاص نمونہ کی کلی، خاص طرز کے تکمے نہیں دیتا، وہ یہ کہتا ہے کہ لباس ساتر ہو، پردہ پوش ہو، غرور پیدا کرنے والا نہ ہو، اسراف سے محفوظ ہو، تنعم و راحت پسندی کا پیدا کرنے والا نہ ہو، حتی الامکان اس میں سادگی و اعتدال کا لحاظ رکھا گیا ہو، ان حدود کے اندر آپ کو ہر زمانہ ہر ملک ہر موسم اور ہر طرح کے حالات و ضروریات کے لئے لباس تیار کرنے کی پوری آزادی ہے، تہذیب قدیم اصرار کرتی ہے کہ کرتہ فلاں نمونہ کا ہو جو دو ہزار برس پہلے فلاں دور میں استعمال ہوتا تھا، پاجامہ کی جگہ دھوتی یا لنگوٹ ہو کہ وہ ہمارے پرکھوں کا شعار ہے۔ جاڑوں میں کمبل یا روئی کی رضائی کے علاوہ کچھ استعمال نہ کیا جائے کہ یہ سب چیزیں باہر سے آئی ہیں، مذہب کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں، اندرون ملک و بیرون ملک، دیس پردیس، قدیم و جدید کی تقسیم اس کے یہاں بے معنی اور فضول ہے اس کے نزدیک زندگی کے کچھ ہمہ گیر اصول ہیں جو ہر ملک و قوم اور ہر زمانہ کے لئے عام ہیں، وہ انسانوں سے یہ نہیں کہتا کہ یہ لباس تمھارے دیس کا ہے یہ پردیس کا،

یہ تمھارے باپ دادا پہنتے تھے یہ نہیں پہنتے تھے۔ وہ تمام انسانوں سے کہتا ہے:۔

یٰبنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا	اے آدمؑ کی اولاد ہم نے تمھارے لئے
یواری سوأتکم وریشا ولباس التقویٰ	وہ لباس پیدا کیا ہے جو تم کو برہنگی سے
ذالک خیر۔	بچائے اور آرائش کے کپڑے اور پرہیزگاری
(اعراف۔ع۔۳)	کا لباس وہ سب سے بہتر ہے۔

اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ فلاں کھانا فلاں ملک کا ہے اور فلاں ہیں کو فلاں قوم نے ترقی دی، فلاں کھانے کی اس لئے سرپرستی کی جائے کہ وہ ہمارے ملک کا قدیم ترین کھانا ہے اور فلاں قسم کے آداب طعام کا اس لئے مقاطعہ کیا جائے کہ ایک حملہ آور قوم ان کو اپنے ساتھ لائی تھی، وہ صرف یہ کہتا ہے:۔

کلوا واشربوا ولا تسرفوا انہ لا	کھاؤ پیو اور بے جا خرچ نہ کرو اس کو
یحب المسرفین ۵ (اعراف۔ع۔۳)	بے جا خرچ کرنے والے پسند نہیں آتے۔

ساری زندگی میں مذہب و تہذیب کا یہی اصولی فرق نظر آئے گا۔

مذہب اصول عطا کرتا ہے، تہذیب بنے بنائے سانچے دیتی ہے وہ بھی سیکڑوں ہزاروں برس پہلے کے جو اپنی زندگی کھو چکے ہیں اور جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں۔ مذہب زندگی کو وسیع اور لچکدار بناتا ہے، تہذیب اس کو تنگ اور بے لچک بناتی ہے۔ مذہب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ قدیم تہذیب صدہا چیزوں سے محروم کرتی ہے، مذہب کہتا ہے:۔

قل من حرم زینۃ اللہ التی	پوچھئے کس نے اللہ کی پیدا کی ہوئی وہ
اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق۔	زینت حرام کی جو اس نے اپنے بندوں
(اعراف۔ع۔۴)	کیلئے پیدا کی اور کھانے کی ستھری چیزیں۔

اور قدیم تہذیب ہر چیز میں اپنا نشان ڈھونڈھتی ہے جہاں اُس کو اپنا نشان نہیں ملتا، اس کو وہ رد کرتی ہے یا اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے۔

قدیم تہذیبیں انسانوں کو چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کرتی ہیں اور انسانوں اور

انسانوں کے درمیان، ملکوں اور ملکوں کے درمیان، قوموں اور قوموں کے درمیان، بلکہ صوبوں اور صوبوں کے درمیان رسوم و عادات کی دیواریں کھڑی کرتی ہیں۔ مذہب تمام انسانوں کو ایک طرح کے اصول زندگی، ایک مقصدِ زندگی، ایک روحِ زندگی اور ایک پیغامِ زندگی عطا کرتا ہے۔ قدیم تہذیبوں کے مطالعہ اور قدیم تاریخ کے اثر سے جو ذہنیت تیار ہوتی ہے وہ قومی عروج اور دورِ قدیم کے بازگشت کے لئے ناانصافی، تنگ نظری اور ظلم سکھاتی ہے۔ اس لئے کہ بعض وقت اس کے بغیر اس تہذیبی دور کی واپسی مشکل ہوتی ہے، اس لئے یورپ کی جن قوموں کا ذہنی و سیاسی نشو و نما قدیم تہذیب اور قدیم تاریخ کی بنیاد پر ہوا وہ بڑی ظالم مغرور اور بے رحم ثابت ہوئیں، مذہب کی تعلیم ہے:۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین للّٰہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علٰی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون ٥ (المائدہ۔ ع۔ ۲)	اے ایمان والو! اللہ کے واسطے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ انصاف کرو یہی بات خدا کے خوف و لحاظ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ تمہارے اعمال سے خوب خبردار ہے۔

قدیم تہذیبیں کہتی ہیں آؤ اس دور کی طرف جب ایسے رسم و رواج تھے، کھانے پینے کا یہ طریقہ تھا، لباس کا یہ طرز تھا، کھانے کے یہ برتن تھے یا فلاں درخت کے پتے تھے، سواری کیلئے رتھ تھے یا بیل گاڑیاں تھیں، یا اونٹ تھے، آؤ شدھ سنسکرت کی طرف یا خالص عربی کی طرف یا زبان پہلوی کی طرف۔

مذہب کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، اس کی نظر میں وسائل اہم نہیں مقاصد اہم ہیں [illegible] جن کے لئے یہ وسائل استعمال کئے جاتے ہیں۔ رتھ، بیل گاڑی، اونٹ کی سواری یا [illegible] میں جب جس چیز کی ضرورت ہو اور مقصدِ سفر کے لئے زیادہ مفید ہو اُس کو اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اسکی نگاہ میں ضروری یہ ہے کہ:۔

لتستووا علیٰ ظهوره ثم تذكروا	تم ان سواریوں پر سوار ہو، پھر اللہ کے
نعمة ربكم اذا استويتم	احسان کو یاد کرو جب تم ان پر بیٹھ جاؤ،
عليه وتقولوا سبحان الذی	اور کہو کہ پاک ہے اس کی ذات جس نے
سخر لنا هذا وما كنا له	ہمارے قابو میں ان سواریوں کو دیا اور
مقرنين وانا الى ربنا	یہ ہمارے بس کی تو نہ تھیں، اور ہم اپنے
لمنقلبون ( )	رب کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔

مذہب کی دعوت یہ نہیں کہ آؤ عبرانی زبان کی طرف یا عربی یا سنسکرت یا فارسی کی طرف، مذہب کی صاف دعوت سب کے لئے وہی ہے جو محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے تمام اہلِ مذاہب کو دی۔

قل يا اهل الكتاب تعالوا الى	اے اہلِ کتاب ایسی بات کی طرف آؤ جو
كلمة سواء بيننا وبينكم	ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہو کہ
ان لا نعبد الا الله ولا نشرك	بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک
به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا	نہ ٹھہرائیں اس کا کسی کو اور ہم میں سے
اربابا من دون الله	ایک دوسرے کو اللہ کے علاوہ رب
(آل عمران - ع - ۷)	نہ بنائے۔

اس لئے قدیم تہذیبوں کا احیا انسانیت کے لئے ایک مصیبت اور ایک فتنہ ہے، جو نئی نئی جنگیں اور نئے نئے اختلافات اور نئے مشکلات پیدا کرے گا، صحیح مذہب کی دعوت، پیامِ رحمت اور انسانیت عامہ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

پھر فرض کیجئے کہ خدانخواستہ سب قدیم تہذیبیں اپنے حامیوں کی خواہش کے مطابق زندہ ہو جائیں۔ ہندوستان، یونان، روم، ایران، عرب کی قدیم تہذیبیں دوبارہ واپس آجائیں تو دنیا میں کیسا فتنہ برپا ہو اور کیا تماشہ دیکھنے میں آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ تہذیبیں زندہ ہوں گی تو اپنے تمام خصوصیات اور محاسن و معائب کے ساتھ زندہ ہوں گی۔ آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ فلاں قدیم تہذیب ضرور زندہ ہو مگر فلاں معائب اور نقائص جو اس کی پوری زندگی میں قائم رہے ہیں

زندہ نہ ہوں، اور اس کا آپ کو اختیار ہی کب ہے۔ ہر تہذیب اپنے تمام مزاجی خصوصیات اور امتیازی صفات کے ساتھ زندہ ہوگی، اب دنیا کا نقشہ کیا ہوگا، ہندوستان میں شہوانیت کا دور دورہ ہے، سخت طبقاتی ناانصافی اور چھوت چھات پایا جاتا ہے، عورتیں ستی ہو رہی ہیں، یونان میں دیویوں کی قربان گاہوں پر حیا سوز افعال کئے جا رہے ہیں، عصمت فروشی ایک معزز و پسندیدہ پیشہ ہے۔ روم میں غلاموں پر تیل چھڑک کر آگ لگا کر عورتوں میں روشنی کا انتظام کیا جا رہا ہے اور اس انسانیت سوز روشنی میں پر تکلف دعوتوں اور شاہانہ ضیافتوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ بیابانی کے دنگل گرم ہیں، جہاں ایک انسان دوسرے انسان پر محض لوگوں کی شوق تماشہ بینی کی تسکین کے لئے تلوار سے حملہ آور ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ایک انسان خاک و خون میں لوٹتا نظر آتا ہے، مجمع اس کی آخری کراہ سننے کے لئے اور نزع کی کیفیت دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتا ہے اور پولیس کو انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ ایران میں آتش پرستی ہو رہی ہے، امراء ایک ایک لاکھ کی صرف ٹوپی پہنے ہوئے ہیں اور غرباء سردی میں ٹھٹھر کر مر رہے ہیں۔ حقیقی بہن سے نکاح کا دستور ہے اور ایک طبقہ عورت کو سوسائٹی کی ملکیت عامہ بنانے کا طلبگار ہے۔ عرب میں معصوم بچیاں دفن کی جا رہی ہیں، قافلے لٹ رہے ہیں، بے بات کی بات پر چالیس چالیس برس تک جنگیں جاری رہتی ہیں۔ شراب، جوئے اور بداخلاقی کے عریاں قصوں کو فخریہ اشعار میں بیان کیا جا رہا ہے اور ان اشعار کو کعبہ میں آویزاں کر کے شاعری کی قدردانی کا ثبوت دیا جا رہا ہے، کیا یہ دنیا کا کچھ اچھا نقشہ ہوگا اور کیا اس بات کے لئے کوئی قانونی و اخلاقی جواز ہے کہ ہندوستان کی چار ہزار برس پہلے کی تہذیب تو ضرور زندہ ہو لیکن ایران و عرب کی ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی تہذیبیں زندہ نہ ہوں، اگر ہر ملک میں اس کی قدیم تہذیب کو زندہ ہونے کا حق ہے تو دنیا کا ہر ملک اس حق کا طلبگار ہے اور ہمیں استثناء کا کوئی حق نہیں۔

دراصل ان تہذیبوں کے مٹ جانے میں اللہ کا بڑا فضل شامل تھا، ان کے ساتھ ان کی بہت سی بے اعتدالیاں اور ناانصافیاں بھی مٹ گئیں، اور انسانوں کی ایک بڑی جماعت کو ان سے نجات ملی، قومی تعصبات سے اگر آزاد ہو کر ہم تاریخ و فلسفۂ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم کو نظر آئے گا کہ دنیا میں جو چیز مٹی اس کو مٹ ہی جانا چاہئے تھا، اس کا مٹ جانا اس کی

علامت ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنی عمر پوری کر چکی تھی، کسی دوسرے نظامِ زندگی کا اس پر غالب آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب آنے والا نظامِ زندگی اس سے فائق و برتر تھا اور زندگی کا زیادہ استحقاق اور استعداد رکھتا تھا۔

اب ان مٹی ہوئی تہذیبوں کا دوبارہ زندہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے فراعنۂ مصر کی مسالہ لگی ہوئی لاشوں کو (ممی) ان کے مقبروں سے نکال کر دوبارہ مصر کے تخت پر بٹھانا اور حکومت کے اختیارات کو ان کے حوالہ کرنا ہو، دنیا میں کوئی فلسفہ اور نظامِ زندگی بغیر روح اور اپنے مخصوص پیغام کے زندہ نہیں رہ سکتا، ان تہذیبوں کی روح نکل چکی، وہ اپنا پیغام اپنے زمانہ کی محدود دنیا کو سنا چکیں، اب ان میں عصرِ حاضر کی روح ہے نہ دنیا کے لئے کوئی پیغام، نہ ان کے پاس انسانیت کے مسائل و مشکلات کا کوئی حل ہے، نہ سرگشتہ و حیران قوموں کے لئے راہِ عمل، اس لئے اب ان مردہ تہذیبوں کا زندہ کرنا، طاقت اور وقت دونوں کا ضیاع اور ایک لاحاصل کام ہے۔

دعوت و جدوجہد کی چیز دراصل صحیح اور غیر فانی مذہب ہے جس کو اللہ کے پیغمبر ہر ملک اور ہر دور میں اور محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) آخری اور دائمی طور پر لے کر آئے، انھوں نے اس کے ذریعہ سے انسانوں کو دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دیا، خالق سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، توحید خالص کا سبق پڑھایا، حساب کتاب کی اخروی زندگی کا منتظر بنایا، نیکی اور بدی کے معین حدود بتلائے اور اخلاق و معاشرت و حقوق باہمی کے وہ بے خطا اصول و ضوابط عطا کئے جن پر ہر دور میں حیاتِ انسانی کی تنظیم ہو سکتی ہے اور مدنیت صالحہ وجود میں آتی ہے۔ ان کے احکام پر عمل کرنے سے خود بخود ایک زندگی پیدا ہوتی ہے جو افراط و تفریط اور ہر طرح کی بے اعتدالیوں سے پاک ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ قائم ہوتا ہے جو امن و سکون، اطمینانِ قلب، اشتراک و تعاون اور اعتدال و توازن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اس کی بنیادیں ٹھوس لیکن اس کی فضا وسیع ہے اس میں فولاد کی طرح بیک وقت صلابت اور لچک دونوں موجود ہیں، یہ وہ زندگی اور معاشرہ ہے جس پر کسی قوم و نسل کی اچھاپ اور کسی قومیت اور وطنیت کا ٹھپہ نہیں۔ یہ انسانیت کی دولت مشترکہ ہے جس میں کسی قوم اور ملک کی اجارہ داری نہیں، اس سے نہ چین کو انکار ہو سکتا ہے نہ ہندوستان کو عار، نہ ایران کے لئے وحشت کی کوئی وجہ ہے نہ یورپ کے لئے گریز کی کوئی راہ، پُر امن اور کامل

زندگی کے لئے اس کے سوا کوئی نمونہ ہی نہیں۔

آپ کا جی چاہے تو آپ اس زندگی کو بھی تہذیب کہہ سکتے ہیں جو ان عقائد و احکام سے وجود میں آئی ہے لیکن آپ اس کو عربی تہذیب یا ایرانی تمدن نہیں کہہ سکتے، اس کو کسی ملک اور قوم اور اس کے طرزِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نہیں، اور وہ کسی قومی تمدن یا ملکی تہذیب کی نمائندہ اور وکیل نہیں، ہر ملک میں اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے اور ہر قوم اس کو اپنا سکتی ہے مٹ جانے والے تمدنوں پر اس کی بنیاد نہیں، ایمانیات و عقائد اور غیر متبدل حقائق پر اس کی بنیاد ہے جو نبی دنیا میں لے کر آئے، اس لئے اس کے مٹنے اور دوبارہ زندہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ؎

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں!

اس کے لئے علیحدہ دعوت و احیاء کی ضرورت نہیں، اسلام کی دعوت اس کی دعوت ہے، اور یہ دعوت ہر وقت زندہ اور تابندہ ہے۔ ؎

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں!

تصوّف وسلوک!

(از جناب مولنا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ)

(۵)

صحبت سے دین دل میں رچ جاتا ہے اہل اللہ کی صحبت سے محض فہم دین کی بصیرت ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ صحبت کی بالکل قدرتی ونفسیاتی خاصیت یہ بھی ہے، کہ مصاحب کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آویگی، مزید برآں آدمی بتکلف وتعود عمل بھی اختیار کرلے سکتا ہے، مگر بلا صحبت کے دین قلب وروح میں رچتا یا سرایت بہ مشکل ہی کرتا ہے، اور اس عمل کی نوعیت بس زیادہ سے زیادہ ایسے مزدور یا تنخواہ دار نوکر کے کام کی ہوتی ہے جس کو آجر یا آقا سے کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی کو مذکورۂ بالا وعظ (تقوی) میں فرمایا کہ:۔

"حضرت عمل تو دوسری چیز ہے، لیکن اصل دین وہ ہی جو قلب میں رچ جائے سو یہ صحبت پر موقوف ہے"

غرض محققین اہل اللہ کی صحبت یا یہ نہ میسر ہو تو کم ازکم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظر اصلاح واستفادہ مطالعہ نہ صرف دین کی صحیح فہم وبصیرت کے لئے ضروری ہے (جو نام ہی باطنی روشنی کا جیسے بصر ظاہری نگاہ کا) بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان وعمل ہمارے اندر منتقل ہوتا اور قالب سے تجاوز کرکے قلب وروح میں اترتا یا رچ جاتا ہے۔

لیکن کیا عرض کیا جائے کہ اس بالکل عقلی بلکہ موٹی بات سے اچھے اچھے اہل علم کو ایسی بے پروائی ہے کہ محض اپنی علمی بلکہ درحقیقت محض معلوماتی وتصنیفی قوت، وذرائع معلومات کی وسعت کو نہ صرف اپنی صلاح کے لئے کافی سمجھ لیا ہے بلکہ اسی بھروسہ پر اصلاح کی مستقل تحریکوں کے امام وعلمبردار بن جاتے ہیں، جس کی بدولت اپنی اعلیٰ ذہانت وقابلیت کے باوجود اپنے اور دوسروں کے

حق میں ویسے ہی طبیب و معالج بن جاتے ہیں جس نے کسی طبیب کے پاس باقاعدہ مطب کئے بغیر محض کتابی معلومات اور قدرتی ذہانت کے زور پر اپنا اور دوسروں کا علاج شروع کر دیا ہو! بلکہ امامت کا جھنڈا ہاتھ میں لینے کے بعد کسی کی اقتداء و اتباع کا امکان اور بھی دور تر ہو جاتا ہے!

تاہم طلب و تشنگی کیلئے راستہ کبھی بند نہیں، نہ پانی کا قحط ہے۔ ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست
تاکہ آبت جوشد از بالا و پست

عشق و محبت

نہ صرف مسلمان صوفیوں کے عالم و جاہل عوام و خواص تمام طبقوں میں عشق و محبت کا لازمۂ تصوف یا عین تصوف ہونا مسلم ہے (حتیٰ کہ نام ہی اس کا طریقِ عشق آ.) بلکہ تمام دیگر مذاہب بلکہ فلسفہ تک میں جہاں کہیں تصوف کے ہم معنیٰ یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ایسی ملتی ہے جس کو مغربی ادبیات میں سریت (مسٹزم) کہا جاتا ہے، اُس میں بھی بڑا خاص عنصر عشق و محبت ہی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے مغربی محققین نے تو دادِ تحقیق یہاں تک دی کہ مسلمان صوفیہ میں عشق و محبت کی تعلیم کو ان بیرونی اثرات سے ماخوذ قرار دے دیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نفسِ تصوف ہی کو اسلام میں بہت بعد کی اور بیرونی اثرات کی پیداوار کہہ دیا۔ حالانکہ اسلامی تصوف کی خود محققین صوفیہ کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت، بلکہ کمالِ اسلام و شریعت کا۔ حتیٰ کہ حضرات صوفیہ سب سے بڑا صوفی حضرات صحابہؓ اور خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہی خلاصہ اس باب میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی تجدید کا ہے، جیسا کہ اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا۔

اتنا ہی نہیں حضرت نے تو قرآن و حدیث سے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں[۱]، اور فرمایا کہ غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر دیتا! اس کی کچھ مثالیں انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر آئیں گی۔ یہاں اس ذکر کا مدعا صرف یہ ہے کہ جس اسلامی تصوف کے دو ہزار اصولی و فروعی مسائل خود قرآن و حدیث سے ثابت و مستنبط ہوں۔ اس میں اب آخر کون سی اہم

---

[۱] الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم صفحہ ۲۰

اور انوکھی بات رہ گئی ہوگی، جس کے لئے اسلامی تصوف اسلام کو چھوڑ کر غیروں کا دستِ نگر ہوسکتا!
بات یہ ہے کہ افہام و تفہیم کے لئے بعض رائج الوقت بیرونی تعبیرات و اصطلاحات سے کام لیا گیا، یا غیروں کی بعض محض تدبیری چیزیں تدبیر ہی کے درجہ میں اختیار کرلی گئیں، جیسے کہ پاس انفاس وغیرہ۔ جس کی مثال بقول حضرت مجدد وقت کے ایسی ہی ہے جیسے غزوۂ خندق میں فارسیوں کی خندق کی تدبیر حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) کے بتلانے سے خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اختیار فرمائی تھی۔ اب اگر اس پر کوئی عقلمند محقق یہ داد تحقیق دینے لگے کہ اسلامی جہاد ایرانیوں یا فارسیوں کے اثرات سے ماخوذ ہے تو اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے، کہ ؎

برین عقل و دانش بباید گریست

اس باب میں ان محققین نے غیر اسلامی اصطلاحات سے بہت دھوکا کھایا ہے تو انکی نسبت یاد رکھنا چاہئے کہ اصطلاحات دو قسم کی ہیں ایک جو مقاصد سے متعلق ہیں (جیسے رضا و قرب وغیرہ) وہ تو شریعت سے الگ نہیں بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے۔ دوسری وہ اصطلاحات ہیں جو امور زائدہ کے متعلق ہیں وہ شریعت سے جدا ہوسکتی ہیں جیسے تجدد امثال، توحید وجودی، شغلِ رابطہ وغیرہ۔ (اشرف المسائل ص۳۴)

باقی نفس عشق و محبت کی تعلیم تو اگر ان محققین نے قرآن مجید ہی کو کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو نظر آجاتا کہ صوفی ہونا تو درکنار قرآن کی رو سے تو مسلمان اور مومن ہونے ہی کے لئے اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت لازم ہے۔ "الذین آمنوا اشد حبا للہ" اور عشق "اشدِ حب" کے سوا نام ہی کس کا ہے۔ اسی طرح حدیث میں حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی محبت کی نسبت ارشاد ہے کہ "کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک میں اس کو اُس کے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔"

> "عشق لوازم ایمان سے ہے، جب تم نے آمنّا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کرلیا۔ جیسے کوئی کہے کہ مجھ پر نان نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہوگیا میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا، صرف قَبِلْتُ النکاح کہا تھا، تو ہر شخص یہی کہے گا کہ قبلت کہنے ہی سے تو شوہری کے حقوق لازم ہوگئے۔ اسی طرح جب لا الہ الا اللہ کہا، بس عاشق ہوگئے کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہوگئے اور

مومن کے بارے میں ارشاد ہے کہ "والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ" یعنی جو خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، تو تصدیق ایمان کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے تو اب عشق کے حقوق ادا کرو، بس کان مت ہلاؤ، سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو" (الشریقہ ص ۳۲و۳۳)

حب عقلی البتہ اسلامی تعلیمات جس طرح ہر امر میں افراط و تفریط کی نا استواریوں اور نشیب و فراز سے پاک ہیں اسی طرح عشق و محبت کے معاملہ میں بھی طبعی یا نفسانی جوش و خروش بیخودی و جامہ دری مامور و مطلوب بالکل نہیں۔ یوں کسی ضعیف القلب یا مغلوب الحال کا حال ہی یہ ہو جائے تو وہ معذور ہے۔ مطلوب و مامور وہی اشد حبا للّٰہ والی حب ایمانی ہے، جس کو حب عقلی بھی کہا جاتا ہے نہ کہ حب طبعی یا نفسانی، جس کو عرف عام میں عشق کہا جاتا ہے۔ کسی نے ان دونوں کے فرق و فضیلت کی بابت، سوال کیا تھا کہ

"صراط مستقیم میں مولانا اسمٰعیل صاحب شہید نے حب ایمانی یا عقلی کو حب نفسانی یا عشق پر بہت ترجیح دی ہے اور طریق عشق کو ایک حد تک مذموم ثابت کیا ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے صوفیائے کرام مولانا رومیؒ مولانا جامیؒ وغیرہ نے عشق کی مدح سرائی کی ہے۔ اس باب میں حضرت کی جو تحقیق ورائے ہو اس سے مفصل مطلع فرمائیے[۱]"

اب حضرت کا عالمانہ و محققانہ جواب سنئے۔ پہلے چند مقدمات ہیں۔

اوّل فضیلت دو طرح کی ہوتی ہے ایک باعتبار ذات شی کے، دوسری باعتبار اس کی حالت خاصہ کے۔ پہلی کو فضیلت ذاتیہ کہتے ہیں، اور دوسری کو اضافیہ کہنا مناسب ہے۔ دوم کمالات ولایت مستفاد ہوتے ہیں کمالات نبوت سے اس لئے جو کمال ولایت کا جس قدر کمال نبوت سے

---

[۱] التکشف عن مہمات التصوف جلد دوم (از امداد الفتاویٰ ص۱)

مشابہ ہو وہ دوسرے کمال سے جو مشابہت میں کم ہو افضل ہوگا۔ سوم عشق ایک خاص درجہ ہے محبت کا جس میں ہیجان و غلیان (یا جوش و خروش) ہوتا ہے۔"

"ان مقدمات کے بعد جاننا چاہئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جو صفت محبتِ الٰہی کی ہوتی ہے اس میں ہیجانِ نفسانی نہیں ہوتا، اس لئے بالیقین محبت کی یہی نوع فی نفسہ افضل ہوگی۔ مگر کسی خاص استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے تربیت باطن میں دوسری نوع زیادہ نافع و موافق ہو جانا ممکن ہے جیسے گوشت فی نفسہ افضل الاغذیہ ہے لیکن کسی خاص طبیعت کیلئے آش جو کو اصلح کہا جاتا ہے۔"

"پس مولانا شہید رحمہ اللہ فضیلت ذاتیہ کے مرتبہ میں حبِ ایمانی کو ترجیح دے رہے ہیں، اور بعض آثار مغلوبیت کے اعتبار سے حبِ نفسانی کو مضر بتلا رہے ہیں، اور دوسرے حضرات صوفیہ رحمہم اللہ فضیلتِ اضافیہ کے مرتبہ میں عشق کی مدح کر رہے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین اکثر اہلِ حال کے کلام میں وارد ہیں، جن کو تحقیقات عامہ مقصود نہیں، یا عشق سے مراد ان حضرات کی اصطلاح میں مطلق کمال محبت ہو، جو شامل ہو محبت ایمانی کو بھی، اور مقصود خدمت کرنا اُس شخص کی ہو جس میں یہ کمال نہیں، جیسے حدیث میں ہے لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ۔ پس دونوں توجیہ پر مولانا اور صوفیہ کے کلام میں تعارض نہیں رہا۔ واللہ اعلم۔"[1]

عقلی محبت اختیاری ہے

نیز طبعی اور عقلی یا ایمانی محبت میں ایک اور خاص و عظیم فرق یہ ہے کہ طبعی محبت غیر اختیاری ہوتی ہے اور اسلام غیر اختیاری چیزوں کی تکلیف نہیں دیتا، بخلاف عقلی و ایمانی محبت کے کہ وہ ہمارے اختیار کی شی ہے۔ اس کا بڑا مدار

---

[1] التکشف عن مہمات التصوف جلد سوم (از امداد الفتاوی ص۱)

عمل پر ہے مثلاً جس عمل کو ہم ایک مرتبہ عقلاً پسند کر کے اس کو بار بار کرتے رہیں، تو پھر اُس سے محبت وانس قدرۃً پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ عمل کسی کے حکم یا اتباع کی بنار پر اختیار کیا گیا ہے، تو کرتے کرتے اس حاکم یا متبوع سے بھی محبت ہو جانا لازم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اختیاری محبت کا سیدھا نسخہ یہ تجویز فرما دیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا محب و محبوب ہے زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ لو، تو آپ سے آپ اللہ کے سچے اور پکے محب و عاشق ہی نہیں بلکہ محبوب بھی بن جاؤ گے۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

"عمل میں خاصیت ہی محبت پیدا کرنے کی۔ تجربہ کر لو روز روز کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہو جائے گی، پہلے تھوڑی ہوگی پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہو جائے گا کہ بہت ہی زیادہ ہو جائے گی، وہ جو کہتے ہیں کہ پالے کی محبت، اس کی یہی تو اصل ہے۔ غرض نیک عمل میں یہ برکت ہی کہ اس سے محبت حق پیدا ہوتی ہی۔"

"یہاں ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں، مگر محبت پیدا نہیں ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک ہی چیز تو نہیں کہ بس عمل کر لیا، بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزا سے، ایک جزء تو عمل کرنا ہے اور دوسرا جزء یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے۔ مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے۔ نیک عمل کا جو مامور بہ طریق ہی اس طریق سے کرو پھر دیکھو محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی۔ تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہے کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھ کر کیا، اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جائے، سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو انشاء اللہ کیسا اثر ہوتا ہے۔"

"بہرحال ایک جزء تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت، استقامت کے ساتھ مشغول رہو۔ دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر، یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو، مگر وہی کہ جی لگا کر تاکہ

محض صورتِ ذکر نہ ہو) تیسری بات یہ ہے اور یہ بہت ہی ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو، اس سے لوگ بھاگتے ہیں۔ اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جاکر رہیں۔ بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ ہم کامل و اکمل ہو گئے، بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و اکمل ہوا ہے[1]۔"

غرض اسی نسخہ کو بعض اور اجزا کی اعانت سے آثار المحبت (صـ۱۹) میں یوں تجویز فرمایا ہے، کہ

"جن چیزوں سے کوئی محبوب ہوتا ہے یعنی انعام ونوال، حسن وجمال، اور فضل کمال ہر طرح سے عقلاً ونقلاً علی وجہ الکمال اللہ ہی میں ہیں، پس وہی مستحق محبت ہیں۔ تدبیر یہ ہے کہ چند باتوں کا التزام کرلو ایک تو تھوڑی خلوت میں اللہ اللہ کرلیا کرو۔ گو یہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو۔ لیکن اس نیت سے کہ خدا تعالیٰ کی محبت ہو۔ دوسرے کسی وقت تنہائی میں خدا کی نعمتوں کو سوچا کرو، پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں، اور اس کے باوجود خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آرہے ہیں۔ تیسرے محبانِ خدا سے علاقہ پیدا کرو، آنا جانا دشوار ہو تو خط وکتابت ہی رکھو۔ چوتھے خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری اطاعت کیا کرو، کیونکہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اُس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے۔ پانچویں خدا تعالیٰ سے دُعا کیا کرو کہ اپنی محبت عطا فرمائیں۔"

غرض جو عشق ومحبت مامور ومطلوب ہے وہ طبعی ونفسانی نہیں، بلکہ عقلی وایمانی، جو بالکل اپنے اختیار میں ہے اور اس کے حصول کا جو نسخہ تجویز فرمایا گیا ہے، اس کے بھی تینوں اجزا بالکل اختیاری ہیں یعنی:۔

---

[1] اشرف السوانح۔

۱۔ اعمالِ صالحہ بہ نیت محبت۔

۲۔ ذکر اللہ مع الحقیقت۔

۳۔ اہل اللہ سے تعلق یا صحبت، جس کی ضرورت پر اوپر مفصل گفتگو گذر چکی۔ ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق
عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

نیز یہ اعمال صالحہ یا اتباعِ سنت والی عقلی و ایمانی محبت کا راستہ وصول الی اللہ کا نہ صرف یقینی و اقرب راستہ ہے، بلکہ اسہل بھی اتنا ہے کہ زیادہ مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہیں ہوتی، اور اصطلاح میں اس کو طریق جذب بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں سب سے بڑے محب و محبوب الٰہی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی نقل و اتباع ہوتی ہے، اس لئے قدرۃً اپنے کامل ترین محب و محبوب کے تتبع یا نقل اتارنے والے کی خود حق تعالیٰ کی طرف سے کشش یا انجذاب ہوتا ہے۔

کسی موقع پر فرمایا، کہ

"حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحبؒ کے سلسلہ میں جو اس قدر جلد وصول الی اللہ ہوتا ہے، حالانکہ نہ یہاں کچھ زیادہ ریاضات ہیں نہ مجاہدات، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وصول بطریقِ جذب ہوتا ہے بطریقِ سلوک نہیں۔ اور یہ جذب برکت ہے اتباعِ سنت کی، کیونکہ اتباعِ سنت کا ثمرہ بوجہ تشبہ بالمحبوب کے محبوبیت عنداللہ ہے، اور محبوبیت کیلئے جذب لازم ہے"۔[۱]

محبوب سے ظاہری شباہت بھی کسی کو ہو تو اسکی طرف کشش قدرتی بات ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی بھی توجہ کی جلد امید ہے۔ حضرت خواجہ (عزیز الحسن صاحبؒ) نے خوب فرمایا:۔ ؎

ترے محبوبؐ کی یارب شباہت لیکے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لیکے آیا ہوں

---

[۱] اشرف السوانح صفحہ ۲۲۵ (حصۂ دوم)

اللہ تعالیٰ ہم کو اتباعِ سنت کی توفیق بخش دیں اور خواجہ صاحبؒ کی اس دُعا کو اپنے تمام متبع سنت بندوں کے حق میں قبول فرمائیں !۔

محبت کا مدار مناسبت پر!

اسی عشق و محبت کے سلسلہ میں شریعت و طریقت کے جامع مجدد علیہ الرحمہ نے ایک اور بڑی لطیف بحث فرمائی ہی جو صوفیہ اور اہل محبت سے بھی زیادہ ہمارے خشک علماء کے سننے اور سمجھنے کی ہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ محبت کا مدار مناسبت پر ہے، اور یہ مناسبت انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمام مخلوقات سے زیادہ حاصل ہے۔ جس کو حضرات صوفیہ مظہر اتم ہونے سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور جس پر احقر کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ ہی نے سندِ خلافت اور ونفخت فیہ من روحی سے سرفراز فرما کر قرآنی شہادت کی مہر لگا دی ہے۔ کیونکہ کسی کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جس کو ظاہراً و باطناً متخلف سے زیادہ سے زیادہ مناسبت اور مشابہت ہو۔ اگر خلافتی تصرفات سے ظاہری مناسبت عیاں ہی تو من روحی سے باطنی۔ اس لئے اگر یہ احسن تقویم کی بلندی سے اسفل سافلین کی پستی میں پھینک دیئے جانے کا راستہ خود ہی نہ اختیار کر لے۔ تو اس کا مطلوب و محبوب اللہ تعالیٰ کے سوا ہو ہی کون سکتا ہی !۔

خلق اللّٰہ اٰدم علیٰ صورتہ کا مطلب

اور محبوب کون ہوتا ہی وہی جس سے مناسبت ہو، تو قلب کو جس سے مناسبت ہوگی وہی محبوب ہوگا۔ میں نے ایک باپ سے سنا ہی کہ مجھ کو فلاں بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہی، وجہ یہ ہے کہ وہ میرا سا ہی یعنی مجھے اس سے مناسبت ہی۔ سو برہان و وجدان سے ثابت ہو چکا ہی کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہی، اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہی رسول مقبول (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کہ ان اللّٰہ خلق اٰدم علےٰ صورتہ۔ یعنی اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

"یہاں صورت کے معنی شکل کے نہیں، بلکہ وہی مناسبت ہی جس کو صوفیہ نے ایک خاص عنوان سے کہا ہے جسے علمائے خشک قبول نہیں کرتے کہ انسان مظہر ہے حق تعالیٰ کا۔ اس لفظِ مظہر سے چونکتے ہیں جو حقیقت میں

اس حدیث کی تفسیر کا عنوان ہے، اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے جس سے بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع آدم کو بنایا ہے۔"

"مگر بعض روایات میں بجائے صورتہ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے اس کو کیا کریں گے۔ اس کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ راوی نے اپنے اجتہاد سے روایت بالمعنیٰ کر دی ہے۔ میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو، جو تفسیر صوفیائے کرام نے کی وہ نہایت بے تکلف و سہل ہے"

کیونکہ صورت اصل میں اسی کو کہتے ہیں جس کے واسطہ سے کوئی شے ظاہر ہوتی ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا سب سے بڑا اتم ظہور انسان ہی کی ذات و صفات سے ہوا ہے، اس لئے اس کو تمام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے گویا اپنی ہی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔

"یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں، اگر کہو کسی چیز کی شکل کو کہتے ہیں، مانا، مگر اس کو کیوں کہتے ہیں۔ اصل میں صورت کی حقیقت ظہور ہے۔ چنانچہ یہ بھی محاورہ کہ صورۃ المسئلۃ کذا یعنی فلاں مسئلہ کی صورت یہ ہے اور یوں بھی کہتے ہیں کہ اس کام کے بننے کی کیا صورت ہے، تو یہاں صورت کے معنیٰ ظہور کے ہیں، اور چہرہ کو بھی صورت ظہور ہی کے معنیٰ میں کہتے ہیں کہ اس سے حقیقتِ انسانیہ کا ظہور ہوتا ہے۔"

آگے اس حقیقتِ باطنہ کو بالکل ظاہر فرما دیا ہے، کہ وہی "من روحی" والی رُوح یا انا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے، کہ:۔

"یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں، اور وہ رُوح ہے، اور وہ ایک مخفی چیز ہے۔ چونکہ رُوح ایک خفی چیز تھی جسے کالبد سے ظاہر فرمایا، اس لئے کالبد کو اس کی صورت کہہ دیا، تو اصل معنی صورت کے ظہور کے ہوئے۔"

"اب سمجھئے کہ خلق آدم علیٰ صورتہ کے معنی ہیں علیٰ ظہورہ یعنی خدا نے آدمؑ کو اپنے ظہور پر پیدا کیا، یعنی آدم کو پیدا کر کے اپنے صفات کو

ظاہر کر دیا۔ گو اور مخلوقات سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے، مگر انسان چونکہ سب سے زیادہ جامع کمالات ہے، اس لئے اس سے زیادہ ظہور ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس کو مظہر اتم کہتے ہیں۔"

"صوفیہ نے کیا کہا، وہی انھوں نے بھی کہا جو حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، صرف اصطلاح بدل دی۔ یہ اُن کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کیلئے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں۔ علمائے خشک جو انکی اصطلاح نہیں سمجھتے اعتراض کر دیتے ہیں، جو واقع میں خود اپنی فہم پر ہوتا ہے۔ اور محققین کی عادت ہوتی ہے کہ طالب کے سامنے تو نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں لیکن معاند کے اعتراض سُن کر بھی خاموش رہتے ہیں، بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اظہار سے منع کرتے ہیں۔"[1]

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی
بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

حمل امانت کی لطیف توجیہ

غرض تمام مخلوقات میں چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناسبت و مشابہت زیادہ حاصل ہے، اس کی بناء پر اس کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا عاشق بھی ہونا چاہئے۔ ابتدائے طالب علمی میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے، اس کی فصل عاشق ہے، کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں"[2]۔ بلکہ حضرت تو اس کے قائل ہیں کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی ناطق ہیں، ہاں یہ مسلّم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو۔ حمل امانت کی بھی ایک دلچسپ[3] توجیہ حضرت نے انسان میں غلبۂ عشق ہی سے فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے غایت مشابہت کی

---

[1] الشریعۃ از صـ۱۴ تا صـ۱۶
[2] وعظ التحصیل والتسہیل صـ۲۶
[3] وعظ التحصیل والتسہیل صـ۲۴

بناء پر عشق تو تھا ہی، اور معشوق کے حکم و خوشی کے پورا کرنے میں چون و چرا شانِ عشق نہیں، بس اس دیوانگی میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنے کو پیش کر دیا۔

"بہر حال انسان کے حمل امانت کا منشا عشق تھا، اور اس کو میں نے حافظ شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے، فرماتے ہیں:- ؎

آسماں بارِ امانت نتواند کشید

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاءِ حملِ امانت پر اشارہ ہے (اور اسی کلام سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے، جو محبت کے علاوہ درجہ ہے)"

"البتہ حق تعالیٰ کی محبت میں شان عقلیت غالب ہوتی ہے، اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شانِ طبیعت غالب ہوتی ہے، اور سرسری نظر میں محبتِ عقلی محبتِ طبعی کے سامنے مضمحل معلوم ہوتی ہے، حالانکہ امر بالعکس ہے۔ چنانچہ اسی محبوب طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جاوے[1]"

یہ ایک طالب کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا تھا، جن کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وہ حضرت علیہ الرحمہ کے ساتھ محبت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کم محسوس کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ میں اسبابِ محبوبیت بدرجۂ کمال جمع ہیں

پھر کسی سے محبت کے عقلاً جو اسباب ہو سکتے ہیں، وہ بالذات اور بدرجۂ اتم و اکمل اللہ تعالیٰ ہی میں موجود ہیں۔

"کسی سے جو محبت ہوتی ہے اس کی وجہ یا کمال ہے، یا جمال یا نوال (یعنی داد و دہش) تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت نہیں ہوتی کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب دیکھو یہ صفتیں بالذات کس کی ہیں، جس میں

---

[1] اشرف السوانح حصۂ دوم ص ۱۲۷

یہ اوصاف بدرجۂ اکمل ہوں گے وہ زیادہ محبوب ہوگا، تو اسمیں مسلمان کو
توشبہ نہیں ہوسکتا کہ سب سے زیادہ کمال کے ساتھ یہ اوصاف
خدا ہی میں پائے جاتے ہیں۔"

غرض مسلمان یا مومن کیلئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقلی محبت میں اشد ہونا بالکل لازمۂ ایمان ہے۔
یہی نہیں، بلکہ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو جس شے سے محبت ہوتی ہے وہ دراصل محبتِ حق
ہی کا ظل و پرتو ہوتی ہے، کیونکہ جہاں کہیں جو بھی جمال وکمال پایا جاتا ہے وہ کمالِ حق ہی کا پرتو ہے۔

"ہر کمال کمالِ خداوندی ہی کا ظل ہے، تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہو
واقع میں وہ کمالِ خداوندی کا عاشق ہے۔ اور اس کی ایسی مثال ہے
جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی اور اس کی وجہ سے وہ دیوار کا
عاشق ہوگیا، حالانکہ یہ واقع میں دیوار کا نہیں آفتاب کا عاشق ہے،
کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا یعنی نور جو واقع میں
آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے
اور وہ نور زائل ہوجائے، تو عشق بھی زائل ہوجاتا ہے۔" ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار — عشق را باحی و باقیوم دار
عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

عقلی محبت کا لازمہ

لیکن سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ اس عقلی
عشق و محبت کا لازمہ یہ ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں بھی "محب کے ذمہ
محبوب کے جو حقوق ہوتے ہیں اسی طرح کا تعلق ہم کو حق تعالیٰ سے رکھنا چاہئے"۔

"دیکھئے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اُس کے
دل میں معشوق کی کتنی عظمت و محبت ہوتی ہے، کیا اگر معشوق یہ حکم دے کہ
تم میرے پاس آؤ، گرمی کے وقت بلبلاتے ہوئے دوپہر میں چار کوس
تک برہنہ پا چلے آؤ تو کیا عاشق انکار کرے گا، یا اس سے اس حکم کے
مصالح پوچھے گا۔ اگر اس کو سچا عشق ہے تو بلانے سے دوڑا ہو آئے گا

اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہ رُکے گا۔ غرض کسی قسم کے امر و نہی میں
اس کو ذرا بھی پس وپیش نہ ہوگا، لوگ اس کی حرکات پر اس کو دیوانہ
بتلائیں گے، پاگل کہیں گے، مگر اس کو اس سے ذرا عار نہ ہوگا، اور
کہے گا:۔ ؎

ما اگر قلاشں وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

"سب جانتے ہیں کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے تو اس کی
یاد کسی وقت دل سے نہیں اترتی، اور دوسرے اس کے ہر حکم کو
گوش قبول سے سنتا ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عاشق سے محبوب کے
کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو، کیونکہ بھول ہمیشہ اس
کام میں ہوا کرتی ہے جس کی جانب پوری توجہ نہ ہو، اور جو چیز ہر وقت
قلب پر مستولی ہو اُس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں۔"

بس حضرات صوفیہ کے ہاں جس عشق پر اتنا زور ہے کہ اُن کا سارا دین و مذہب ہی عشق
معلوم ہوتا ہے، وہ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی تجدید و اصلاح کے مطابق طبعی و نفسانی جوش و خروش
کا نہیں، بلکہ ایمانی و عقلی محبت کے اسی استیلائی درجہ کا نام ہے جس میں محبوب کی طرف توجہ اور اسکی
یاد و اطاعت کے سوا دل و دماغ میں ماسوا کی قطعاً گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اسی کو سرآمدِ صوفیہ
حضرت مولانا روم فرماتے ہیں، کہ ؎

عشق آں شعلہ است چوں بر فروخت
ہر کہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

انتخاب

عالمگیر قانون

ادارۂ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر مسٹر رومولو نے حال ہی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"ضرورت ہے کہ دنیا بھر میں ایک ایسا قانون رائج ہو جائے، جو سب کیلئے قابلِ عمل ہو، تاکہ اس قانون کے ماتحت کمزور اور چھوٹی قوموں کو بھی آزاد اور پر امن رہتے ہوئے اپنی حالت کو سدھارنے کا موقع مل سکے"۔

خواہش کتنی نیک ہے. مگر کیا عالم واقعات میں ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا وہی لوگ جو خود اپنے اپنے ملک کے لئے کوئی ایسا قانون نہ بنا سکے جو سب طبقوں کے لئے یکساں قابلِ قبول ہو ساری دنیا کے لئے ایسا قانون بنا سکیں گے جو تمام چھوٹی بڑی قوموں کے فائدے کو ملحوظ خاطر رکھے۔

اقوام متحدہ کے بوجھ بجھکڑوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، حقیقت بہر حال یہی ہے کہ اس قسم کا عالمگیر قانون صرف خدائی ہدایت ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے ـــــ وہی خدا جس کے منصف اور غیر جانبدار ہونے پر دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قومیں متفق ہیں. اور جس کے قانون سے کسی کو بھی یہ خطرہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں میرے مفاد کا لحاظ نہ رکھا گیا ہوگا۔

("الانصاف" الہ آباد)

بے بس مسلمان

"امرتسر ۲۱ اکتوبر- ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی تقریر میں جو سکھ پولیٹیکل کانفرنس کے

جلسہ میں ۵۰ ہزار مجمع کے سامنے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مضحکہ کے ساتھ کہ یہ "سکولر" حکومت بھی خوب ہے، جس کے ماتحت جیل میں قیدیوں کو جبراً و قہراً "رگھو پتی رگھو راجہ رام" کا بھجن گانا پڑتا ہے۔ اگر ایسا کوئی حکم اسکولوں کے لئے بھی ہے تو میں سکھ لڑکوں سے کہتا ہوں کہ اس کی خلاف ورزی کریں، اس لئے کہ ہم سکھ سوائے خدائے واحد کے اور کسی (دیوتا اوتار وغیرہ) کے قائل نہیں۔"

(اسٹیٹسمین ۲۳ راکتوبر)

ایک دوسری تقریر میں تصریح بھی آگئی کہ وہ قیدی بھی جن سے یہ بھجن گوایا گیا مسلمان تھے، اور خود وہ جیلر صاحب جنھوں نے یہ بھجن گوایا مسلمان تھے! اور اسکولوں میں تو شائد یہ بھجن عام ہو چکا ہے۔ ہماری جمعیۃ علماء اور ہمارے ممبران اسمبلی یہ سب کچھ دیکھتے اور اس ڈر سے خاموش ہیں کہ کہیں "فرقہ پرست" نہ سمجھ لئے جائیں جو وقت کی زبان میں سب سے بری سیاسی گالی ہے! ——

. . . .

. . . .

("صدق" لکھنؤ)

موحدوں کی شرک نوازی

پاکستانی سفیر متعینہ انقرہ (ترکی) کی بیگم صاحبہ کے قلم سے:-

"۔۔۔ ۔۔۔ ان شہروں میں جا بجا بڑے بڑے چوک ہیں جن کے درمیان اتاترک کے مجسمے بنے ہوئے ہیں اور جنگ آزادی کے معرکے پتھر میں تراشے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ استنبول اور انقرہ میں کثرت سے اتاترک کمال کے مجسمے سیاہ مرمری تراشے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی جنگ آزادی کے معرکے دیواروں پر پتھر سے تراشے ہوئے ملتے ہیں۔"

بت تراشی میں یہ غلو اور کمال فرنگی اور جاہلی نقطۂ نظر سے جتنا بھی قابلِ داد ہو، سوال یہ ہے کہ

کسی اسلامی ملّت کے لئے بھی باعثِ فخر ہو سکتا ہے؟ —— اور پھر ایک پاکستانی خاتون کا اس کو سراہنا اور اس کا موقع بموقع مدح پر ذکر کرنا خود پاکستانی اسلامیت کے کہاں تک مطابق ہے؟ آہ ابراہیمی آزری اور موحد کی شرک نوازی!۔

("صدق" لکھنؤ)

حیدرآباد کے صاحبِ ثروت مسلمان؟

(حیدرآباد کے آزاد خیال قوم پرور روزنامہ "شعیب" (۳۰ اکتوبر ۴۹ء) کے اداریہ سے)

یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ ریاست کے اضلاع میں مسلم عوام کی حالت ابتک اطمینان بخش نہیں، اور ان میں ایک بڑی تعداد اب تک اطمینان کی زندگی شروع نہیں کر سکی ہے۔ اس سلسلہ میں جو سب سے بڑی دشواری ہے وہ یہ ہے کہ ان بے گھر انسانوں کے جو مکانات فسادات کے زمانہ میں ڈھادیئے گئے ہیں وہ اب تک ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں اور ان کی تعمیر کی کوئی سبیل نہیں نکل سکی ہے، اور نہ اُن میں اتنی سکت ہے کہ وہ خود اپنے مکانوں کی تعمیر کرا سکیں۔

یقینی اس سلسلے میں حکومت پر بہت بڑا فرض عائد ہوتا ہے اور یہ کام حکومت کا تھا، لیکن اگر حکومت حیدرآباد اس کام کو تشفی بخش حد تک پورا نہ کر سکی تو اتنا کام تو حیدرآباد کے صاحب ثروت مسلمان بھی انجام دے سکتے تھے بشرطیکہ وہ اس کی طرف توجہ کرتے۔ حیدرآباد میں دولت مند مسلمانوں کی کمی نہیں ہے اور انھیں شکر ادا کرنا چاہئے کہ ان فسادات میں وہ محفوظ و مامون رہے اور دہلی کے دولت مند مسلمانوں کی طرح لٹے اور برباد نہیں ہوئے، لیکن پھر بھی حیرت ہے کہ اب تک ان میں کوئی حس پیدا نہ ہوئی، اور ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ پچیس پچاس لاکھ روپے اکٹھا کر کے ان غریب مسلمانوں کے مکانوں کی کم سے کم چھتیں ہی بنوا دیں یا دیواروں پر چھپر ہی ڈلوا دیں۔ اسی حیدرآباد شہر میں "بولارم ریزیڈنسی" کے پیچھے مسلمانوں کا ایک پورا گاؤں جس میں ۸۰ - ۹۰ گھر ہیں ویران پڑا ہے، صرف دیواریں کھڑی ہیں اور اُن کی چھتیں گرا دی گئی ہیں، لیکن اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی حیدرآباد کے دولت مندوں میں اتنی غیرت اور حمیت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ کم از کم اس ایک گاؤں کو تو

دوبارہ بسادیں۔ حیدرآباد کے ہزاروں مسلمان اب تک ممبئی کے فوٹ پاتھ پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہزاروں تباہ شدہ مسلمان عورتوں اور مردوں نے تنگ آکر گداگری کو پیشہ کے طور پر اختیار کرلیا ہے، اور وہ حیدرآباد کی سڑکوں اور گلیوں میں بھیک مانگتے نظر آتے ہیں لیکن حیدرآبادی مسلمانوں کی حمیت اور غیرت ایسی سوگئی ہے کہ وہ جگائی ہی نہیں جاسکتی۔

کچھ صاحبِ ثروت مسلمان تو اپنی "قوم" کو یہیں چھوڑ کر اور اپنا سر محفوظ رکھنے کیلئے نہایت بزدلی اور بے شرمی سے پاکستان بھاگ گئے اور جو موجود ہیں ان پر خود غرضی اس قدر طاری اور مسلط ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ اپنے میں مگن ہیں اور انکی عیش وعشرت کی زندگی اور انکی تفریحات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، وہ اب بھی ہزاروں اور لاکھوں روپئے اپنی عیش پسندی پر صرف کرتے ہیں۔ جو لوگ بڑی بڑی ملازمتوں پر ہیں انھیں بھی کسی قسم کا احساس نہیں، اور انھیں بھی سوائے اپنی نوکریوں کی خیر منانے کے اور کوئی فکر نہیں۔

حیدرآباد کے اندر خدا کے فضل سے ایسے تاجر اور صنعت گر موجود ہیں جو پچیس لاکھ کی رقم اکیلے چندہ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور ایسی جاگیریں اور پائیگاہ موجود ہیں جن میں سے ایک ایک پچاس لاکھ کا چیک دے سکتی ہیں لیکن ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔

مسلمانوں کو رشک وحسد ہوتا ہے کہ ان میں برلا اور ڈالمیا موجود نہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کا دولت مند ترین انسان جو کئی برلا اور کئی ڈالمیا کو خرید سکتا ہے اس کے مسلمان ہونے کے باوجود مسلمان غریب اور فاقہ مست ہیں۔ دنیا کی یہ سب سے بڑی دولت مند شخصیت اسی حیدرآباد میں موجود ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو حیدرآباد تشریف لائے تو انھوں نے ہزاگزالٹیڈ ہائی نس نظام سے کہا کہ:-

"آپ حیدرآباد کے مسلمانوں کی دوبارہ آبادکاری کیلئے ایک کروڑ روپیہ چندہ دیجئے"

لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اعلیٰحضرت بالکل خاموش رہے اور نہ "ہاں" کہا، اور نہ "نا" کہا۔ اسی طرح جب پنڈت سندر لال تشریف لائے تھے تو لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے بھی سرکارِ عالی کو اس طرف متوجہ کیا تھا لیکن سرکارِ عالی اسی طرح خاموش رہے۔

اخباروں میں خبریں آئی ہیں کہ حضور نظام اپنے خاندان کیلئے پانچ پانچ دس دس کروڑ کے

ٹرسٹ قائم کر رہے ہیں، لیکن کیا یہ بے گھر اور بے در بیکس انسان جو دو سو سال سے نسلاً بعد نسلٍ حکومتِ آصفیہ کی رعایا ہیں، وہ اعلیٰحضرت کے بچے نہیں ہیں؟ ہم یہ بھی نہیں بھول سکتے ہیں کہ خود اعلیٰحضرت نے وائسرائے کے اشارے پر وار فنڈ اور دوسرے فنڈوں میں جس کا فائدہ سلطنت برطانیہ کو پہونچتا تھا، اپنی تھیلیوں کے منھ کھول دیئے ہیں اور کروڑوں روپئے دیئے ہیں۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس جاگیردارانہ نظام اور اس دولت مند طبقے کے لٹنے کا وقت آگیا ہے کیونکہ اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ یہ طبقہ اس قدر بے حس ہوگیا ہے کہ اب بھی اس میں کوئی حس و حرکت پیدا نہیں ہوتی اور وہ بیدار نہیں ہوتا۔ ہمارے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا یہی وہ رویہ ہے جس کے سبب ہندوستان کے نوجوان دن بدن کمیونزم کی گود میں چلے جا رہے ہیں، اور اگر اب بھی انھوں نے آنکھیں نہ کھولیں اور اپنے کو حالات کے مطابق نہ بنایا تو وہ دن دور نہیں کہ اس طبقے کا نام و نشان ہی ہندوستان سے مٹ جائے۔

("الہدیٰ" حیدرآباد دکن)

از ماست کہ بر ماست

ایک پچھلے نمبر میں "نماز چور مسلمان" کے عنوان سے نوٹ اس مضمون کا درج ہوا تھا کہ مدراس کے جن طلبہ نے محض امتحان کے ایک پرچہ میں ناغہ ہونے کے خیال سے نمازِ عید ترک کردی، اور اپنی اس غیر اسلامی روش پر ہرگز کسی ہمدردی کے مستحق نہیں، اسے پڑھ کر علامہ مناظر احسن گیلانی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ سب صدق خواں حلقہ تک پہنچنے کے قابل ہے:۔

"آپ کی یہ بات مجھے بہت ہی پسند آئی کہ جو آپ نے مسلمانانِ مدراس کے متعلق ترک نماز کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۹۹ فی صدی امور مذہبی معاملات و مسائل کے متعلق ایسے ہیں جن کو خود مسلمانوں نے اپنے اختیار سے چھوڑ رکھا ہے۔ اہم فرائض کی وہ پرواہ نہیں کرتے، لیکن ایک فی صدی باتیں جن کو اسلام میں چنداں اہمیت بھی نہیں ہے اگر دوسری قوموں کی بے جا دست اندازیوں سے کچھ متاثر

ہوتی ہوں تو پھر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا فقرہ جو آپ علماء یہود کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے کہ تم مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگلتے ہو۔ یہی دورہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کی نسلوں پر پڑا ہوا ہے۔ فرائض پنجگانہ کے تارک مسلمانوں کو کیا حق ہے کہ وہ قربانی وغیرہ پر آنسو بہائیں کہ دوسرے ان کو قربانی کرنے نہیں دیتے۔ رشوت کے روپیہ سے قربانی کے جانور خرید کر کے مقابلہ کا بازار ان میں گرم تھا، شائد زیادہ افسوس ان کو اسی کا ہے۔ موطا میں حضرت امام مالکؒ نے ابو ایوب صحابی کا یہ تاریخی بیان نقل کیا کہ:-

کنا نضحی بالشاة الواحدة یذبحها الرجل منا عن اهل بیته ثم تباهی الناس بعد فصارت مباهاة۔	ہم لوگ (یعنی صحابہؓ کا طریقہ تھا) کہ ایک بکرا ذبح کرتے تھے جیسے ذبح کرنے والا اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربان کرتا تھا، پھر لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و نمود کرنے لگے تو اب قربانی بس فخر و نمود بن کر رہ گئی ہے۔

اس سے عہدِ صحابہؓ کے طریقِ عمل کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس کا بھی کہ نمائش و مقابلہ کا جذبہ قربانی میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت دن سے شریک ہو چکا ہے، اور احساس کی شدت ممکن ہے کہ اسی کا نتیجہ ہو۔

یہ عرض کرنا تو شائد آج بھی محض حقیقت بیانی ہو ہر مبالغہ سے خالی کہ متروک احکام اسلامی میں سے ۹۵ فی صدی تو ہمارے اپنے اختیار سے چھوڑے ہوئے ہیں، اور کل ۵ فی صدی ایسے نکلیں گے جن میں غیروں کی طرف سے کوئی جبر یا مداخلت ملے گی۔

("صدق" لکھنؤ)

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

(حضرت شاہ ولی اللہؒ)

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہؒ کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا مغلیہ سلطنت کا زوال انحطاط، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور انکے غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ کا خونی سیلاب، احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ۔ یہ سارے واقعات شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحبؒ ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے، اسلئے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور انکے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہے۔ پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی، اور انکے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ یہ مقالہ اچھی خاصی کتاب ہے۔ باریک قلم سے الفرقان سائز کے ۱۳۰ صفحات پر ختم ہے، آخر میں حضرت صوفی (ایم اے) کی ایک بڑی اہم نظم "امت مسلمہ سے روح ولی اللہی کا خطاب" بھی شامل ہے۔ کاغذ سفید چکنا۔ (قیمت:- عہ)

امام ولی اللہ دہلوی

اور اُن کا فلسفہ

(از حضرت مولنا عبید اللہ سندھی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور اُن کے فلسفہ پر یہ نہایت گہرا علمی مقالہ بلا شبہ نوادر میں سے ہے اور اُن کی علمی خصوصیات اور انکے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کیلئے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

اسمیں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت اور ہند و حرمین کے اساتذہ و شیوخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں انکی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارہ میں انکے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ صاحب کو اور انکے طریق فکر کو سمجھنے کیلئے اس مقالہ سے جو روشنی حاصل کی جاسکتی ہے کسی دوسری کتاب سے حاصل نہیں ہوسکتی، لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے، دوسرے حضرات پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ کاغذ سفید چکنا (قیمت:- [illegible] عہ)

"تذکرۂ امام ربانی"

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے سوانح و خصائص اور آپکے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی بیان؛ اکبر اور اس کے منافق و ملحد حواریوں کے گھڑے ہوئے "دین الٰہی" کی تفصیلات، اُس زمانہ کے علماء سوء اور ملحد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کیلئے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جدوجہد اور بارگاہ خداوندی میں چیخ پکار، اور اصلاح و تجدید کے اس مشن میں آپ کی محیر العقول کامیابی اور مغلیہ سلطنت کے رویہ اور مسلک پر آپ کی مساعی تجدیدیہ کا اثر —— ان تمام چیزوں کی پوری تفصیل آپ کو "تذکرۂ امام ربانی" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ (قیمت:- عمر)

ملنے کا پتہ
کتبخانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟

مولنا سید ابو الحسن علی ندوی کی نہایت اہم تصنیف جسمیں گویا پورے کتبخانہ کا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ ان سی کتاب ان کتابوں میں سے ایک ہے جو کسی قوم میں بڑے بڑے انقلاب کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ (قیمت:- سے)

[illegible] الفرقان [illegible] لکھنؤ سے شائع کیا۔

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

دفتر الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ (یوپی)

جلد ۱۷ | بابتہ ماہ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء | نمبر ۲

"پاکستانی احباب کی خدمت میں!"

سکہ کے تبادلہ کا مسئلہ حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان ابتک طے نہ ہو سکا اس لئے منی آرڈر اور وی پی کی صورت اب بھی ممکن نہیں۔

لہٰذا جو حضرات "الفرقان" جاری کرانا چاہیں یا کتب خانۂ الفرقان سے کتابیں منگوانا چاہیں وہ آرڈر روانہ فرما دیں انشاء اللہ تعمیل کر دی جائے گی، اور روپے کی وصولی کی جب کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی تو اس کی اطلاع آپ حضرات کو کر دی جائے گی۔

نیازمند:- ناظم "الفرقان" لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں!

(از۔ محمد منظور نعمانی)

۰ ۲ ذیقعدہ مطابق ۲۲ ستمبر یہ عاجز حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تھا، اور ۲ صفر مطابق ۱۱ دسمبر کو لکھنؤ واپس پہنچا ہے۔ قریباً ساڑھے تین مہینے کی اس مدت میں الفرقان اور دفتر الفرقان سے میں صرف دور اور بے تعلق ہی نہیں بلکہ بے خبر بھی رہا —— پھر یہ ایک عجیب اتفاق ہوا کہ روانگی سے قریباً دو ہفتے پہلے سے بعض کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ ناظرین الفرقان کو اپنے ارادۂ سفر اور پروگرام سے مطلع کرنے کیلئے چند سطریں لکھ کر بھی دفتر میں نہ دے سکا، حالانکہ میرے نزدیک یہ ضروری تھا، اور اس کے علاوہ بعض اور اہم باتیں بھی ایسی تھیں جن کا اپنے مخلص احباب اور الفرقان کے ناظرین سے اس موقع پر عرض کرنا میں بہت ضروری سمجھتا تھا —— بمبئی پہونچکر اس کا موقع ملا تو وہاں سے ایک مفصل خط ناظرین الفرقان کے نام لکھا اور اس تاکید کے ساتھ ڈاک سے دفتر بھیجا کہ ذیقعدہ کے الفرقان میں نگاہِ اولیں سے پہلے اس کو شائع کر دیا جائے۔ یہ خط روانہ کر کے میں مطمئن ہو گیا کہ چند دنوں میں میری یہ گزارشات اپنے مخلصین اور الفرقان کے ناظرین تک پہونچ جائیں گی —— لیکن اسکے ڈھائی مہینے بعد مدینۂ طیبہ پہونچ کر مجھے دفتر کا پہلا خط ملا (جو اگرچہ ۲۶ ستمبر کو ہوائی ڈاک سے روانہ کیا گیا تھا لیکن محکمۂ ڈاک کے حسنِ انتظام کی برکت سے صرف ڈیڑھ مہینے میں ۹ نومبر کو مجھے ملا) اس خط سے یہ معلوم کر کے بیحد قلق ہوا کہ بمبئی سے لکھا ہوا میرا وہ خط دفتر پہنچا ہی نہیں۔ اس خط کیساتھ الفرقان کیلئے ایک مضمون بھی روانہ کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی ڈاک کے حسنِ انتظام ہی کی نذر ہو گیا —— لکھنے والے نے جس چیز کو بہت ضروری سمجھ کے خاص اہتمام سے لکھا ہو

اور وہ مطمئن ہو چکا ہو کہ میرا پیام اپنے مخاطبین تک پہونچ گیا، جب اچانک اُس غریب کو یہ معلوم ہو کہ وہ اس طرح راستہ ہی میں ضائع ہو گیا تو اس کی قلبی اذیت اور روحانی تکلیف کا کسی دوسرے کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

"حج نمبر" جو رمضان و شوال کا مشترک شمارہ تھا شروع شوال میں شائع ہو گیا تھا، اور اس طرح "الفرقان" کا نظامِ اشاعت اپنی عمر میں پہلی دفعہ بالکل قابو میں آگیا تھا اور امید تھی کہ اب انشاء اللہ وقت کی پابندی کے ساتھ ماہ بماہ شائع ہوتا رہے گا، لیکن میرے جاتے ہی بیچارے کارکنانِ الفرقان کو ایک سخت مشکل اور پریشانی سے دوچار ہونا پڑا، صورت یہ ہے کہ الفرقان کے خریداروں کی بہت بڑی تعداد پاکستان میں ہے، حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے مابین سکّہ کے تبادلہ کے مسئلہ پر جو الجھاؤ ہوا (جو ابتک بھی نہیں سلجھ سکا ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان سے منی آرڈر اور وی پی کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ اور الفرقان کا حال یہ ہے کہ اس کا کوئی محفوظ سرمایہ تو ہے نہیں، روزمرّہ کی ڈاک سے جو روپیہ اس کے خریداروں سے وصول ہوتا رہتا ہے اسی سے اگلے مہینہ کے رسالہ کی تیاری اور اشاعت کا کام سرانجام پاتا ہے ـــــ گذشتہ سال بفضلہ تعالیٰ خریداروں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے کام اطمینان اور فراغت سے چلتا رہا اور اسی اطمینان کی حالت میں ۲ ستمبر کو میں یہاں سے روانہ ہو گیا، لیکن میرے جاتے ہی دونوں حکومتوں کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف ہو جانے کی وجہ سے جب پاکستان سے روپیہ کی آمد یک لخت بند ہو گئی تو الفرقان جن عزیزوں کے سپرد کر کے میں گیا تھا وہ بیچارے اس مشکل کا کوئی حل نہ نکال سکے، اور الفرقان کی تیاری اور اشاعت کے لئے روپیہ کا کوئی انتظام بروقت نہیں کر سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ رسالہ پھر ایک مہینہ لیٹ ہو گیا ـــــ اب واپس آکر اس عاجز نے الفرقان اور اس کے کارکنوں کو اس حال میں پایا کہ محرم کا پرچہ کئی دن سے چھپا رکھا تھا اور محصول ڈاک کیلئے روپیہ ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیچارے اس کو روانہ نہیں کر سکے تھے، ـــــ افسوس ہے کہ دونوں حکومتیں ابتک بھی اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکی ہیں، اور جلد ہی

اس کے حل ہونے کے کچھ آثار بھی نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے الفرقان اور اسکے کارپردازوں کے لئے پھر ایک سخت فکر اور آزمائش کی صورت پیدا ہوگئی ہے بس اللہ تعالیٰ ہی کارساز ہے اور اس کے کرم سے اُمید ہے کہ اس مشکل کے لئے آسانی کی کوئی صورت وہی پیدا کرے گا۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ہ

استاذ جلیل حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین) کی وفات اس ہفتہ نہیں بلکہ اس دور کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ علماء و فضلاء کی آج کی دنیا میں کمی نہیں لیکن راسخین فی العلم کا صدیوں سے قحط ہے۔ ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کی جن چند ہستیوں کے علمی رسوخ اور دینی بصیرت پر اس دور میں اعتماد کیا جاسکتا تھا، بلاشبہ حضرت مولانا ان میں سے ایک تھے ——— نظر و مطالعہ کی وسعت، فکر کی دقت وسلامت، اور زبان و بیان کی فصاحت وحلاوت کی صفات اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان میں جمع کردی تھیں کم از کم اس عاجز نے تو ابھی تک ان میں ان کا کوئی ثانی نہیں دیکھا، بارہا خود اپنے پر یہ گذرا ہے کہ کسی علمی اشکال کو لیکر حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی، اور اُس وقت برجستہ جو کچھ فرمادیا وہی اُس اشکال کا آخری اور شافی جواب تھا۔ کبھی کسی مسئلہ کی سند کی تلاش وجستجو میں رجوع کیا گیا تو فوراً جواب ملا کہ فلاں فلاں کتاب میں اس کی تصریح موجود ہے ——— جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادہ کا موقع ہوا ہوگا انھیں اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ ذہانت وذکاوت، فکر کی دقت، ومتانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں وہ آپ ہی اپنی نظیر تھے ——— اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشیں انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق علمی حقیقتوں کو آسان کرکے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ ان کے لئے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔
——— ایک مبصر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سُن کر ایک زمانہ میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب شاید اب غیب نہیں رہے گا بلکہ شہود بن کر سامنے

آجائے گا۔

افسوس ہے کہ پچھلے چند سالوں کی سیاسی ہنگامہ خیزیوں میں مولانا کے یہ خاص کمالات اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور عام طور سے لوگوں کو یہی یاد رہ گیا کہ مولانا فلاں سیاسی پارٹی کے حامی ہیں اور فلاں کے مخالف۔

قدرت کی تقسیم نے حضرت ممدوح کو پاکستان پہنچا دیا تھا اور وہاں ان کو ایک خاص وقار اور وزن حاصل تھا جس سے دیندار طبقہ کو بہت کچھ اُمیدیں تھیں، مگر قضاء و قدر کے پروگرام اور فیصلہ کا علم کسی کو نہ تھا۔ ۱۴ دسمبر کی صبح کو اخبارات میں اچانک آپ کی وفات ہی کی خبر پڑھی گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اگرچہ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے کوئی بھی نہیں آیا ہے، سب کو یہاں سے جانا ہے اور سب کے جانے کا وقت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے اس لئے ہر موت اپنے وقت ہی پر ہوتی ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ناقص اور محدود علم رکھنے والے بندے کسی موت کو بہت ہی بے وقت سمجھتے ہیں، حضرت مولانا کی وفات کا یہ سانحہ بھی اسی قسم کا ہے اللہ تعالیٰ ہی اپنے احکام اور اپنے فیصلوں کی حکمت و مصلحت جاننے والا ہے ہم اسکے بندے ہیں اور ہمارا کام صرف تسلیم و رضا ہے۔

ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ وہ خاص طور سے ارادہ اور اہتمام کر کے حضرت ممدوح کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی دعا کریں اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں کہ پاکستان میں دین کے فروغ اور دینی اصلاحات کی جو اُمیدیں حضرت ممدوح سے تھیں، حق تعالیٰ اپنے دوسرے بندوں کے ذریعہ ان کو پورا کرا دے، در اصل کرنے والا سب کچھ ہر حال میں وہی ہے اور اس کا کوئی کام کسی دوسرے پر بالکل موقوف نہیں۔

انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون

فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون

صورت اور حقیقت!

(سید ابو الحسن علی ندوی)

ایک تقریر جو ۲۶، دسمبر ۱۹۴۹ء کو لکھنؤ کے ایک بڑے اجتماع میں مسلمانوں میں اصلاح و دعوت کی کوشش کی ضرورت پر کی گئی تھی۔

ایک چیز کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت ان دونوں میں بہت بڑی مشابہت کے باوجود بہت بڑا فرق بھی ہوتا ہے، آپ روزمرہ کی زندگی میں صورت اور حقیقت اور ان کے فرق سے خوب واقف ہیں میں اس کی دو مثالیں دیتا ہوں۔ آپ نے مٹی کے پھل دیکھے ہوں گے جو اپنی شکل و صورت میں بالکل اصلی پھل معلوم ہوتے ہیں، لیکن صورت و حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اصلی آم کوئی اور چیز ہے اور مٹی کا نقلی آم کوئی اور چیز، مٹی کے آم میں نہ اصلی آم کا ذائقہ ہے نہ خوشبو، نہ رس نہ نرمی، نہ اس کی خاصیتیں، صرف آم کی شکل ہے اور اس کا رنگ و روغن اسلئے اس کو آم کہیں گے مگر مٹی کا آم، یہ مٹی کا آم دیکھنے بھر کا ہے، نہ کھانے کا نہ سونگھنے کا، نہ ذائقہ نہ خوشبو۔

آپ مردہ عجائب خانہ میں گئے ہوں گے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں سب درندے اور سب جانور موجود ہیں، شیر بھی ہے اور ہاتھی بھی، تیندوا بھی اور چیتا بھی، مگر بے حقیقت، بھس بھری ہوئی کھالیں، جن میں نہ کوئی جان ہے نہ طاقت، شیر ہے مگر نہ اس کی آواز ہے، نہ غصہ نہ طاقت ہے نہ ہیبت۔

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صورت کبھی حقیقت کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، صورت سے حقیقت کے خواص کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے۔ صورت کبھی حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، صورت کبھی حقیقت کا بوجھ سنبھال نہیں سکتی۔ جب صورت کسی حقیقت کے مقابلہ میں آئے گی اُس کو

شکست کھانا پڑے گی۔ جب صورت پر حقیقت کا بوجھ ڈالا جائے گا صورت کی پوری عمارت زمین پر آرہے گی۔

صورت اور حقیقت کا یہ فرق ہر جگہ نمایاں ہوگا، ہر جگہ صورت کو حقیقت کے سامنے پسپا ہونا پڑے گا، یہاں تک کہ عظیم سے عظیم اور مہیب سے مہیب صورت اگر حقیر سے حقیر حقیقت کے مقابلہ میں آئے گی تو اس کو مغلوب ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی حقیقت ہر بڑی سے بڑی صورت کے مقابلہ میں زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ حقیقت ایک طاقت ہے، ایک ٹھوس وجود ہے، صورت ایک خیال ہے۔ دیکھئے ایک چھوٹا سا بچہ اپنے کمزور ہاتھ کے اشارہ سے ایک بھس بھرے ہوئے مردہ شیر کو دھکا دے سکتا ہے، اس کو زمین پر گرا سکتا ہے، اس لئے کہ بچہ خواہ کتنا کمزور سہی ایک حقیقت رکھتا ہے، شیر اس وقت صرف صورت ہی صورت ہے، بچہ کی حقیقت شیر کی صورت پر آسانی سے غالب آجاتی ہے، یہ عالم حقائق کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ایک حقیقت رکھی ہے، مال کی بھی ایک حقیقت ہے، اس کی محبت طبعی اور اس کی خواہش فطری ہے، اگر حقیقت نہ ہوتی تو اس کے متعلق احکام کیوں ہوتے؟ اس میں کشمش کیوں ہوتی؟۔ اولاد ایک حقیقت ہے اس سے طبعی محبت اور فطری تعلق ہوتا ہے، اگر اولاد ایک حقیقت نہ ہوتی تو شریعت میں اس کی پرورش و نگہداشت کے احکام اور فضائل کیوں ہوتے؟ اسی طرح طبعی ضروریات اور خواہشات کی بھی ایک حقیقت ہے، ان حقیقتوں پر ایک بالاتر قوی تر حقیقت ہی غالب آسکتی ہے، کوئی صورت غالب نہیں آسکتی۔ یہ حقائق کتنے باطل آمیز سہی، ان پر فتح حاصل کرنے کے لئے اسلام و ایمان کی حقیقت درکار ہے۔ اسلام کی صورت کتنی مقدس سہی، ان پر فتح حاصل نہیں کر سکتی، اس لئے کہ ادھر حقیقتیں ہیں ادھر صرف صورت۔ آج ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ صورت اسلام ادنیٰ ادنیٰ حقائق پر غالب نہیں آرہی ہے، اسلئے کہ صورت میں دراصل کچھ بھی طاقت نہیں۔ ہماری صورتِ اسلام، صورتِ کلمہ، صورتِ نماز، ہم سے ادنیٰ ترغیبات چھڑانے سے قاصر ہے، ادنیٰ عادات پر غالب آنے سے عاجز ہے، ہم کو موسم کی ادنیٰ سختی اور حقیر ترین خواہش کا مقابلہ کرنے کی طاقت عطا نہیں کرتی، آپ کا یہ کلمہ جو کبھی گردن کٹوا دینے کی طاقت رکھتا تھا جو مال و اولاد کو اللہ کی راہ میں بے تکلف قربان

کرا دینے کی قوت رکھتا تھا، جو وطن چھڑا دینے اور تختۂ دار پر چڑھا دینے کی قوت رکھتا تھا، آج وہ ان سردیوں میں صبح کی نماز کے لئے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا، جو کلمہ زندگی بھر کی منھ لگی شراب شریعت کے ایک حکم پر ہمیشہ کے لئے چھڑا سکتا تھا، آج اگر ضرورت پڑ جائے تو آپ کی ادنیٰ مرغوب چیز یا معمولی عادت بھی نہیں چھڑا سکتا، اس لئے کہ وہ کلمہ کی حقیقت تھی جس کے کارنامے آپ تاریخ اسلام میں پڑھتے ہیں، یہ کلمہ کی صورت ہے جس کی بے اثری آپ دن رات دیکھتے ہیں، ہم غلطی یہ کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی تاریخ کو اپنے اوپر اوڑھنا چاہتے ہیں اس کو اپنی زندگی پر منطبق کرنا چاہتے ہیں، جب وہ منطبق نہیں ہوتی جب وہ لباس ہمارے اوپر راست نہیں آتا، جب جگہ جگہ جھول پڑتے ہیں تو ہم شکایت کرتے ہیں تعجب کرتے ہیں کہ کلمہ وہ بھی پڑھتے تھے ہم بھی پڑھتے ہیں، نماز وہ بھی پڑھتے تھے ہم بھی پڑھتے ہیں پھر کیوں اُسی طرح کے واقعات ظہور میں نہیں آتے، کیوں اُسی طرح کے نتائج و ثمرات برآمد نہیں ہوتے ؟۔

دوستو اور بزرگو! اپنے نفس کو دھوکہ نہ دو، وہاں کلمہ کی حقیقت تھی، ایمان کی حقیقت تھی، نماز کی حقیقت تھی۔ یہاں کلمہ کی صورت ہے، ایمان کی صورت ہے۔ نماز کی صورت ہے۔ جس طرح املی کے بیج سے آم کے پھل کی توقع فضول ہے اسی طرح صورت سے حقیقت کے خواص کی اُمید بیکار ہے اور فریب نفس۔

حضرت خبیبؓ کا واقعہ آپ نے سنا ہے، پھانسی کے تختہ پر ان کو چڑھایا گیا۔ چاروں طرف سے نیزوں کی نوکوں نے کو چنا شروع کیا، برچھیوں نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا، اور وہ صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ عین اس حالت میں ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمھاری جگہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوں ؟ وہ تڑپ کر جواب دیتے ہیں کہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ مجھے چھوڑ دیا جائے اور حضورؐ کے تلوے میں کوئی کانٹا بھی چبھے۔

حضرات! کیا یہ صورتِ اسلام تھی جس نے ان کو تختۂ دار پر ثابت قدم رکھا، اور اُنکی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے، نہیں وہ اسلام کی حقیقت تھی جو ان کے ہر زخم پر مرہم رکھتی تھی، جو ہر نیزے کی چبھن پر ان کے سامنے جنّت کا نقشہ لاتی تھی، اور ان کو دکھاتی تھی کہ یہ تمھاری اس تکلیف کا

صلہ ہے، بس چند لمحوں کا معاملہ ہو، یہ جنت تمھاری منتظر ہے، یہ خدا کی رحمت تمھاری منتظر ہے، اگر تم نے اس فانی جسم کی اس فانی تکلیف کو گوارا کر لیا تو غیر فانی زندگی کی غیر فانی راحت تمھارا حصہ ہے۔ یہ عشق و محبت کی حقیقت تھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم کو کیا یہ منظور ہے کہ تمھاری جگہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوں، تو حضورؐ کی صورت حقیقت بن کر اُنکے سامنے آگئی، اور ان کو گوارا نہ ہوا کہ اس جسمِ اقدس کو ایک کانٹے کی بھی تکلیف ہو۔

یہ چند پاک اور بلند حقائق تھے جو درد و تکلیف کی حقیقت پر غالب آگئے۔ صورتِ اسلام میں اس حقیقی درد و تکلیف کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ صورتِ اسلام تو تکلیف کے تصورات اور خیالات کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہم کو اور آپ کو معلوم ہے کہ گذشتہ فسادات کے موقع پر خیالی خطرات کی بنا پر لوگوں نے صورتِ اسلام بدل دی، مسلمانوں نے سروں پر چوٹیاں رکھیں اور غیر اسلامی شعار اختیار کئے اس لئے کہ ان غریبوں کے پاس صرف صورتِ اسلام تھی، وہ اس میدان میں ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت صہیب رومیؓ جب ہجرت کر کے جانے لگے تو کفار مکہ نے ان کو راستہ میں روکا اور کہا کہ صہیب تم جا سکتے ہو مگر یہ مال نہیں لیجا سکتے جو تم نے ہمارے شہر میں پیدا کیا ہے۔ اب حقیقت اسلام کا حقیقت مال سے مقابلہ تھا، حقیقت اسلام اپنی مقابل حقیقت پر غالب آئی، اگر صورتِ اسلام ہوتی تو وہ حقیقت مال کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔
آپ نے سنا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ جب ہجرت کر کے جانے لگے تو کفار ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، انھوں نے کہا کہ تم جا سکتے ہو مگر ہماری لڑکی ام سلمہ کو نہیں لیجا سکتے، اب حقیقتِ اسلام کا ایک حقیقت سے مقابلہ تھا، وہ حقیقت کیا تھی بیوی کی محبت جو ایک حقیقت ہے، لیکن اسلام کی حقیقت مومن کے دل میں ہر حقیقت سے زیادہ طاقتور اور گہری ہوتی ہے، انھوں نے بیوی کو اللہ کے حوالہ کیا اور تن تنہا چل دیئے۔ کیا صورت اسلام میں اتنی طاقت ہے کہ آدمی بیوی کو چھوڑ دے، بچہ کو چھوڑ دے۔ ہم نے تو دیکھا ہے کہ لوگوں نے بیوی اور بچوں کے لئے کفر تک کو اختیار کر لیا ہے اور صورتِ اسلام کی ذرا پرواہ نہیں کی ہے۔

آپ نے سنا ہے کہ حضرت ابو طلحہؓ نماز پڑھ رہے تھے، ایک چھوٹی سی چڑیا ان کے

باغ میں آگئی، اور اس کو پھر جانے کا رستہ نہ ملا۔ حضرت ابو طلحہؓ کی توجہ بٹ گئی۔ نماز کے بعد انھوں نے پورا باغ صدقہ کردیا، اس لئے کہ حقیقتِ نماز اس شرکت کو گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ باغ کی بھی ایک حقیقت ہے، اس کی سرسبزی، اس کی فصل، اس کی قیمت کی ایک حقیقت ہے اس حقیقت کا مقابلہ صورت نماز نہیں کرسکتی، اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت حقیقتِ صلوٰۃ ہی میں ہے۔ آج ہماری آپ کی نماز ادنیٰ ادنیٰ حقیقتوں کا مقابلہ اس لئے نہیں کرسکتی کہ وہ حقیقت سے خالی اور ایک صورت ہی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ یرموک کے میدان میں چند ہزار مسلمان تھے اور کئی لاکھ رومی، ایک عیسائی (جو مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے لڑ رہا تھا) کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ رومیوں کی تعداد کا کچھ ٹھکانا ہے؟ حضرت خالدؓ نے کہا خاموش! خدا کی قسم اگر میرے گھوڑے اشقر کے سم درست ہوتے تو میں رومیوں کو پیغام بھیجتا کہ اتنی ہی تعداد اور میدان میں لے آئیں۔ حضرات! حضرت خالدؓ کو یہ اطمینان و اعتماد کیوں تھا اور وہ رومیوں کی تعداد کو بے حقیقت کیوں سمجھتے تھے؟ اس لئے کہ وہ حقیقتِ اسلام رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے مقابلہ میں صرف رومیوں کی صورتیں ہیں جو ہر طرح کی حقیقت سے خالی ہیں۔ یہ لاکھوں صورتیں اسلام کی حقیقت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔

ہم یقیناً کلمہ پڑھتے ہیں، ہم میں سے بہت سے لوگ کلمہ کے معنی سے بھی واقف ہیں، لیکن حقیقتِ کلمہ کوئی اور چیز ہے۔ وہ ان الفاظ و معنی سے بہت بلند ہے۔ کلمہ کی یہ حقیقت صحابہ کرامؓ کو حاصل تھی، وہ جب کہتے تھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو واقعۃً سمجھتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا کوئی حاکم و بادشاہ نہیں، اللہ کے سوا کوئی محبت اور خوف کے لائق نہیں، اللہ کے سوا کوئی امید و توقع کے قابل نہیں۔ اللہ کے سوا کسی کی ہستی کوئی ہستی نہیں۔ کیا یہ سب حقیقتیں ہم سب کے دل میں اتری ہوئی ہیں، ہمارے دماغ کے اندر بسی ہوئی ہیں، ہماری زندگی کے اندر جڑ پکڑے ہوئے ہیں؟ اگر ہم ان حقیقتوں سے واقف بھی ہوتے تو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا کہ ہم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں جس کو اس حقیقت کا ذرا سا بھی احساس ہے، اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے سمجھتا ہی کہ وہ

کتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم!
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را!

ہم سب مانتے ہیں کہ آخرت برحق ہے، جنّت دوزخ برحق ہی، مرنے کے بعد یقیناً زندہ ہونا ہے، لیکن کیا سب کو ایمان کی وہ حقیقت حاصل ہے جو صحابہؓ کو حاصل تھی، اس حقیقت کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک صحابی کھجوریں کھاتے کھاتے پھینک دیتا ہے، اور کہتا ہے ان کے ختم ہونے کا انتظار کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے اور فوراً آگے بڑھ کر شہادت حاصل کرتا ہی اس لئے کہ جنّت اس کے لئے ایک حقیقت تھی، اور وہ حقیقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، اس کی حقیقت جس کو حاصل تھی وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ مجھے "احد" پہاڑ کے اس طرف سے جنّت کی خوشبو آرہی ہے۔ یرموک کے میدان میں ایک صحابی حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امیر! میں سفر کے لئے تیار ہوں کوئی پیغام تو نہیں کہنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہاں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ہمارا سلام عرض کرنا، اور کہنا کہ آپ نے جو وعدے فرمائے تھے وہ سب پورے ہوئے ہیں۔ یہ ہے یقین کی حقیقت، اس حقیقت پر کون سی قوت غالب آسکتی ہے، اور ایسی حقیقت رکھنے والی جماعت پر کون سی جماعت غالب آسکتی ہے؟۔

امت میں جو سب سے بڑا انقلاب ہوا وہ یہ کہ اس کی ایک بڑی تعداد اور شائد سب سے بڑی تعداد میں صورت نے حقیقت کی جگہ لے لی، یہ آج کی بات نہیں یہ صدیوں کی پرانی حقیقت ہے، صدیوں سے صورت نے حقیقت کی جگہ حاصل کر رکھی ہے، عرصہ تک دیکھنے والوں کو صورت پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا رہا اور وہ حقیقت کے ڈر سے اس صورت کے قریب آنے سے بچتے رہے، لیکن جب کسی نے ہمت کر کے اس صورت کو چھوا تو معلوم ہوا کہ اندر سے پول ہے، اور حقیقت غائب ہو چکی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی کبھی کاشتکار کھیت میں ایک لکڑی گاڑ کر اس پر کوئی کپڑا ڈال دیتا ہے جس کو دیکھ کر پرندوں اور جانوروں کو شبہ ہوتا ہے کہ کوئی آدمی رکھوالی کر رہا ہے

لیکن اگر کبھی کوئی سیانا کوا یا ہوشیار جانور ہمت کر کے کھیت میں جا پڑے تو ظاہر ہے کہ وہ بے جان شبیہ کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے جانور اس کھیت کو روند ڈالتے ہیں اور پرندے اس کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، ان کی صورت حقیقت بن کر صدیوں انکی حفاظت کرتی رہی، قومیں ان کے قریب آنے سے ڈرتی تھیں، حقیقتِ اسلام کے واقعات ان کے ذہن میں تازہ تھے، اور کسی کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، لیکن کب تک؟ جب تاتاریوں نے بغداد پر چڑھائی کی جس پر حملہ کرنے سے وہ برسوں احتیاط کرتے رہے تو اس صورت کی حقیقت کھل گئی اور مسلمانوں کا بھرم جاتا رہا، اس وقت سے صورت اسلام حفاظت کرنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے، اب صرف حقیقت اسلام ہی اس امت کی حفاظت کر سکتی ہے۔

آپ تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلخ داستانیں پڑھتے ہیں، یہ حقیقت کی شکست کے واقعات نہیں، یہ سب صورت کی شکست و ہزیمت کے واقعات ہیں، صورت نے ہم کو ہر معرکہ میں رسوا اور ذلیل کیا، لیکن خطا ہماری تھی، ہم نے غریب صورت پر حقیقت کا بوجھ رکھنا چاہا وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکی، خود بھی گری اور پوری عمارت کو بھی زمین پر لے آئی۔

عرصہ دراز سے صورتِ اسلام معرکہ آزما ہے اور شکست پر شکست کھا رہی ہے اور حقیقت اسلام مفت میں بدنام اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے، دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم اسلام کو شکست دے رہے ہیں، اس کو خبر نہیں کہ حقیقت اسلام تو مدت سے میدان میں آئی ہی نہیں، اس کے مقابلہ میں صرف مسلمانوں کی صورت ہے نہ کہ اسلام کی حقیقت۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں ترکی میدان میں آیا لیکن اسلام کی ایک نڈھال صورت لیکر، یہ نحیف و نزار صورت مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی، فلسطین میں تمام عرب قومیں اور سلطنتیں مل کر یہودیوں کے مقابلہ میں آئیں لیکن حقیقتِ اسلام، شوقِ شہادت، جذبہ جہاد اور ایمانی کیفیات سے اکثر عاری، عربی قومیت کے نشہ میں سرشار، صرف اسلام کے نام و نسبت سے آراستہ، نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے روح صورت نے یہودیوں کی جنگی قوت و تنظیم اور اسلحہ کی حقیقت سے مات کھائی؛

اس لئے کہ صورت حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہودی ایک حقیقت رکھتے تھے اگرچہ سرتاپا مادّی، عرب صرف ایک صورت رکھتے تھے اگرچہ مقدس، لیکن صورت صورت ہے اور حقیقت حقیقت!۔

اسلام کی صورت اللہ کے یہاں ایک درجہ رکھتی ہے، اس لئے کہ اس میں مدتوں اسلام کی حقیقت بسی ہوئی رہی ہے، اور یہ اسلام کی حقیقت کا قالب ہے۔ اسلام کی صورت بھی اللہ کو پیاری ہے، اس لئے کہ یہ اس کے محبوبوں کی پسندیدہ صورت ہے۔ اسلام کی صورت بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، اس لئے کہ اس صورت سے حقیقت اسلام کی طرف منتقل ہونا نسبتاً آسان ہے، جہاں صورت بھی نہیں وہاں حقیقت تک پہونچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن دوستو! اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے وعدے دنیا میں، اور مغفرت و نجات اور ترقی درجات کے وعدے آخرت میں سب حقیقت سے متعلق ہیں نہ کہ صورت سے۔ حدیث میں ہے ان اللّٰہ لا ینظر الیٰ صورکم و اموالکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم و اعمالکم (اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے) جو لوگ صرف صورت کے حامل، اور حقیقت سے یکسر خالی تھے ان کو وہ ان لکڑیوں سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی سہارے سے رکھی ہوئی ہیں۔ وہ فرماتا ہے:۔

واذا رایتھم تعجبک اجسامھم	اگر تم ان کو دیکھو تو تم کو ان کے جسم بڑے
وان یقولوا تسمع لقولھم کانھم	بھلے معلوم ہونگے، وہ بات کرینگے تو تم
خشب مسندۃ یحسبون کل صیحۃ	کان لگا کر سنوگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ
علیھم ؕ (المنافقون)	لکڑیاں ہیں جو سہارے سے رکھی ہوئی ہیں

ہر آواز کو وہ اپنے خلاف ہی سمجھتے ہیں۔

دنیا میں بھی فتح و نصرت تائید و اعانت کے وعدے "حقیقت ایمان" ہی کے ساتھ مشروط ہیں۔ صاف فرماتا ہے:۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم	سست و غمگین نہ ہو تم ہی سربلند ہو، اگر
الاعلون ان کنتم مومنین ؕ	تم (حقیقتاً) صاحب ایمان ہو۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمانوں ہی کو ہے، لیکن پھر بھی شرط لگائی کہ اگر تم میں حقیقتِ ایمان پائی جاتی ہے تو پھر تمھاری سربلندی میں شک نہیں۔

دوسری آیت میں بھی صفتِ ایمان ہی پر اپنی مدد کا وعدہ فرمایا:۔

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا	ہم ضرور ضرور اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے
فی الحیاۃ الدنیا ویوم یقوم	اور اُن لوگوں کی جو صفتِ ایمان سے
الاشھاد (المؤمن)	متصف ہیں، دنیا کی زندگی میں بھی اور

آخرت میں بھی، جب اللہ کے گواہ کھڑے ہوں گے۔

اسی حقیقت ایمانی پر خلافت ارضی دین کے اقتدار اور امن و اطمینان کا وعدہ فرمایا ہے:۔

وعد اللہ الذین اٰمنو منکم وعملوا الصالحٰت	ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان رکھتے ہیں
لیستخلفنھم فی الارض کما	اور جن کے عمل صالح ہیں اللہ کا وعدہ ہے کہ
استخلف الذین من قبلھم	ان کو زمین کی خلافت سے سرفراز کرے گا
ولیمکنن لھم دینھم الذی	جیسے ان لوگوں کو سرفراز کیا جو ان سے
ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم	پہلے تھے، اور ان کے دین کو جو اللہ کا
من بعد خوفھم امنا ؕ	پسندیدہ ہے اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے

خوف کو امن سے بدل دے گا۔

لیکن باوجود اس کے کہ یہ سارے وعدے ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر تھے، پھر یہ شرط فرمائی کہ یہ ضروری ہے کہ اس میں اسلام کی حقیقت (توحید کامل) پائی جائے۔

یعبدوننی ولا یشرکون	(اس شرط سے) کہ میری عبادت کریں گے
بی شیئا ؕ (النور)	میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔

پس اس وقت سب سے بڑا کام اور امت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے عوام اور سواد اعظم کو صورت سے حقیقت کی طرف سفر کرنے کی دعوت دی جائے، صورت اسلام میں روح اسلام اور حقیقت اسلام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اس وقت اُمت کی سب سے

بڑی احتیاج یہی ہے، اسی سے اس کے سب حالات اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے حالات بدلیں گے۔ دنیا کے حالات اس امت کے تابع اور اس امت کے حالات اس حقیقت کے تابع ہیں۔ یہ امت حضرت مسیح (علیہ السلام) کے الفاظ میں زمین کا نمک ہے، دیگ کا مزا نمک کے تابع ہے، اور نمک کا مزا اس کی نمکینی پر موقوف ہے، اگر نمک کی نمکینی ختم ہو جائے تو وہ نمک کس کام کا، اور پھر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے والی چیز کہاں سے آئے گی۔ آج ساری زندگی بے کیف و بے روح ہے، اس لئے کہ اس امت کی بڑی تعداد حقیقت سے عاری اور روح سے خالی ہے، پھر زندگی میں روح اور حقیقت کہاں سے آئے۔

دنیا کی اور قومیں بھی ہیں جو ہزاروں برس سے اپنے مذہب کی حقیقت اور روح سے خالی ہو چکی ہیں اور ان میں صرف چند بے روح رسمیں اور چند بے حقیقت صورتیں رہ گئی ہیں لیکن ان قوموں کی دینی اور روحانی زندگی ختم ہو چکی ہے، ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، آج دنیا کی کوئی طاقت کوئی شخصیت کوئی اصلاح ان میں دینی زندگی اور حقیقی روح پیدا نہیں کر سکتی، ایک نئی قوم کا بن جانا ان قوموں کی دوبارہ زندگی سے آسان ہے جن لوگوں نے ان قوموں میں از سر نو دینی زندگی اور اخلاقی روح پیدا کرنے کی انتہائی جد و جہد کی، وہ زمانۂ حال کے وسائل اور سہولتوں کے باوجود سخت ناکام رہے، اس لئے کہ درحقیقت ان میں ایمان و یقین اور دینی روح پیدا کرنے کا سرچشمہ عرصہ ہوا خشک ہو چکا ہے، زندگی کا سرا اور سررشتہ کٹ چکا ہے، جب کسی درخت کی جڑ خشک ہو چکی ہو اور اس کی رگیں زمین چھوڑ چکی ہوں تو اس کی پتیوں کو پانی دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن اس امت کی زندگی کا سرچشمہ موجود ہے اس امت کی زندگی کا سرا موجود ہی، اور یہ امت اس سے وابستہ ہے۔ وہ ہے اللہ او راس کے رسولؐ پر ایمان، آخرت اور حساب کتاب کا یقین، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار۔ اس امت کو اس گئی گذری حالت میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے جو تعلق ہے وہ دوسری قوموں کے خواص کو بھی نصیب نہیں۔ اس انحطاط کے زمانہ میں بھی جتنی حقیقت اس میں پائی جاتی ہے وہ دوسری قوموں میں مفقود ہے: اس کی کتاب آسمانی (قرآن مجید) محفوظ ہے اور اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے پیغمبر کی سیرت اور

زندگی جو آج بھی ہزاروں لاکھوں دلوں کو گرما دینے اور زمانہ کے خلاف لڑا دینے کی طاقت رکھتی ہے بکمل طور پر موجود ہے اور آنکھوں کے سامنے ہے، صحابۂ کرام رض کی زندگی، اُنکی زندگی کا انقلاب، اور ان کی کوشش سے دنیا کا انقلاب نظر کے سامنے موجود ہے، یہ سب زندگی کے چشمے ہیں، یہ سب حرارت اور روشنی کے مرکز ہیں۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ اس امت میں صورت سے حقیقت کی طرف ترقی کی ضرورت کا عام احساس پیدا ہو۔ زندگی کے ان مرکزوں سے تعلق پیدا ہو اور مادی و معاشی انہماک سے اس کو ان مرکزوں سے اکتساب فیض کی فرصت ملے، اور وہ اپنی اصلی زندگی کے چند دن گذار کر اپنی زندگی میں انقلاب اور اپنی پوری زندگی میں ایمان و احتساب (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اسی کی رضا کے شوق میں کام کرنے کی رُوح) پیدا کرے۔

ہماری دعوت صرف یہ ہے، کہ :۔

یاایھا الذین اٰمنوا اٰمِنوا "اے مسلمانو! صورتِ اسلام سے حقیقتِ ایمان کی طرف ترقی کرو"

ہمارے مستقل ہفتہ وار اجتماعات جن کی ہم شہر شہر اور قصبہ قصبہ دعوت دیتے ہیں اسی لئے ہیں، کہ ہر آبادی میں ایسے مرکز قائم ہوں جہاں مسلمان جمع ہو کر اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق یاد کریں، جہاں سے ان کو حقیقت اسلام کا پیغام ملے، جہاں ان کو اپنی کھوئی ہوئی زندگی کا سُراغ لگے، جہاں سیرت نبوی اور اصلی اسلامی زندگی کے واقعات اور دین کی بنیادی اصولی دعوت کے ذریعہ ان میں دینی جذبات و احساسات بیدار ہوں، اور ان میں دینی انقلاب کی خواہش پیدا ہو۔ اگر یہ مرکز اور اس طرح کے اجتماعات نہ ہوئے تو بڑے پیمانے پر اور طاقتور و مؤثر طریقے پر امت کی اکثریت میں "حقیقتِ اسلام" اور "روحِ اسلام" پیدا ہونے کی کیا توقع ہے۔

پھر ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ کچھ دن حقیقتِ اسلام کو حاصل کرنے اور اس کو اپنے میں راسخ کرنے کے لئے اپنے اوقات فارغ کریں اور اس ماحول سے نکل کر جس میں حقیقتِ اسلام پنپنے اور ایمانی کیفیات اُبھرنے نہیں پاتیں۔ ایک ایسے ماحول میں وقت گذاریں

جہاں اصلی زندگی کی جھلک موجود ہو۔ جہاں علم وذکر، دعوت و تبلیغ، خدمت و ایثار، تواضع و خلق، محنت وجفاکشی کی زندگی ہو، ہم اس وقت مسلمانوں کو اس مقصد کے لئے جماعتوں کی شکل میں نکلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی بڑی تعداد اس کو جزوِ زندگی بنالے اور اس کا رواج پڑجائے، تو ہم کو اللہ کی ذات سے اُمید ہو کہ کروڑوں مسلمانوں تک حقیقتِ اسلام کا یہ پیغام پہونچ جائے گا اور لاکھوں مسلمانوں کی زندگی میں دینی رُوح، ایمان واسلام کی حقیقت اور اس کی صفات وکیفیات پیدا ہوجائیں گی۔

حضرات! ہم اس سے بالکل مایوس نہیں ہیں کہ اس زمانہ میں حقیقتِ اسلام پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہم کسی ایسے زمانہ اور انقلاب کے قائل نہیں جس میں حقیقتِ اسلام دوبارہ پیدا نہیں کی جاسکتی۔ آپ پیچھے مڑکر دیکھئے تاریخ کے سمندر میں آپ کو حقیقتِ اسلام کے جزیرے بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ بارہا حقیقتِ اسلام اُبھری اور ایمانی کیفیات پیدا ہوئیں۔ وہی اللہ اور رسول پر یقین واعتماد، وہی شہادت کا ذوق، جنّت کا شوق، وہی دنیا پر آخرت کی ترجیح۔ جب کبھی اور جہاں کہیں حقیقتِ اسلام پیدا ہوگئی اس نے ظاہری قرائن وقیاسات کے خلاف حالات پر اور مخالف طاقتوں پر فتح پائی ہے، تمام گذرے ہوئے واقعات کو دہرادیا ہو اور قرنِ اوّل کی یاد تازہ کردی ہے۔

حقیقتِ اسلام اور حقیقتِ ایمان میں آج بھی وہی طاقت ہے جو ابتدائے اسلام میں تھی۔ آج بھی اس سے وہ سب واقعات ظاہر ہوسکتے ہیں جو اس سے پہلے ظاہر ہوئے ہیں۔ آج بھی اس کے سامنے دریا پایاب ہوسکتے ہیں، سمندر میں گھوڑے ڈالے جاسکتے ہیں، درندے جنگل چھوڑکر جاسکتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ گلزار بن سکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ حقیقتِ ابراہیمی موجود ہو۔ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہو اندازِ گلستاں پیدا

"دجّالی فتنہ" اور "سورۂ کہف"

(از۔ جناب مولٰنا مناظر احسن صاحب گیلانی)

(۲)

دجّالی فتنہ، جسے چاہیں تو آپ "حمارؔی[1] تہذیب و تمدن" بھی کہہ سکتے ہیں؛ اس فتنے کے نمایاں خط و خال، آثار و لوازم آپ کے سامنے پیش ہو چکے، اگر ان نشانیوں اور علامتوں سے آپ اس فتنے کے پہچاننے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں، تو اس کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کے ان اشاروں سے انشاء اللہ مستفید ہونے کی صلاحیت آپ میں پیدا ہو چکی ہوگی، جو اب آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

۱

سورۂ کہف کے مشتملات اور مضامین کی اجمالی فہرست کا پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔

۱۔ ابتدائی رکوع اور خاتمہ کی رکوع میں چند کلیاتی اشارے پائے جاتے ہیں، جیسا کہ انشاء اللہ معلوم ہوگا، دجّالی فتنے سے ان اشاروں کا کافی گہرا تعلق ہے۔

۲۔ ان کلیاتی اشاروں کے سوا چند قصص اور حکایتیں ہیں۔ یعنی[1] اصحاب کہف کا قصہ، لدنّی[2] اور خدا کے حضور سے علم و رحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰؑ کی ملاقات، ذو[3] القرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے) دو[4] آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور[5] مکالمہ

---

[1] حمار، عربی میں گدھے کو کہتے ہیں۔ "المسیح الدجّال" کی طرف جس گدھے کا انتساب کیا گیا ہے۔ روایۃً و درایۃً اس کا مآل جو کچھ بھی ہے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اسی کے ساتھ اگر اس کو بھی سوچا جائے کہ تمدن جدید کے ائمہ اجتہاد (صفحہ ۱۹ پر)

جن میں ایک کے قبضے میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع و وسائل تھے، اور دوسرے کا دامن ان ذرائع و وسائل سے خالی تھا، دُنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل، آدمؑ اور شیطان کے قصے کا اعادہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

ان تمثیلی قصص و حکایات کو بیان کرتے ہوئے، بعضوں کے شروع میں تو صراحۃً یہ کہدیا گیا ہے کہ اس کا ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے کیجئے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:- واضرب لهم مثلا رجلين (اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال الخ)۔ یا دنیا کی اس پست زندگی کی مثال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:- واضرب لهم مثل الحيوٰة الدنيا (اور بیان کر ان کے لئے اس پست زندگی کی مثال)۔ اور بعضوں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہے، مگر سباق و سیاق اور قرآن کے شیوۂ بیان کے جو مذاق شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گذرے ہوئے واقعہ کا دہرانا، یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل و تمیز کا مضحکہ ہے، اسی لئے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری مشغلہ ہے: قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کرلیتا ہے جن سے کسی خاص مقصد کے ذہن نشین کرانے اور سلجھانے سمجھانے

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ) کارل مارکس کو سب سے بڑی کارفرما جوہری قوت انسانی جدوجہد میں پیٹ اور پیٹ کے تقاضے ہی جو نظر آئے ہیں، اور اسی کے ساتھ فرائڈ نے "جنسی میلان" کی نشاندہی، بنی آدم کی ساری تگ و دو میں جو کی ہے، ان دونوں نظریات کو اگر ملالیا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ انسانیت جن جذبات کے رو میں تمدن جدید کے ان محققوں کو بہتی نظر آئی ہے ان کی مثالی صورت کے لئے گدھے کے قالب سے بہتر قالب شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آخر شکم پروری اور خر نفسی کے سوا غریب گدھا اور بھی کچھ ہے؟ عہدِ جدید کا انسان جب ان ہی دو کارفرما قوتوں کی سواری پر سوار ہوکر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے، کد و کاوش جدوجہد کے تمام شعبے چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر، جب ان ہی دو محرکہ قوتوں کے زیر اثر گردش کررہے ہیں، نسلِ انسانی کی ساری اچھل پھاند جب ان ہی دونوں جذبات سے زور حاصل کررہی ہے تو گدھے کی سواری کے سوا "المسیح الدجال" کی یا ان کے نتیجے آپ ہی بتائیے کہ اور نظر ہی کیا آتا! سوار جب خود کہہ رہا ہو کہ میں گدھے پر سوار ہوں تو دیکھنے والوں نے کیا غلطی کی ؂

؂ جب اس کو گدھے پر سوار دیکھا ۔ ۱۲

میں مدد ملتی ہو، نہ صرف گزرے ہوئے واقعات وحوادث بلکہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اور ایک عالمگیر تاریخی انقلاب کے متعلقہ حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے پیش آتے چلے جا رہے تھے، ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آگئی ہے تو اس وقت بھی حسب دستور ذکر کے لئے ان ہی اجزاء کو اس نے چن لیا ہے جن سے اس خاص مقام میں کسی قسم کا تفہیمی کام وہ لینا چاہتا ہے۔ بدر واحد، فتح مکہ، جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو میں نے عرض کیا، ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً شعب ابی طالب میں نظر بندی، ہجرت حبشہ، فتح خیبر، اور از یں قبیل بیسیوں چیزیں اسی سلسلے کی ایسی ہیں کہ انکے ذکر سے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں، یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک واقعہ کے تفصیلات کا علم نہ ہو، ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا، اور اس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہے اور نہ وہ کوئی تاریخی یادداشت یا ریکارڈ ہے، اس کا ایک متعین موضوع ہے[1]۔ اسی لئے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع کے گرد گردش کرتے ہیں، اسی موضوع خاص کے لئے جہاں جہاں مناسب تھا، بعض گذرے ہوئے واقعات اور قصص کا بھی اس نے ذکر کیا ہے، مگر اسی التزام کے ساتھ یعنی صرف بقدر ضرورت اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی اس خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے، اسی لئے آپ پائیں گے کہ ایک ہی قصہ کا اعادہ مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہے تو کہیں نسبتاً تفصیل وبسط کا رنگ پایا جاتا ہے، اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جزء کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔ مجھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہڈی" جیسے ایک ہی ہوتی ہے مگر جسدی نظام میں وہی "ہڈی" کسی جگہ کافی طویل عریض موٹی نظر آتی ہے، اور دوسری جگہ بھی ہڈی ہی ہوتی ہے مگر ایک انچ ڈیڑھ انچ سے زیادہ

---

[1] یعنی جس کی استدعا "اھدنا الصراط المستقیم" کی دعا میں کی جاتی ہے، وہ سیدھی راہ جس پر پڑھ کر انسانیت قدرت اور اس کے قوانین سے وفاقی تعلق پیدا کر لیتی ہے، قرآنی تعبیر جس کی "انعام" کے لفظ سے کی گئی ہے۔

بڑی نہیں ہوتی، کچھ یہی طریقہ قرآنی قصص کے استعمال میں اختیار کیا گیا ہے، ایک ہی لکڑی ہوتی ہے بڑھئی مختلف پیمانوں پر اسی ایک لکڑی سے ٹکڑے بنا بنا کر اپنی اپنی جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق ضرورت ہے کہ قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطۂ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب و غریب اعجازی نظام واضح ہوگا۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ سورۂ کہف کے ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق یعنی کہاں کب یہ واقعات پیش آئے، تاریخی آثار اور کتابوں سے ان کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں، یا ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اُس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے، یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سُراغ رسانی علم کی خدمت ہے، اس خدمت کو بھی کوئی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی یقیناً قدر و قیمت کی مستحق ہوگی، لیکن جس نتیجے تک پہونچانے کے لئے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہے اُس کیلئے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

۲

جو براہِ راست عربی زبان میں قرآن سے استفادہ نہیں کر سکتے، اُن کے سمجھانے کا مرحلہ کافی دشوار ہے۔ پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں، پھر ان کا ترجمہ کروں، مطلب بیان کروں، اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی سمیت کے ازالہ میں سورۂ کہف کے اس جزء سے مدد لینے کی کیا شکل ہے دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں، مگر دل کسی پر جما نہیں، حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں، آپ پڑھتے جائیے، دیکھئے اسی راہ سے فائدے کی صورت خدا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

سب سے پہلی بنیادی بات دجالی فتنے سے ماؤف فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ باور کرایا جاتا ہے کہ جس میں کچھ نہ تھا یقین کرو کہ سب کچھ اسی سے ملا ہے، سب کچھ... تا اینکہ زندگی بھی اسی سے ملی ہے جس میں زندگی نہ تھی، علم اسی سے ملا ہے جس میں علم نہ تھا۔ الغرض جس میں بینائی نہ تھی اُس سے بینائی، جس میں شنوائی نہ تھی اُس سے شنوائی، جس میں ارادہ نہ تھا

اُس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اقتدار نہ تھا، اسی سے اختیار و اقتدار، سب کچھ یہی بنیادی احساس ہے جسے ہر اُس دل اور دماغ میں آپ آج پائیں گے، جس پر دجالی فتنے کی عفریتی پرچھائیاں پڑ چکی ہیں۔ ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی، پانے والے کچھ اسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔

صرف ایک لفظ "ارتقاء" جادو کا کوئی چمچہ ہے جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے، جسے انسان کی فطرت کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جس کے سامنے جاری ہے "کچھ نہیں" سے "کچھ" بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو اُس کے تصور سے بھی عاجز ہے، اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات و صفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتی، حیوانی، انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ابتداءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھے۔ پھر وہی کمالات وصفات جو "نیست و نابود" تھے، ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں۔ گویا جو نہ تھے وہ ہو گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی منوایا بھی جاتا ہے، اور ماننے والے اسی کو مان بھی لیتے ہیں۔ جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اسی کے منگوا دینے میں کامیابی کیسے ہو گئی۔ خصوصاً اس دعوی کے ساتھ کہ عقل و مشاہدے کے سوا، دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہو سکتی۔ اسی عقل و مشاہدے کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مانے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا، حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہے اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔ دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اُس وقت نہ یہ موجود تھے نہ وہ، مگر جانے بغیر جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے، وہی ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہو گئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہرحال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ کیسے نکل آیا، صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا، نابود نے بود کا، نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کر لیا۔

ان قصوں کو تو جانے دیجئے، زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ "جس میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا" جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہوگی، مادّے کی کیچڑ سے اُبل کر باہر آنے والے اس شخص کے احساسات کیا ہوں گے، کائنات کے اس بحرِ مواج کی ہر موج میں صد کام نہنگ کے چھپے ہوئے حلقوں کو توڑتے پھوڑتے ہوئے سمجھتا ہے کہ موجودہ زندگی کے پانے میں وہ کامیاب ہوا ہے، کس زندگی کے پانے میں؟ جو خود مستقل "قیدِ غم" ہے، اور "غم کی اس قید" پر بھی مسلسل حوادث و آفات کے ہتھوڑے پڑتے چلے جاتے ہیں، تا اینکہ بالآخر غم ہی کی شکل میں جو زندگی ملی تھی، جب تک ساتھ رہی سوزش بنکر ساتھ رہی، جس دن سوزش اس کی ختم ہوئی، زندگی بھی ختم ہوگئی۔ الغرض ایک بے سہارے تنکے کی طرح ہستی کے سمندر میں "کچھ نہیں سے نکل کر" سب کچھ بن جانے والا یہ انسان تیرتا رہتا ہے جس کا کوئی محافظ کوئی نگراں نہیں، جس کی سعی کا کوئی حاصل، اور جس کے وجود یا زندگی کا کوئی انجام نہیں۔

"دجالیت" کے اس عہد میں ساری بے قراریاں، جن میں آدمی کا دل تہہ و بالا ہوتا رہتا ہے، سچ پوچھئے تو ان کی ضمانت در حقیقت بے کسی کے اسی احساس میں پوشیدہ ہے، جو زندگی کی اس ارتقائی توجیہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اب ایک طرف دجالی ذہنیت کے اس قدرتی نتیجے اور لازمی احساس کو رکھئے، اور سورۂ کہف کی پہلی سطر کے پہلے جز "الحمد للہ" پر ٹھہر جائیے۔ میں آپ سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آگے پڑھئے یا نہ پڑھئے، صرف "الحمد للہ" سے علم کی جو روشنی پیدا ہوتی ہے، وہ تاریکی کے ان مہیب بادلوں کو چھانٹنے کے لئے کافی ہے۔

سمجھا آپ نے "الحمد للہ" کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے کہ ہر وہ کمال یا صفت، جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ "اللہ" یعنی اس ذات کے ساتھ مختص ہے جس کی کارفرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہے جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں بلکہ جس میں سب کچھ ہے اسی سے ملا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے، جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے، حیات ہے، علم ہے، قدرت ہے، ارادہ ہے، رحمت و رافت ہے، جو اس سے پیدا ہوا ہے، خیال تو کیجئے کہ ان مایوسیوں اور وسواسی محرومیوں سے اس کو کیا واسطہ جو یہ سوچتا ہے کہ جس میں کچھ نہ تھا اسی سے نکل کر میں دنیا میں آیا ہوں، اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے[1]

---

[1] کے بعد بھی میں کچھ باقی نہ رہوں گا۔ (باقی)

تصوّف و سلوک!

(از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ)

(۶)

عشق و تفویض اس ایمانی عشق کا منصوص و معروف نام تفویض ہے، ارضا الحق نام وعظ میں ارشاد ہے، کہ:-

"عشق کی حقیقت ہی تفویض ہے کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردے جسطرح چاہیں ہم میں تصرف کریں تشریعاً بھی تکویناً بھی اور ہم ہر حال میں راضی رہیں، یہی حقیقت ہے تفویض کی"

ایک عجیب نکتہ کسی ملفوظ میں یہ بیان فرمایا کہ:-

"شیطان جو مردود ہوا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سالک محض تھا۔ جذب ومحبت کا مادّہ بالکل نہ تھا ورنہ اس بے ادبی سے اعتراض نہ کرتا۔ اس لئے سالک محض (خشک اہلِ عمل) کی حالت خطرے سے خالی نہیں۔ چاہئے کہ جذب کا مادہ بھی پیدا کریں جس کا طریقہ کثرتِ ذکر اور صحبتِ اہلِ محبّت ہے" (اشرف المسائل ص۱۷)

اور یہ ایمانی عشق لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہی، کیونکہ غیر اللہ سے جتنے تعلقات ہیں وہ ان کے آلہ و معبود یا نافع وضار ہونے کی غلطی و غلط فہمی ہی سے ہیں، جس کی خود قرآن مجید نے شدّت سے نفی فرمائی ہے۔ افتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم۔ خود مولانا (روم) اسی مذکور بالا[۱] شعر کے بعد فرماتے ہیں، کہ ؎

---

[۱] عشق آں شعلہ است چوں برفروخت ہر کہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند — درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت — مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

دنیوی عشق یا استیلائے محبت کا لازمہ بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ غیر پر نظر نہ پڑے، مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت بیان فرمائی ہے، کہ:-

"ایک شخص ایک عورت کے پیچھے پیچھے چلا، اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے، کہنے لگا میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں، اُس نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آرہی ہے، وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہوسناک تو تھا ہی فوراً پیچھے لوٹا، جب لوٹنے لگا تو اس عورت نے ایک دھول رسید کیا، اور ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیان و دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر — نیست ایں دعوائے عشق اے بے ہنر

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیر پر کیوں نگاہ کی، یہ کیسی محبت ہے کہ دعویٰ خدا کی محبت کا، اور تعلق دوسروں سے۔"

عشق مجازی کی حقیقت

اس حکایت کے سلسلہ میں عشق مجازی کی حقیقت ذرا کان کھول کر سُن لینی چاہئے۔ کیونکہ تصوف کو بدنام کرنے والے بہت سے جاہل ہوسناکوں نے اس کو اپنی ہوس رانی کا پردہ بنانا چاہا ہے، حدیث میں ہے، کہ:-

من عشق فعف وکتم فمات مات شھیداً۔	یعنی جو شخص کسی پر (بلا اختیار) عاشق ہو جائے پھر عفیف رہے، اور پوشیدہ رکھے پھر مر جائے تو وہ شہید مرے گا۔

"اس حدیث میں دو مسئلے ہیں۔ پہلا یہ کہ عشق غیر اختیاری مطلق مذموم نہیں (جیسا کہ بعض خشک مزاج اس کو عیوب میں شمار کرتے اور عاشق کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ اور مذموم کیسے ہو سکتا ہے جبکہ شہادت تک

پہونچاتا ہے، اور اسی وجہ سے بعض اہلِ طریق اس کی مدح کرتے اور وصول الی المقصود کے اسباب میں کہتے ہیں:"

عارف جامی فرماتے ہیں ؎

متاب از عشق او گرچہ مجازی است
کہ آں بہرِ حقیقت کارسازی است

اور عارف رومی فرماتے ہیں ؎

عاشقی گرزین سر و گرزان سرست
عاقبت مارا بدان شہ رہبرست

" دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس عشق کے محمود و موصل الی المقصود ہونے کی شرط یہ ہے کہ معشوق مجازی کی طرف قطعاً التفات نہ ہو، نہ اس کی طرف نظر کرے، نہ اس کا کلام سنے حتیٰ کہ اس کی طرف قلب سے بھی توجہ نہ کرے (یعنی دل میں بھی تصور نہ لائے) اور یہی مراد ہے جامی کے قول سے جو شعر بالا سے متصل ہی ہے:- ؎

ولے باید کہ بر صورت نمانی
وزیں پل زود خود را بگذرانی

اسی طرح عارف رومی کا قول شعر بالا کے تھوڑی دور بعد ہے۔ ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

اور راز اس میں یہ ہے کہ مقصود حقیقی تک پہونچنے کی بڑی شرط ماسوا سے قطع تعلق کرنا ہے، اور عشق بجز محبوب کے سب تعلقات کو قوت کے ساتھ قطع کر دیتا ہے، جیسا کہ عارف رومی فرماتے ہیں۔ ؎

عشق آں شعلہ ست چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تو محبوب مجازی کا ماسوا تو اس عشق مجازی سے فنا ہو گیا، پھر جب اپنے نفس کو اس محبوب مجازی سے بالکل الگ کر کے مراقبات و اذکار سے ہمہ تن محبوب حقیقی کی طرف توجہ کر کے اس کے قریب کر دیا، پس تعلقات رخصت ہو گئے اور صرف واحد محبوب حقیقی باقی رہ گیا، جیسا کہ شعر بالا کے بعد ہی مولانا رومی فرماتے ہیں۔ ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند — در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ سوخت — مرحبا اے عشق شرکت سوز سوخت

عشق مجازی کو حقیقی میں مبدل کرنے یا اس کو عشق حقیقی کا ذریعہ بنانے کے لئے جو شرائط ہیں اُن کی تفصیل التکشف میں فرمائی ہے کہ اگر اتفاقاً و بلا قصد عشق مجازی میں مبتلا ہو جائے۔

"تو اول عفت و پارسائی اختیار کرے، کوئی امر خلاف شرع نہ کرے، نہ قصداً اس کو دیکھے، نہ اس سے باتیں کرے، نہ اس کی باتیں کرے، نہ دل میں قصداً اس کا خیال کرے، کیونکہ مخالفت شرع عشق حقیقی کے منافی ہے اور منافی کے ہوتے کب اُمید ہے کہ عشق حقیقی حاصل ہو۔ دوسرے اس سے ایسی دوری اختیار کرے کہ اتفاقاً بھی اس پر نظر نہ پڑے، نہ آواز کان میں پہونچے، تاکہ قلب میں سوز و گداز پیدا ہو۔ تیسرے خلوت و جلوت میں یہ سوچا کرے کہ اس کا کمال یا حُسن و جمال کہاں سے آیا، اور کس نے عطا کیا، جب موصوف مجازی کی یہ دلربائی ہے تو موصوف حقیقی کی کیا شان ہو گی:- ؎

چہ باشد آں نگار خود
کہ بہ بندد ایں نگار ہا

"اس سے اس کا عشق مجازی مخلوق سے خالق کی طرف مائل ہو جائے گا یہی معنی ہیں اس قول کے کہ شیخ کامل عشق مجازی کا ازالہ (یعنی اسکو فنا)

نہیں کرتا، بلکہ امالہ (یعنی معشوق حقیقی کی طرف مائل) کر دیتا ہے، جس طرح انجن گرم ہو مگر الٹا چلتا ہو، تو قطع مسافت کرنے والے کو مناسب نہیں کہ اس کو بُجھا دے، بلکہ اس کی کل پھیر کر سیدھا چلا دے۔

اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو قصداً عشق مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس سے حلال عشق مراد ہے (مثلاً بی بی سے) نہ کہ حرام، کیونکہ معصیت تو موصل الی اللہ ہو ہی نہیں سکتی، اور جو اس مشورہ سے غرض ہے، وہ عشق حلال سے بھی حاصل ہے، کیونکہ عشق میں گو وہ مجازی ہو، یہ خاصیت ضرور ہے کہ اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسروں کے تعلقات قلب سے دفع ہو جاتے ہیں، اور خیال میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے، اب صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اس تعلق کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے تو بہت آسانی سے قلب خالی ہو جاتا ہے۔

"جیسے گھر میں جھاڑو دے کر سب خس و خاشاک ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں، پھر کسی ٹوکرے میں اٹھا کر باہر ایک دم پھینک دیتے ہیں، اگر ایک ایک تنکا اُٹھا اُٹھا کر پھینکا جائے طویل مدت صرف ہو، پھر بھی اس قدر صفائی نہ ہو، غرض مقصود اصلی ترک تعلقات یا قلب میں رقت سوز و گداز پیدا کرنا ہے، جو اگر اور طریقہ سے حاصل ہو جائے تو بھی کافی ہے۔"

اور آج کل خصوصاً اور طریقے ہی مناسب ہیں۔

"چونکہ اس زمانہ میں اس طریق کے اندر خطرہ شدید ہے کیونکہ نفوس میں شہوت پرستی و لذت جوئی زیادہ ہے، اس لئے قصداً ایسے طریق کا بتلانا جائز نہیں، ہاں اگر اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو بطریق مذکور اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف کر دینا چاہیئے۔" (کشف جلد سوم صفحہ ۶۹۵)

لیکن یہ پھر ایک مرتبہ سُن لینا اور خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ اس اصطلاحی محبت یا جملہ سوز اور "شرکت سوز" عشق کی گرمی۔

"حاصل اس طرح ہوتی ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے، اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے۔ اور یہی وہ چیز ہے، جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے، نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے، نہ مؤرخ۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، اس کے سوا بھی اکثر ایسے کام ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اگر کوئی ساری خوان نعمت حفظ کرلے، مگر جب تک کسی کامل اُستاد کے پاس نہ رہے باورچی گری نہیں آسکتی۔ اسی طرح اگر کوئی کتاب دیکھ کر کرتے، اچکن وغیرہ کی کاٹ ازبر کرلے، تو اس کو درزی کا کام نہیں آسکتا۔ تصوف کے سینہ بہ سینہ ہونے کے یہی معنی ہیں، نہ یہ کہ مسئلے سینہ بہ سینہ ہیں، کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں موجود ہیں بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔"[1]

باطنیت

تصوف کی باطنیت یا سینہ بہ سینہ ہونے کی شہرت تصوف کے دوستوں اور دشمنوں سب کے لئے بڑے فتنہ کا سامان رہی ہے۔ جاہل غیر محقق نام نہاد صوفیوں کے لئے تو اس کی بدولت الحاد و اباحت تک کا راستہ صاف ہو گیا۔ جس ہوا و ہوس کی ظاہر کتاب و سنت میں گنجائش نہ دیکھی اُس کو باطن کا علم یا سینہ بہ سینہ راز بتا دیا۔ دوسری طرف علمائے ظاہر ایسی باتوں سے متوحش ہو کر سرے سے تصوف ہی کے منکر و دشمن ہو گئے۔ حالانکہ اس کو علم باطن کہنے کے اصلی و صحیح معنی وہی تھے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی کہ اس علم کا خاص تعلق یا خاص

---

[1] الرفیق صہ ۱۲

موضوع بحث قالب وظاہر کے بجائے قلب و باطن کے احکام، اس کے امراض، اور اُن امراض کا معالجہ ہے۔ اور جو شریعت کا اسی طرح ایک حصّہ ہے جس طرح فقہ ظاہر و جوارح کے احکام کا۔ اور جس طرح فقہ کے ظاہری احکام تمامتر کتاب وسنّت ہی میں منصوص یا اسی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح تصوّف کے باطنی احکام بھی بالکلیہ قرآن وحدیث ہی کے منصوصات یا ان ہی پر مبنی ہیں۔

اخفاء کی وجہ باقی کچھ چیزیں تو ہر علم وفن ہی میں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا تعلق یا تو ذاتی تجربے سے ہوتا ہے، اس لئے وہ بغیر اس تجربہ سے گذرے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتیں، اور اندھے کے حق میں کھیر ٹیڑھی بن جاتی ہے، اس لئے اُن کی تعبیر بجائے تفہیم کے اُلٹے غلط فہمی کا موجب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ عام ذوقیات و وجدانیات یا صوفیانہ کیفیات و مکاشفات وغیرہ کا حال ہے۔ پھر یہ بھی تجربے ہی کی بات ہے کہ ان کے اظہار سے اکثر اپنا باطنی نقصان بھی ہوتا ہے، اس لئے بھی ان کا اخفا ضروری ہے۔

"تصوّف کے اجزاء بہت سے ہیں منجملہ ان کے احوال بھی ہیں، ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں خدا کے ساتھ جن کے ظاہر کرنے سے اپنا باطنی نقصان ہوتا ہے نیز ایک جزء اس میں علم مکاشفہ و اسرار بھی ہیں، ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے، اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والوں کو ہو جاتی ہیں جن سے اُن کا بہت نقصان ہوتا ہے، اگر کسی شخص نے کبھی آم نہ کھایا ہو اور اس کے سامنے آم کی کیفیت بیان کی جائے تو کیسی ہی جامع حقیقت بیان کرو لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی، اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو ما شوی بدانی

اور وجہ یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتے ہیں، اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔"[1]

---

[1] ازفوز ص ۲۵۔

اسی طرح ایک ملفوظ میں ارشاد ہے، کہ:۔

"اپنے حالات واسرار پر کسی کو مطلع نہ کرنا چاہئے، اگرچہ کوئی کتنا ہی مخلص دوست ہو، ایسا کون ہوگا کہ اپنی بی بی کو کسی دوست کی بغل میں دینا گوارا کرے" (اشرف المسائل صنہ)

ایک اور وجہ یہ تو وجدانیات وذوقیات کے اخفاء کی وجہ تھی۔ علاوہ بریں بعض باتیں ہر علم وفن کی ایسی پیچیدہ ودقیق ہوتی ہیں کہ ہر کس وناکس ان کے فہم کی استعداد نہیں رکھتا۔

مولانا روم ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں ؎

نکتہا چوں تیغ پولاد ست تیز گر نہ داری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا کز بریدن تیغ را نبود حیا

اور اسی واسطے ابن العربی نے کہا کہ یحرم النظر فی کتبنا کہ ہماری کتابوں کا دیکھنا حرام ہے۔ رہا یہ شبہ کہ جب کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا کیوں، تو انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے جلیسوں کے لئے لکھا ہے۔

بعض اور مصالح اس کے علاوہ بعض ضمنی مصالح ومنافع کی بنا پر بھی تصوف کی تعلیم میں کچھ اخفاء سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر شخص کو اس کی خاص حالت واستعداد کے موافق اس تعلیم سے نفع ہوتا ہے۔ دوسرا اگر اس کی ریس کرنے لگے تو اُلٹے ضرر کا اندیشہ ہے، یا اسی طرح اخفاء وخلوت کے اہتمام کے ساتھ جو بات کہی جائے، تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

"چنانچہ جو محقق ہیں وہ دماغی قوت اور فرصت کو دیکھ کر تعلیم کرتے ہیں اور سب کو الگ الگ بتلاتے ہیں اور اسی وجہ سے تصوف کی تعلیم مخفی ہے کہ ہر ایک کا حال جدا ہے، تو علانیہ تعلیم میں احتمال ہے کہ ایک طالب براہ ہوس دوسرے کی تعلیم پر بلا اجازت عمل کرنے لگے یہ وجہ ہے مخفی تعلیم کی، نہ اس وجہ سے جو کہ مشہور ہے کہ تصوف کے مسائل

سینہ بہ سینہ علاوہ شریعت کے چلے آتے ہیں، دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ خلوت کی بات خصوصیت کی سمجھی جاتی ہے اور اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے[1]۔"

غرض کسی بات کا کسی مصلحت سے اخفا، نہ فی نفسہ کوئی جرم و گناہ ہے، اور نہ صرف تصوف کے ساتھ خاص کہ اس کی وجہ سے اس سے توحش جائز ہو۔ رہا جاہل یا نفس پرست نام کے صوفیوں کا اس سے ناجائز کام لینا سو وہ بھی تصوف کے ساتھ خاص نہیں، جہلا اور اہل غرض ظاہر شریعت میں کب اس سے باز رہتے ہیں۔ باقی مخلص و متقی محققین یا اُن کے مقلدین کے لئے جب کتاب و سنت کی کسوٹی الحمد اللہ موجود ہے تو وہ کھوٹے کھرے کی تمیز ہر وقت کر سکتے ہیں۔

اور حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی تجدید و تحقیق کا یہ معیار تو اس درجہ بلند تھا کہ تصوف کی مقبول سے مقبول تعلیم کو بھی جہاں اس معیار سے گری یا مشکوک ہوئی تو بے تکلف ترک فرما دیتے تھے، یا اگر خود گنجائش بھی نظر آتی، مگر طالب کے شک میں پڑ جانے کی وجہ سے اس کو خلجان ہونے کا اندیشہ ہوتا، تو اس کو ترک ہی کا مشورہ دیتے۔ اسم ذات کا ذکر صوفیہ کے سارے سلاسل میں کیسا مقبول و مسلّم ہے۔ خود احقر کو پہلے اس میں شک ہوا کہ خالی اللہ اللہ کے ذکر کی کوئی اصل و سند نہیں معلوم ہوتی، پھر خیال ہوا "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" اور "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى" وغیرہ سے ذکر اسم ذات بھی مراد ہو سکتا ہے۔ تاہم حدیث میں ہر موقع اور ہر قسم کے اذکار کی تعلیم پائی جانے کے باوجود اسم ذات کی تعلیم نہ ہونا یا صحابہ میں اس کا کوئی اثر تک نہ ملنا سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر اس بارے میں حضرت سے مکاتبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ احقر کو اس سے بالکلیہ منع فرما دیا، اور خود حضرات صوفیہ کی تعلیم میں اس کے رواج عام کا منشا نفس ذکری حیثیت کو نہیں بلکہ مشق و تمرین کی حیثیت کو قرار دیا۔

اسی طرح ذکر جہر و ضرب کی تعلیم بھی حضرات صوفیہ کے ہاں کتنی عام ہے، اس کی نسبت

---

[1] التقویٰ صفحہ ۱۲۔

قصد السبیل ہی میں بقدر ضرورت اجازت کے ساتھ تنبیہ فرمائی ہے کہ:۔

"یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا خود کوئی ثواب کی بات نہیں، ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے"۔

ایک اور بڑی تنبیہ کی بات اس سلسلہ میں اس عام وعامیانہ خیال کا ازالہ تھا کہ علم باطن علم ظاہر یا شریعت سے افضل ہے، جیسا کہ مثلاً ان اشعار سے شبہ ہوتا ہے۔ ؎

آں پسر را کش خضر ببرید حلق ۔ سر آں را در نیابد عام خلق

گر خضر در بحر کشتی را شکست ۔ صد درستی در شکست خضر ہست

وہم موسیٰ با ہمہ نور و ہنر ۔ شد ازاں محجوب تو بے پر مپر

حالانکہ یہاں مقصود فقط اتنا ہے کہ بہت سی باتوں کی مصلحت و حکمت مخفی ہوتی ہے، ہر شخص خصوصاً عوام کی سمجھ میں نہیں آتی، لہٰذا بزرگوں کی ایسی باتوں پر اعتراض میں عجلت و مبادرت خواص کو بھی زیبا نہیں، صبر و تحقیق سے کام لینا ضروری ہے۔ غرض۔

"اس میں تائید ہے ترک اعتراض کی، یعنی دیکھو ظاہر میں خضر (علیہ السلام) نے کشتی کو توڑا تھا مگر واقع میں اس کی حفاظت تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا خیال باوجود تمام تر علم و معرفت و کمال نبوت کے اس کی وجہ معلوم کرنے سے محجوب ہا سو تم بے پر مت اڑو"۔

"اس قصہ سے بعضوں کو شبہ ہو گیا کہ علم باطن علم شریعت سے افضل ہے اسی وجہ سے موسیٰ (علیہ السلام) کو خضر (علیہ السلام) کے پاس استفادہ کے لئے بھیجا گیا، نیز اس سے مستنبط کیا کہ اگر شیخ خلاف شرع کچھ حکم کرے تو مرید کو اس کا اتباع واجب ہے"۔

"سو خوب سمجھ لو کہ یہ سب دعوے باطل ہیں، علم باطن کا حکم شرع سے افضل ہونا اس قصہ سے ثابت نہیں ہوتا، دو وجہ سے، اوّل یہ کہ علم باطن خود ایک شعبہ ہے علم شریعت ہی کا۔ اصلاح ظاہر کے حکم کو فقہ کہتے ہیں،

اور اصلاح باطن کے حکم کو تصوف۔ سو جز اکس طرح کل سے افضل ہو سکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں خضر (علیہ السلام) کو جو بعض امور بعیدہ و مخفیہ کی اطلاع ہوگئی تھی، یہ سرے سے علم باطن ہی نہیں جسمیں گفتگو ہے، بلکہ چند واقعات جزئیہ و حالات کونیہ ہیں جن کا انکشاف انکو ہوگیا تھا۔

"جس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ جو چیزیں زماناً یا مکاناً بعید تھیں، وہ اُن کے علم میں قریب ہوگئیں۔ سو دور کی چیز کا نزدیک معلوم ہو نا علم باطن نہیں۔ بخلاف علم موسیٰ (علیہ السلام) کے، کہ وہ علوم شرعیہ کلیہ و معارف الٰہیہ ہیں، کہ ظاہر و باطن سب ان کے شعبے ہیں۔ غرض علم خضری کسی طرح علم موسوی سے فائق نہیں۔ جیسے کسی بڑے کامل کو یہ خبر نہ ہو کہ پس دیوار کیا ہے، سو اس واقعہ کا جاننے والا کسی طرح اس کامل سے نہیں بڑھ سکتا۔"

"اور جو مسئلہ (پیر کی علی الاطلاق وجوب اطاعت کا) استنباط کیا ہے وہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) کو خضر (علیہ السلام) کا کامل ہونا خود اللہ تعالیٰ کی شہادت سے معلوم ہوگیا تھا تو یقیناً یہ بھی معلوم تھا کہ اُن سے کوئی امر خلاف شرع نہ ہوگا۔ گو اس کی وجہ نہ سمجھنے سے انکار فرمایا ورنہ سکوت و تسلیم کی گنجائش تھی، باقی جو شخص خلاف شرع ہو یا دوسرے کو ایسا امر بتلائے، اس کا کامل ہونا ہی مشکوک ہو جاوے گا۔"

"پھر خضر (علیہ السلام) شریعت موسویہ کے اتباع کے مکلف نہ تھے ان کی شریعت کچھ اور تھی۔ بہ خلاف اس وقت کے کہ سب ایک ہی شریعت کے مکلف ہیں، اب خلاف کرنے والے کا اتباع جائز نہیں پس معلوم ہوا کہ یہ سب دعوے سرتاسر غلط ہیں۔ اور اس مقام پر مولانا روم کا مقصود علم خضری کو علم موسوی پر فضیلت دینا نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب بعض اکابر کو بعض چھوٹے اسرار پر اطلاع نہیں ہوتی، تو تم چھوٹے ہو کر

بڑوں کے اسرار کا انکار کیوں کرتے ہو۔[1]"

اشد فتنہ لیکن اس باطنیت کی راہ سے جو فتنہ سب سے اشد تصوف میں داخل ہو گیا وہ قرآن کے ظاہری و باطنی معنیٰ و تفسیر کا ہے۔ اس کی حقیقت پوری توجہ سے معلوم کر لینا چاہئے۔

"اکثر صوفیاء کرام کے کلام میں بعض آیتوں کا خلاف ظاہر معانی پر محمول ہونا پایا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر ناظرین کو دو غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض تو یوں اعتقاد کر لیتے ہیں کہ قرآن شریف کی تفسیر یہی ہے، اور علمائے ظاہر کی تفسیر غلط ہے، یہ اعتقاد بالکل باطل اور زنادقہ کا شعار ہے جس سے ساری شریعت ناقابلِ اعتبار اور منہدم ہو جاتی ہے، اور بعض لوگ ان حضرات پر طعن کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے قرآن میں تحریف کر دی اور تفسیر بالرائے کرتے ہیں، اس لئے اس کی تحقیق ضروری ہے۔"

"اصل قرآن کی تفسیر تو وہی ہے جو علمائے مفسرین نے لکھی ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو مضمون قرآن کا مقصود یا مدلول ہے اس کے مشابہ کوئی ایسا مضمون ہوتا ہے کہ مدلول قرآنی سے ذہن اس مشابہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسا زید و عمر میں مناسبت ہو، اور زید کے بیان میں عمر و یاد آجائے۔ اس انتقال ذہن کی وجہ سے جو مضمون قرآن کا اصل مدلول ہے اس پر مشابہ کا قیاس کر کے اس کے لئے بھی وہی حکم جو مدلول قرآنی کا ہے ثابت کرنے لگتے ہیں، لیکن اس سے مقصود صوفیہ کا اس مشابہ مضمون کو خود نص میں داخل کر دینا نہیں ہوتا، بلکہ محض قیاس و تمثیل کا قصد ہوتا ہے۔

"مثلاً (طَهِّرَا بَيْتِيَ) کا اصل مقصود و مدلول تطہیر کعبہ ہے جس سے

---

[1] التکشف جلد سوم مسائل مثنوی ص ۱۵ و ۱۶۔

ذہن منتقل ہو گیا کہ انسان میں بھی ایک چیز کعبہ کے مشابہ ہے، اور وہ قلب ہے، کیونکہ جس طرح کعبہ پر انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں، قلب پر بھی فائض ہوتے ہیں (یا جس طرح کعبہ بیت اللہ ہے اُسی طرح قلب المومن عرش اللہ ہے۔ راقم ہذا) اس سے قیاس کیا کہ جس طرح کعبہ کی تطہیر ضروری ہے، اسی طرح قلب جو موردِ تجلیاتِ الٰہی ہے، اس کا پاک رکھنا بھی ضروری ہے۔"

"اس کو علم اعتبار کہتے ہیں، جس کی اجازت فاعتبروا یا اولی الابصار میں موجود ہے، اور تمام فقہا و محدثین احکام میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر کوئی اس معنی میں مقیس (مشابہ) کو مجازاً مدلول نص کہہ دے بایں معنی کہ قیاس مظہر ہے نہ مثبت، تو اس میں کوئی بات قابلِ مواخذہ نہیں۔ ساری خرابی غلو کی ہے۔" چنانچہ:-

"بعض نے جو یہ تکلف کیا ہے کہ ہر آیت کا ایک ظہر اور ایک بطن ہے یہ نہایت بعید ہے، کیونکہ ظہر و بطن دونوں کا اس آیت میں احتمال (گنجائش) ہونا ضروری ہے۔ اور ایسے نکات و اعتبارات وغیرہ (جو ہر آیت میں نکالے جائیں) یقیناً آیت میں محتمل نہیں ہوتے، جیسا کہ ماہرین قواعد شرعیہ و عربیہ پر مخفی نہیں، اس لئے ان کو بطن قرآن کہنا نہایت مستنکر ہے۔ بلکہ بطن سے (اصل میں) مراد وہ دقیق معانی اور خاص استنباطات ہیں جن کو حضرات مجتہدین سمجھے ہیں اور جس کی تفصیل اہل اصول نے وجوہ و دلالات میں لکھی ہے اور ان بطون میں مراتب مختلف ہیں۔ بعض عوام نہیں سمجھتے، علماء و متوسطین سمجھ جاتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو علمائے راسخین و مجتہدین سمجھتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو صرف انبیاء (علیہ السلام) سمجھتے ہیں۔" وفوق کل ذی علم علیم۔

(باقی آئندہ)

انبیاء کا طریق دعوت و اصلاح

(۳)

یہ ایمان انسان کی امانت اس کی پاکیزگی اور شرافت کا محافظ تھا خلوت و جلوت میں جہاں کوئی آنکھ دیکھتی نہ تھی اور ایسی جگہ جہاں آدمی کا پورا اقتدار اور دباؤ ہوتا اور کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہ ہوتی، یہ ایمان نفس کی ترغیبات اور خواہشات پر پورا قابو رکھتا۔ اسلام کی تاریخ فتوحات میں غنیمت کے مال میں دیانت و ادائیگی امانت اور اخلاص کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیریں نہیں مل سکتیں، یہ صرف ایمان راسخ اور اللہ کے دھیان اور ہر موقع و محل پر اس کے علم کے استحضار کے نتائج تھے؟۔

تاریخ طبری بیان کرتی ہے کہ مسلمان جب مدائن پہنچے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا لوگوں نے کہا اس قدر قیمتی مال غنیمت ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا ہمارے پاس جو مال ہے اس کو اس سے کچھ نسبت نہیں، ان لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں یہ لاتا بھی نہیں ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ معمولی شخص نہیں، انھوں نے پوچھا تم ہو کون؟ اس نے کہا خدا کی قسم تم کو میں یہ نہیں بتا سکتا اس لیے کہ تم تعریف کرو گے اور کسی اور کو بھی نہیں بتا سکتا کیونکہ وہ بھی کچھ نہ کچھ کہے گا۔ میں تو اللہ کی تعریف بیان کرتا ہوں اور اس کے ثواب پر راضی ہوں۔ جب یہ چلا تو لوگوں نے ایک آدمی پیچھے کر دیا کہ معلوم کرے کون ہے تو معلوم ہوا کہ عامر بن عبد قیس تھا

توحید کے عقیدے نے ان کا سر اونچا اور گردن فراز کر دی تھی کیا مجال تھی کہ غیر اللہ کے سامنے یا جابر بادشاہ کے آگے یا زبردست عالم درویش یا دینی یا دنیوی سردار کے سامنے خم ہو اس ایمان نے ان کے دل و نظر کو خدائے تعالیٰ کی بڑائی اور اس کی عظمت سے معمور کر دیا تھا، مخلوقات کا حسن

جمال دنیا کی دل فریبیاں، شان و شوکت کے مظاہر ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ وہ جب ملوک و سلاطین اور ان کے جاہ و حشم، کروفر اور ان کے درباروں کی سجاوٹ اور زیب و زینت پر نظر ڈالتے اور یہ دیکھتے کہ یہ سلاطین اسی میں خوش ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ چند بے جان مجسمے یا مٹی کی مورتیں ہیں۔ جن کو شاہانی لباس سے آراستہ کردیا گیا ہو۔

ابو موسیٰ کہتے ہیں جب ہم نجاشی کے پاس پہونچے وہ مجلس میں بیٹھا تھا، دائیں جانب عمرو بن العاص بائیں جانب عمارہ تھے۔ مذہبی پیشوا دو رویہ بیٹھے تھے عمرو اور عمارہ نے بادشاہ سے کہا کہ یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے، ہم لوگ پہنچے فوراً پادریوں نے کہا کہ بادشاہ کا سجدہ کرو۔ حضرت جعفر نے برجستہ جواب دیا کہ ہم صرف خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔

حضرت سعد نے رستم کے پاس جو کہ ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ربعی بن عامر کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا، ربعی بن عامر پہونچے تو دربار فرش و فروش سے آراستہ تھا رستم یاقوت اور بیش بہا موتی زیب بدن کئے لباس بیش قیمت تاج سر پر رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا ربعی بن عامر پھٹے پرانے لباس میں پہونچے۔ مختصر سی ڈھال چھوٹا سا گھوڑا یہ ان کی حیثیت تھی وہ گھوڑے پر سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اُترے قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑا باندھ دیا اور خود رستم کے پاس جانے لگے آلات حرب ساتھ تھے، سر پر خود جسم پر زرہ بھی موجود تھی لوگ بولے جنگی لباس تو اتار دو کہنے لگے میں خود سے نہیں آیا مجھے بلایا گیا ہو اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس ہوا جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ آنے دو وہ اسی فرش پر نیزے سے سہارا لیتے ہوئے بڑھے نیزے کی نوک نے فرش کو جابجا سے کاٹ دیا لوگ بولے تمہارا کیسے آنا ہوا بولے، ہم کو اللہ نے اس لیے بھیجا ہو کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں داخل کردیں اور دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عادل کے سایہ تلے لے آئیں۔

آخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی دلیری بھر دی تھی۔ جو بالکل خارق عادت تھی ان میں جنت کا عجیب و غریب شوق زندگی کی تحقیر پیدا کردی تھی، جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کھنچ جاتا تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں وہ اس طرح جنت کی جانب لپکتے تھے جیسے نامہ بر کبوتر اپنی اڑان میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہونچ کر دم لیتا ہو۔

معرکہ احد میں جب کہ بہت سے سلمان میدان چھوڑ چکے تھے حضرت انس بن نضر بڑھے انھوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے کہ اے سعد بن معاذ خدا کی قسم جنت کی خوشبو پہاڑ احد کے اسی طرف سے آرہی ہے انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے اسّی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے زخم تھے۔ ہم نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کا مثلہ کیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے جنھوں نے ان کو پوروں سے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا۔

بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہیں تو عمیر بن حمام انصاری نے کہا یا رسول اللہ اس کی وسعت زمین و آسمان؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا آپ نے فرمایا ہاں ہاں پاؤ گے وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے پھر بولے اگر ان کھجوروں کے کھالینے کا انتظار کروں گا تو بہت ساوقت لگے گا پھر تمام کھجور الگ پھینکے اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔

ابوبکر بن ابوموسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے باپ دشمن کے مقابل تھے اور فرمارہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں یہ سُن کر ایک شخص اٹھا اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اس نے کہا ابوموسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے انھوں نے جواب دیا ہاں، وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور اس نے کہا السلام قبول ہو اور تلوار کا پر تلا توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لیکر دشمن کے مقابلہ میں آگیا اور شہادت پائی۔

عمرو بن جموح کے چار بیٹے تھے اور ان کے خود کے پیر میں لنگ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں تشریف لے جاتے تو وہ بیٹے آپ کے ہمراہ جاتے جب آپ غزوۂ احد کے لیے تشریف لے جانے لگے تو عمرو بھی ساتھ ہونے لگے ان کے بیٹوں نے سمجھایا کہ آپ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے آپ اگر تشریف نہ لے جائیں تو زیادہ اچھا ہے اور ہم تو آپ کی طرف سے کافی ہیں ہی اللہ نے جہاد آپ پر سے ساقط کردیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرے بیٹے مجھکو آپ کے ہمراہ نکلنے سے روکتے ہیں اور بخدا میری یہ تمنا ہے کہ میں اپنے اس لنگ سے جنت میں چلوں پھروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو جہاد سے معاف فرمادیا ہے اور انکے بیٹوں سے فرمایا کہ جانے کیوں نہیں دیتے شاید اللہ شہادت نصیب فرمادے وہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ کے لیے نکلے اور شہادت پائی

شداد بن ہاد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ایمان لایا اور آپ کی اتباع کرلی اور کہا کہ میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا۔ آپ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا خیبر کا معرکہ پیش آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا اس میں اعرابی کا بھی حصّہ لگا کر صحابہ کے سپرد فرمایا یہ اعرابی سب کے جانور چرایا کرتا تھا جب لوٹ کر آیا تو لوگوں نے اس کا حصّہ اس کے حوالہ کردیا اس نے کہا یہ کیا؟ لوگوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمھارا حصّہ لگایا تھا اس نے لے لیا اور لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا اور کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تمھارا حصّہ ہے میں نے لگایا تھا وہ بولا میں نے آپ کی اتباع اس لیے نہیں کی تھی میں نے اتباع اس لیے کی تھی کہ اس جگہ تیر لگے اور اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا تاکہ میں جنت جاسکوں آپ نے فرمایا اگر خدا سے تیرا معاملہ سچا ہے تو خدا ابھی تیری یہ آرزو پوری کردے گا۔ جب جنگ ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا اور اس اعرابی کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس کو مقتول پایا۔ آپ نے پوچھا کیا یہ وہی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ہاں آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ سچا تھا۔ اللہ نے بھی اس کو سچا کردیا۔

یہ تمام لوگ اعمال و اخلاق میں طرز و طریق میں اخذ و ترک میں سیاست و اجتماع میں اس ایمان سے پہلے پراگندہ تھے کسی طاقت کے سامنے سر تسلیم نہ خم کرتے اور نہ کسی ضابطۂ حیات کا اعتراف کرتے اور نہ کسی نظام زندگی سے منسلک تھے وہ خواہشات کے تابع تھے بغیر سمجھے بوجھے عمل کرتے گمراہیوں میں بھٹکتے پھرتے اب وہ ایمان اور بندگی کے دائرہ میں اس طرح داخل ہو گئے تھے کہ ان کے لیے اس سے باہر آنا مشکل ہو گیا تھا انھوں نے اللہ کی شہنشاہیت اقتدار اور اس کے اجازت و منع کو تسلیم کیا تھا اور اپنے کو رعایا بندہ اور مطیع مطلق مان لیا تھا اور اس کو اپنی قیادت حوالہ کردی تھی۔ قانون الٰہی کو بے چون و چرا تسلیم کرلیا تھا خواہشات اور خودسری سے دستبردار ہو گئے تھے وہ ایسے غلام بن گئے تھے جو نہ اپنے مال کا مالک ہے نہ اپنی جان کا جو مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کرسکتا ہے ان لوگوں کی صلح و جنگ، دشمنی و دوستی، خوشی، ناراضگی، عطا و محرومی اور صلہ و قطع رحمی سب اللہ کے حکم کے تابع بن گئی تھی جو کچھ بھی کرتے اس کے حکم کے موافق کرتے چونکہ جس زبان میں اللہ کی کتاب کا نزول ہوا تھا

اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرماتے وہ اس زبان پر عبور رکھتے تھے وہ لوگ جاہلیت سے خوب نا واقف تھے اس میں پلے اور بڑھے تھے اس وجہ سے اسلام کا مطلب خوب سمجھتے تھے ان کو یہ خوب معلوم تھا کہ اسلام نام ہی ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف ایک سلطنت سے دوسری سلطنت کی طرف اور ایک حکومت سے دوسری حکومت کی طرف منتقل ہونے کا۔ ایک طرف بندوں کا راج یا صرف نراج ہی دوسری طرف خدا کی حکومت ہی کل تک خدا سے جنگ تھی اور اس کے قانون سے کشمکش اب مکمل اطاعت و سپردگی اور دائمی صلح و آشتی ہی کل تک صرف خودی تھی اب صرف خدا کی بندگی، جب اسلام کو اختیار کر لیا تو اب خود رائی اور خودسری کا کوئی کام نہیں اب حکم خداوندی سے سرتابی اور قانون الٰہی سے بغاوت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا کے حکم کے بعد اختیار باقی نہیں ہی۔ رسول سے مخالفت اور اس سے حجت و بحث کا کوئی موقع نہیں۔ نہ غیر اللہ کے سامنے مقدمہ جا سکتا ہی اور نہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ ہو سکتا ہی نہ دین کے مقابلہ میں رسم و رواج کی پابندی ہو سکتی ہی۔ نہ نفس پرستی باقی رہ سکتی ہی۔ جب وہ اسلام لائے تو انھوں نے جاہلی زندگی کو اس کے تمام خصوصیات عادات اور رسوم کے ساتھ ترک کر دیا۔ اور اسلام کو اس کے پورے خصوصیات متعلقات اور لوازم کے ساتھ اختیار کیا اس سے ان کی زندگی میں بلا تاخیر مکمل انقلاب رونما ہو گیا۔

فضالہ بن عمیر بن ملوح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے جب فضالہ آپ کے قریب ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون فضالہ؟ —— انھوں نے جواب دیا ہاں فضالہ یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ تم کیا سوچ کر آئے تھے؟ کہنے لگے نہیں کچھ نہیں! اللہ کو یاد کر رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے پھر فرمایا اللہ سے توبہ کرو پھر اپنا دست مبارک ان کے سینے پر رکھا اور ان کا قلب پرسکون ہو گیا، فضالہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا ہاتھ جیسے ہی سینے سے اٹھا آپ مجھکو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے زیادہ کوئی محبوب چیز پیدا ہی نہیں کی فضالہ کہتے ہیں میں گھر لوٹا تو راستہ میں وہ عورت ملی جس سے دل لگی کیا کرتا تھا اس نے کہا آؤ باتیں کریں میں نے کہا کہ اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے انسان کو اللہ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کا صحیح اور یقینی علم عطا کیا تھا

اس عالم کی ابتدا و انتہا اور موت کے بعد انسان کا جس سے سابقہ پڑنے والا ہے اس سب کا علم انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک بے منت و بے مشقت پہونچا تھا انبیاء علیہم السلام نے ایسے علوم بتا ان کی رہنمائی کی جن کے حصول و مبادی بھی ان کو حاصل نہ تھے جن پر یہ انسان اپنی تحقیق کی عمارت قائم کر سکتا، انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے وقت اور قوت کو بچا لیا اور مابعد الطبعیات و مسائل الہیات کی اس لاحاصل تلاش و تحقیق سے بچا لیا جس میں نہ ان کے حواس کام دے سکتے تھے نہ نظر رستہ پا سکتی تھی نہ ان کے پاس اس کے بنیادی معلومات ہی موجود تھے۔

لیکن لوگوں نے اس نعمت کا شکر ادا نہ کیا ایک بے ضرورت مہم اپنے سر لی ان حقائق کی جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کو بے محنت حاصل ہو گئے تھے از سر نو تحقیق شروع کی، اور ان نامعلوم خطوں میں سفر کی ابتداء کی جہاں ان کے ساتھ نہ کوئی رہبر تھا اور نہ کوئی ان راہوں سے باخبر، وہ اس معاملہ میں اس سیاح سے بھی زیادہ گمراہ و پریشان غیر ضروری کام کرنے والے تھے جو انسان کے اس آخری علم سے بھی قانع نہ ہو سکا ہو جو جغرافیہ میں موجود تھا اور نقشہ جات کی شکل میں نسلوں اور صدیوں کی محنتوں کا نتیجہ تھا اور اس نے کوشش کی کہ پہاڑوں کی بلندی سمندروں کی گہرائی پھر سے ناپے اور صحراؤں فاصلوں اور حدود کو باوجود تھوڑی سی عمر رکھنے کے باوجود کم طاقتی بے بضاعتی کے از سر نو جانچے اس آدمی کی محنت کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تھک کر رہ جائے اس کا عزم جواب دے جائے اور وہ شخص صرف چند یادداشتوں اور ناکام اشاروں کا سرمایہ جمع کر سکے۔ اسی طرح جن لوگوں نے الہیات کے میدان میں بغیر بصیرت اور بغیر روشنی کے قدم رکھا ان کو اس علم میں سوائے متضاد آراء، ادھورے معلومات، اتفاقی خیالات اور عجلت کے نظریات کے کچھ ہاتھ نہ لگا خود راہ کھو بیٹھے اور دوسروں کی بھی منزل کھوٹی کی

"دربارِ الٰہی کے آداب"

(از مولانا ظفیر الدین صاحب)

"بعض بزرگوں کے حسب مشورہ اپنی کتاب "نظام مساجد" کا ایک ضروری باب ہدیہ ناظرین ہے، گو علمی لحاظ سے یہ باب اہم نہیں، مگر عملی اعتبار سے سبھوں کے لیے پڑھنے کے لائق ہو، دعا فرمائی جائے کہ یہ کتاب طباعت کی منزل سے گزر کر جلد اہل علم اور شائقین کے ہاتھوں میں پہونچ جائے۔"

اب تک خانہ خدا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے یہ امر بالکل منقح ہو گیا ہو گا کہ اس دربار کی کچھ اور ہی خصوصیت ہو، اور اس کا امتیازی نشان بہت اونچا ہے، تو جس مقدس گھر کی شان و شوکت اور وقعت و عزت کا عند اللہ یہ حال ہو، یقینی طور پر اس کے آداب بھی اسی اعتبار سے بلند ہوں گے، اور ان کا بجالانا بھی اسی قدر ضروری ہو گا۔

دنیا کے معمولی درباروں کا حال آپ کو معلوم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس کے کچھ خاص آداب ہوتے ہیں جس کی بجا آوری ہر اس شخص پر لازم ہوتی ہو جو وہاں آئے، بادشاہ و تخت اور اس کے حکام کے اجلاس کے قوانین منضبط ہوتے ہیں۔ اور ان کی خلاف ورزی کی حالت میں سزائیں متعین ہوتی ہیں خواہ وہ جرمانہ کی سزا ہو یا قید و بند کی۔

دنیاوی حکام کے اجلاسوں کے آداب جسے ہم رات دن اپنی اپنی زندگی میں برتتے ہیں، اس کو سامنے رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اس دربار کی عزت و وقعت کا کیا حال ہو گا جو انسانوں کا نہیں، بلکہ ان کے خالق و مالک کا گھر کہلاتا ہو، جو احکم الحاکمین کے روبرو ہونے کا مقام ہو، اور جو اسی کے آگے سجدہ کرنے کے لیے مخصوص ہو۔

قرآن پاک میں اس گھر کا تذکرہ جس عنوان سے کیا گیا ہو وہ آپ اپنی مثال ہو، اس کی رفعت اور

علو المرتبتی کی بڑی مدح سرائی کی گئی ہو، اس کی صفائی و پاکی کی بار بار تاکید بیان کی گئی ہو اور اس کے آداب کی طرف نمایاں اشارے کیے گئے ہیں، اور رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہایت تفصیل کے ساتھ ایک ایک چیز کو بتایا ہو، اور ساتھ ہی ان احکام کی جو مسجد کے باب میں آئے ہیں خلاف ورزی پر وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

آنے کے آداب

وہ آداب جو مسجد سے متعلق ہیں مختلف شعبوں میں منقسم ہیں، اور پھر ہر ہر شعبہ کے لیے متعدد جزئی احکام ہیں، مثلاً آداب کی تقسیم میں، مسجد آنے کے آداب، مسجد کی صفائی و پاکی کے آداب، مسجد میں بیٹھنے اور ذکر و شغل کے آداب وغیرہ ہیں ان میں سے ہر ایک پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، ضرورت ہو مذہب کے دلدادہ مسلمان ان کو فکر و نظر کے ساتھ پڑھیں، ان کی حکمتوں کو سمجھیں اور پھر ان مسلمانوں کو بتائیں جن کو دنیا نے اپنے دام فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

نیت پاک اور بخیر ہو

ہر چیز کی بنیادی اینٹ نیت ہو "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی حدیث جس پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہو جس کو شرح و بسط کے ساتھ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ مسجد کا ارادہ کرتے ہوئے نیت پاک اور دل صاف ہو، قلب دنیاوی آ[illegible]ہوں سے پاک اور منزہ ہو، نام و نمود، ریا و سمعہ کا چور دل میں چھپا نہ ہو، بلکہ دل محبت مولیٰ سے سرشار اور خشیت الٰہی سے معمور ہو اور ایسا معلوم ہو جو لرزہ براندام کر رہا ہو، اس لیے کہ یہاں ذرا سی چوک سے پونجی کے لٹ جانے کا خوف ہو اور اس سے بڑھ کر اندھے غار میں گر جانے کا اندیشہ۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا، اور نیت صالحہ کو بتایا۔

وذالك انه اذا توضأ فاحسن الوضو	یہ ثواب کی زیادتی اس وقت ہو جب اچھی طرح وضو
ثم خرج الى المسجد لا يخرجه الا الصلوٰة	کرے پھر مسجد کے لیے نکلے، اور فقط نماز ہی کی نیت سے
(بخاری ج ۱ ص ۶۹)	نکل رہا ہو۔

ایک دوسری حدیث میں ہو کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص میری اس مسجد میں کسی خیر کی نیت سے آئے اس کی مثال مجاہد فی سبیل اللہ کی ہو، ورنہ وہ اس شخص جیسا ہو جو دوسرے کی متاع للچائی ہوئی نگاہوں سے تاکا کرتا ہو۔[1]

---

[1] مشکوٰۃ عن ابن ماجہ و البیہقی ص ۱/۱۲

اس حدیث سے مسئلہ صاف ہو جاتا ہو کہ ایسے شخص کو کوئی ثواب میسر نہیں ہوگا، بلکہ اُلٹے دُکھ ہوگا۔

باوضو آئے گھر سے جب چلنے لگے تو پہلے وضو کر لیا جائے کیوں کہ سُنت طریقہ یہی ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جماعت کی نماز میں ثواب کی زیادتی کا ذکر فرمایا ہو وہاں یہ مصرح ہو کہ ثواب کی زیادتی اس وجہ سے ہو کہ وضو کیا اور اچھا وضو کیا اور اس کے بعد خالص نیت سے مسجد روانہ ہوا، اور انہی آداب کے ساتھ چلنے پر درجہ کی بلندی اور گناہ کی معافی کی بشارت ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علی صلاتہ فی بیتہ وفی سوقہ خمسا وعشرین ضعفا وذالک انہ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد لایخرجہ الا الصلوٰۃ لم یخط خطوۃ الارفعت لہ بہا درجۃ وحط عنہ بہا خطیئۃ (بخاری ج۱ صہ۶۹)

مرد کی باجماعت نماز اس کی اس نماز سے جو گھر اور بازار میں پڑھی جائے، پچیس گُنا بڑھی ہوئی ہو، اور وہ زیادتی اس وجہ سے ہو کہ اس نے وضو اس کے حقوق کے ساتھ ادا کیا۔ اور محض نماز ہی کی نیت سے نکلا، اس سلسلہ میں جو قدم اٹھائے گا اس کے بدلہ میں ایک درجہ بلند ہوگا اور اس کا ایک گناہ معاف ہوگا۔

ضرورت بھی ہو کہ دربار خداوندی کے لیے پوری تیاری کے ساتھ چلیں، کپڑے بھی صاف ہوں، بدن اور جسم بھی پاک ہوں اور اعضائے وضو جو وہاں جاکر نمایاں طور پر مصروفِ مناجات اور اظہارِ تذلل میں پیش پیش ہوں گے، صاف ستھرے اور پاکیزہ ہوں۔

دُعا پڑھتے آئے روانہ ہوتے ہوئے زبان پر یہ دُعا ہو، جو دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہو، "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَایَ ھٰذَا اِلَیْكَ فَاِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ بَطَرًا وَّلَا اَشَرًا وَّلَا رِیَاءً وَّلَا سُمْعَةً وَاِنَّمَا خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ وَاَسْأَلُكَ اَنْ تُنْقِذَنِیْ مِنَ النَّارِ وَاَنْ تَغْفِرَلِیْ ذُنُوْبِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ"۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز پڑھنے کے لیے نکلتا ہو اور یہ (اوپر والی) دعا پڑھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتا ہو، جو اس کے لیے فراغت نماز تک دعا کرتے ہیں[۵]۔

ان چند جملوں کی دعا پڑھنے کا کتنا بڑا اجر رکھا گیا ہو، محنت معمولی اور مزدوری اتنی بڑی، اس پر بھی

۵۔ شرح سفر السعادت صہ۳۹۴ و زاد المعاد صہ۱۴۰/۲

ہمارے دل اثر پذیر نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے میں نے اس مسئلہ پر جتنا غور کیا کہ "نظام مساجد" سے متعلق کیا دینی اور دنیوی فائدے ہیں، سچ کہتا ہوں معلوم ہوا یہ اتھاہ سمندر ہے جس کی تہ تک پہونچنا آسان نہیں، کوئی قدم اور کوئی بولی اس سلسلہ کی فائدے سے خالی نہیں۔

اچھی ہیئت میں آئے

روانہ ہوتے ہوئے ایک نظر اپنی ظاہری ہیئت پر بھی ڈال لی جائے، اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ ہم ایک عظیم المرتبت دربار کو جا رہے ہیں، اتنا عظیم المرتبت کہ اسے دنیا کی جنت سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہیں، حدیث او پر گذر چکی ہے جس میں ان کو جنت کا باغ کہا گیا ہے، اس لیے جہاں ہر طرح کی نجاست حقیقی اور حکمی سے پاک ہو کر جانا ضروری ہے ادب یہ بھی ہے کہ ظاہری ہیئت عمدہ سے عمدہ ہو، ایسی عمدہ جو شریعت کی نظر میں خراج تحسین حاصل کر سکے۔

حتی المقدور کپڑے پاک و صاف ہونے کے ساتھ صاف ستھرے ہوں، کرتہ کی آستین پوری ہو، اگر قدرت نے وسعت عطا کی ہے تو خوشبو مل لیں، تاکہ پسینہ وغیرہ کی بو بالکلیہ جاتی رہے اور فرشتوں کو کوئی اذیت نہ پہونچنے پائے ارشاد ربانی ہے یابنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد (اعراف ۳۰) اے آدم کی اولاد! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس زینت پہن لیا کرو۔

اس آیت سے مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ ہیئت مسجد کی حاضری میں حتی الوسع اچھی ہو ابن کثیر وغیرہ کے اقوال اس سلسلہ میں قابل ملاحظہ ہیں۔

باوقار و اطمینان آئے

مسجد آتے ہوئے یہ خیال رہے کہ ہم ایک بڑی عبادت کے لیے بڑے گھر کی طرف جا رہے ہیں، اس لیے رفتار میں پورا وقار، اعتدال، اور سکینت نمایاں ہو، ایسی رفتار ہرگز نہ اختیار کی جائے جس سے دیکھنے والا اہلکا پن محسوس کرے اور عام نظروں میں مضحکہ خیزی کی حد تک پہونچ جائے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ نماز کا ارادہ کرنا بھی نماز ہی کے حکم میں ہے۔ لہذا راستہ چلتے ہوئے لہو و لعب، ہنسی مذاق، اور ناجائز چیزوں پر نظر سے پرہیز کیا جائے۔ اور یہاں بھی حتی الوسع نماز کے خلاف امور سے پورا اجتناب کیا جائے، نگاہ نیچی، دل میں محبت و خشیت، اور امید و بیم کی کیفیت طاری ہو، چہرہ پر تواضع اور تذلل کے آثار ہوں، مگر یہ سب کسی اور کے لیے ہرگز ہرگز نہ ہو، محض رب العالمین کے لیے ہو۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان آیا ہے۔

اذا سمعتم الاقامۃ فامشوا الی الصلوۃ وعلیکم		تم جب اقامت سنو تو نماز کے لیے اس طرح چلو کہ

بالسکینۃ والوقار ولا تسرعوا (بخاری باب سعی الی الصلوٰۃ) — تم پر سکینت و وقار طاری ہو، اور دوڑو مت۔

واتوھا وعلیکم السکینۃ فما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتموا فان احدکم اذا کان یعمد الی الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ۔ (مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ) — نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ تم پر وقار و اطمینان ہو، جو پالو پڑھ لو، اور جو چھوٹ جائے اسے پورا کرلو، جب تم میں کا کوئی نماز کا ارادہ کرتا ہو تو وہ حکماً نماز ہی میں ہوتا ہو۔

پیدل آئے

مسجد پیدل چلتے آنا چاہیے، بغیر عذر شرعی سواری سے آنا اچھا نہیں، تاکہ ہر قدم کا اجر نامۂ اعمال میں لکھا جاسکے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی معلوم ہوتا ہو، پھر یہ کہ پیدل مسجد آنا باعث کفارۂ گناہ ہو، جیسا کہ ایک لمبی حدیث میں پورا واقعہ گذر چکا ہو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا واقعہ بیان فرمایا ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ کی رویت غنودگی کی حالت میں میسر آئی۔ رب العزت نے مجھ سے ملاء اعلیٰ کے بارے میں سوال کیا، میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، آخر کار اس نے اپنا دست قدرت مجھ پر ڈالا جس کا اثر میں نے محسوس کیا، اس کے بعد رب العزت کی طرف سے پھر وہی سوال ہوا، اب میں نے کہا کہ فرشتے کفارات گناہ میں جھگڑ رہے ہیں، یعنی کون ایسے عمل ہیں جو گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ میں نے تفصیلی جواب دیا، اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ہو۔

والمشی علی الاقدام الی الجماعات (مشکوٰۃ باب المساجد) — جماعت کے لیے پاؤں پاؤں چلنا، (باعث کفارۂ گناہ ہو)

پہلے دایاں پیر داخل کرے

راستہ اس طرح طے کرکے جب مسجد کے دروازہ پر پہونچ جائیں تو ذرا قلب وجگر تھام لیں کہ اب ایک بڑے گھر میں داخلہ ہورہا ہو، علمائے سلف اور صوفیاء کرام کے حالات میں میری نظر سے ایسے واقعات گذرے ہیں جس کا تصور بھی آج کل مشکل ہی سے ہوسکتا ہو، بعض بزرگان دین کا مسجد کے دروازہ پر پہونچ کر رنگ بدل جاتا تھا، اور ان کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔

بہرحال داخل ہوتے ہوئے مسجد میں پہلے دایاں پیر رکھیں، پھر بایاں، اور فارغ ہوکر جب نکلنے لگیں تو الٹا کریں، یعنی پہلے بایاں پیر نکالیں پھر دایاں، مگر جوتا وغیرہ پہلے داہنا ہی پیر میں پہنیں گے کہ طریقہ مسنونہ یہی ہو۔

عن انسؓ انہ یقول من السنۃ اذا دخلت — حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ سنت ہو کہ جب مسجد

المسجد مبتدأ برجلك اليمنى واذا خرجت ان تبدأ برجلك اليسرى (فتح الباری ج۱۲ ص۲۵۲) — میں تو داخل ہو تو پہلے دایاں پاؤں ڈال اور جب نکلے تو پہلے بایاں پیر نکال۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل رہا اور ادب کا تقاضا بھی یہی ہو، کہ نسبتاً دائیں کو بائیں پر فضیلت ہے۔

دعا پڑھی جائے دایاں پاؤں رکھتے ہوئے یہ دعا پڑھی جائے "اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِی اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" (اے اللہ مجھ پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب نکلیں تو بایاں پاؤں پہلے نکالیں اور یہ دعا پڑھتے ہوئے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ بِفَضْلِكَ" (اے میرے اللہ! تجھ سے تیرے فضل و بخشش کی درخواست کرتا ہوں)۔

مسلم شریف میں حضرت ابو اسیدؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اذا دخل احدکم المسجد فلیقل اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك (تم میں سے جو بھی مسجد میں داخل ہو اس کو کہنا چاہیے اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك

واذا خرج فلیقل اللّٰھم انی اسئلك بفضلك۔ (مشکوۃ ج۱ ص۶۸) — اور جب مسجد سے نکلے تو یہ پڑھنا چاہیے اللّٰھم انی اسئلك بفضلك۔

سلام کیا جائے مسجد میں پہونچ کر دیکھے کہ لوگ جمع ہیں تو سلام کرے، اور اگر کوئی موجود نہ ہو تو اس طرح سلام کرے۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا مِنْ رَّبِّنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ"

قرآن پاک میں ہو۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً (نور — ۸) — تم جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو کہ دعا کے طور پر ہو اور اللہ کی طرف سے مقرر ہے برکت والی پاکیزہ ہو۔

مفسرین اور احکام قرآن بیان کرنے والوں نے اس آیت کے ضمن میں اس کو ثابت کیا ہو جو میں نے اوپر لکھا اور فقہاء کرام نے بھی اس کی صراحت کی ہو، (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایا جائے موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ اور احکام القرآن للجصاص ج۳ ص۴۰۴ اور عالمگیری ج۲ ص۲۱۵)

نماز تحیۃ المسجد موقع ہو تو پہلے مسجد آکر دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھیں، وقتی نماز کا وقت ہو یا کوئی اور وقت ہو، البتہ اوقات مکروہہ میں سے کوئی وقت نہ ہو جیسے آفتاب کے

طلوع وغروب کا وقت یا زوال کا، حضرت کعب بن مالکؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس (بخاری)	تم میں کا کوئی مسجد میں جب داخل ہو تو اس کو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنی چاہیے۔

مگر یہ تحیۃ المسجد کی نماز وقتی نمازوں میں سے صرف ظہر، عشا، اور عصر میں پڑھی جائے گی۔ بقیہ دو نماز فجر ومغرب تو اس سے پرہیز کیا جائے گا، اس لیے کہ ان وقتوں میں کوئی نفل نماز پہلے جائز نہیں ہے، مغرب سے پہلے تو گنجائش ہی نہیں، باقی فجر تو اس وقت پہلے صرف دو رکعت سنت ہے۔

مسجد پہونچکر کوئی بیٹھ رہے اور اس کے بعد تحیۃ المسجد پڑھنا چاہیے تو یہ بھی جائز ہے مگر اولویت کے خلاف ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی صراحت فرمائی ہے[۵۱]

فرض وسنت کوئی پہونچتے ہی شروع کردے تو کیا اس کے ذمہ سے تحیۃ المسجد کی نماز ساقط ہو جائے گی؟ جواب یہ ہے کہ ہاں یہ بھی شکل جائز ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

چوں در مسجد داخل شود اگر ادائے فرض وسنت است فبہا، والا دو رکعت تحیۃ المسجد ادا نماید ..... اگر فرض وسنت ونفل دیگر ادا نمود تحیۃ المسجد از وساقط گشت (فتح العزیز پارہ اول صد ۲۴۲)	مسجد میں داخل ہوتے اگر فوراً ادائے فرض وسنت ہو تب تو خیر ورنہ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور بجائے تحیۃ المسجد فرض، سنت اور دوسری نفل نماز پڑھ لی تو اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی۔

اگر کوئی اوقات مکروہہ میں یا صبح ومغرب میں تحیۃ المسجد کی تلافی کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ قبلہ رو بیٹھکر ایک ساعت ذکر وتسبیح وتہلیل میں گزارے[۵۲]، یوں تو ابن عابدین نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے دن بھر میں ایک مرتبہ بھی تحیۃ المسجد پڑھ لی تو کافی ہے[۵۳]، مگر اوپر جو حدیث نقل کی گئی اس کے لب ولہجہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وقت موقع ہو تو تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنی چاہیے۔

تحیۃ المسجد سلام پر مقدم ہے شرح سفر السعادت میں حضرت شیخؒ نے لکھا ہے کہ پہلے تحیۃ المسجد کی نماز ادا کرے پھر حاضرین کو سلام کرے "تحیۃ المسجد" مسجد کو سلام کرنے کے حکم میں ہے جو حق اللہ ہے اور اس موقع پر حق اللہ کو حق العباد پر تقدیم حاصل ہے[۵۴] حافظ ابن قیمؒ نے بھی اسی کو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[۵۱] فتح الباری ج۱۔ ص ۴۶۱ [۵۲] فتح العزیز پارہ اول ص ۲۴۲ [۵۳] رد المختار ج۱۔ ص ۶۱۴ [۵۴] شرح سفر السعادت ج۲۔ ص ۲۱۵

ومن هديه صلى الله عليه وسلم ان الداخل في المسجد يبدأ بركعتين تحية المسجد ثم يجيئ فيسلم على القوم فتكون تحية المسجد قبل تحية اهله۔ (زاد المعاد۔ ج۲۔ ص۲۴)

نبی صلی اللہ کی سیرت سے یہ ہے کہ مسجد میں جو داخل ہو وہ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے پھر وہ قوم کو آکر سلام کرے، پس معلوم ہوا کہ تحیۃ المسجد سلام سے قبل ہو۔

انھوں نے ثابت کیا ہے کہ صحابۂ کرام کا دستور آپ کے ساتھ ایسا ہی تھا۔

باطمینان بیٹھے: مسجد میں جہاں باطمینان جگہ مل جائے بیٹھ جائیں، نہ نمازیوں کی گردن پھاندی جائے نہ جگہ کے لیے شور و ہنگامہ کیا جائے، نہ صف میں گھس کر جہاں جگہ نہ ہو مصلی کو تکلیف دینے کی کوشش کی جائے، نہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گذرنے کی جرأت کی جائے، نہ انگلی وغیرہ چٹخائی جائیں کہ ان کی ممانعت آئی ہے۔ ہر ایسی حرکت سے جو خلاف ادب اور شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہو اجتناب کیا جائے، موقع ہو تو ذکر و شغل اور نوافل میں وقت گذاریں، ورنہ خموش باادب بیٹھے رہیں۔[۱]

یہ مسجد میں آنے کے وہ آداب ہیں جن کا عمل میں لانا از بس ضروری ہے، پھر یہ کہ میں نے وہی آداب بیان کیے ہیں جو رات دن پیش آتے ہیں۔ اور ان کا برتنا ہر ایک پر لازم ہے، بقیہ وہ آداب جن کو شریعت نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے اور وہ یہاں ضبط تحریر میں نہیں آسکے ہیں ان پر بھی عمل کرنا چاہیے۔

دنیا کی باتوں سے اجتناب: آداب مسجد سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ اس میں دنیا کی باتیں کرنے سے احتراز کیا جائے، وہ باتیں خواہ جائز ہوں خواہ ناجائز، اس زمانہ میں اس گناہ میں عوام و خواص تقریباً دونوں ہی کم و بیش مبتلا ہیں، اس لیے ذرا تفصیل سے بیان کیے جا رہے ہیں۔

یہ اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ قرآن پاک نے اپنے معجزانہ پیرایہ میں اسے بیان کیا، ارشاد ربانی ہے۔

أَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا (جن۔ ۲)

بلاشبہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں، پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں مسجد میں دنیا کی گفتگو کا مسئلہ کھول کر لکھا ہے اور اس کو واضح کیا ہے

---

[۱] عالمگیری ج ۹۔ ص ۲۱۵۔

کہ یہ گھر اللہ تعالیٰ ... اس کی تسبیح و تقدیس اور عبادت کے لیے مخصوص ہیں۔ صاحب جمل لکھتے ہیں۔

معنی افردوا المساجد بذکر اللہ ولا تجعلوا لغیر اللہ فیھا نصیبا۔ (ج ۴ ص ۴۲۳) — معنی یہ ہو کہ مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے مخصوص کرلو اور غیر کے لیے اس میں کوئی حصہ نہ بناؤ۔

اس سے واضح تر عبارت "تفسیرات احمدی" کی ہو۔

ان فیھا علی ظاہرھا مما یستدل بہ علی انہ لا یجوز فی المسجد التکلم بکلام الدنیا (ص ۵۹) — اس آیت کے ظاہر سے استدلال کیا گیا ہو کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا جائز نہیں ہو۔

قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہو۔

فِی بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ (نور) — ان گھروں میں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے

اس آیت میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ مسجدوں میں صرف ذکر اللہ ہی کی قسم کی چیزیں ہونی چاہییں۔ کیونکہ یہاں بیوت سے مساجد مراد ہیں، اور یہ بات ظاہر ہو کہ ان کی قدر و منزلت بھی اسی میں ہو کہ دنیاوی باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ وہاں پہونچ کر دھیان سب کٹ کر اللہ تعالیٰ پر ہو، اس آیت کے ضمن میں ابو بکر جصاص تحریر فرماتے ہیں۔

ھذا یدل علی انہ یجب تنزیھھا من القعود لامور الدنیا مثل البیع والشراء وعمل الصناعات ولغو الحدیث الذی لا فائدۃ فیہ والسفہ وما جریٰ مجریٰ ذالک (احکام القرآن ج ۳ ص ۴۲۳) — یہ آیت بتاتی ہو کہ مسجدوں کو دنیاوی کاموں سے پاک صاف رکھنا واجب ہو جیسے خرید و فروخت، دستکاری اور ایسی باتیں کرنا جو بے فائدہ ہیں، اور اسی طرح نادانی وغیرہ کی باتیں کرنا۔

رحمت عالم صلعم کی پیشینگوئی اور امت کو ہدایت

میں نے یہ اس لیے نقل کیا تاکہ اصل مسئلہ کھل کر اہل علم کے سامنے آجائے، اور ان کو کوئی اشکال پیدا نہ ہو سکے ... سب کو معلوم ہو کہ رحمت عالم صلعم کے زمانہ میں ان کا کیا احترام تھا اور آپ کے خلفاء و اصحاب نے اس احترام کو کیسے نباہا، حدیثوں سے معلوم ہوتا ہو کہ عہد نبوی میں ایسی باتوں کا عوام مسلمانوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پیشینگوئی کے طور پر فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا کی باتیں مسجدوں میں ہونے لگیں گی، پھر آپ نے تاکید فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے، ارشاد

فرمایا تھا۔

فلا تجالسوا ھم فلیس للّٰہ فیہم حاجۃ (مشکوٰۃ ج ۱۔ ص ۷۱) ان لوگوں میں جو مسجدوں میں دنیا کی باتیں کریں، مت بیٹھنا کیونکہ ان کی اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں۔

گویا دنیا کی باتیں خانہ خدا میں اسقدر مبغوض ہیں کہ اس بڑے خطرہ کی آپ نے اپنی امت کو سیکڑوں سال پہلے اطلاع دی اور پھر تاکید فرمادی کہ اس گناہ کے کام سے بچنا، اور ہرگز اس کی جرأت نہ کرنا۔

فقیہ ابو اللیث نے بھی حضرت علیؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ اسلام کا بجز نام اور قرآن کا سوائے نشان کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ان کی مسجدیں بنی تو ہوں گی لیکن ذکر اللہ سے ویران ہوں گی[۱]۔

ان روایتوں کو پڑھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کیا عجب جس زمانہ کی پیشینگوئی کی گئی تھی وہ ہمارا ہی زمانہ ہو، اس لیے ارباب علم و دانش خوب غور کرلیں اور عوام مسلمان اپنے اعمال پر گہری نظر ڈالیں، تاکہ کل کے کل مسلمان اس گناہ سے بچ سکیں۔

کون نہیں جانتا کہ مسجد دربار الٰہی اور جلوہ گاہ رحمت ہے، پھر ایسے مقدس اور پُر جلال دربار میں دنیا کی باتیں جتنی نامناسب، نازیبا، عقل و خرد سے بعید، اور مذموم ہوسکتی ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

جہاں مساجد کے فضائل بیان کیے گئے ہیں وہاں جو حدیثیں گذر چکیں ہیں، جن میں ان محترم و مقدس گھروں کی رفعت کا ذکر ہے، یہ جملے قابل غور ہیں "احب البلاد الی اللہ مساجدھا وابغض البلاد اسواقھا۔ خیر البقاع مساجدھا وشر البقاع اسواقھا" جن کا ماحصل یہ ہے کہ روئے زمین پر وہ جگہ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے پیاری اور سب سے بہتر ہے، وہ وہی گھر ہے جس کو ہم "مسجد" کے مختصر لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں بازار کو سب سے بُری جگہ شمار دیا گیا ہے، آخر بات کیا ہے، یہی نہ کہ بازار دنیاوی دھندوں کے اڈے ہوتے ہیں جہاں دُنیا اپنی بساط بچھائے رونق افروز رہتی ہے، اور شور و غل، ہو حق، اور ہنگامہ اس کا لازمہ ہے۔

غور کیجیے جب انہی مبغوض ترین جگہ کے لوازم اس محترم و مقدس دربار میں کیے جائیں گے جو عند اللہ محبوب ترین ہیں تو یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[۱] تنبیہ الغافلین ص ۱۰۱

انتخاب

(از ادارہ)

دینِ مُلّا ایک ترک خاتون اخبار نویس نے اگلے روز لاہور میں ایک اخبار نویس سے فرمایا کہ پاکستان میں پردہ اٹھ کر رہے گا خواہ "مُلّا" اس کے حق میں کتنا ہی زور لگائیں، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مستقبل میں پردے کے متعلق پاکستان کا کیا رویہ ہوگا، لیکن ہم اپنی ترک بہن کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ پردے کی حمایت "مُلّا" اس لیے نہیں کرتے کہ انھوں نے اسے خود ایجاد کیا ہو یا اس کا حکم دیا ہو، بلکہ غریب "مُلّا" صرف اس لیے پردے کی حمایت کرتا ہو کہ اس کی دانست میں اللہ اور اس کے مقدس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہو، ورنہ کوئی "ملا" اپنی قوم کی خیر خواہی میں کسی مسٹر سے کم نہیں،

آپ یہ تو کہہ سکتی ہیں کہ "مُلّا" نے کتاب وسنت کی شرح وتفسیر کرنے میں غلطی کی ہو لیکن پردہ کو محض "دینِ مُلّا" کہہ کے مردود نہیں قرار دیا جاسکتا، سوال یہ ہو کہ ترکانِ عہد حاضر کو پردے سے جو نفرت ہوئی ہو۔ تو کیا اس لیے کہ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں نے کتاب وسنت کے سرچشمے سے براہِ راست فیض حاصل کیا اور ان کو معلوم ہوگیا کہ قرآن وسنت میں پردہ نہیں ہو بلکہ وہ بے حجابی اور عریانی ہو جو یورپ اور امریکہ اور اقوام کفار میں رائج ہو، یا انھوں نے اسلام کو بالکل نظر انداز کر کے صرف تقلید فرنگ میں پردہ اٹھایا اور یہی سوال ان خاتونوں سے کیا جاسکتا ہو جنھوں نے پاکستان میں پردہ کو اٹھا کر بے حجابی کو رواج دیا ہو۔

اگر پہلی صورت ہو تو پردے کے اٹھنے پر ہر مسلمان کو خوش ہونا چاہیے اور "مُلّا" کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے، لیکن اگر دوسری بات ہو تو پھر مُلّا کہہ کر خدا اور رسول کی اطاعت سے منھ موڑنے والوں کو اپنا انجام سوچ لینا چاہیے ـــ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اصل بحث: حقیقت میں اصل بحث پردے اور بے حجابی کی نہیں، بلکہ یہ ہو کہ زندگی کے

بارے میں مسلمان کیا نقطۂ نگاہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کو جیسا کہ وہ کتاب وسنت میں ہو بلاکم وکاست اور بلاچون وچرا کے اختیار کرنا چاہتے ہیں، یا دین فرنگ کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

اگر ان کا ارادہ دوسری راہ اختیار کرنے کا ہو تو پھر صرف پردے اور بے حجابی کا سوال نہیں، اور نہ اس کے حسن وقبح کا ہو، بلکہ ان کو صاف صاف لفظوں میں کہہ دینا چاہئے کہ ہم اسلام کو اپنا دین نہیں بنانا چاہتے۔ اس کے بعد ان سے کوئی "ملّا" پردے کی بحث نہیں کرے گا بلکہ خود دین کی حقانیت کی، لیکن اگر وہ مسلمان رہنا، مسلمان جینا، اور مسلمان ہی مرنا چاہتے ہیں تو پھر ان کو وہ پورا دستور حیات اختیار کرنا پڑے گا، اور وہ یہ نہیں کر سکیں گے کہ کچھ باتیں اسلام سے لیں اور کچھ اپنے نفس کے دین کی، یہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر قسم کا اسلام کسی مصرف کا نہیں، نہ آخرت میں کام آئے گا نہ دنیا میں چناں چہ جب سے مسلمانوں نے دین کے ٹکڑے کیے ہیں (عبادات، رسوم اور پرسنل لا) تک تو اسلام کو اپنا دین بنایا، اور باقی زندگی کو پیروی کفار میں دے دیا ہو، اس وقت سے مسلمانوں کا اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی زوال شروع ہو، اور کوئی تدبیر ان کو عروج سے ہم کنار نہیں کر سکی، کوثر لاہور

اُف رے شہنشاہیت کی روح

مساوات کی جنتِ ارضی کے مہادیو کی سال گرہ کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:-

"ماسکو۔ ۲۱ دسمبر۔ آج مارشل اسٹالن کی ۷۰ ویں سال گرہ کا جشن منایا گیا۔۔۔۔۔۔ ہنگری میں ۲۴ توپوں کی سلامی دی گئی، بلغاریہ میں ایک شہر کا نام مارشل اسٹالن کے نام پر تبدیل کیا گیا، رومانیہ کے شہر بخارسٹ میں مارشل اسٹالن کا بُت نصب کیا گیا"۔

"لاکھوں پونڈ کے تحفوں سے بھری ہوئی گاڑیاں کئی دن سے مشرقی یورپ سے کریملن آ رہی ہیں، ان تحفوں میں قیمتی موٹر کاروں سے لے کر سگار کے موزوں تک ہر قسم کی چیزیں ہیں"۔

"اس موقع پر مارشل اسٹالن کی دس لاکھ تصویریں شایع کی گئی ہیں، ۵ لاکھ کی تعداد میں ان کی سوانح عمریاں طبع کرائی گئی ہیں اور ۲۰ لاکھ سال گرہ کارڈ روس کے شہروں اور قصبات میں تقسیم کیے گئے ہیں،

مارشل اسٹالن نے کمیونزم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں اُن سے نہ کوئی انکار کرتا ہو اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی ضرورت ہو، مگر سوال یہ ہو کہ کیا اشتراکی اصولوں میں اس بات کی گنجائش ہو کہ خدمت

کی بنیاد پر کسی ریاست کے شہریوں کے تمدنی مدارج میں فرق کیا جائے۔ کیا یہ بات مارکسزم کی روح کے مطابق ہو کہ جو شخص زیادہ سوچ سکتا ہو اسے ان لوگوں کے مقابلہ میں بادشاہوں کا سا مرتبہ دے دیا جائے جو اس سے کم سوچ سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی گنجائش ہو تو کیا یہ طبقات کو ایک نئی ترتیب سے وجود میں لانے کے مترادف نہیں ہو۔

اگر یہ سب کچھ نہیں ہو تو کیا روس میں لوگ عام طور پر اسی طرح سال گرہ مناتے ہیں۔ کیا اسی طرح ہر شخص کی لاکھوں تصویریں شائع کی جاتی ہیں اور بت نصب کیے جاتے ہیں، اُف رے شہنشاہیت کی روح۔

"الانصاف"

اب بھی سوچو

چیکوسلاویکیہ کی [illegible] اسمبلی نے حال ہی میں ایک قانون پاس کیا ہو جسکی رو سے جائز اور ناجائز بچوں میں مکمل مساوات قائم کردی گئی ہو، بالفاظ دیگر اب وہاں کسی مرد یا عورت کو زناء سے [illegible] رہنے کی ضرورت نہیں ہو کہ ان کے ناجائز تعلق کے نتیجہ میں ایک ایسا بچہ دنیا میں [illegible] ان کی بدنامی کا موجب ہوگا۔

چیکوسلاویکیہ ایک اشتراکی ملک ہو اور اشتراکیت مغرب کے مادہ پرستانہ رجحان کا نقطۂ کمال ہو جو لوگ آنکھیں بند کر کے مغرب کی راہ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں انھیں ایک بار پھر غور کرنا چاہیے کہ ان کی وہ اخلاقی قدریں جن پر وہ فخر کرتے ہیں اس راہ پر گامزنی کے بعد زندہ رہ سکیں گی یا نہیں۔

مسلمانوں کو اس خبر پر خاص طور پر غور کرنا چاہیے، کیوں کہ ان کے مخصوص رجحانات کے پیش نظر اشتراکیت کے علمبردار اس سلسلہ میں انھیں کے سامنے سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں، چناں چہ معاصر کوثر کی روایت کے مطابق پاکستان میں روسی ادیبوں کا جو وفد آیا ہوا ہو اس کے ایک رکن نے بتایا کہ روس میں شادی کے رشتہ کی بیحد عزت کی جاتی ہو۔ اور جنسی آوارگی کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور اس کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہو وہ سرمایہ دار ممالک کا پروپگنڈا ہو۔

سوال یہ ہو کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ صحیح ہو تو سویٹ یونین کے ایک رکن کے اس طرز عمل کی کیا توجیہ کی جائے، کیا چیکوسلاویکیہ کی اشتراکیت بقیہ سویٹ یونین کی اشتراکیت سے کچھ مختلف ہو۔

"الانصاف" الہ آباد

سزائے موت کی گرانی

آزاد ہندستان میں موت کی سزا دینے کے لیے حکومت کے خزانہ پر کتنا بار ڈالا جاسکتا ہے؟ یہ بات گاندھی جی کے قاتلوں کے لیے سزائے موت کی تجویز کرنے سے ظاہر ہوئی۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ نے ہند پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مقدمہ کے اخراجات کی تفصیل بتائی، کہ اس مقدمہ میں جملہ ۹ لاکھ ۴۶ ہزار ۲ سو ۲۸ روپیہ صرف ہوئے، اس میں سب سے بڑے وکیل کو ۳ لاکھ ۸۶ ہزار ۲ سو ۲۰ روپیہ، اور بمبئی کے ایڈوکیٹ جنرل اور ان کے دو مددگاروں کو ۲ لاکھ ۲۹ ہزار، ۷ سو ۱۳ روپئے دیے گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے اخراجات یہ ہوئے:۔

ہنگامی مصارف۔ ۲۹ ہزار ۲ سو روپیہ، مخصوص جج کی تنخواہ۔ ۲۶ ہزار ۴ سو ۲۷ روپیہ

عمارت میں توسیع۔ ۴۱ ہزار ۸ سو روپیہ، پولیس۔ ایک لاکھ ۵۲ ہزار ۴ سو ۵۰ روپیہ

دفتری عملہ۔ ۲۵ ہزار ۵۷ روپیہ۔

اخراجات کی [illegible] سے لوگوں کو اپنی زندگی کی قیمت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ اس پر شور مچا رہے ہیں، مگر وہ ان اخراجات کی گرانباری کا اندازہ کر کے اپنی زندگی کی ارزانی کے بہر کیف قائل ہو جائیں گے، اگر آج حکومت نے چند نوٹوں کے بندوبست میں خزانہ کا منھ کھولا ہے تو کل اسے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا مول بڑھانے میں خرچ کرنے کی توفیق ہو ہی جائے گی۔ زندگی میں خرچ نہ ہوا موت میں خرچ تو ہوا، یہ تو الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ آزاد ہندستان کی حکومت سابقہ برطانی حکومت سے کچھ کم خراچ ہے، مسلمہ قاتلوں کی سزائے موت تجویز کرنے میں لاکھوں کا خرچ دنیا میں ایک مثال ہے۔

"صدق" لکھنؤ

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

(حضرت شاہ ولی اللہؒ)

(از مولنا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہؒ کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا مغلیہ سلطنت کا زوال انحطاط، ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھوں اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور انکے غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ کا خونی سیلاب اور احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ۔ یہ سارے واقعات شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحبؒ ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے، اسلئے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور انکے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہے۔ پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی، اور انکے طرز عمل سے موجودہ حالات میں بھی کبار روشنی ملتی ہے۔ یہ مقالہ اچھی خاصی کتاب ہے۔ باریک قلم سے الفرقان سائز کے ۱۳۰ صفحات پر ختم ہوا ہے، آخر میں حضرت صوفی (ایم اے) کی ایک بڑی اہم نظم "استعانت مسلمہ سے روح ولی اللہی کا خطاب" بھی شامل ہے۔ کاغذ سفید چکنا۔ (قیمت:- عمر)

امام ولی اللہ دہلوی

اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولنا عبید اللہ سندھی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف [illegible] فلسفہ پر یہ نہایت گہرا علمی مقالہ بلاشبہ نوادر میں سے ہے [illegible] علمی خصوصیات اور انکے فلسفہ [illegible] کو سمجھنے کیلئے یہ کلید [illegible]۔

اسمیں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت اور ہند و حرمین کے اساتذہ و شیوخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و سنت میں انکی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور معقولات کے بارہ میں انکے خاص مجتہدانہ طریقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہ صاحب کو اور انکے طریق فکر کو سمجھنے کیلئے اس مقالہ سے جو روشنی حاصل کی جاسکتی ہے کسی دوسری کتاب سے حاصل نہیں ہوسکتی لیکن صرف [illegible] اور عربی داں حضرات کیلئے یہ مقالہ [illegible] ہے، دوسرے حضرات پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ [illegible]

(قیمت:- ایک روپیہ۔ عہ)

"تذکرۂ امام ربانی"

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے سوانح و خصائص اور آپکے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی بیان، اکبر اور اس کے منافق و ملحد حواریوں کے گھڑے ہوئے "دینِ الٰہی" کی تفصیلات، اُس زمانہ کے علماء سوء اور ملحد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کیلئے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جدوجہد اور بارگاہِ خداوندی میں چیخ پکار اور اصلاح و تجدید کے اس مشن میں آپ کی غیر المعقول کامیابی اور مغلیہ سلطنت کے رویہ اور مسلک پر آپ کی مساعی تجدید کا اثر ——— ان تمام چیزوں کی پوری تفصیل آپ کو "تذکرۂ امام ربانی" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ (قیمت:- عگر)

ملنے کا پتہ

کتبخانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟

مولنا سید ابوالحسن علی ندوی کی نہایت اہم تصنیف جسمیں گویا پوری تاریخ کا [illegible] [illegible] قیمت۔ [illegible]

[illegible]

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے!

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ

جلد ۱۷ | بابتہ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں!

قوموں کی تاریخ میں اخلاقی، دینی اور روحانی حیثیت سے مدوجزر آتے رہتے ہیں۔ کوئی زمانہ اخلاقی و روحانی ترقی کا ہوتا ہے، اور کوئی زمانہ اخلاقی و روحانی تنزل و انحطاط کا۔ تاریخ کا طالب علم ان انقلابات کا عادی ہوتا ہے وہ ان چیزوں کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتا اور کسی اخلاقی انحطاط و تنزل سے وہ کسی قوم سے مایوس نہیں ہو جاتا، اور نہ وہ عام قومی زوال کی پیشین گوئی کرنے لگتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ان تغیرات اور ترقی و انحطاط کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اس بات کی، کہ قوم کا ضمیر زندہ ہے یا مردہ۔ اگر کسی قوم میں اخلاقی خرابیاں، روحانی امراض اور اجتماعی عیوب پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس قوم کا ضمیر زندہ اور بیدار ہے، وہ مجرموں کو ملامت کرتا ہے وقتاً فوقتاً قوم کا احتساب کرتا رہتا ہے۔ اس قوم میں نمایاں تعداد یا مؤثر شکل میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو اپنی قوم کو اس کی غلطیوں اور ناانصافیوں پر برملا ٹوک دیتے ہیں۔ وہ موقع پر اپنے ہم قوم اور ہم خیالوں کو ملامت اور اپنے حریفوں یا بیگانوں کی حمایت سے نہیں چوکتے، ان کے نزدیک کوئی ناانصافی یا زیادتی اس لئے جائز اور قابل سکوت نہیں کہ وہ دوستوں اور اپنی قوم کے افراد سے سرزد ہوئی ہے۔ اگر صورتِ حال یہ ہے تو وہ ساری خرابیوں کے باوجود اس قوم سے مایوس نہیں ہوتا اور اس کے نزدیک اس قوم کی اصلی طاقت اور اس کا اخلاقی سرمایہ محفوظ ہے، اس کا ضمیر زندہ ہے، اس سے کسی عام بے راہ روی اور قومی خودکشی کا خطرہ نہیں۔

لیکن کبھی کبھی قوموں کی تاریخ میں ایسا دور بھی آتا ہے کہ اس قوم کے پاس سب کچھ ہوتا ہے لیکن زندہ اور بیدار ضمیر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انگلیوں پر گنے جانے

والے افراد بھی نہیں ہوتے جو اس قوم کا آزادانہ و بیباکانہ احتساب کریں، اور اس سلسلہ میں کسی خطرہ اور کسی ملامت کی پرواہ نہ کریں، ان کو اپنے مقبول و معتوب ہونے کا کوئی خیال نہ ہو، مستقبل کی ترقیات اور کامیابی کے امکانات سے آنکھیں بند کر کے اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کریں، فوائد اور اصول کے مقابلے میں اصول کو ترجیح دیں، یہ صورتِ حال اس قوم کے اخلاقی افلاس کی دلیل اور خطرے کی کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایک ایسا مؤثر عنصر قومی زندگی کے لئے بیحد ضروری ہے جو اپنی قوم کی غلطیوں اور زیادتیوں پر تنبیہ کرتا رہے۔ طاقت ور اور غالب فرد یا جماعت (جس کے ساتھ اس کی ضروریات وابستہ ہیں) اگر ناانصافی یا زیادتی کرے تو بلا تامل اس کے مقابلے میں کمزور اور مغلوب کا ساتھ دے اور اس کی حمایت میں اپنی آواز بلند کرے۔ اس عنصر کی ضرورت، ملک کی آزادی، اور قومی حکومت سے کسی طرح کم نہیں۔ اس عنصر کے بغیر کسی ملک کی آزادی اور حکومت کا بقا بھی مشکل ہے۔ قومیں جب ایسے افراد یا عناصر سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتی ہیں، اور آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت ان کی زندگی دنیا کے لئے اور خود ان کے لئے جنجال بن جاتی ہے۔ پہلے ان کی طاقت دوسروں کے خلاف پھر خود اپنی بیخ کنی میں صرف ہونے لگتی ہے اور اس طرح وہ مٹ کر رہ جاتی ہیں۔

جب کسی قوم پر یہ دور آتا ہے تو اس کی قوتِ تنقید فنا ہو جاتی ہے، اچھے اچھے صاحبِ نظر اور صاحبِ شعور یا تو قوم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، یا سب کچھ دیکھ سُن کر بھی خاموش رہتے ہیں، بڑے سے بڑا واقعہ پیش آجاتا ہے، کھلی ناانصافی اور زیادتی ہوتی ہے، اور ان کو تنقید اور اختلاف کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ افسوسناک حال اُن لوگوں کا ہوتا ہی جو ایسے موقع پر اپنی قوم کو ملامت و مذمت کرنے کے بجائے اُلٹا فریقِ ثانی ہی کو بُرا بھلا کہتے اور اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کو کچھ کہنے سننے کی عادت ہی ہوتی ہے وہ چھوٹے چھوٹے مسائل اور غیر متعلق مباحث پر اپنا وقت اور قوت صرف کرتے پھرتے ہیں، مثلاً اگر کسی ملک میں غالب اور طاقت ور جماعت کو جرأت کے ساتھ انصاف، رواداری، فراغ دلی، وسیع النظری، اور ایثار و قربانی اور دوسروں کے جذبات و خصائص کے احترام کی

تعلیم و تلقین کی ضرورت ہے، تو وہ اس کے بجائے کمزور اور کم تعداد والی جماعت کو اپنی زبان و تہذیب، جماعتی و دینی خصوصیات و روایات سے دستبردار ہو جانے اور بڑی جماعت میں اپنے وجود کو فنا اور اپنی ہستی کو گم کر دینے کی تعلیم دیں گے، اگر کسی اکثریت کو اس تعلیم کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے دل سے انتقامی جذبات نکال دے اور اپنی عالی ظرفی کا ثبوت دے تو وہ اس کے مقابلے میں اقلیت کو نصیحت کرینگے کہ وہ سابقہ واقعات کو بھول جائے اور ہر قسم کی زیادتیوں کو معاف کر دے۔ اگر کسی ملک میں مختلف قومیں بستی ہیں اور مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں تو وہ ان کے معابد اور جذبات کے احترام کی تبلیغ تلقین کے بجائے، اشتعال انگیز باتیں، اور نفرت پھیلانے والی تقریریں کرتے پھریں گے، ان کو اپنی قوم اور غالب جماعت پر تنقید کرنے اور اس کا اخلاقی و اصولی احتساب کرنے کے بجائے، کمزور و بے بس اقلیتوں سے کہنا سننا اور ان کو نصیحت کرنا اور مشورے دینا زیادہ آسان اور بے خطر کام معلوم ہوتا ہے، ٹھوس اور تلخ حقیقتوں کے بجائے، زبان و ادب کی بے نتیجہ اور دور از کار بحثوں سے ان کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے یہ سب اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ قوم اپنے مادی عروج کے باوجود اندرونی حقیقت، زندگی کی صحیح روح، دماغی صلاحیت اور اخلاقی جرأت سے محروم ہوتی جا رہی ہے، اور اصول پر منافع اور مصلحتوں کو، صداقت و انصاف پر جذبات و خواہشات کو ترجیح دینے کی وہ وبا اس قوم میں پھیل رہی ہے جس نے تاریخ میں اس سے پہلے بڑی بڑی صاحبِ دماغ اور برسرِ عروج قوموں کو فنا کر دیا۔

ایک ہزار برس سے زائد تک مسلمانوں کی شریعت کا محفوظ رہنا اور مزاج اسلامی کا برقرار رہنا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، اس واقعہ کے اسباب و علل ہیں اور اس میں ایک اہم سبب دینی احتساب و تنقید کا تسلسل ہے جو ہمیں اس اُمت کی تاریخ میں شروع سے اس وقت تک نظر آتا ہے اس خاصی طویل تاریخ میں ایک مختصر سے مختصر دور بھی ایسا نہیں آیا کہ ضمیر کا گلا بالکل گھونٹ دیا گیا ہو، اور زبان تنقید خاموش ہو گئی ہو۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں مسلسل ایسے ناقد اور محتسب پیدا ہوتے رہے جنھوں نے خلفاء کا جو (آدھی دنیا پر حکومت کرتے تھے) برسرِ منبر

دامن پکڑ لیا۔ سلاطین و وزراء کو اُن کی غفلتوں پر ٹوک دیا، قوم اور حکومت کے غلط رجحان کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اپنی تقریروں اور تصنیفوں اور مجلسوں اور گفتگوؤں میں وقت کے مقبول خیالات، مروجہ رسوم و عادات اور اخلاقی انحطاط پر سخت اور تلخ تنقید سے باز نہیں آئے۔ امام ابوحنیفہؒ کا عہدۂ قضا سے انکار، امام مالکؒ کا مشہور فتویٰ (مجبور کی طلاق کوئی چیز نہیں) جو خلافتِ عباسیہ کو چیلنج تھا، امام احمد بن حنبلؒ کا خلق قرآن کے سرکاری عقیدہ کے خلاف میدان میں آجانا اور ہر طرح کی اذیت برداشت کرنا، تاریخ کے مشہور واقعات ہیں سلطنتِ عثمانیہ میں سلطان سلیم کی اس خواہش کے خلاف کہ وہاں کی عیسائی آبادی کو مسلمان بنا لیا جائے۔ شیخ الاسلام کا اعلان اور انکار کہ یہ قرآن کی آیت لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر نہیں) کے خلاف ہے۔ اور سلطان کا اعتراف تاریخی واقعہ ہے، خود ہندوستان میں علاء الدین خلجی کے وقت سے اکبر کے عہد تک برابر اس حدیث پر عمل ہوتا رہا کہ:۔

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔	اعلیٰ جہاد جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کا کہنا ہے۔

اگر غور سے دیکھئے تو سلطان جائر (طاقت ور بے انصاف) کا مصداق کبھی کبھی شخص کے بجائے قوم۔ یا کسی قوم کا رجحان عام یا کسی مُلک کی رائے عامہ بھی ہو سکتی ہے۔ آج جمہوری نظام نے قوم، اور قوم کے نمائندوں کو دونوں خصوصیتیں بخشدی ہیں، قوت اور ناانصافی کا موقع، اس لئے جب کسی جماعت یا طاقت میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو وہ سلطان جائر کی صحیح مصداق ہے، اور اس کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنا اتنا ہی مشکل کام اور جوانمردی کی بات ہے جو شخصی سلطنت کے زمانہ میں مطلق العنان بادشاہوں کے سامنے تھی مطلق العنان و جابر بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے جان کا خطرہ تھا، آبرو کا خطرہ تھا، مال کا خطرہ تھا۔ قوم مزاج اور مرضی کے خلاف کلمۂ حق کہنے سے انتخاب میں ناکامی کا خطرہ ہے، حکومت کے نہ ملنے کا خطرہ ہے، پارٹی کی شکست کا خطرہ ہے۔ جن لوگوں کی روح انھیں چیزوں میں اٹکی ہوئی ہے وہ ان میں سے ایک خطرہ بھی مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، وہ بڑی سے بڑی

روشن خیالی، آئین پسندی، جمہوریت نوازی کے باوجود بڑے بڑے سنگین واقعات سے چشم پوشی کرتے ہیں، بڑی بڑی ناانصافیوں کو جیتی مکھی کی طرح نگل جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے اصولی اور ضمیر فروشی کا یہ ناسور بڑھتا بڑھتا پوری قوم کو کھا لیتا ہے اور قوم کا اخلاقی احساس چند افراد یا چند سیاسی جماعتوں کی خود غرضی اور مصلحت پرستی کے نذر ہو جاتا ہے، لیکن جو شیر مرد ہمت سے کام لیتے ہیں اور اپنے اور اپنی جماعت کے منافع کو بلا تامل خطرے میں ڈال دیتے ہیں، اور قوم کے غلط رجحان اور ناجائز خواہش کے بجائے اپنے آزاد ضمیر کا ساتھ دیتے ہیں، وہ خواہ وقتی طور پر ناکامیاب رہیں اور قوم کے دربار میں معتوب قرار پائیں لیکن وہی حقیقتاً اس قوم کے محسن اور نجات دہندہ ثابت ہوتے ہیں اور بعض اوقات پوری پوری قوموں کو عام تباہی اور بربادی سے بچا لیتے ہیں، تاریخ میں ہمیشہ انھیں لوگوں نے بلند جگہ پائی ہے اور پچھلی نسلوں نے ان کے احسان کو مانا ہے۔

ہند کے آزاد جمہوریہ کو آج یہی امتحان درپیش ہے، اور اس کی آزادی، عزت اور وقار اور ملک کا امن و اطمینان اور نیک نامی انھیں صاحب ضمیر بیباک اور بے لاگ ناقدوں کے وجود اور ہمت پر منحصر ہے، اور امید ہے کہ اتنا بڑا ملک یکسر اُن کے وجود سے خالی نہیں ہو گیا ہوگا۔

جذباتِ مائل

(حضرت مائل انصاری خیرآبادی)

ہلے جاتے ہیں دل اہلِ وفا کے
ڈراتے ہو اُنھیں خنجر دکھا کے

فرشتے کہتے ہیں آمین آمین
اُٹھے ہیں ہاتھ یہ کس کی دُعا کے

مُسلماں کی نظر، اللہ اکبر
ازل سے منتظر ہیں جو قضا کے

اسی پر ناز تھا اے چلنے والو!
گئے بیٹھ آخرش منزل کو پا کے

کسے بیٹھے ہو مٹی میں بلا کے

ذرا اُٹھی، کہ رُخ بدلے ہوا کے

بتوں کی بندگی اور تجھ سے مائل
کر اللہ اللہ، اے بندے خدا کے

اصلی اسلامی زندگی اور اس کا مثالی نمونہ

"ناچیز مدیر الفرقان کی ایک تقریر، جو دسمبر ۴۹ء میں بھوپال کے ایک اہم تبلیغی اجتماع میں کی گئی تھی۔ بھوپال کے تبلیغی احباب ہی نے اس کو خاص اہتمام سے قلمبند کرایا تھا، نظر ثانی کے بعد ہدیۂ ناظرین کرام کی جارہی ہے۔"

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ لقد جاءت رسل۔ ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل من اتبعھم باحسان الی یوم الدین۔

بزرگو، دوستو، اور دینی بھائیو!

اللہ کا شکر ہے کہ ہم اور آپ دین کے کام اور اپنی آخرت کی فکر کے سلسلے میں یہاں جمع ہوئے ہیں، انسانوں کی بڑی تعداد کا کسی ایک جگہ جمع ہوجانا کوئی خاص بات نہیں ہے، آپ کسی بازار میں نکل جائیے اس سے زیادہ مجمع نظر آجائے گا، کسی بڑے اسٹیشن پر چلے جائیے اس سے بہت زیادہ آدمیوں کو آپ وہاں دیکھ لیں گے، کسی سینما کے پاس سے گذر کر دیکھئے اس سے بہت بڑی بھیڑ آپ کو نظر آجائے گی۔ لیکن اللہ کا بڑا فضل ہے اپنے ان بندوں پر جو اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے اور اس کے دین کی فکر میں کہیں جمع ہوجائیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا ان لوگوں کو بھی دیتا ہے جن سے اس کو محبت ہوتی ہے اور ان کو بھی دیتا ہے جن سے اس کو محبت نہیں ہوتی، لیکن دین کی دولت وہ صرف انھیں بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ راضی ہوتا ہے اور جن سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ پس آج ہمارا اور آپ کا اس جگہ جمع ہونا درحقیقت ہم سب پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے کہ اپنے کروروں بندوں میں سے ہم کو اس نے توفیق دی کہ اس کے مقدس دین کے کام کے لئے اور اس سے ٹوٹا ہوا

تعلق جوڑنے کی فکر میں ہم یہاں جمع ہو گئے، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ اس انعام و احسان کا شکر ادا کریں۔

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدیی وان اعمل صالحا ترضاہ وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین۔

ان چند تمہیدی جملوں کے بعد میں وہ بات کہنا چاہتا ہوں جس کے عرض کرنے کا میں نے اس صحبت میں ارادہ کیا ہے۔

حضرات! اتنی بات تو ہم آپ سبھی جانتے ہیں کہ اسلام کسی ذات برادری کا نام نہیں ہے، بلکہ زندگی گذارنے کے اس خاص طریقے کا نام اسلام ہے جو اپنے بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے، اور جس کی تعلیم ہر زمانے میں اس کے پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں اور اُمتوں کو دی تھی، اور سب سے آخر میں آخری اور مکمل شکل میں اسی کی تعلیم حضرت محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دی، قرآن مجید اسی طریقۂ زندگی کا بنیادی دستور ہے۔ بہر حال اسلام کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ ایک خاص طریقۂ زندگی کا نام ہے، اور اسی طریقے کے اختیار کرنے والوں کا نام مسلم ہے۔ آپ اس کو یوں سمجھئے کہ مسلمان ہونا ایسا نہیں ہے جیسے شیخ، سید، مغل، یا پٹھان ہونا۔ شیخ یا سید یا مغل پٹھان ہونے کے لئے کوئی خاص علم و عمل یا زندگی کا کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ ہر وہ شخص سید یا شیخ کہلاتا ہے جو کسی سید یا شیخ کے گھر میں جنم لے لے۔ اسی طرح جو شخص کسی مغل خاندان یا پٹھان خاندان میں پیدا ہو جائے وہ آپ سے آپ باپ دادا کے مغل یا پٹھان ہونے کی وجہ سے مغل اور پٹھان کہلاتا ہے۔

لیکن مسلمان ہونے کے لئے یہ بالکل کافی نہیں ہے کہ کسی مسلمان خاندان میں آدمی پیدا ہو جائے، بلکہ مسلمان صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے اس دین پر یعنی زندگی کے اس طریقے پر ایمان لائے جس کا نام اسلام ہے، اور اسی کو اپنا دین اور اپنی زندگی کا طریقہ بنا لے۔ الغرض اسلام کوئی قومیت نہیں ہے، بلکہ وہ انسانوں کیلئے

زندگی گذارنے کا ایک خاص طریقہ ہے جس میں عقائد، عبادات اور اخلاق و عادات اور معاشرت و معاملات، غرض زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق احکام اور ہدایتیں ہیں۔

اسلام کی حقیقت سمجھنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تربیت سے صحابۂ کرامؓ نے زندگی کا جو طریقہ سیکھا تھا اور وہ جس طرح زندگی گذارتے تھے بس اس کو دیکھ لیا جائے، اُن کی زندگی قیامت تک کے لئے اسلام کا نمونہ اور معیار ہے۔ اسلام چونکہ ایک خاص قسم کی زندگی کا نام ہے اس لئے اس کو اسلام والوں کی زندگی ہی سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، اور اس کے لئے وہی نمونہ زیادہ قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے جو خود حضورؐ کی تعلیم و تربیت سے تیار ہوا تھا۔

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں آپ کو دو طرح کی چیزیں ملیں گی۔ ایک ان میں سے بعض حضرات کے وہ خاص خاص کمالات جو بعض میں ہیں اور دوسروں میں نہیں ہیں، مثلاً حضرت ابوبکرؓ بعض ایسے کمالات کے حامل ہیں جو حضرت عمرؓ میں بھی نہیں ہیں، اسی طرح حضرت عمرؓ میں بعض وہ کمالات ہیں جو ان کے علاوہ عام صحابۂ کرامؓ میں نہیں ہیں۔ اس قسم کے شخصی اور انفرادی کمالات کو ہم عمومی اسلامی زندگی کا نمونہ اور معیار نہیں کہہ سکتے، لیکن جو چیزیں صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت میں مشترک ہیں جن سے ان کا کوئی فرد بھی خالی نہیں، نہ امیر نہ غریب، نہ مرد نہ عورت، نہ بوڑھا نہ جوان، نہ پڑھا نہ بے پڑھا، نہ عربی نہ عجمی، تو ان چیزوں کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ اسلامی زندگی کے وہ اجزاء ہیں جن سے کسی مسلمان کو بھی خالی نہ ہونا چاہئے ——— میں اس وقت آپ کے سامنے صحابۂ کرامؓ کی زندگی کی چند وہی باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو اُنکی پوری جماعت میں عام طور سے پائی جاتی تھیں اور جن میں کسی بڑے چھوٹے کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس چیز کا ذکر مناسب ہوگا وہ یہ ہے کہ ان سب حضرات کا ایمان حقیقی اور شعوری تھا یعنی وہ جانتے تھے کہ اللہ و رسولؐ پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے اور اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔

آج جو مسلمان قوم ہمارے سامنے ہے اس میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے زندگی بھر میں کبھی ایک دفعہ بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ہمارے مسلمان ہونے کا کیا مطلب ہے اور ایمان و اسلام

کی کیا حقیقت ہے، بہت سے ایسے ہیں جو اسلامی کلمہ تک سے ناواقف ہیں، بہت سے ہیں جنھیں کلمہ کے الفاظ اگر معلوم ہیں تو اس کے معنی مطلب سے وہ آشنا نہیں ہیں، بہت سے ہیں جنھیں ایمان و اسلام کی ذمہ داریوں کا کوئی پتہ نہیں اور پتہ لگانے کی کوئی فکر بھی نہیں ہے —— لیکن صحابۂ کرامؓ میں اس طرح کا ایک آدمی بلکہ کوئی بچہ بھی نہیں ملے گا۔ اُن میں سے ہر فرد جانتا تھا اور خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے مومن و مسلم ہونے کا مطلب کیا ہے۔ ان میں سے جو شخص جس وقت اسلام کا کلمہ پڑھ کر اسلام میں آتا تھا وہ اسی وقت سے خوب سمجھتا تھا کہ میں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر کس بات سے انکار کیا اور کس چیز کا عہد اور اقرار کیا، اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ کر میں نے کیا فیصلہ کیا۔

بھائیو! "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" میں اس بات کا عہد و اقرار ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود و مالک نہیں، ہم اس کے اور صرف اسی کے بندے ہیں، ہم اس کی عبادت کریں گے اور اپنی پوری زندگی کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں کہ اسی کی بندگی میں گذاریں گے جس طرح کہ ایک بندہ کو گذارنا چاہئے۔ اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" میں اس بات کا فیصلہ اور اعلان ہے کہ ہم نے حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسولؐ مان لیا، اور اب ہم ایک امتی کی حیثیت سے آپ کے ہر حکم کو مانیں گے اور جس راستے پر آپ چلائیں گے اُس پر چلیں گے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صحابۂ کرامؓ میں ہر شخص ایمان کی اس حقیقت کو جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ایمان لانے کے بعد اب میں زندگی گذارنے میں آزاد نہیں ہوں کہ جس طرح چاہوں زندگی گذاروں بلکہ اب مجھے اللہ کی بندگی والی اور رسولؐ کی پیروی والی زندگی گذارنی ہے، اسی لئے ایمان لانے اور اسلام میں آنے کے بعد سب سے پہلی فکر اُن کو یہ ہوتی تھی کہ وہ ایمان والی اور بندگی والی اُس زندگی کو سیکھیں جس کی تعلیم رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) دیتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ اُن میں کا ہر شخص بقدرِ ضرورت دین سیکھنا ضروری سمجھتا تھا اور کسی نہ کسی طرح سیکھ لیتا تھا —— تو حقیقی اور شعوری ایمان کے بعد دوسری چیز جو اُن میں عام تھی وہ دین کا ضروری علم تھا۔ آپ میں سے بہت سے حضرات اس بات سے واقف ہوں گے کہ صحابۂ کرامؓ میں بہت بڑی تعداد ایسے حضرات کی تھی جو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے

یہاں تک کہ اگر آپ کاغذ قلم اُن کے سامنے رکھ کر درخواست کرتے کہ آپ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھ دیجئے، یا اپنا نام ہی اس کاغذ پر لکھ دیجئے تاکہ آپ کی ایک متبرک یادگار ہمارے پاس رہے تو وہ بڑی سادگی سے آپ سے کہہ دیتے کہ ہم لکھنا نہیں جانتے، اسی طرح اگر آپ قرآن شریف کی کوئی سورت مثلاً "الحمد شریف" ہی کاغذ پر لکھ کر اُن کے سامنے رکھتے اور عرض کرتے ذرا اس کو پڑھ کر سنا دیجئے! تو وہ (سورۂ فاتحہ زبانی یاد ہونے کے باوجود) بڑی بے تکلفی اور سچائی سے کہہ دیتے کہ ہم پڑھے لکھے نہیں ہیں —— لیکن صحابۂ کرامؓ میں جو اس طرح کے ان پڑھ تھے وہ بھی دین سے ناواقف نہ تھے۔ وہ حضورؐ کی صحبت میں حاضر ہوکر، آپؐ کی باتیں سُن سُن کر، اور آپؐ کا طریق عمل دیکھ دیکھ کر اور ضرورت کے موقعوں پر آپؐ سے پوچھ پوچھ کر ضروری درجہ کا علم دین حاصل کر لیتے تھے، اور اسی طرح بغیر لکھے پڑھے زبانی ہی قرآن شریف بھی یاد کر لیتے تھے —— الغرض صحابۂ کرامؓ میں جس طرح یہ بات عام تھی کہ وہ سب ایمان و اسلام کی حقیقت جانتے تھے اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ اسی طرح دوسری بات اُن میں یہ بھی عام تھی کہ ہر شخص اپنی ضرورت کے بقدر دین سیکھنا ضروری سمجھتا تھا اور اُس پوری جماعت میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کو دین سیکھنے کی فکر نہ ہو، اور جو دین کے ضروری احکام سے ناواقف ہو۔

تیسری چیز اُن میں جو عام تھی وہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر شخص دین کے متعلق جو کچھ جانتا تھا اُس پر عمل کرنا چاہتا تھا، بلکہ دین کا علم اسی لئے حاصل کرتا تھا کہ اس کے مطابق زندگی گذاری جا سکے۔ آج کل کے نوّے فی صدی سے زیادہ مسلمانوں کی جو یہ حالت ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے لیکن نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فرض ہے لیکن نہیں ادا کرتے، جانتے ہیں کہ جھوٹ حرام ہے لیکن اُس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے —— صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت میں کوئی ایک شخص بھی اس طرح کا نہیں ملے گا جو دین کی باتیں اور دینی احکام جانتا ہو، مگر ان پر عمل کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو، اور اپنی عملی زندگی میں اللہ کے اُن احکام سے بے پروا ہو جن کو وہ جانتا ہے —— بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں احکام پر عمل تو وہ لوگ بھی کرتے تھے جو سچے اور مخلص مومن نہ تھے جن کو قرآن شریف میں منافق کہا گیا ہے۔ آپ میں سے جو حضرات

زمانۂ نبوی کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اُس زمانہ میں منافقین بھی مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھتے تھے، زکوٰۃ بھی ان کو ادا کرنی پڑتی تھی، اور مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں بھی وہ شریک رہتے تھے، کیونکہ اُس زمانہ میں مسلمانوں کی عام زندگی یہی تھی، اور جو شخص اسلام کے ان مطالبات کو ادا نہ کرتا وہ ایمان والوں کی جماعت میں شمار نہیں ہو سکتا تھا ——— الغرض صحابۂ کرامؓ کی جماعت میں اور اُس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں اسلامی احکام پر عمل تو اتنا عام تھا کہ سچے اور مخلص مسلمانوں کے ساتھ ان منافقوں کو بھی عمل کرنا پڑتا تھا جن کے دلوں میں پورا ایمان بھی نہ تھا۔

چوتھی چیز جو صحابۂ کرام کی زندگی میں ہم کو عام اور مشترک ملتی ہے وہ خدا کا خوف، اور آخرت کی فکر ہے، پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ کی پوری جماعت میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے دل پر خدا کے خوف کا غلبہ نہ ہو اور جس کو آخرت کی فکر دنیا کی ساری فکروں سے زیادہ نہ ہو، حتیٰ کہ ان میں سے جن بزرگوں کو زندگی ہی میں نبوت کی زبان سے جنّت کی بشارت مل چکی تھی اُن کا حال بھی یہ تھا کہ خدا کے خوف سے روتے روتے اُنکی آنکھوں کی سیاہی پھیکی پڑ گئی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے متعلق کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ آنکھوں سے آنسو جاری رہنے کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا تھا اور اُن کے چہرے پر آنسو بہنے کی جگہ دو نیلگوں خط سے پڑ گئے تھے، اور کبھی کبھی رو رو کر کہا کرتے تھے کہ کاش میں جنگل کا کوئی درخت ہوتا جس کو کاٹا جاتا، یا گھاس کا پودا ہوتا جس کو کوئی جانور چر لیتا، اور آخرت میں مجھے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی نہ پڑتی ——— اسی طرح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا یہ حال تھا کہ فطری طور پر مضبوط دل اور طاقتور ہونے کے باوجود کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ عذاب کی کوئی آیت سُنکر بیمار پڑ جاتے، جب شہید کئے گئے ہیں تو روتے تھے، خنجر کے زخم کی تکلیف سے نہیں، بلکہ اللہ کے عذاب اور آخرت کے حساب کتاب کی فکر سے، یہاں تک کہ جب حضرت صہیبؓ نے اُن کو تسلی دی اور بتلایا کہ آپ دنیا میں اللہ کی رضا کے ایسے ایسے کام کر کے جا رہے ہیں، اور آپنے اللہ و رسولؐ کی وفاداری اور دین کی اور مسلمانوں کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے، تو فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے برابر سرابر پر بھی چھوڑ دے یعنی نیکیوں کا ثواب نہ ملے اور خطاؤں پر عذاب نہ ہو تو میں سمجھوں گا کہ

کامیاب ہو گیا ——— اسی طرح حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کے دیکھنے والوں نے بیان کیا ہے کہ ہم نے ان کو راتوں کی اندھیری اور تنہائی میں اس طرح بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھا ہے، جیسے کسی زہریلے جانور کا ڈسا ہوا آدمی روتا ہے ——— اور یہ تو اکابر صحابہؓ ہیں میں تو کہتا ہوں کہ انہیں جو لوگ ادنیٰ[1] درجہ کے تھے، اور جن سے کبھی کبھی بڑے بڑے گناہ بھی ہو گئے ہیں، اُن کا حال بھی یہ تھا کہ گناہ کرنے کے بعد خدا کے خوف اور آخرت کے عذاب کے خیال سے دنیا ان کے لئے بے مزہ اور زندگی دوبھر ہو جاتی تھی، اور عذاب آخرت سے بچنے کے لئے وہ بڑی سے بڑی سزا کیلئے خود اپنے کو پیش کر دیتے تھے، اور جب تک وہ سزا اُن کو مل نہ جاتی تھی اُنھیں چین نہ آتا تھا۔

حضرت ماعزؓ ایک صحابی ہیں اُن سے بہت بڑا ایک گناہ ہو گیا، یعنی بے چارے زنا کے مرتکب ہو گئے، نفس کے تقاضے سے یہ گناہ تو کر بیٹھے، لیکن خدا کے خوف کا اتنا غلبہ ہوا کہ خود حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آکر عرض کر دیا کہ حضرتؐ مجھ سے ایسی ناپاک حرکت ہو گئی ہے لہذا مجھے پاک کرا دیجئے، یعنی مجھے شرعی سزا دلوا دیجئے یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت ماعزؓ کنوارے نہ تھے، شادی شدہ تھے، اور جانتے تھے کہ شادی شدہ آدمی اگر ایسا گناہ کرے تو اسکی سزا سنگساری ہے جس کا طریقہ یہ تھا کہ زمین میں ایک گڑھا کھود کر مجرم کو قریبًا کمر تک دبا دیا جاتا تھا، اور صرف کمر سے اوپر کا حصہ زمین کے اوپر رہتا تھا، پھر اُس شخص کو پتھروں وغیرہ سے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

بہر حال حضرت ماعزؓ جانتے تھے کہ مجھے کیا سزا دیجاویگی اور وہ کتنی سخت ہوگی، اور سزا کے علاوہ میری کیسی رسوائی ہوگی، مگر اس کے باوجود خدا کا خوف اور آخرت کے عذاب اور رسوائی کا یقین اُن کو کھینچ کر حضورؐ کی خدمت میں لے آیا، حالانکہ اُن کے متعلق کوئی رپورٹ نہیں تھی، اور اگر وہ خود اپنے جرم کو چھپا لیتے تو شائد آج تک کسی کو اطلاع نہ ہوتی، لیکن آخرت کے عذاب کا خیال اُن پر اس قدر غالب آیا کہ سنگساری کی تکلیف کو انہوں نے اس کے مقابلہ میں بہت ہلکا سمجھا، اور خود حضورؐ سے اس سزا کی درخواست کی، اور جب حضورؐ نے ایک خاص اصول کے ماتحت

---

[1] یعنی جو اکابر صحابہؓ کی نسبت سے ادنیٰ تھے، ورنہ فی الحقیقت اُن میں کوئی ادنیٰ نہ تھا۔ ۱۲

ان کو کوئی جواب نہیں دیا، اور سزا کا بھی حکم نہیں دیا، تو انھوں نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ حضورؐ کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کیا، اور سزا کی درخواست پر اصرار کیا، جس کے بعد اُن کو سزا دی گئی اور وہ سنگسار کر دیئے گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اور اس سے زیادہ عبرت کا واقعہ ایک صحابی عورت کا ہے جن کو حدیث میں غامدیہ کہا گیا ہے۔ اس اللہ کی بندی سے بھی وہی گناہ ہو گیا تھا، یعنی یہ بے چاری بھی نفس کی خواہش سے مغلوب ہو کر زنا کی مرتکب ہو گئی تھی، اور کسی کو بھی اس کے اس گناہ کی اطلاع نہیں تھی، مگر اس کو یقین تھا کہ اللہ کو میرے اس گناہ کا علم ہے، اور اس کا عذاب دنیا کی ساری تکلیفوں سے زیادہ سخت ہے، پس اللہ کے عذاب ہی کے خوف نے اسے بھی مجبور کیا، اور وہ بھی خود ہی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا حضرتؐ مجھ سے ایسا ناپاک کام ہو گیا ہے لہذا مجھے سزا دلا کر پاک کر دیجئے۔ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پہلے کوئی توجہ اُن کی طرف نہیں فرمائی، گویا کہ آپ نے سنا ہی نہیں کہ کسی نے کیا کہا ہے۔ حضورؐ کی اس بے توجہی کو دیکھ کر پھر اس بندی نے عرض کیا کہ حضورؐ یہ بات میں کسی پاگل پنے سے نہیں کہہ رہی ہوں، میں ہوش و حواس میں ہوں، اور واقعۃً مجھ سے یہ ناپاک گناہ ہو گیا ہے لہذا مجھے سنگسار کرا دیجئے، تاکہ آخرت کے عذاب سے میں بچ جاؤں۔ اسی سلسلے میں اُس نے حضورؐ کو یہ بھی بتلا دیا کہ میرا اندازہ ہے کہ اس زنا سے مجھے حمل بھی رہ گیا ہے، جب حضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو پھر اس وقت تم پر سزا جاری نہیں کی جا سکتی، اب تم واپس جاؤ اور اپنے گھر رہو، جب بچہ پیدا ہو جائے تو پھر آنا (بچّے کے پیٹ میں ہوتے ہوئے شرعی سزا نہیں دی جا سکتی، جو جان بے قصور ہے اُسے کیوں ہلاک کیا جائے) بہر حال حضورؐ نے اس عورت کو واپس کر دیا، حمل کی مدّت پوری ہو جانے پر جب بچہ پیدا ہوا تو اللہ کی یہ بندی نومولود بچّے کو ہاتھوں میں اٹھائے پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں فلاں گنہگار عورت ہوں اب یہ بچّہ ہو چکا لہذا اب مجھے سزا دلا کر پاک کر دیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا ابھی نہیں، ابھی اس بچّے کو تمہارے دودھ کی ضرورت ہے، جاؤ جب یہ تمھارے دودھ کا محتاج نہ رہے اور روٹی ٹکڑا کھانے کے قابل ہو جائے تب ہمارے پاس آنا، چنانچہ یہ اللہ کی بندی بچے کو پالتی رہی اور جب وہ ٹکڑا

چبانے کے قابل ہو گیا تو بچے کو گود میں لیکر اس ہیئت کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے بچے کے ہاتھ میں دے رکھا تھا اور وہ اس کو چبا چبا کر کھا رہا تھا۔ بہر حال اس شان کے ساتھ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ حضرت میں فلاں گنہگار عورت ہوں جس کی سزا کو آپ نے اس بچے کی پرورش کی وجہ سے اب تک ملتوی کیا ہے، اب اس بچے کو میرے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، دیکھ لیجئے یہ روٹی کھانے لگا ہے، لہذا اب اس کو کسی کے سپرد فرما دیجئے اور مجھے سنگسار کرا دیجئے، تاکہ آخرت کے عذاب کی طرف سے مجھے اطمینان ہو جائے۔ چنانچہ حضورؐ کے حکم سے یہ اللہ کی بندی سنگسار کر دی گئی۔ سنگسار کرنے والوں میں ایک مشہور صحابی تھے، ان کی زبان سے ایک سخت کلمہ اس بے چاری کے متعلق نکلا، حضورؐ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان صحابی سے فرمایا کہ تم نے ایسا کلمہ اللہ کی اس بندی کے متعلق کہا، تمہیں کیا خبر ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر سب اہلِ مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کی نجات کے لئے کافی ہو۔

ان دونوں واقعوں میں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ بغیر کسی رپورٹ، یا شہادت کے خود انھوں نے اپنے جرم کی اطلاع کی اور اصرار کے ساتھ سزا کی درخواست کی، اور خاص طور سے غامدیہ کو کئی دفعہ اس کا موقع ملا کہ اگر وہ سزا سے بچنا چاہے تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو، کیونکہ وہاں کوئی ضمانت و مچلکہ تو تھا نہیں، اور درمیان میں اتنا زمانہ بھی گذرا جس میں اس کے دل میں سیکڑوں ہزاروں دفعہ زندگی کی بہاروں اور دنیا کی لذتوں کا خیال آیا ہو گا، اور شاید طرح طرح کے وسوسے شیطان نے دل میں ڈالے ہوں گے، لیکن اللہ کا خوف اور آخرت کے عذاب کا ڈر اتنا غالب تھا کہ اس نے زندگی مشکل کر دی تھی، اور ساری لذتوں کی طرف سے دل سرد کر دیا تھا۔ یہ حال ان مردوں اور عورتوں کا تھا جن سے زنا جیسے گناہ ہوئے، بس اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی جماعت میں خدا کا خوف اور آخرت کا فکر کس درجہ عام تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ آج ہم لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے، اور ہم مسلمانوں کو دیکھ کر ہمارے بزرگوں کے ان واقعات پر یقین لانا بھی آج دنیا کے لئے مشکل ہے۔

صحابۂ کرامؓ کی اسی صفت کو دوسری طرح یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ان کی زندگی خدا سے غفلت اور آخرت فراموشی کی زندگی نہیں تھی، اللہ کا اور اس کے حکموں کا اور اُسکے عذاب اور مواخذہ کا انھیں برابر دھیان رہتا تھا، اور اگر کسی وقت شیطان انھیں غافل کر کے اُن سے کوئی گناہ کرا بھی دیتا تھا تو جلدی ہی وہ غفلت سے چونک پڑتے تھے اور پھر توبہ و استغفار اور دنیوی سزا کے ذریعہ گناہ کے ناپاک اثر کو جب تک دھو نہ ڈالتے تھے انھیں چین نہ آتا تھا چاہے اس کے لئے انھیں اپنی جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں۔

مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا آج جو یہ حال ہے کہ اُن کی ساری زندگیاں اللہ سے غافل اور آخرت سے بے فکر ہو کر گذر رہی ہیں۔ صحابۂ کرامؓ اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایمان و اسلام کے دعوے کے ساتھ کوئی شخص ایسی زندگی بھی گذار سکتا ہے۔ بہر حال اُن کی زندگی اللہ کے ذکر اور آخرت کی فکر کی زندگی تھی۔ قرآن مجید میں اسی زندگی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْاَبْصَارُ ؕ —— یعنی وہ ہر حال میں ذاکر اور با خدا تھے، نماز کے وقت وہ نماز کے ذریعہ خدا کو یاد کرتے تھے، تجارت اور خرید و فروخت اور اس طرح کے دوسرے معاملات میں وہ اللہ کے احکام کی پابندی کے ذریعہ اس کو یاد رکھتے تھے، مصیبت میں صبر اور راحت میں شکر اُن کا ذکر تھا، حاجتوں اور مشکلوں میں دعا اور استعانت اور خطا ہو جانے پر استغفار اور انابت اور سچّی توبہ اور سزا کے لئے خود اپنے کو پیش کر دینا اُن کی عام سیرت تھی اور وہ قیامت کے اُس آنے والے دن سے ڈرتے اور لرزتے رہتے تھے جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی، الغرض اُن کی پوری زندگی اللہ کے ذکر اور آخرت کے فکر کی زندگی تھی اور یہ صفت اُس پوری جماعت کی صفت تھی جس سے اُن کا کوئی فرد بھی خالی نہ تھا۔

پانچویں چیز جو صحابۂ کرامؓ میں اسی طرح عام تھی وہ ان کی سچّی اسلامی اخوت اور باہمی محبت اور ہمدردی تھی۔ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تربیت نے گویا خود غرضی کا بیج ہی ان کے دلوں سے نکال دیا تھا۔ اس سلسلے میں میں دو واقعے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک جنگ میں، غالباً یرموک کی جنگ میں ایک صاحب شریک تھے، ایک دن وہ میدانِ جنگ سے واپس نہیں آئے اور کسی سے ان کی خبر خبر بھی نہیں ملی تو ان کے ایک بھائی ان کی تلاش میں نکلے اور اس خیال سے کہ شاید وہ کہیں پیاس کی حالت میں پڑے ہوں پانی کا ایک مشکیزہ بھی ساتھ لے لیا۔ اتفاق سے وہ ایک جگہ ایسی حالت میں پڑے ہوئے ملے کہ بس دم توڑ رہے تھے۔ اور جاں کنی کا وقت تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ پانی دوں؟ انھوں نے اشارہ سے ہاں کی، یہ مشکیزہ سے پانی نکال ہی رہے تھے کہ قریب ہی سے کسی اور پڑے ہوئے زخمی کی کراہٹ کی آواز آئی۔ ان کے بھائی نے اشارہ سے کہا کہ جس بھائی کی یہ آواز آرہی ہے پہلے ان کو پانی دے کے آؤ۔ یہ پانی لے کے ان کے پاس پہونچے۔ ان کا بھی آخری دم تھا، انھوں نے ان کو پانی دینا چاہا لیکن ابھی دینے نہ پائے تھے کہ قریب ہی سے کسی تیسرے زخمی کی ہچکی کی آواز آئی، ان دوسرے صاحب نے یہ آواز سن کر اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پانی دو۔ چنانچہ یہ صاحب پانی لے کر ان تیسرے صاحب کے پاس پہونچے، لیکن اتنی ہی دیر میں وہ جاں بحق ہو چکے تھے۔ پھر جب یہ ان کے پاس سے لوٹ کر دوسرے صاحب کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ بھی ختم ہو گئے۔ پھر جب اپنے بھائی کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ بھی اللہ سے واصل ہو چکے ہیں۔

دوسرا واقعہ جو میں اس سلسلہ میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی کے یہاں بکری ذبح ہوئی انھوں نے اس کی سری اپنے کسی ساتھی کے یہاں ہدیہ کے طور پر بھیج دی۔ ان صاحب نے شکریہ کے ساتھ لے لی۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ خود کھا پکا لیتے اس کو کسی اور صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ان صاحب نے اس کو ایک اچھا تحفہ سمجھ کر کسی چوتھے صاحب کے گھر پہونچا دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سری اس طرح سات گھروں پھر کر پھر ہدیہ اور تحفہ کے طور پر اسی گھر واپس آئی جہاں سے چلی تھی۔

ان دونوں واقعوں سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ایثار اور ان کی ہمدردی و غمخواری صحابہ کرام کی عام مشترک صفت تھی جس میں زید، عمرو، بکر کی کوئی خصوصیت نہ تھی؛ بلکہ اس سوسائٹی میں ہر فرد کا یہی حال تھا کہ وہ دوسروں کے حق کو اور دوسروں کی ضرورت کو اپنے حق اور اپنی ضرورت پر مقدم سمجھتا تھا۔

چھٹی چیز جو صحابہ کرام میں اسی طرح عام تھی وہ دین کی خدمت کا جذبہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جدوجہد اور قربانی کا شوق تھا۔ صحابہ کی پوری جماعت میں تلاش کرنے سے بھی آپ کو کوئی ایسا فرد نہ ملے گا جو اس چیز سے خالی ہو۔ حد یہ ہو کہ عورتوں اور بچوں کے سینے بھی اس جذبہ اور اس شوق سے بھرے ہوئے تھے: مائیں اور بہنیں اور بیویاں ایمانی ذوق و شوق کے ساتھ اپنے بیٹوں، اور بھائیوں اور شوہروں کو جہاد کے لیے رخصت کرتی تھیں۔

ایک بوڑھے صحابی تھے جن کے پاؤں میں لنگ بھی تھا اور آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید میں لنگڑوں کو صراحۃً جہاد سے معذور و مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو لیکن ایک جہاد کے موقع پر یہ صاحب بھی جانے پر مصر ہوئے، ان کے کئی جوان بیٹے تھے انھوں نے ان کو روکنا چاہا اور کہا کہ ہم جا رہے ہیں اور آپ کو اللہ نے بھی مستثنیٰ کر دیا ہو اس لیے آپ نہ جائیں، بلکہ گھر ہی پر رہیں۔ یہ اس پر راضی نہ ہوئے اور بالآخر مقدمہ حضور کے سامنے پیش ہوا، آپ نے بیٹوں سے تو یہ فرمایا کہ بھئی! جب یہ جانا ہی چاہتے ہیں تو تم انھیں کیوں روکتے ہو، انھیں شہادت کا شوق ہو تو جانے دو ___ اور بوڑھے اور لنگڑے باپ سے فرمایا کہ بھئی جب اللہ نے تمھیں معذور قرار دے دیا ہو اور جہاد تم پر فرض نہیں ہو، اور اللہ کے دیے تمھارے یہ جوان بیٹے موجود ہیں جو جا رہے ہیں تو پھر تم نہ جاؤ تو کیا حرج ہو؟ ان بوڑھے صحابی نے عرض کیا حضور میرا جی چاہتا ہو کہ میں اپنی اس لنگڑی ٹانگ کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑوں اور مارا جاؤں تو اس لنگ کے ساتھ خدا کے سامنے حاضر ہوں اور اسی لنگڑی ٹانگ سے جنت میں جاؤں اسی طرح اسلامی تاریخ میں صحابی بچوں کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ چھپ چھپ کر اسلامی لشکروں کے ساتھ میدان جہاد میں جاتے تھے اور دینی جدوجہد کی راہ میں خاک و خون میں تڑپنا ان کا سب سے زیادہ مرغوب کھیل تھا۔ صحابۂ کرام کی پوری جماعت میں دین کی خدمت کا جذبہ اور اس کی راہ میں قربانی کا شوق جس قدر عام تھا اس کا کسی قدر اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ صحابہ کے تذکرہ میں جو بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً استیعاب، اسد الغابہ، اصابہ، آپ ایک طرف سے ان میں سے کسی کو دیکھنا شروع کیجیے اور صرف یہ دیکھتے جائیے کہ یہ صحابی کہاں پیدا ہوئے اسلام لانے کے بعد ان کی زندگی کہاں کہاں اور کن مشاغل میں گذری اور کہاں یہ دفن ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ کو ان کتابوں میں اکثر صحابہ کے متعلق بلکہ قریب قریب سب کے متعلق یہی ملے گا

کہ یہ صاحب فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے، اسلام لانے کے بعد زندگی کا اصل مشغلہ بس دین کی خدمت تھا فلاں جنگ میں شہید ہوئے، یا دین کے فلاں شعبہ کی خدمت کرتے ہوئے فلاں شہر میں ان کی وفات ہوئی اور فلاں جگہ مدفون ہیں۔ اگر آپ اس نظر سے صحابہ کے تذکروں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ مکہ اور مدینہ میں پیدا ہونے والے صحابیوں میں بہت تھوڑے ہیں جو مکہ میں یا مدینہ میں، یعنی اپنے اصل وطن میں دفن ہوئے ہیں ورنہ اکثر وہی ہیں جن کا گھر اگرچہ مکہ یا مدینہ تھا لیکن دین کی خدمت اور دین کی جدوجہد کے سلسلہ میں دوسرے ملکوں کی خاک میں دفن ہیں۔

صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد کا اپنے وطنوں سے دور ملکوں اور شہروں میں دفن ہونا حالانکہ وہ آج کل کے فوجیوں کی طرح کسی حکومت کے تنخواہ دار نوکر نہ تھے بلکہ اپنے ایمانی جذبہ سے اور صرف دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اپنا دینی فرض سمجھ کر محض رضا کارانہ طور پر وہ یہ سب کچھ کرتے تھے۔ تو یہ اس کی بڑی دلیل ہو کہ یہ صفت بھی ان میں ایمان اور خوفِ خدا کی طرح ہی عام تھی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ ایک جنگ کے موقع پر حضرت خالد بن الولید نے رومی فوجوں کے سپہ سالار کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میرے ساتھ اللہ کے جو بندے اور اسلام کے جو سپاہی ہیں وہ دین کی راہ میں جان دینے اور اللہ کے لیے خاک و خون میں تڑپنے کے ایسے ہی عاشق ہیں جیسے رومی لوگ شراب کے عاشق ہوتے ہیں۔ درحقیقت حضرت خالد کے خط کا یہ ایک جملہ جس کو تاریخ نے ابتک محفوظ رکھا ہو، صحابۂ کرام کی اس عمومی صفت کا اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہو۔ الغرض صحابۂ کرام میں جس طرح حقیقی اور شعوری ایمان عام تھا جس طرح دین کا ضروری علم اور اس کی مطابق عمل عام تھا جس طرح خدا کا خوف اور آخرت کی فکر عام تھی اور جس طرح باہمی محبت و ہمدردی کی صفت عام تھی اسی طرح دین کی خدمت اور دین کیلیے جد و جہد اور اس راہ میں فداکاری و قربانی کا شوق بھی عام تھا۔ اس دور میں جو مومن و مسلم تھا وہ دین کا خادم اور دین کی راہ میں جد و جہد کرنے والا بھی تھا۔　　(باقی)

تصوّف و سلوک

(از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ)

۷

(اس سلسلہ کی اشاعت اب سے ۷-۸ مہینے پہلے الفرقان میں شروع ہوئی تھی آج اس کی ساتویں قسط ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے۔ یہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ در اصل یہ ایک مستقل اور مبسوط تصنیف ہے۔ مخدوم و محترم حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی (سابق پروفیسر فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی) نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (نور اللہ مرقدہ) کی دینی خدمات اور اصلاحات و تجدیدات پر چار مستقل کتابیں اب تک مرتب فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ "تصوف و سلوک" ہے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی سیکڑوں تصانیف اور مواعظ و ملفوظات کے ہزاروں اوراق میں دین کے اس اہم شعبہ (تصوف و سلوک) کے متعلق جو تحقیقات و تجدیدات منتشر تھیں حضرت مولانا ندوی ممدوح نے نئے تصنیفی انداز میں اپنی توضیحات و تقریبات کے ساتھ ان سب کو بہترین طریقہ سے پانچ سو صفحہ کی اس ایک کتاب میں جمع کر کے دین کے اس اہم شعبہ کی بلاشبہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے جو در اصل دین کی روح اور اس کا قلب ہے۔ اس وقت کتاب پر تبصرہ یا تقریظ لکھنا مقصود نہیں لیکن چونکہ جی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ کے بندے اس کتاب کا مطالعہ کر کے دین کے اس شعبہ کے متعلق اپنے خیالات کو درست اور اپنے ذہنوں کو صاف کریں اس لئے بے تکلف اتنا عرض کرتا ہوں کہ خود مجھے اس کتاب سے غیر معمولی فائدہ ہوا ہے اور دل کی بہت سی گرہوں کو اس کے مطالعہ نے کھولا ہے۔

اس کے آخری ابواب میں سے پورا ایک باب اب سے قریباً ایک سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں "حیات طیبہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا ممدوح نے میری استدعا پر اس کے ابتدائی چند ابواب کا مسودہ بھی، شاعت کی اجازت کے ساتھ مرحمت فرما دیا تھا چنانچہ اب تک چھ قسطوں میں کتاب کا قریباً چوتھائی حصہ شائع

ہو چکا ہے لیکن یہ سب مسلسل نہیں تھا کہیں کہیں درمیان سے کچھ چھوڑا بھی جاتا رہا ہے اگر اب چونکہ کتاب کی طباعت قریباً مکمل ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ بقیہ دو ہفتہ میں اصل کتاب ہی بالکل مکمل شکل میں پریس سے آجانے والی ہے[1] اس لیے آج کی قسط پر الفرقان میں اس کی اشاعت کا سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ آخری قسط بھی مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف مقامات کے کتاب کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے ——— "مدیر"

(۱)

تصوف بے عملی کا نہیں کمال عمل کا نام ہے! جس دین کی رو سے انسان کی تخلیق کا مقصد اور ترقی کا مدار ہی تمام تر اعمال ہوں، بلکہ جس نے ایمان کی روشنی و رہنمائی میں سارے اعمال صالحہ کو عین عبادت قرار دیدیا ہو۔ پھر ان اعمال صالحہ سے نماز روزہ وغیرہ کے عرفی عبادات ہی مراد نہ ہوں بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے سارے معاملات، اخلاق و معاشرت حکومت و سیاست، جہاد و قتال امن و صلح، تہذیب و تمدن غرض پوری عملی زندگی کے جزئی سے جزئی اعمال اس کے دائرہ میں داخل ہوں اور معمولی سے معمولی نشست و برخاست، اکل و شرب تک کے آداب و احکام اس کی رہنمائی سے محروم نہ ہوں اور تصوف نام ہو اسی دین کے درجۂ کمال کا تو ایسے تصوف کے معنی ایمان کے ساتھ کمال عمل کے سوا ہو ہی کیا سکتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس کمال عمل تصوف کو اس کے غیر محقق معتقدین و منکرین دونوں نے مسائل زندگی سے فرار و بیزاری رہبانیت و خانقاہ نشینی باور کر رکھا ہے۔

استخفاف عمل کی غلطی! معتقدین نے تو عشق و محبت، قرب و معیت، وجودیت و عینیت وغیرہ کی فنی اصطلاحات کے معنی بزعم خود خدا جانے کیا کیا قرار دے لیے کہ معاملات و معاشرت اور اخلاق کے دینی احکام و اعمال کا ذکر ہی کیا صوم، صلوٰۃ وغیرہ عبادات تک کا ان کے قلب میں استخفاف پیدا ہو گیا پھر بعض بزرگوں کے ہاں کسی غلبۂ حال یا عذر خاص کی بنا پر اعمال کے اہتمام میں اگر کچھ کمی دیکھی تو اس حال یا عذر کو تو سمجھے نہیں، الٹے

---

[1] پوری کتاب پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقدمہ ہے۔ جلد بھی خوشنما ہے جس پر گرد پوش چڑھا ہوا ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ کتب خانہ الفرقان سے بھی طلب فرمائی جا سکتی ہے۔ ناظم کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

حیلہ جو نفس کے فریب میں آکر اس مغلوبیت و معذوری ہی کو عین کمال سمجھ لیا جس کی نقالی میں دین و دنیا دونوں سے مارے گئے۔

دوسری طرف اس طرح کے اپنے پرائے غیر محقق منکرین نے ایسی باتوں سے بدگمان ہوکر خود تصوف کو سراپا بے عملی، رہبانیت و خانقاہ نشینی یا صبر و توکل، ترک و تجرد، زہد و قناعت، تحمل و تواضع وغیرہ کو پست ہمتی کی تعلیمات اور بزدلانہ سلبی اخلاق کا مجموعہ سمجھ کر سرے سے انکار کر دیا۔ یا اسلامی تصوف کو بھی جوگیوں اور اشراقیوں، ہندؤں اور نو فلاطونیوں کی طرح بلکہ انھیں سے ماخوذ و مستفاد نرے گیان و دھیان کا کوئی نظام یا سریت (مسٹزم) کا کوئی فلسفہ قرار دے کر داد تحقیق دی۔

پھر عشق و محبت، قرب و وصال، وجودیت، وشہودیت، عینیت و غیریت کے سے مسائل و مضامین تصوف کی بڑی بڑی کتابوں اور بڑے بڑے صوفیہ کے کلام میں اس کثرت و شدت سے داخل و پیوست ہیں، کہ ظاہر بین نگاہوں میں احکام و اعمال کے بجائے تصوف تمام تر نام ان ہی چیزوں کا ہوگیا۔ نیز جن گوناگوں دقیق و فلسفیانہ عنوانات اور نو بنو رنگین و شاعرانہ تعبیرات سے ان مضامین کو بیان کیا جاتا ہے، وہ اور بھی بظاہر کتاب و سنت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کی عملی و اتباعی حیات کے برعکس ایک خالص نظری شاعری و فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نظر نہیں آتا۔

لہذا ان مضامین سے متعلق حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ کی تجدیدات و تحقیقات کو اوپر جو ذرا شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا، وہ ان تہ بتہہ پیدا ہونے والی غلطیوں کے ازالہ، اور اسلامی تصوف سے ان چیزوں کے صحیح تعلق کے فہم کے لیے ازبس ضروری تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عشق و محبت قرب و معیت، وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود، سب در اصل ایک ہی معنون، ایک ہی حقیقت یعنی عبدیت کی (جو خالص کتاب و سنت کا نچوڑ ہے)، تعبیر و تفہیم کے مختلف عنوانات و اسالیب یا فنی اصطلاحات ہیں۔ اور تقریب فہم کے لیے نئی نئی تعبیرات و عنوانات یا اصطلاحات دینی و دنیوی کس علم و فن میں مناسب وقت و موافق حاجت اختیار اور وضع نہیں کرلی جاتی ہیں۔

اصل مدعا عبدیت ہے جو عمل و اطاعت کا کمال ہے

ورنہ بڑا منشا و مدعا ان سب عنوانات و اصطلاحات کا عبد و رب کے اسی ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون والے منصوص تعلق عبادت و عبدیت یا بندگی و سرافگندگی کو واضح کرنا اور عملی زندگی میں اس کو پیوست کرنا ہے۔ تاکہ حق تعالیٰ سے ہمارا وہی تعلق پیدا ہو جائے، جو کسی ہمہ وقت کمربستہ و بے عذر غلام کو اپنے مالک سے ہوتا ہے، نیز ذات و صفات، احاطت و معیت، قرب و اقربیت کی معرفت سے کانک تراہ فان لم تکن تراہ فهو يراك" کا وہ احسانی رنگ پیدا ہو جائے، جو کسی غلام کو اپنے مالک کی عین حضوری و پیشی میں حاصل ہوتا ہے، کہ اس کے چھوٹے بڑے احکام سے سرمو تجاوز نہیں کرتا اور یہی عمل و اطاعت کا کمال ہے۔

کمال عبدیت کمال تسلیم و رضا کو مستلزم ہے

مالک بھی کیسا جو ہر طرح "کمال وجمال ونوال" کا مالک وجامع ہو، جس کے ساتھ نہ صرف خشک غلامانہ بلکہ عاشقانہ وابستگی بھی لازم ہے۔ اگر عبدیت و بندگی کا یہ تعلق عشق و محبت کے جذب و شوق سے بالکل خالی اور نرا مملوکانہ و مجبورانہ نوعیت کا ہو، تو بری بھلی طرح احکام کی عملی اطاعت تو ہو گی، لیکن قلبی رضا کارانہ سلامہ مفقود ہو گا۔ اور "ہر چہ از دوست می رسد نیکوست" کا مقام، رضا نصیب نہ ہو گا۔ بلکہ طبیعت کے ناموافق احکام میں الٹے بددلی وشکایت کا خطرہ رہے گا اسی لیے "حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک حبی و عشقی تعلق کا رنگ کچھ نہ ہو مراقبہ توحید کی اجازت نہیں مرحمت فرمایا کرتے تھے کہ ہر خیر و شر رنج و راحت کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے دیکھ کر خلاف طبع ناقابل تحمل باتوں میں شکایت و ناشکری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے" کمال عبدیت و بندگی کے ساتھ کمال تسلیم و رضا کا تو یہ عالم ہونا چاہیے کہ

ناخوش تو خوش بود بر جان من | دل فدائے یار دل رنجان من
نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت | سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی
فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب | کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

حضرات صحابہؓ کی عملی زندگی میں خدا و رسول کی محبت نے ہی عاشقانہ رنگ تو غالب کر دیا تھا جس کی بدولت احکام کے سامنے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ نہ تبر سے ڈرتے

تھے نہ تلوارے۔ نہ اہل وعیال کی محبت مزاحم اتباع واطاعت ہوتی تھی، نہ وطن ودیار کا انس مانع غربت وہجرت ہوتا تھا۔

عشق ومحبت وجودیت وشہودیت سب کا بڑا مقصود وہی عبدیت کی عملی زندگی اور اس کے کمال یعنی مقام احسان ورضا کا حصول ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی کا وجود نظر میں رہ جائے، نہ اس کے احکام کے مقابلہ میں دوسروں سے خوف ورجا کا خیال ہو، نہ اپنے نفع وضرر کا پاس۔ ہر حال وخیال پر احکام کی اطاعت وفرمانبرداری غالب ہو۔

۲

نسبت باطنی کی علامت اور تصوف میں اعمال کی اہمیت تصوف میں جس کو نسبت باطنی کہا جاتا ہے، اسی قصد السبیل صفحہ ۲۸ پر اس کی علامت بھی یہ پڑھیے کہ

"علامت نسبت باطن کے حاصل ہونے کی دو ہیں ایک یہ کہ اللہ کی یاد دل میں ایسی جم جائے کہ کسی دم دل سے دور نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے حکموں پر چلنے کی طرف چاہے وہ احکام ایسے ہوں، جن میں اللہ نے اپنی عبادت کے طریقے بتلائے ہیں، اور چاہے وہ احکام ہوں جن میں بندوں کو آپس میں معاملہ کرنے کے طریقہ بتلائے ہیں اور چاہے وہ احکام ہوں جن میں نشست وبرخاست اور تمام کاموں کا طریقہ بتلایا ہے، ان سب حکموں کی طرف ایسی رغبت ہو جائے اور جس سے منع فرمایا ہے ان باتوں سے ایسی نفرت ہو جائے۔ جیسی کہ ان چیزوں کی طرف رغبت ہوتی ہے، جو اپنے جی کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، اور جیسی ان چیزوں سے نفرت ہوتی ہے، جو اپنے جی کو بری معلوم ہوتی ہیں[1] اور اس کی سب عادتیں مطابق قرآن شریف کے ہو جاویں"۔

اعمال کے بغیر خدارسی ناممکن ہے یہ ہے اسلام کے تجدیدی وصحیح تصوف کا لب ولباب کہ وہ نام ہے "قرآن شریف کے موافق سارے اعمال میں کمال کا۔ البتہ ان اعمال میں

---

[1] جیسا کہ قرآن پاک کی حسب ذیل آیت ہے کہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں ایمان کو محبوب ومزین بنا دیا اور کفر اور اللہ کی نافرمانی اور گناہ کی نفرت پیدا کر دی۔" من"

جس طرح فقہ کا خاص موضوع اعمال ظاہرہ ہیں۔ تصوف کا خاص موضوع اعمال باطنہ ہیں (مگر وہی اعمال ظاہرہ کے تقدم ولزوم کی شرط کے ساتھ) یعنی بغیر ظاہر وجوارح کے اعمال کے محض باطن وقلب کے اعمال واحوال میں کوئی شخص عمر بھی محنت ومشقت کرے گا ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ تک نہ پہونچے گا۔ نہ اسلامی تصوف کے معنی میں صوفی ہوگا اس لیے کہ اسلامی تصوف کی رو سے

اصل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے۔ جس کا ذریعہ ہے شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا۔ ان حکموں میں بعضے متعلق ظاہر کے ہیں جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ (عبادات) اور جیسے نکاح وطلاق، ادائے حقوق زوجین وغیرہ (دیانات) جیسے لین دین، وپیروی مقدمات وشہادت ووصیت وتقسیم ترکہ وغیرہ (معاملات) اور جیسے سلام وکلام وطعام وقیام وقعود مہمانی ومیزبانی وغیرہ (معاشرات) ان مسائل کو علم فقہ کہتے ہیں۔ اور بعضے متعلق باطن کے ہیں جیسے خدا سے محبت رکھنا، خدا سے ڈرنا، خدا کو یاد رکھنا۔ دنیا سے محبت کم کرنا، خدا کی مشیئت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی نہ ہونا غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ ان اخلاق کو سلوک کہتے ہیں۔

احکام باطن پر بھی عمل فرض ہے "اور مثل احکام ظاہری کے ان احکام باطن پر عمل کرنا فرض وواجب ہے نیز ان باطنی خرابیوں سے اکثر ظاہری اعمال میں خرابی آجاتی ہے۔ جیسے محبت حق کی کمی سے نماز میں سستی ہوگئی یا بعدی جلدی بلا تعدیل ارکان پڑھ لی۔ یا بخل سے زکوٰۃ وحج کی ہمت نہ ہوئی۔ یا کبر وغلبہ غضب سے کسی پر ظلم ہوگیا، حقوق تلف ہو گئے۔ وعلیٰ ذلک۔

اور اگر ان ظاہری اعمال میں احتیاط کی بھی جاوے، تب بھی جب تک نفس کی اصلاح نہیں ہوتی وہ احتیاط چند روز سے زیادہ نہیں چلتی"

لہذا نفس وباطن کی اصلاح نہ صرف اعمال باطنہ کے لیے ضروری ہے، بلکہ اعمال ظاہرہ کو کمال ودوام کے ساتھ ادا کرنے کے لیے بھی لازم ہے۔

پیر کی ضرورت "لیکن باطنی خرابیاں ذرا سمجھ میں کم آتی ہیں، اور جو سمجھ میں آتی ہیں ان کی درستی کا طریقہ کم معلوم ہوتا ہے، اور جو معلوم ہوتا ہے نفس کی کشاکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے ان ضرورتوں سے پیر کامل کو تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج و تدبیر بھی بتلاتا ہے، اور نفس کے اندر درستی کی استعداد اور ان معالجات میں سہولت اور تدبیرات میں قوت پیدا ہونے کے لیے کچھ اشغال و افکار کی بھی تعلیم کرتا ہے اور ذکر بذات خود بھی عبادت ہے۔

سالک کے دو کام پس سالک کو دو کام کرنے پڑتے ہیں ایک ضروری یعنی ظاہری و باطنی احکام شرعیہ کی پابندی اور دوسرا مستحب یعنی کثرت ذکر۔ پابندی احکام سے خدا تعالیٰ کی رضا اور کثرت ذکر سے زیادت رضا و قرب حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہے خلاصہ سلوک کے طریق و مقصود کا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تصوف و درویشی کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے جس کا انحصار ظاہری و باطنی اعمال کی پوری پوری پابندی ہے۔ اور ان اعمال کے دو درجے ہیں ایک فرائض و واجبات کا جن کی پابندی ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے۔ لہذا اس درجہ کے تصوف یا درویشی کا حصول بھی لازماً ہر مسلمان پر فرض ہے جس کا نام ولایت عامہ ہے۔ دوسرا درجہ وہی کثرت ذکر یا زیادت رضا و قرب کا ہے۔

"جس میں ظاہر کو نفل عبادتوں میں اور باطن یعنی دل کو اللہ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رکھے کسی دم غافل نہ ہو۔ یہ درجہ مستحب ہے اور لوگ اسی کو فقیری کہتے ہیں۔

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ

ناجائز درویشی "اگر اس دوسرے درجہ میں مشغول ہونے کے سبب پہلے درجہ کی باتوں میں سے کوئی ضروری بات چھوٹ جائے یا ان میں کسی قسم کا نقصان پڑ جائے، تو پھر اس دوسرے درجہ میں مشغول ہونا منع اور ناجائز ہے۔ جیسے بعض جاہل کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر درویشی کا دم بھرتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے جاہل اذکار و اشغال و مراقبات و ریاضات یا احوال کو درویشی و ولایت کا اصل مقصود جانتے ہیں۔ یہ نرا جہل ہے۔ مقصود صرف ظاہر و باطن کے اعمال ہیں۔ باقی متعارف اذکار و اشغال یا ریاضات و مراقبات محض اصلاحِ اعمال کی تدابیر ہیں۔ اور احوال محض ثمرات غیر لازمہ ہیں یعنی ایسے ثمرات، جن کا مرتب ہونا ضروری نہیں، نہ ان کا حصول ضروری و مقصود ہے۔

رسمی بیعت ضروری نہیں پیری و مریدی یا بیعت کو بھی بہتوں نے جو درویشی کے لیے لازم یا خالی بیعت ہی کو کافی سمجھ رکھا ہے یہ سراسر جہل ہے۔ پیری و مریدی کی اصلی غرض ظاہری و باطنی اعمال کی اصلاح خصوصًا نفسانی امراض کا علاج ہے۔ اگر پیر و مرید دونوں کی جانب سے اصلاح و علاج کا اہتمام پوری طرح ہو، تو نفس رسمی بیعت قطعًا ضروری نہیں۔ البتہ جیسے آدمی جسمانی بیماریوں میں تا بہ امکان بہتر سے بہتر حاذق و شفیق معالج و طبیب کو تلاش کر کے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسی طرح باطنی و نفسانی بیماریوں کے معالج یا شیخ میں بھی اس کا اہتمام لازم ہے۔ اسی لیے شیخ کامل کی پہچان معلوم کر لینا البتہ ضروری ہے۔

شیخ کامل کی پہچان (۱) بقدر ضرورت دین کا علم رکھتا ہو (۲) عقائد و اعمال و اخلاق میں شریعت کا پابند ہو (۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی دنیا کا ایک شعبہ ہے (۴) کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔ (۵) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں (۶) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم و دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں (۷) اس سے جو لوگ بیعت ہیں ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار شریعت و قلتِ حرص دنیا کے اچھی ہو (۸) وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو اور ان کی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے (۹) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو (۱۰) خود بھی ذاکر و شاغل ہو کہ بدون عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

اسی طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی سے نہیں۔ اصل میں یہ نفسانی تصرف ہے، جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کرسکتا ہے، اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں۔ کیونکہ اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔ صرف غبی مرید کے لیے جو ذکر سے بالکل متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں قبول آثار ذکر کا ایک گونہ تاثر و انفعال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جائے۔[1]

شریعت و طریقت اور معرفت و حقیقت کی تفسیر بھی اس سلسلہ میں کچھ مختصراً سن لینی چاہیے۔ کسی سائل کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

"شریعت نام ہے، احکام تکلیفیہ کے مجموعہ کا جس میں اعمال ظاہری و باطنی سب آگئے اور متقدمین کی اصطلاح میں لفظ فقہ کو اس کا مرادف سمجھتے تھے۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے معرفۃ النفس مالہا وما علیہا پھر متاخرین کی اصطلاح میں ظاہری اعمال سے متعلق شریعت کا جو جزو تھا اس کا نام فقہ ہو گیا۔ اور باطنی اعمال سے متعلق دوسرے جزء کا نام تصوف ہو گیا۔[2]

ان اعمال باطنی کے طریقوں کو طریقت کہتے ہیں۔ پھر ان اعمال باطنی کی درستی سے قلب میں جو جلا و صفا پیدا ہوتا ہے، اس سے قلب پر بعض حقائق کونیہ متعلقہ اعیان و اعراض بالخصوص اعمال حسنہ و سیئہ و حقائق الٰہیہ صفاتیہ و ذاتیہ

---

[1] تبویب تربیۃ السالک ص۱ ۱۲

[2] لیکن یہ دونوں باہم متضاد نہیں، بلکہ ثانی اول ہی کی اصلاح و تکمیل کا نام ہے، خاکسار کا ایک شعر ہے جس میں حضرت کے اس تجدید کی تمثیل ہے ؎

اب تو مینو نہیں ہے مین نہ برفتوائے شیخ　　اب وہی ہوگا فقیہہ شہر جو مینوش ہے

بالخصوص معاملات فیما بین اللہ و بین العبد منکشف ہوتے ہیں۔ ان مکشوفات کو حقیقت کہتے ہیں، اور انکشاف کو معرفت اور صاحب انکشاف کو محقق و عارف کہتے ہیں۔

"پس یہ سب امور متعلق شریعت ہی کے ہیں۔ اور عوام میں جو یہ شائع ہو گیا ہے کہ شریعت احکام ظاہرہ کے جز کو کہنے لگے ہیں، یہ اصطلاح کسی اہل علم سے منقول نہیں۔ اور عوام میں اس کا منشا بھی صحیح نہیں کہ وہ اعتقاد ہے، ظاہر و باطن کی تنافی کا، واللہ اعلم"[1]

ولایت عامہ و خاصہ | غرض شریعت یا اس کے دونوں قسم کے ظاہری و باطنی اعمال کے ہی جمع و اہتمام کا نام تصوف ہے۔ فرائض و واجبات کی حد تک ان دونوں کے جمع و اہتمام کو اصطلاح میں ولایت عامہ کہتے ہیں۔ جس کا حصول ہر مومن پر فرض ہے۔ دوسرا درجہ فرائض و واجبات کے تقدم و لزوم کے ساتھ نوافل و مستحبات خصوصاً ذکر کثیر کے اہتمام کا ہے یعنی" اذکرا اللہ ذکرا کثیرا اور یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم" وغیرہ آیات و احادیث کے مطابق زندگی کے تمام حرکات و سکنات، نشست و برخاست میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور دھیان یا ذکر و استحضار سے خالی و غافل نہ ہو۔ سارے اعمال میں احسان عبادت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ جو کچھ بھی ہم کریں اس طرح کریں گویا اللہ تعالیٰ کو ہم سامنے دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نہ بھی دیکھیں تو وہ بہرحال ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ درجہ ولایت خاصہ کا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ولایت و بزرگی سے یہی درجہ مراد لیا جاتا ہے۔ قرب و حضور وغیرہ بھی اسی کی تعبیرات ہیں۔

سالک و مرید نام ہے کمال دین کی اس راہ کے رہ رو و طالب کا اور پیر و شیخ اس راہ کا رہبر ہے۔ سلوک کی حقیقت ان دونوں درجوں کے ظاہری و باطنی اعمال میں سرگرمی اور ان کی اصلاح و درستی ہے۔ تصوف کی حقیقت ہے تعمیر الظاہر والباطن ظاہر کا درست

---

[1] تبویب تربیۃ السالک ص ۱۲

کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ کہ قلب کی حالت درست ہو" (الرفیق صفحہ ۱۲) مرید اس سرگرمی و عمل اور اصلاح کا ارادہ و عہد کرتا ہے اور پیر اپنے تجربہ و بصیرت سے علماً وعملاً اس کی اعانت و رہنمائی کا وعدہ کرتا، اور ظاہر و باطن کی تمام عملی بیماریوں کی دیکھ بھال رکھتا اور حاذق و شفیق طبیب کی طرح ان کا علاج کرتا ہے۔

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

(جناب مولانا سید احمد قادری استاد شمس الہدیٰ، پٹنہ)

خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ (م ۱۰۷۹ھ) اپنے والد بزرگوار امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے سچے جانشین تھے۔ امام ربانی نے اپنی تمام زندگی رد بدعات، احیائے سنت و تصوف کی راہ سے آئے ہوئے مفاسد کی اصلاح میں بسر کی، یہی خدمت ان کے خلف الصدق خواجہ محمد معصوم نے بھی انجام دی۔ میرا مقصود اس وقت ان کی تاریخ مرتب کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف ان کے مطبوعہ مکتوبات کا تعارف، اور ایک طویل مکتوب کا خلاصہ پیش کرنا ہے، یہ کتاب اگرچہ مطبوعہ ہے لیکن اب کمیاب ہے، اس کی کمیابی کا حال یہ ہے کہ شیخ محمد اکرام آئی سی ایس نے اپنی کتاب رود کوثر کے دیباچے میں اس کتاب کے نہ ملنے کی شکایت کی ہے اور اسی وجہ سے وہ مکتوبات خواجہ محمد معصوم پر کوئی تبصرہ نہ کر سکے۔ تقسیم ہند کے بعد ضلع پٹنہ کے ایک خوش ذوق و اہل علم بزرگ کی لائبریری فروخت ہوئی اور اس طرح یہ کتاب راقم الحروف کو دستیاب ہوگئی۔

اس کتاب کا جو نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے وہ مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۸۴ھ ہجری مطابق ۱۸۶۷ء کا چھپا ہوا ہے کتاب کے آخر میں محمد عبدالرحمٰن شاکر، حافظ محمد ابو سعید خاں سعید، اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے قطعات تاریخ موجود ہیں ـــــ اس مجموعے میں ۲۲۹ خطوط ہیں، ابتدائی خطوط مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے نام ہیں، ان خطوط کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے والد ماجد کی زندگی ہی میں درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے، ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کو ان کی طرف خاص توجہ تھی، اور ان کو اپنے والد و شیخ سے محبت مفرط، حضرت مجدد کے حکم سے یہ سرہند سے دور کسی شہر میں مقیم تھے لیکن جدائی ان کے لیے سخت اذیت دہ تھی، اس سلسلے میں جو کچھ انھوں نے

لکھا ہو اس کے لفظ لفظ میں درد، کرب، سوز، اور بے چینی کی وہ کیفیت محسوس ہوتی ہو جو محب کو فراقِ محبوب میں ہوتی ہو، چند الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں، مکتوب دوم میں لکھتے ہیں۔

"احوال دعاگویان ایں حدود بمین توجہات علیہ مستوجب حمد است غیر از آلام فرقت و مہاجرت اندوہے واقع نیست۔

خیالِ وصل تو ما حالِ زندہ می دارد — دگرنہ با غمِ ہجراں حیات یعنی چہ

مکتوب ہفتم کے چند الفاظ یہ ہیں:۔

"احوال و اوضاع خدمۂ ایں حدود مستوجب حمد است ہموارہ تر، ترصد استماع اخبار فرخندۂ آثار سلامتی خدمۂ عتبۂ علیہ دامن گیر است، اشتیاق دریافت دولت حضور را چہ شرح دہد و سوز و گداز جدائی را چساں وانماید۔

دردلم خون شد آخر چند جوشم — مے اندر آبگینہ چند نوشم

حضرت مجدد کے علاوہ ان کے خلفا کے نام بھی خطوط کی ایک بڑی تعداد موجود ہو، خلفاء مجددیہ میں سب سے زیادہ خطوط میر محمد نعمان کشمی رح کے نام ہیں، ان کی تعداد ۱۶ ہو۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ کے صاحبزادوں کے نام بھی چند لمبے لمبے مکتوب لکھے گئے ہیں۔ ایک خط شہزادۂ اورنگ زیب کے نام ہو۔ دو خط ایک خاتون کے نام بھی ہیں، چند مختصر خطوط عربی زبان میں لکھے گئے ہیں، اور بقیہ سب فارسی میں ہیں۔ یہ مکتوبات خواجہ محمد معصوم کا بالکل مجمل و مختصر تعارف ہو، اس تعارف کے بعد راقم الحروف حضرت خواجہ کے ایک طویل مکتوب کا خلاصہ پیش کرنا چاہتا ہو، یہ مکتوب سچے مشائخ و صوفیہ کی نمائندگی کرتا اور ان بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہو جو صوفیوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت خواجہ نے یہ خط ایک غلط فہمی ہی دور کرنے کے لیے لکھا تھا۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

میرے مخدوم! اس وقت لوگوں میں یہ بات زبان زد اور مشہور ہے کہ صوفیہ کا مسلک یہ ہو کہ مخلوق کے حال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، اور سب کو اچھی نظر سے دیکھا جائے، عام از یں کہ کوئی کیسے ہی بُرے خصائل و عادات میں گرفتار کیوں نہ ہو یہ بات چوں کہ خلاف واقع اور بہتیرے مفاسد کا سرچشمہ ہو اس لیے میرے دل میں آیا کہ اس باب میں کچھ لکھوں ــــ اگر حالِ مخلوق سے ترکِ تعرض اور بلا امتیاز ہر شخص سے

خوشنودی و رضامندی کا عقیدہ صحیح ہو تو پھر امر بالمعروف، نہی عن المنکر حب فی اللہ، بغض فی اللہ، جہاد فی سبیل اللہ، غرض پورے کا پورا دین مہمل اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ صوفیہ کے متعلق جس شخص کا بھی یہ خیال ہو معلوم نہیں وہ صوفیہ کی کس جماعت کو ہدف طعن بناتا ہے۔

مشائخ نقشبندیہ کا یہ طریقہ سنت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب ہے جیسا کہ ان کے کتب و رسائل سے ظاہر ہوتا ہے۔ امر معروف، نہی منکر، حب فی اللہ، بغض فی اللہ، اور جہاد فی سبیل اللہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے فرائض و واجبات میں داخل ہے، لہذا امر معروف کا ترک درحقیقت طریقۂ نقشبندیہ کو چھوڑنا ہے، حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ فرماتے ہیں "ہمارا طریقہ حضرت رسالت مآب کی متابعت اور آثار صحابہ کی پیروی ہے"

اگر صوفیہ کا مشرب ترک تعرض ہوتا تو حضرت خواجہ خود اپنے پیر امیر کلال پر ذکر جہر کے سلسلہ میں اعتراض نہ کرتے۔ جب پیر کے ادب و احترام کے باوجود امر بالمعروف ضروری تھا تو پھر دوسرا اور کون ہے جس کے حال سے ترک تعرض کیا جائے؟ صرف حضرت خواجہ پر ہی کیا موقوف ہے تمام مشائخ حق اور صوفیۂ سلف کے متعلق اسی طرح کی باتیں منقول ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ صوفیہ نے سلوک و ریاضت کے جو یہ دفتر تیار کیے ہیں اور اس میں مہلکات (ہلاک کرنے والی چیزیں)، منجیات (نجات بخشنے والی چیزیں) کی تفصیل دی ہے، یہ امر معروف و نہی منکر ہے یا کچھ اور؟ تعرض ہے یا ترک تعرض؟ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اپنے پیر سے نقل کرتے ہیں کہ وہ مجھ سے فرماتے تھے۔ "محبت الٰہی کی راہ تاریک و باریک ہے اس لیے تمہیں چاہیے کہ مخلوق کو نصیحت کرو اور خطرات سے انھیں ڈراؤ۔"

شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہ جو اہل وحدت الوجود کے امام ہیں انھوں نے کیوں اپنے وقت کے صوفیہ پر رقص و سماع کے باب میں اعتراض کیا اور اس کے ترک پر دلائل قائم کیے چنانچہ بہتیرے صوفیہ اس سے باز آ گئے۔ اور جو باز نہ آئے انھوں نے اپنے نقص و قصور کا اعتراف کیا، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے اپنے بعض رسائل میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر ایک عظیم الشان باب تحریر فرمایا ہے۔ اس میں اس کی باریکیاں اور اس کام کی احتیاطیں و رعایتیں لکھی ہیں،

اپنے اس رسالہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کو نہی منکر کے سلسلے میں اپنی جان کا خوف ہو جب بھی اس شخص کیلئے نہی منکر جائز ہے، اور اگر وہ شخص اہل عزیمت وصبر میں سے ہو تو جائز ہی نہیں بلکہ افضل ہے، کیوں کہ ایسے موقع پر نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ کے حکم میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ نے لقمان علیہ السلام کے قصے میں کہا ہے وأمر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على ما اصابك ان ذالك من عزم الامور"

انصاف کرنا چاہیے کہ اگر صوفیہ کے ان پیشواؤں اور مقتداؤں کا مشرب ترک تعرض ہوتا تو پھر وہ امر معروف و نہی منکر میں اتنا مبالغہ کیوں کرتے، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے معروف و منکر کی تعریف لکھی ہے "جو شے کتاب و سنت و عقل کے موافق ہو وہ معروف ہے اور جو شے ان کی مخالف ہو وہ منکر ہے۔" پھر انھوں نے ان کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک ظاہر جس کو عوام و خواص سبھی جانتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، کی فرضیت یا جیسے زنا، شراب، چوری، رہزنی، سود، اور غصب وغیرہ کی حرمت ــــ امر معروف و نہی منکر کی یہ قسم عوام و خواص دونوں کے لیے واجب التعمیل ہے یعنی عوام پر بھی ضروری ہے کہ وہ ان فرائض کے تارکوں اور ان محرمات کے مرتکبوں پر امر معروف و نہی منکر کریں۔ دوسری قسم وہ ہے جس کو عوام نہیں جانتے صرف خواص جانتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات کا تفصیلی علم۔ یہ قسم علماء کے ساتھ مخصوص ہے ــــ فضیل بن عیاض جو اکابر صوفیہ میں ہیں فرماتے ہیں جو شخص بدعتی سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو حبط کر دیتے ہیں، اور ایمان کا نور اس سے نکال لیتے ہیں۔ ایک بڑے صوفی نے کہا ہے جس دن صوفیہ آپس میں امر معروف و نہی منکر نہیں کرتے اور مداہنت برتتے ہیں وہ دن ان کے لیے اچھا نہیں ہے، اگر مشرب صوفیہ ترک تعرض ہوتا تو یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی تھی ــــ اچھی طرح غور کرو کہ جو لوگ عدم تعرض کے قائل ہیں، وہ عذاب و ثواب اخروی اور ان وعیدوں پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں، جو برے اعمال کے لیے قرآن و حدیث میں آئی ہیں۔ اگر ایمان رکھتے ہیں تو پھر کیوں کسی نامراد کو تباہی و ہلاکت سے نکال کر اس کو نجات کی راہ نہیں دکھاتے۔ اگر کوئی اندھا چلا جا رہا ہو اور اس کے راستے میں کنواں یا سانپ ہو تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ اسکو متنبہ کرینگے اسکو بچائینگے اور اسکے حال سے تعرض کرینگے جب دنیا کی تباہی و ہلاکت سے بچانا یہ ضروری سمجھتے ہیں تو پھر آخرت کی تباہی و ہلاکت سے بچانا کیوں ضروری نہیں سمجھتے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت قیامت اور حشر

ونشر کا یقین ہی نہیں رکھتے۔ (اعاذنا اللہ عن اعتقادھم)

اگر ترکِ تعرض خلق، مرضئ حق ہوتی تو وہ کیوں انبیا کو مبعوث کرتا، شریعت بھیجتا، دین اسلام کی دعوت دیتا اور اسلام کے سوا ہر دین کو باطل قرار دیتا اور پھر وہ کیوں ان تمام امتوں کو ہلاک کرتا جنھوں نے اس کے انبیا کی دعوت قبول نہ کی، پھر کس لیے اس نے جہاد کو فرض کیا جس میں مسلمانوں کو بھی ایذائے قتل پہونچتی ہو، اور کفار کو بھی، مجاہدوں اور شہیدوں کے فضائل و مراتب میں کیوں آیتیں نازل کیں جو قرآن میں بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ نفس انسانی جو اللہ ہی کی مخلوقات میں سے ہے اس کی مخالفت و دشمنی کا حکم کیوں دیا، نفس سے لڑنا نہ صرف یہ کہ جہاد ہے بلکہ جہاد اکبر ہے ــــ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ بھی اللہ کے دشمن ہیں ان پر راہِ حق واضح کرنا اور ان کی سرکشی کو دبانا ضروری ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمالِ رحمت ہے کہ اس نے انبیاء کو اصالۃً اور اولیاء کو طبعاً مخلوق کی ہدایت کے لیے بھیجا اور ثواب و عذاب کی اطلاع دی تاکہ ہر شخص اپنے بھلے بُرے کو سمجھ لے اور اسے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ کی حجت پوری ہو، ــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، قل ھذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی۔ اس آیت کے مطابق انبیاء کے پیرو دعوت الی اللہ اور امر معروف میں ان کے شریک ہیں۔ اور جو شخص امر معروف کا تارک ہو وہ دراصل نبی کا پیرو ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ واجبات دین میں ہیں۔ مسند امام احمد کی ایک حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بندہ صریح ایمان کا لطف نہیں پاتا جب تک اس کا حال یہ نہ ہو کہ جس سے محبت کرے اللہ کے لیے کرے اور جس سے بغض رکھے اللہ کے لیے رکھے، اگر اس نے یہ کر لیا تو پھر خدا کی دوستی کا مستحق ہو گیا۔ ابوداؤد میں ہے جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا اس نے ایمان کی تکمیل کر لی ــــ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محبوب کے دوستوں کی محبت اور محبوب کے دشمنوں سے نفرت لوازم محبت میں سے ہے۔ سچا عاشق اس چیز پر بالکل مجبور ہے، یہ اس کے اختیار ہی میں نہیں کہ محبوب کے دشمنوں سے اسے نفرت نہ ہو۔ یہ چیز عشقِ مجازی میں بھی ظاہر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سے محبت کا دعویٰ کرے اور محبوب کے دشمنوں سے بیزاری کا اظہار نہ کرے تو محبوب اس کی محبت کو تسلیم نہ کرے گا اور اسے منافق سمجھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس باب میں ہمارے لیے اسوہ و نمونہ بنا کر

پیش کیا ہو قد قال اللہ تعالیٰ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برآء منکم الخ ان نصوص قطعیہ سے ثابت ہوتا ہو کہ مخلوق کی ہدایت و نجات کے لیے ان کے حال سے تعرض کرنا ضروری ہو اور یہ بھی ثابت ہوتا ہو کہ اچھے کو اچھا سمجھنا اور بُرے کو بُرا سمجھنا بھی ضروری ہو اگر خیر و شر کا امتیاز مٹا دیا جائے تو پاکیزگیٔ اخلاق کی بنیاد ہی ڈھ جائے۔

ہمارے لیے نصوص کی متابعت فرض ہو، ہمیں نص درکار ہو نہ کہ فص (فصوص الحکم کی طرف اشارہ ہو)، نجات اخروی وابستۂ نص ہو نہ کہ وابستۂ فص ــ اس کے علاوہ خود نظریۂ وحدۃ الوجود کے ماننے والے علمائے حق و مشائخ خیر شریعت کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں، شریعت سے اعراض کو وہ بھی الحاد و زندقہ ہی سمجھتے ہیں۔ باقی رہے گمراہ وجودی (وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والے)، تو ان کا عجیب حال ہو۔ یہ لوگ دوسروں پر ظلم نہیں کرتے، دوسروں کو بھی ظلم کرنے سے روکتے ہیں۔ سانپ اور بچھو کو مارتے ہیں اور مارنے کا حکم دیتے ہیں۔ اپنے معتقدوں اور فرماں برداروں سے راضی اور اپنے منکروں سے ناراض ہوتے ہیں۔ آبِ شیریں، طعام لذیذ، متاعِ نفیس، آوازِ خوش اور بوئے خوش سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ان کے اضداد سے انھیں انقباض ہوتا ہو، دوسروں کی بہ نسبت اپنے ماننے والوں کی حمایت زیادہ کرتے ہیں، جلب منفعت و دفع مضرت میں کسی سے پیچھے نہیں، تدبیر معاش و تربیت اولاد سے فارغ نہیں، مجرموں کو سزا دیتے ہیں، مریضوں کو نامناسب غذا سے پرہیز کراتے ہیں، غرض ان تمام دنیوی امور کی پوری پوری رعایت کرتے ہیں، حالاں کہ ان میں بہت سی چیزوں کا ترک مُباح ہو، دوسری طرف جب امور اخروی کا معاملہ آتا ہو تو احکام الٰہی کے باوجود وحدت وجود کا حیلہ تراش کر بندگی و اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ کیا عقل کا تقاضہ یہی ہو؟ اور کیا یہی انصاف ہو؟ ــ حقیقت یہ ہو کہ انھیں دین پر ایمان ہی نہیں، یہ احکام الٰہی اور نبوت کے منکر ہیں ورنہ وحدت الوجود کے ماننے والے مستقیم الاحوال و مشائخ اللہ کی بندگی میں کسی سے پیچھے نہیں، پھر ان گمراہ وجودیوں کا ــ جو مشرب کم آزاری و صلح کل اختیار کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ــ عجیب حال ہو یہ لوگ تمام کافروں، یہودیوں، جوگیوں، برہمنوں، ملحدوں، اور زندیقوں سے صلح و آشتی کا معاملہ کرتے ہیں، ان کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں، آپس میں محبت و دوستی کا تعلق رکھتے ہیں لیکن جو لوگ سیدنا محمد رسول اللہ کی سنت کے پیرو ہیں۔ ان سے انھیں عداوت ہو، ان کی ایذا

رسانی وتخریب پر کمربستہ ہیں۔ یہ عجیب صلح کل ہے ــــ اچھی طرح غور کرو کہ اگر مخلوق کو اس کے حال پر چھوڑ دینا صحیح ہوتا تو امت محمدیہ کا مقصد وجود امر بالمعروف ونہی عن المنکر کیوں قرار پاتا۔ قال تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر ــــ انبیاء، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور سلف صالح نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جو جد وجہد کی ہے اور اس سلسلہ میں جو مصائب برداشت کیے ہیں وہ تمھارے سامنے ہیں، اگر ترک تعرض کا مسلک درست ہو تو پھر یہ تمام کوششیں محض بے وقوفی قرار پاجائیں گی، اگر ترک تعرض کسی جہت سے بھی مستحسن ہوتا تو برائی سے انکار قلبی کو اضعف ایمان کیوں قرار دیا جاتا۔ مسلم کی روایت ہے۔ من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان ــــ پھر یہ بھی دیکھو کہ امر معروف ونہی منکر اس قدر ضروری ہے کہ اس کا تارک دنیا میں مجرموں اور خطاکاروں کے ساتھ داخل عذاب کر دیا جاتا ہے، اگرچہ بذات خود فرمانبردار واطاعت گزار ہو۔

اگر کوئی کہے کہ امر معروف ونہی منکر اور جہاد فی سبیل اللہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا اولیا کا طریقہ ترک تعرض اور امر معروف نہ کرنا ہے جیسا کہ اس وقت کے بعض لوگ کہہ بھی رہے ہیں تو میں جواب میں کہوں گا کہ ان امور کی فرضیت، ان کی تعمیل پر اجر وثواب اور ترک پر وعید نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ اس میں تمام مخلوق برابر ہے کسی کی اس میں خصوصیت نہیں، خواص، عوام، انبیاء واولیا سبھی سب فرائض کی تعمیل میں برابر ہیں اور وعدہ وعید میں سبھی داخل ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ حصول نجات انبیاء کی متابعت سے وابستہ ہے، اولیا نے جو کچھ بھی پایا ہے وہ انبیاء کی پیروی اور ان کے طفیل میں پایا ہے۔ اللہ تک رسائی انھیں بزرگواروں کے اتباع میں منحصر ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ انبیا کی راہ کے سوا ہر راہ ضلالت وگمراہی کی راہ ہے، شیطان کی راہ ہے۔ فما ذا بعد الحق الا الضلال اس مدعا پر دلیل شافی ہے اور ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ اس دعوی پر شاہد عدل ہے، جو شخص بھی راہ حق میں انبیاء کی پیروی چھوڑ کر داخل ہوگا وہ گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہ کرے گا۔ اور اگر کچھ حاصل ہو بھی تو استدراج کے سوا کچھ نہ ہوگا جس کا نتیجہ آخرت میں محرومی و

مایوسی ہو۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔

محال است سعدی کہ راہِ صفا / تواں رفت جز در پے مصطفا

خواجہ عبد الخالق غجدوانی نے فرمایا شیطان کے شر سے وہ محفوظ رہیگا جو راہ حق میں اسطرح داخل ہو کہ اسکے داہنے ہاتھ میں کتاب اللہ اور بائیں ہاتھ میں سنت رسول اللہ ہو، اور انھیں دو چراغوں کے درمیان راستہ طے کرے ــــ انصاف کرنا چاہیے، نبوت ختم ہو گئی، وحی منقطع ہو چکی، دین کامل ہو چکا، نعمت تمام ہو گئی آج کس حجت سے اور کس سند سے کوئی شخص ایسے محکم دین کو برخاست کر سکتا ہو اور محض اپنے خواب و خیال سے انبیاء علیہم السلام کے متفقہ کلمہ کو رد کر سکتا ہو، اپنی عقل و دانش سے کام لینا چاہیے اور خواب و خیال پر مغرور ہو کر صراط مستقیم سے دور نہ ہونا چاہیے، انبیا کا اتباع ہی نجات دینے والا ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہو خطرہ ہی خطرہ ہو، فالحذر کل الحذر۔

قطعی راہ نجات کو چھوڑ کر پر خطر راہ میں قدم رکھنا اور شیطان کے دام تزویر میں گرفتار ہونا عقل سے دور ہے وجد و حال و خواب و خیال جو پیغمبران برحق کے خلاف ہو اس کی حیثیت اس سراب کی سی ہو جسے پیاسا پانی سمجھتا ہو۔ کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماء قبر میں اور قیامت میں انبیاء کی متابعت کے سوا کوئی چیز مفید ثابت نہ ہوگی۔ ہاں اگر احوال و مواجید اور کشوف و الہامات پیروی انبیاء کے ساتھ جمع ہوں تو نور علیٰ نور ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرب الٰہی اب منحصر ہو اس شریعت میں جسے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس کی طرف انھوں نے تمام دنیا کو دعوت دی۔ ہر کشف و الہام ہر وجد و حال اور ہر حقیقت کی کسوٹی شریعت محمدی ہو، اگر اس جانچ میں کوئی اترے تو کھری ورنہ کھوٹی۔ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی کا یہ جملہ یاد رکھنے کے لائق ہو کل حقیقۃ ردتھا الشریعۃ فھی زندقۃ ہر حقیقت جسے شریعت رد کر دے زندقہ و گمراہی ہو۔ (مکتوب بست و نہم ۲۹)

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مکتوب درحقیقت ایک آئینہ ہو جس میں ہر وہ شخص اپنی صورت دیکھ سکتا ہو۔ جو تصوف سے دل چسپی اور صوفیہ و مشائخ رحمھم اللہ اور ان کے مسلک و مشرب سے عقیدت رکھتا ہو۔ نیز یہ مکتوب ان لوگوں کے لیے بھی قابل غور ہو جو "ہمہ نیک و ہمہ خوب" کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں۔ اور تمام مذاہب کو حق اور نجات دلانے والا سمجھتے ہیں۔

مجھے ضرورت ہو | مکتوبات خواجہ محمد معصوم اگر کسی صاحب کے پاس ہوں اور وہ بقیمت یا ہدیۃً کسی کو دے سکتے ہوں تو اس عاجز کو اسکی ضرورت ہو اور عرصے سے میں اسکی تلاش میں ہوں ــــ محمد منظور نعمانی

سفر حجاز کے بعض تجربات اور تاثرات

محمد منظور نعمانی

حجاز کو روانہ ہوتے وقت اپنے محبین اور الفرقان کے ناظرین کے لیے اس پورے سفر کا روزنامچہ لکھنے کا ارادہ تھا اور شروع میں دو تین دن کچھ لکھا بھی لیکن جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی سوچ فکر میں اور پھر بیٹھ کر اس کو لکھنے میں روزانہ اچھا خاصا وقت صرف ہوا کرے گا۔ اس لیے سرے سے یہ ارادہ ہی فسخ کر دیا۔ اور پھر اپنی حالت کچھ ایسی ہو گئی کہ مختصر سے مختصر کوئی یادداشت لکھنے پر بھی طبیعت آمادہ نہ ہو سکی۔ اب واپسی پر بعض مخلص دوستوں نے اصرار کے ساتھ فرمائش کی کہ اس مبارک سفر کے کم از کم خاص خاص تجربات اور تاثرات ہی الفرقان میں لکھے جائیں بس اسی فرمائش ہی کی تعمیل میں ذیل کی سطریں حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ناظرین کے لیے ان کو مفید بنائے:۔

(۱) اس سفر کے سلسلہ میں اس عاجز و عاصی پر اللہ تعالیٰ کے جو بے حد کرم ہوئے اُن میں سب سے پہلا تو یہ تھا کہ روانگی سے صرف دو مہینے پہلے "الفرقان کا حج نمبر" مرتب کرنے کی توفیق ملی۔ اس کے بعض مضامین نے (خصوصاً رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کے مضمون نے) حج و زیارت کا ذوق پیدا کرنے اور جذبۂ شوق کو مشتعل کرنے میں الحمد اللہ بہت کام کیا۔ اگرچہ روانگی سے پہلے بھی یہ مضمون کئی بار پڑھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اثنائے سفر میں بھی جب جب اور جہاں جہاں اس کو پڑھا جذبات و کیفیات کے پیدا کرنے اور ابھارنے میں اس نے حیرت انگیز اثر دکھایا۔ اس لیے دوسروں کے فائدہ کی خاطر صفائی کے ساتھ اپنا یہ تاثر عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حج اور زیارت دونوں میں کسی اچھی کیفیت یا دل کی لذت کا کچھ حصہ اگر اس نامۂ سیاہ کو نصیب ہوا تو اس میں سب سے بڑا حصہ اس مضمون کا یا اس کے لکھنے والے کا تھا اس حقیقت کو محسوس کر کے بے تکلفی اور ہر وقت کی معیت و رفاقت کے باوجود رفیق محترم کے لیے زبان سے یہی نکلتا ہے۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جان جاں ہمراز کردی

(۲) اسی طرح دوسرا خاص کرم اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں اس بندہ پر یہ ہوا کہ بالکل غیر متوقع اور اچانک طور پر سفر سے صرف ایک دن پہلے رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کے حقیقی بھانجے مولوی سید محمد ثانی صاحب کے ساتھ چلنے کی ایک صورت اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دی۔ عزیز موصوف اب سے دو سال پہلے اپنے ماموں صاحب ممدوح کی معیت میں حج کر چکے ہیں اور چونکہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں قریباً تین تین مہینے قیام کرنے کا ان کو موقع ملا تھا اس لیے حج و زیارت اور حرمین شریفین کے مشاہد و مآثر کے متعلق ان کی واقفیت اور ان کا تجربہ غیر معمولی ہے۔ ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بڑی سہولتیں نصیب فرمائیں اور بہت سی غلطیوں اور دقتوں سے ہم محفوظ رہے۔ اس تجربہ کے بعد عمومی مشورہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندہ کو اس مبارک سفر کی توفیق نصیب فرمائے تو تا امکان اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے کہ کسی ایسے مرد صالح کا ساتھ ہو جائے جو حج کا تجربہ اور وہاں کے حالات سے واقفیت بھی رکھتے ہوں اس کی وجہ سے جو غیر معمولی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور جو اطمینان رہتا ہے اس کا پورا اندازہ خود اس عاجز کو بھی اس تجربہ ہی سے ہوا ہے۔

(۳) مولانا سید محمد ثانی صاحب کے علاوہ اس عاجز کے ساتھ دس بارہ رفیق اور بھی تھے گویا یہ سب ہمارے قافلے کے افراد تھے۔ باہم فرق مراتب کے باوجود الحمدللہ یہ سب اچھے رفیق تھے۔ پھر ان میں سے بعض بہت ہی اچھے اور خوش اوقات تھے جن کی رفاقت اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی، اس تجربے نے بعض اکابر کے اس ارشاد کی پوری پوری توثیق و تائید کی کہ اس مبارک سفر میں اچھے صالح رفقاء کی اہمیت ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔

(۴) حج کے تجربہ کاروں سے سُنا بھی تھا اور مناسک کی اکثر کتابوں میں دیکھا بھی تھا کہ اس سفر میں کھانے پینے میں شرکت اور حصہ داری سے حتی الوسع پرہیز کیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ واقعتہً یہ چیز بہت اہم اور بے حد ضروری ہے۔ جب تک مزاج اور ذہن میں گہری مناسبت بلکہ یگانگت نہ ہو اور جب تک آپس میں اتنی محبت نہ ہو کہ کھانے پینے میں ہر ایک دوسرے کو ترجیح دے اس وقت تک روٹی ہانڈی اور دسترخوان کی شرکت خصوصاً اس سفر میں ہرگز مناسب نہیں، عموماً اس کی وجہ سے دلوں میں بُرائی اور تعلقات میں خرابی آجاتی ہے۔ مطلب

نہیں ہے کہ خدانخواستہ شرکت فی نفسہ کوئی بری چیز ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شرکت کی خوش گواری اور خوش انجامی کے لیے جس سمجھ داری اور جس ایثار و محبت کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں اس کی بہت کمی ہو گئی ہے اسی طرح کھانے پینے کے علاوہ دوسری چیزوں میں شرکت کے نتائج بھی اس سفر میں اکثر ناخوش گوار ہی نکلتے ہیں۔ اگرچہ یہ اس عاجز کا ذاتی تجربہ نہیں ہے کیونکہ جن بعض رفقا کے ساتھ اس عاجز کی شرکت بھی رہی وہ سب الحمد للہ ایک دوسرے کے ساتھ گہری للٰہی محبت رکھتے تھے، لیکن اور بہت سے لوگوں کے حالات اور معاملات سے یہی اندازہ ہوا اس لیے عام مشورہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے استثنائی صورتوں کے علاوہ شرکت سے بچا ہی جائے البتہ سب رفقاء سفر کے ساتھ تا بحد امکان ایثار و خدمت کا معاملہ ضرور رکھا جائے اور جہاں تک ہو سکے محض رضاء الٰہی کی خاطر ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے خواہ ان کا سلوک اپنے ساتھ کیسا ہی ہو اللہ کے بندوں کی خدمت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک اور وہ بھی سفر حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن یہ سعادت اللہ کے وہی بندے حاصل کر سکتے ہیں جن میں پہلے سے یہ ملکہ موجود ہو اور جو پورے عزم کے ساتھ اس کا فیصلہ کر لیں ورنہ سُنا بھی تھا اور تجربہ سے بھی یہی معلوم ہوا کہ یہ سفر بڑی سخت کسوٹی ہے اور ایثار و خدمت اور حسن معاملہ جیسے اوصاف میں بے چارے عوام کا کیا ذکر خواص میں بھی بہت کم لوگ اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔

(۵) جاتے ہوئے جہاز میں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ بخار کی تکلیف جب زیادہ ہوئی تو دوستوں کے مشورہ سے جہاز کے ہسپتال میں داخل ہو جانا مناسب سمجھا۔ میرے بعد ہمارے ہی صوبہ کے اور میری جان پہچان کے ایک اور صاحب مریض ہو کر پہنچے ان کے متعلق بعض وجوہ سے میری رائے اچھی نہ تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اُن سے ایک طرح کی غیر اختیاری وحشت تھی اور کشادہ دلی سے ان سے ملنے اور بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ہسپتال ہی میں ایک رات کو اس حال میں ان کو دیکھا کہ اپنے تکیہ پر سر رکھے ہچکیوں سے رو رہے ہیں اور بہت ہی پُر اثر اور رقت انگیز ایک مناجات زبان پر جاری ہے اس وقت اپنی نادانی اور کم نگاہی پر افسوس ہوا اور دل نے کہا تجھے کیا خبر شاید اس بندہ کا اس وقت کا یہ رونا اور ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ اس کی یہ توبہ و استغفار اور دعا و مناجات تجھ جیسے بہت سوں کی عمر بھر کی عبادتوں

سے اللہ کے یہاں زیادہ قیمتی ہو۔

(۶) بمبئی سے جاتے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ تک سارے مسافر اسی صورت و ہیئت اور اسی لباس میں رہے جس میں عموماً اپنے گھروں میں رہتے ہیں یعنی کرتہ پائجامہ پہننے والے اپنے کرتے پاجامے میں کوٹ پتلون والے اپنے کوٹ پتلون میں اور قمیص لنگی پہننے والے اپنے پوربی بھائی اپنی قمیصوں اور لنگیوں میں، آٹھویں دن صبح کو معلوم ہوا کہ آج ۳-۴ بجے ہمارا جہاز یلملم کی پہاڑیوں سے گزرے گا جو اہل ہند کا میقات ہے اور جہاں سے حاجی کو اپنے سلے ہوئے کپڑے اتار کر احرام باندھ لینا ضروری ہے۔ اس اعلان پر سب نے احرام کی تیاریاں شروع کر دیں اور ظہر کے وقت تک سب نے احرام باندھ لیا۔ اب جہاز کی پوری آبادی کا ایک ہی لباس تھا۔ امیر غریب آقا اور نوکر مولوی اور مسٹر شہری اور دیہاتی سب کے سب ایک سفید چادر باندھے ہوئے اور ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھے سب کے سر کھلے ہوئے تھے اور تلبیہ (لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک) سب کا وظیفہ تھا لیکن زبان سے "لبیک لبیک" کہتے وقت شوق و محبت اور ہیبت و عظمت کے جو آثار چہروں پر عام طور سے ظاہر ہونا چاہییں افسوس ہے کہ وہ چند ہی بندگان خدا میں نظر آتے تھے۔ لیکن ان ہی میں بعض اہل خشیت کا یہ حال بھی دیکھا کہ جب وہ تلبیہ پڑھتے تو اُن کے چہروں کا رنگ بدل جاتا آنکھوں سے آنسو بہنے اور آواز میں ایسی لرزش ہوتی کہ گویا وہ رب قدوس کی بارگاہ جلال میں حاضر ہو رہے ہیں اور وہاں کی ہیبت اور اپنی کوتاہیوں کی ندامت سے رو تے اور کانپتے ہیں اور "لبیک" کا کلمہ منھ سے نکالتے ڈرتے ہیں۔

(۷) رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کے نام جاتے ہوئے جہاز سے میں نے ایک خط لکھا تھا جو غالباً الفرقان میں چھپ بھی چکا ہے اُس میں حج کو جانے والی بعض مستورات کی حیرت ناک بے حجابی کا ذکر کیا تھا پھر واپسی کے جہاز میں بے پردگی اور بے حجابی کی وبا جانے والے جہاز سے بھی زیادہ دیکھی اور اس سب سے زیادہ تکلیف دہ منظر مکہ معظمہ میں خاص مسجد حرام میں خصوصاً مصری عورتوں کا ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ہیئت میں مسجد حرام سے باہر اگر عورتوں کا کوئی ایسا مجمع نظر پڑتا تو میرے لیے ان کو مسلمان یقین کرنا بہت مشکل ہوتا چہرے تو آزاد تھے ہی بہت سیوں

کی آدھی آدھی پنڈلیاں بھی بالکل یورپین لیڈیوں کی طرح کھلی رہتی تھیں اور یہ اسی حال اور اسی لباس میں طواف بھی کرتی تھیں۔ بعض اوقات دل میں خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ اس بے حیائی اور بے ادبی پر کہیں اللہ کا عذاب ابھی نہ آ جائے۔

(۸) مکہ معظمہ پہنچ کر سارے عالم اسلام کا نمونہ دیکھنے کا موقع ملا اپنے بندوں کے باطن کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن صرف ظاہر کو دیکھ سکنے والے ہم جیسے عامی بندے تو اپنے عام مشاہدہ کی بنا پر یہی اندازہ کر سکے کہ ساری اسلامی دنیا سے آنے والے ان لاکھوں مسلمانوں میں مشکل سے شاید چند ہزار ایسے ہوں گے جن کی زندگی کو اوسط درجہ ہی کی ایمانی اور اسلامی زندگی کہا جا سکے ورنہ عام حالت یہ تھی کہ نہ صورتیں سچے ایمان والوں کی سی تھیں اور نہ بظاہر سیرتیں۔ یہاں لاکھوں کا جو مجمع تھا وہ سب مختلف ممالک سے آنے والے حاجیوں ہی کا تھا لیکن دین کی اور باتوں کا کیا ذکر، خشوع وخضوع اور ادب ووقار کے ساتھ نماز پڑھنے والے اور ہیبت و عظمت یا شوق ومحبت کی کیفیت کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کرنے والے اپنی ظاہر بین آنکھوں کو ان لاکھوں میں بس خال خال ہی نظر آتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ مسجد حرام اور کعبۃ اللہ اور اللہ کے دوسرے شعائر مثلاً حجر اسود اور زمزم شریف جہاں ہر مسلمان کو سراپا ادب بن جانا چاہیئے وہاں بھی ادب و عظمت کے خلاف جو حرکتیں ہوتی تھیں۔ اور معمولی معمولی باتوں پر بالکل بازار کی طرح بہت سے لوگ جس طرح وہاں لڑتے جھگڑتے اور باہم دست بگریباں ہوتے تھے اور چیرہ دستی اور دھینگا مشتی کے جیسے جاہلانہ مظاہرے بکثرت ہوتے رہتے تھے ان سے طبیعت بعض اوقات انتہائی درجہ میں مشتعل اور غضب ناک ہو جاتی تھی اور دماغی توازن کا قائم رکھنا اس وقت سخت مشکل ہوتا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ دیکھ کے بار بار خیال پیدا ہوتا تھا کہ جس امت میں دین کا زوال اس حد تک پہنچ چکا ہو کہ اس کے حج کو جانے والے طبقہ میں بھی تقویٰ اور شعائر اللہ کے ادب واحترام کی اتنی کمی ہو، سنت اللہ کے مطابق اُس امت کا یقیناً وہی حال ہونا چاہیئے جو اس وقت بہت سے ممالک میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے جو قوم اللہ کے گھر کا بھی ادب نہ کرے اور مسجد حرام میں بھی نافرمانی اور نفسانیت کے مظاہروں سے باز نہ آئے۔ دنیا میں اس پر ذلت وشکست کا عذاب آنا اور دشمنوں کے قدموں سے اس کا روندا جانا قدیم سنت الٰہی ہے۔

الغرض مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں ہر دن یہ یقین اور زیادہ بڑھتا تھا کہ مختلف ممالک کے مسلمانوں کے دینوی کا ضعف و زوال کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ اپنی غیر ایمانی زندگی اور معصیت کوشی کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر کرم سے گر چکے ہیں اور بجائے انعام و اکرام اور رحمت و نصرت کے اس کے غضب کے مستحق ہو چکے ہیں اس لیے امت کی فلاح اور سربلندی کے لیے اولیں شرط یہی ہے کہ وہ پھر سے اللہ کی وفادار بنے اور ایمان کی بنیاد پر اپنی زندگی کی پھر سے تعمیر کرے۔ اس دنیا کے عالم اسباب ہونے سے انکار نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سبب الاسباب ہونے پر بھی ایمان ہے مسلمانوں کی پوری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ جب تک ہم میں ایمانی زندگی اور اللہ کی وفاداری عام تھی۔ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم و توفیق سے ہماری ہر تدبیر صحیح پڑتی تھی اور معمولی سے معمولی اسبابی کوشش سے بڑے بڑے محیر العقول نتائج پیدا ہو جاتے تھے۔ لیکن جب سے ہماری زندگیوں کا طرز عمل بدلا اور بجائے ایمانی زندگی کے نفسانی زندگی کو ہم نے اپنایا اور بجائے تقوی کے معصیت کا ہماری قوم میں غلبہ ہوا اس وقت سے برابر یہی ہو رہا ہے کہ ساری تدبیریں غلط پڑ رہی ہیں اور بڑی سے بڑی اسبابی کوششیں ناکام رہتی ہیں۔

امت کی عام فلاح و بہبود اور سرفرازی و سربلندی کے لیے اللہ کے بہت سے بندے ملتزم سے چمٹ چمٹ کر اور کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کے بڑے الحاح اور تضرع کے ساتھ دعائیں کرتے تھے اور جیسا کچھ بن پڑتا تھا یہ عاجز بھی برابر دعا کرتا تھا لیکن مذکورۂ بالا یقین کا اس نا سیاہ پر اتنا غلبہ تھا کہ اس دعا کے وقت بھی دل میں یہی خیال آتا تھا کہ ان دعاؤں سے بس کچھ اور مہلت مل سکتی ہے یا کچھ وقتی مصائب ٹل سکتے ہیں لیکن نصرت کے غیر معمولی ظہور کے لیے امت کا خود اپنے حال کو بدلنا شرط ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

بہت آج اہلِ حرم یاد آئے

(زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی لکھنوی)

بہت آج اہلِ حرم یاد آئے — خود ان کو بھی شاید کہ ہم یاد آئے

ستم یاد آئے نہ غم یاد آئے — ہمیں تو کرم ہی کرم یاد آئے

اِدھر چھڑ گیا خود بخود سازِ ہستی — اُدھر طائرانِ حرم یاد آئے

گھنی چھاؤں والے ببولوں کے جھرمٹ — مقیمانِ اُم القُریٰ یاد آئے

وہ مخصوص لہجے سلام و دُعا کے — حضوری کے لمحے بہم یاد آئے

وہ صفہ پہ بیٹھے ہوئے سر جھکائے — غلامانِ شاہِ اُمم یاد آئے

ملی یک بیک لذتِ تشنہ کامی — مجھے ساقیانِ حرم یاد آئے

حرم کے وہ رہ رہ کے جنبش میں پردے — نسیمِ سحر کی قسم یاد آئے

کہاں کے گل و لالہ و ماہ و انجم — وہی ان کے نقشِ قدم یاد آئے

ہجومِ تجلّی کے پُر کیف منظر — بہت یاد آئے تو کم یاد آئے

نہ یاد آئے جلوے تو پھرِ وں نہ آئے — جو یاد آئے تو دمبدم یاد آئے

جہاں کچھ ہوا دل کو احساسِ فرقت — وہیں ان کے نقشِ قدم یاد آئے

وہاں جاکے بادِ صبا کچھ نہ کہنا — ہماری اگر شامِ غم یاد آئے

سُنا ہے حمید آج اس انجمن میں
بہت بیقرارانہ ہم یاد آئے

دعوت اصلاح و تبلیغ
کے
رفقاء و کارکنان کے نام

از مرکز لکھنؤ

"کچھ دنوں سے اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ لکھنؤ کے مرکز دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے صوبۂ متحدہ کے ان مرکزوں کو جو حال ہی میں قائم ہوئے ہیں وقتاً فوقتاً ایسے خطوط و مضامین بھیجے جاتے رہیں جن سے دعوت کی وضاحت اور اہمیت ذہن نشین ہوتی رہے اور کام کو صحیح بنیادوں پر ترقی دینے میں مدد ملے۔ یہ خطوط ان سب مرکزوں اور ان کے کارکنوں کے لیے مفید ہیں جو اپنے اپنے مقام پر اس اصول کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ خطوط الفرقان میں بھی شایع ہوتے رہیں گے۔" (مدیر)

مکرم و محترم السلام علیکم ورحمۃ۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ دین سے تعلق اور اس کی خدمت کے سلسلہ میں اللہ نے جن مخلص دوستوں سے تعلق اور ان کی رفاقت کا شرف عطا فرمایا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان سے بکثرت ملنا ہوتا کہ اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل سکے اور ان کے تجربوں اور مشوروں سے فائدہ اٹھایا جا سکے، اگر لکھنؤ کے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت اور تبلیغی سفروں میں رفاقت کی نوبت زیادہ آتی تو اس کا بخوبی موقع ملتا رہتا اب اس عریضہ کے ذریعہ چند معروضات پیش کرنے کا خیال ہے۔

ہماری یہ دینی دعوت جس میں ہم آپ سب ایک دوسرے کے شریک و رفیق ہیں۔ اور جس کا عنوان "تبلیغ" مشہور ہو گیا ہے۔ دراصل وسیع پیمانہ پر امت میں (جس میں بحمد اللہ ہم خود شامل ہیں) ایمان پیدا کرنے کی ایک جد و جہد ہے۔ یہ ساری تحریک اس احساس پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد "ایمان و احتساب" (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کی خوشنودی کا شوق) ہے، اور یہ بنیاد عرصۂ دراز سے متزلزل ہو رہی ہے، مسلمان دنیا کی دوسری مادہ پرست، قوموں کی طرح

خدا فراموش اور آخرت فراموش ہوتے جا رہے ہیں، ان کی زندگی کا سارا انقلاب اور اس کے نتیجہ میں دنیا کا انقلاب اسی ایک تغیر و تنزل کے تابع ہے۔ فرائض سے غفلت، احکام خداوندی سے انحراف، حصولِ معاش کا شدید ترین انہماک، غفلت و جمود، اخلاقی خرابیاں دنیاوی ذلت و رسوائی سب اسی کا نتیجہ ہیں، اب اس صورت حال کو بدلنے کے لیے صرف یہی صورت ہے کہ ہم اپنے میں صحیح اسلامی زندگی پیدا کریں، اور اس کے دو حصے ہیں، ایک دینی جذبات کا نشوونما اور ایک ان خدمات کے ماتحت عملی جد وجہد حرکت و عمل اور دعوت و تبلیغ اور اس سب کا سرا یہ ہے کہ خاص اسی مقصد کے لیے مسلمان جمع ہوں۔ ان میں دینی احساس بیدار اور اسلامی جذبات تیار ہوں، اس کے لیے ہم نے بہت دن کے تجربہ کے بعد ہفتہ وار اجتماعات ضروری سمجھے ہیں، جہاں مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا مقصدِ زندگی اور چھوڑا ہوا طرزِ زندگی یاد دلایا جا سکے، سیرت کے واقعات اور صحابۂ کرام کے حالات اور اصولِ دعوت کے ذریعہ ان میں دینی روح پیدا کی جا سکے۔ پھر دوسرا قدم یہ ہے کہ ان تاثرات و جذبات کو راسخ کرنے اور ایمانی کیفیات کو ترقی دینے کے لیے نیز اسلامی زندگی کو عام طور پر رائج کرنے اور اپنے بھائیوں تک اللہ کا پیغام پہونچانے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہم شہر شہر قریہ قریہ پھریں اور انبیاء اور سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبوب زندگی کی نقل اتارنے کی کوشش کریں یہ وہ سرے ہیں جن کے ذریعہ امت میں عمومی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ تمنا ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ ہم کو اپنی پوری کوششیں صرف کر دینے کی توفیق عطا فرمائے ہمارے اجتماعات شہر کے مسلمانوں کا مرکز زندگی بن جائیں، مشکل سے کوئی مسلمان ان کی شرکت سے محروم اور ان کی دعوت سے غیر متاثر ہو، اپنی ترقی و تربیت اور دین کی حفاظت و اشاعت کیلئے جماعتیں بنا بنا کر نکلنا جزو زندگی بن جائے۔ اللہ کے راستہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ، اور خدا کے دین کی سربلندی کا ولولہ عام ہو اور ہماری زندگی ہی میں زمانہ کی فضا بدل جائے۔ اور انشاء اللہ یہ کچھ دشوار نہیں امید ہے کہ حسب ذیل چیزیں ہمارے اس مقصد کے لیے بہت مفید ہوں گی۔

۱- اجتماع کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ عام اور مؤثر بنایا جائے، گفتگو خصوصی گشت،

اور اس کو وسیع کرنے کے لیے محلہ وار، برادری وار، طبقہ وار، معاون اجتماع منعقد کیے جائیں جسمیں اس ہفتہ وار مرکزی اجتماع کی دعوت دی جائے۔

۲- اجتماع کا نظام اوقات مؤثر اور منضبط ہو، سر دست یہ نظام مفید معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سیرت اور صحابۂ کرام کے کچھ حالات پڑھکر سنائے جائیں، اس کے لیے یہاں ایک ایسی کتاب تیار کی جا رہی ہے جسمیں سیرت اور دینی تاریخ کی روح آجائے۔ تکمیل کے بعد ہر مرکز اس کی ایک نقل لے سکتا ہے، جب تک یہ کتاب تیار نہ ہو حکایات صحابہ پڑھکر سنائی جائے، اس کے بعد ایک دعوتی تقریر ہو جس میں اس حقیقی زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت دی جائے، اور اس کی تدابیر بتلائی جائیں باہر کا پروگرام پیش کیا جائے اور لوگوں کو مرکزی اجتماع میں شرکت اور بیرونی نقل و حرکت پر آمادہ کیا جائے۔

۳- رات کے رہنے پر زور دیا جائے، اور رات گزارنے والوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی جائے جو لوگ رات گزاریں وہ حتی الامکان نوافل اور ذکر و تسبیح کا اہتمام کریں۔

۴- اطراف و مواضعات اور شہر سے باہر جماعتیں بنا کر اصول کے مطابق کچھ وقت گزارنے کی پر زور اور طاقتور دعوت دی جائے اور کوشش کی جائے کہ ہر ہفتہ ہر اجتماع کے بعد ایک جماعت باہر ضرور جائے، وہ جماعت تعلیم و تبلیغی گشت، ذکر، اور اکرام مسلم کا پورا اہتمام رکھے تعلیم کے لیے حسب ذیل کتابیں مفید سمجھی گئی ہیں، فضائل تبلیغ (از شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب) فضائل ذکر (ایضاً) حکایات صحابہ (ایضاً) اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟ (محمد منظور نعمانی) فضائل نماز یہ کتابیں مجموں میں پڑھی جائیں اور خالی اوقات میں دیکھی جائیں باہر کے سفروں کے نظام کیلئے رسالہ دعوت اصلاح و تبلیغ مرتبۂ محمد منظور نعمانی خاص طور پر مطالعہ میں رہے۔

۵- اس دعوت کی حقیقت اور اس کی روح کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے، یہ نہ تو محض کلمہ پڑھانے کی تحریک ہے نہ صرف نماز کیلئے جگانے کی، نہ لوگوں تک سندیسہ پہونچا دینے اور احکام سنا دینے کی ہے، یہ مکمل اسلامی زندگی اور ایمانی کیفیات کے حصول کی کوشش اور پوری تربیت کا نظام ہے، اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے خواص کو دو چیزیں بہت غور سے پڑھنی چاہئیں اور اکثر

(عہ باقی مضمون ص ۵۲ پر ملاحظہ کیجیے)

انتخاب

از۔ ادارہ

مسلمانوں کی بداعمالیوں کی قدرتی سزا

مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کی نہایت کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک راندۂ درگاہ قوم کو محض ہماری بداعمالیوں اور اخلاقی گمراہیوں کی وجہ سے عالم اسلام کے قلب میں پیر ٹکانے کی جگہ مل گئی اور سارے مسلمان ملکوں کے ایڑی چوٹی کے زور لگانے کے باوجود دنیا کے نقشہ پر ہی نہیں بلکہ ہمارے سینہ پر ایک مضبوط یہودی ریاست قائم ہوگئی جو مادی، فوجی اور اقتصادی لحاظ سے تمام عرب ریاستوں سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے، اس کی فوجی برتری کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ وہ مصر کی فوجوں کو رگیدتے ہوئے ۱۰۰ میل مصر کے اندر گھس گئی تھی۔

اس صورت حال کے باوجود دنیا بھر کے مسلمان اس موہوم امید پر جی رہے ہیں کہ اسرائیلی ریاست بہت جلد فنا ہوجائے گی اور پھر عربوں کو اقتدار نصیب ہوگا، حالانکہ خدا نے کبھی مسلمانوں سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ فاسق و مشرک ہوکر بھی کفار پر غالب ہی رہیں گے خدا کا وعدہ تو واضح ہے اس نے مسلمانوں کی ظفر و کامرانی کا صرف اس صورت میں وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی عملی اور اعتقادی زندگی میں سچے مسلمان ہوں، ان کی اجتماعی زندگی اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور آج چونکہ مسلمان ان صفات کے حامل نہیں ہیں اس لیے ذلیل اور نامراد ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اسرائیل کے قیام کا انحصار امریکا اور برطانیہ پر ہے وہ ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ امریکا کے ڈالر اور مشینوں پر جتنا انحصار مسلمان ملکوں کا ہے اتنا اسرائیل کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ بہت سے مسائل میں امریکا اور برطانیہ کو چیلنج کرنے کے لیے تیار ہے

اور متعدد مرتبہ چیلنج کرچکا ہے۔ نمونہ اگر مطلوب ہے تو اس کی نقل کرائی جائے۔ (مدینہ۔ بجنور)

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت

اجودھیا کی بابری مسجد میں جب سے ٹھاکر جی نے سنگھاسن لا ڈٹ کر جمایا ہے ماننے والوں نے وہاں ان کی مورتیاں رکھ دی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان اس مسجد میں خدا کی عبادت کرنے کی آزادی سے محروم ہوگئے ہیں۔ یہ بات کہ مسلمان اس حرکت کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اسی ہندستان میں متعدد واقعات اس طرح کے گزر چکے ہیں جب کہ مسلمانوں نے دین سے اپنی تمام تر غفلت کے باوجود مسجد کی حرمت کو داغداری سے بچانے کے لیے اپنی جانوں کی بے دریغ قربانیاں دی ہیں، اور اس مسئلہ پر ان کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں ہوسکی تھیں لیکن آج ہندستان کے آسمان و زمین اس بُری طرح مسلمانوں کے مخالف ہوگئے ہیں کہ وہ ہر بات کو خواہ وہ کتنی ہی دلشکن و دلخراش ہو خواہ وہ کتنی ہی جاں گسل اور روح فرسا ہو برداشت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، وہ کڑھتے ہیں مگر اظہار نہیں کرسکتے، ان کے دل میں درد ہوتا ہے مگر زبان تک آ نہیں سکتا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں مگر وہ فریاد نہیں کرسکتے، ان کے قلوب میں پریشانی ہے مگر کہیں کس سے کہ کوئی مونس و غمخوار نہیں، ان کے دلوں میں اضطراب ہے مگر اس کا اندازہ کون لگائے کہ اندازہ لگانے والی آنکھیں نہیں۔ (الانصاف۔ الٰہ آباد)

پٹنہ کی ایک مسجد میں مورتی پوجا

سیاست (کانپور) کے صفحات میں بحوالہ اقبال (بمبئی):-

"پٹنہ۔ ۵ جنوری۔ بہار لیجسلیٹو کونسل کی ممبر شریمتی سرسوتی دیوی نے پنڈت نہرو، سردار پٹیل، اور وزیر اعظم بہار کے نام ایک تار روانہ کرکے اس میں بتایا ہے کہ شہر پٹنہ میں ایک ایسی مسجد ہے جو شری رامچندر جی کے پیدائش کے مقام کی نشانی ہے۔ اس لیے بہار کے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کرنے کی تحریک شروع کردی ہے۔ اور وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ مسجد ہندوؤں کے حوالے کردی جائے۔ آج کل بھی اس مسجد میں ہندو پجاریوں اور سادھوؤں کا ہجوم رہتا ہے۔ ان نازک حالات کے پیش نظر حکومت نے اس مسجد پر پہرہ بٹھا دیا ہے اور پھاٹک میں قفل ڈال دیا ہے۔ لیکن اس پہرہ کے باوجود اور دروازہ کے مقفل ہونے کے باوجود مسجد کے اندر ایک چبوترے پر رام اور سیتا کی چاندی کی مورتیاں

بٹھادی گئی ہیں، اور ان مورتیوں کے درشن کو ہزاروں ہندو آتے ہیں، اور اب ہندوؤں کے مطالبہ پر سٹی مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو ان مورتیوں کی پوجا کی بھی اجازت دے دی ہو۔"

'صدق'، لکھنؤ

ان خبروں پر اب کوئی کیا تبصرہ کرے۔ ع

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

مسلم کا حال زار

یو، پی اسمبلی کے ایک رکن مسٹر گوپال نرائن سکسینہ کی تقریر لکھنؤ کے ایک مشترک مجمع میں:۔

"ہندو مہا سبھائی علانیہ ایسی باتیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ پاکستان چلے جاؤ، حالاں کہ جب وہ بھی اسی ملک کے رہنے والے ہیں تو انھیں اس طرح طعنہ نہیں ملنا چاہیے، جو لوگ جانے والے تھے چلے گئے اور جو اب جانا چاہیں گے چلے جائیں گے۔ اس قسم کی طعنہ زنی سے کوئی فائدہ نہیں، ان کے بھی دل ہو وہ بھی انسان ہیں، اب تو اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہو نہ یہ کہ اس کو اور وسیع کیا جائے۔

ہندستان ۲۶ جنوری کو ایک جمہوریہ کا اعلان کرے گا، جس میں اس کو مضبوط بنانا ہو مسلمان کی کمر ٹوٹی ہوئی ہو، وہ زمانہ گیا جب مسلمان اقدام کرتا تھا، اب تو یہ حالت ہو کہ جب اس کو شادی کی خبر معلوم ہوتی ہو تو وہ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہتا ہو۔"

گوپال بابو کی تقریر نے شکسپیر کے بعض فقروں کی یاد دلادی، یہودی قوم صدیوں سے مسیحیوں کے ظلم و ستم کی تختہ مشق چلی آرہی تھی، یورپ میں یہودی ہر قسم کی تحقیر و لتاڑ کا ہدف بنتا تھا۔ صدیوں کے بعد شکسپیر نے اپنے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس (اُردو ترجمہ دلفروش کے نام سے شائع ہو چکا ہو) میں ایک یہودی کی زبان سے یہ فقرے ادا کردیے۔

"آخر کیا یہودی کی آنکھیں نہیں ہوتیں؟ کیا اسے اور اس کے جسم کو دکھ نہیں پہنچتا، اس کے چوٹ نہیں لگتی؟۔ وہ غیرت نہیں رکھتا؟۔ وہ توہین محسوس نہیں کرتا؟"

مسلمانوں کو بھی کچھ ایسی ہی بے حس مخلوق شاید اس وقت فرض کرلیا گیا ہو —— اور

مسلمانوں نے ہندستان کے اکثر مقامات میں خود جو اس کے ثبوت بہم پہونچا دیے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ مفروضہ کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔ (صدق لکھنؤ)

تدبیر و تقدیر

اس اشاعت میں "انتخاب" کے زیر عنوان جو اقتباسات درج ہوئے ہیں اتفاق سے وہ سب دلوں کو رنجیدہ بلکہ زخمی کرنے والے ہیں، لیکن صرف غم و غصہ سے گھٹنے یا اپنی مجلسوں، یا رسالوں، اخباروں کے صفحات میں اپنے جذبات ظاہر کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ جو مناسب وقت تدبیریں اور براہ راست کوششیں اس صورت حال کو بدلنے کی کی جاسکیں وہ بھی کی جائیں، اور ضرور کی جائیں ـــ لیکن خدارا اس یقین کے اپنے اندر پیدا کرنے میں ذرا دیر نہ کیجیے کہ جب تک ہماری زندگی دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں ایمان اور عمل صالح اور سیرت و کردار کی بلندی کے لحاظ سے ممتاز زندگی نہ ہوگی اور جب تک ہم اللہ کی رحمت اور جنت کی طرف ساری دنیا کو بلانے والی امت نہ بنیں گے اور سچی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ بگڑی ہوئی دنیا کو سنوارنے اور اللہ سے اس کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کا چھوٹا ہوا کام انجام دینا جب تک پھر سے نہ شروع کریں گے ـــ اس صورت حال میں کوئی بڑی اور پائیدار تبدیلی ہرگز نہ ہوگی، اور ذلت و خواری کے اس عذاب سے ہمیں نجات نہیں مل سکے گی۔ بابری مسجد کی کیا حقیقت ہے۔ بنی اسرائیل جب اپنی گمراہیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے سزا کے مستحق ہوگئے تھے تو ان کے مقدس قبلہ تک کو ان کے دشمنوں نے پامال کر ڈالا تھا۔ اللہ کے یہاں بے اصولی نہیں ہے، اور کسی قوم اور اس کی یادگاروں سے اللہ کا کوئی ذاتی رشتہ نہیں ہے۔ بہرحال حالات کی تبدیلی کے لیے اپنی تبدیلی شرط اول ہے۔ یہی تدبیر ہے اور یہی تقدیر!۔ (الفرقان)

بقیہ مضمون صفحہ ۴۸

مطالعہ میں رکھنی چاہئیں یک مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت کا آخری (آٹھواں) باب دوسرے دعوت اصلاح و تبلیغ۔

۶۔ اس دعوت کے اپنے صحیح مرکز پر رہنے کے لیے ان شاء اللہ یہ بہت مفید ہوگا کہ مرکزی اجتماع میں ہر ہفتہ کسی نہ کسی جماعت کی شرکت کا اہتمام رہے اور وہاں سے ہر مرکز کا ربط قائم رہے!

۷۔ خط و کتابت اور ضروری حالات سے مطلع کرتے رہنے کا انتظام رکھا جائے تاکہ وقت پر جماعت یا اشخاص کے ذریعہ اعانت کی جاسکے، اور باہمی ربط و تعلق قائم رہے۔ جو دونوں مرکزوں کے لیے ضروری اور مفید ہے۔

براہ کرم خواص اور اپنے اہل الرائے احباب کو جمع کرکے یہ عریضہ سنا دیا جائے اور اس کے معروضات اور گزارشوں پر توجہ فرمائی جائے۔ ہم جناب کے گرامی ناموں اور اجتماع اور کام کے حالات کے سننے کے بہت مشتاق و منتظر ہیں۔ والسلام، مرکز لکھنؤ

کتب متعلقہ قرآن مجید!

قصص القرآن (از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی) پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں انکے متعلق چار جلدوں میں یہ کتاب اس زمانہ کی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے۔

جلد اول حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ تک کے واقعات۔ عیہ؍

جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک کے واقعات۔ مے؍

جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان۔ عیہ؍

جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور متعلقہ واقعات۔ عیہ؍

لغات القرآن۔ اردو میں قرآن شریف کے تمام الفاظ ولغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے۔ ابھی صرف تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔

جلد اول :- للعہ؍

جلد دوم :- للعہ؍

جلد سوم :- للعہ؍

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہ کی دینی تالیفات

حضرت ممدوح کی تالیفات سے امت کو جو بیش از بیش دینی اور ایمانی نفع ہوا ہے وہ اب محتاج بیان نہیں ان کتابوں نے اللہ کے ہزاروں بندوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ ذیل میں کتابوں کے صرف نام اور قیمتیں درج کی جا رہی ہیں

حکایات صحابہ ... ... عکار

فضائل نماز ... ... ۱۲؍

فضائل قرآن ... ... ۸؍

فضائل رمضان ... ... ۱۰؍

فضائل حج ... ... مے؍

فضائل تبلیغ ... ... ۵؍

فضائل ذکر ... ... مے

الاعتدال فی مراتب الرجال ... ... مے

فضائل صدقات یہ حضرت شیخ مدظلہ کی تازہ تصنیف ہے، جس میں زکوٰۃ و صدقات کے متعلق قرآن وحدیث کی ترغیبات وتاکیدات کو تفصیل کے ساتھ جمع فرمایا گیا ہے ـــــ سرمایہ اور ملکیت سے متعلق بعض مباحث خاص طور سے قابل دید ہیں قیمت مے

فہم قرآن (از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ایم اے) قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآن وسنت کا باہم کیا تعلق ہے۔ (عکار)

قرآن اور تصوف (جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب) جس میں کتاب وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو منطقی ترتیب اور وضاحت کے ساتھ ایک خاص اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت (عکار)

رہنمائے قرآن۔ ایک فاضلانہ انگریزی کتاب کا ترجمہ۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات ضرور پڑھیں۔ (قیمت ۔ ۸؍)

کائنات روحانی۔ از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ قرآن مجید جو بظاہر ایک کتاب ہے، در حقیقت وہ روحانی کائنات ہے، جو انسانی روح کی تمام ضروریات کی کفیل ہے (قیمت ۔ ۸؍)

مناجات مقبول جیبی۔ (مع شرح اردو) قیمت عیہ؍

مناجات مقبول! (مع ہفت سورہ مترجم وشجرات) قیمت ... ... مجلد ... ... عکار

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

مفتاح القرآن مع لغات القرآن

(از مولانا معفوظ الرحمن صاحب نامی، بہت ہی کم مدت میں ضروری صرف ونحو کے ساتھ ترجمۂ قرآن کی استعداد پیدا کرنیوالی کتاب۔ قیمت عیہ؍

سیر و تواریخ

نشر الطیب حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی مشہور تالیف، جسمیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وجود نوری سے وفات شریف بلکہ داخلۂ جنت تک کے احوال مستند روایات سے لکھے گئے ہیں۔ ؎

رحمت عالمؐ سیرت نگار نبوی علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کی مختصر مگر جامع تصنیف جو نہایت آسان اور دلچسپ زبان میں لکھی گئی ہے۔ خورد ۱۲؍

سیرۃ خاتم الانبیاءؐ۔ (از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی) اختصار کے باوجود نہایت جامع معتبر و مستند سیرت ہے۔ ۶؍

رسول اللہؐ۔ (از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) سلیس اور عام فہم اردو زبان میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت پر متوسط درجہ کی تصنیف ہے۔ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بہترین علمی اور دینی تحفہ ہے۔ ۱۲؍

پہلی تقریر سیرت (از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) دلی کی شگفتہ زبان میں سیرت نبویؐ پر ایک عجیب غریب تقریر جسکے مطالعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی آج بھی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر رہی ہے

(قیمت مجلد :- ۸؍)

دوسری تقریر سیرت (از مولانا موصوف) سیرت نبویؐ ہی کے موضوع پر یہ دوسری تقریر ہے۔ علاوہ دیگر مضامین کے آنحضرتؐ کی تبلیغی مشکلات اور مخالفین کے زہرہ گداز مظالم اور آپ کے صبر و تحمل کا بیان بڑا اثر انگیز ہے (مجلد ۱۲؍)

تیرھویں صدی کے مجدد و مجاہد
حضرت سید احمد شہیدؒ کی
سوانح حیات

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

جو عرصہ سے نایاب تھی اور کسی قیمت پر بھی شائقین کو دستیاب نہیں ہو سکتی تھی، قریباً دو گنے اضافہ کے ساتھ پھر سے چھپ رہی ہے، پہلی جلد تیار ہو چکی ہے جس میں سید صاحب کے حج تک کی سوانح و واقعات۔ اور آپ کی اصلاحی تبلیغی کوششوں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں جس سے اس زمانہ میں دینی اصلاح کا کام کرنے والوں کو خاص روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ (قیمت طبعہ مجلد للعہ)

نبی عربیؐ۔ (از قاضی سجاد زبیرتھمی) تاریخ ملت کا حصۂ اول۔ متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لیے سیرت سرورِ کائناتؐ کے تمام اہم واقعات جدید اڈیشن جس میں مستقل ایک باب کا اضافہ کیا گیا۔ ۳؍

خلافت راشدہؓ (از قاضی صاحب موصوف) تاریخ ملت کا دوسرا حصہ عہد خلفاء راشدین کے اہم اور مستند واقعات، قدیم و جدید عربی تواریخ کی بنیاد پر جدید اڈیشن۔ ۱۲؍

صفحات ۲۷۶۔ (قیمت ۱۲؍)

خلافت بنو امیہ۔ (از قاضی صاحب) تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفاء بنی امیہ کے حالات و واقعات، کتاب کی ترتیب تاریخ نویسی کے جدید اصولوں پر کی گئی ہے۔ زبان سہل، انداز بیان نہایت شگفتہ، (صفحات ۲۲۶ قیمت ۲؍)

خلافت ہسپانیہ۔ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جس میں خلفائے بنو امیہ اسپین کے حالات اور اسپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان قدیم و جدید تواریخ کی بنیاد پر نہایت کاوش سے جمع کی گئی ہے سلاطین اندلس کے دور حکومت اور انکے محاسن علمی و تمدنی کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ (قیمت مجلد ۱۲؍)

حکایاتِ صحابہؓ ۔ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ ۔ ۱۲؍

امّتِ محمدیہ کا پہلا مجذوب یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ کی قابلِ دید سیرت
(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)
کتاب کیا ہے اللہ ورسول کے اس سرگشتہ عاشق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ (قیمت عہ؍)

معارف الکتاب المبین فی فضائل سید المرسلین ایک نئے طرز کی کتاب کیا ہے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک بحر ذخار، جناب مؤلف نے نکات و اسرارِ قرآنی کو سمجھانے اور آنحضرت صلعم کے فضائل ذہن نشین کرانے میں جس اچھوتے اور دلنشین طریق سے کام لیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ (قیمت ۱۲؍)

سفرنامہ اسیر مالٹا ۔ (از مولانا حسین احمد صاحب مدنی) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی اور ان کے رفقاء سفر کے قید و بند کے حالات (جدید اڈیشن اچھا سائز، مجلد مع خوبصورت گردپوش ۔ عہ؍)

ابوالکلام آزاد ایک تصیدہ مبصر کی نگاہ میں
(از ابوسعید بزمی ایم اے)
قیمت مجلد مع گردپوش ۱عہ؍

غدر کے چند علماء ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا کارنامہ جس قدر شاندار ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی مگر افسوس کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی، ملک کی آزادی کے بعد جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بڑی خوبی سے یہ چھوٹا سا تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔
(قیمت مجلد مع حسین گردپوش عہ؍)

علماءِ حق اور انکی مظلومیت کی داستانیں
(از مفتی صاحب موصوف)
حضرات صحابہؓ سے لے کر ہندوستان کے علماء متاخرین تک کی حق گوئی اور صداقت پروری کی صفت اور جرأت و بیباکی کے متعدد کارناموں کو یاد کرنے کے لیے اور ان کے اوصاف کو زندہ کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔
قیمت مجلد مع خوبصورت گردپوش عہ؍

ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء
(از مفتی صاحب موصوف)
مغلیہ حکومت کے کمزور ہوتے ہی ملک کا شیرازہ کس طرح بکھر گیا اور ہندوستان جنگ کی آماجگاہ کیونکر بن گیا؟ جنگ پلاسی کمپنی کو کیسے سازگار ہوئی؟ کمپنی نے کیسی کیسی تدبیروں سے ہندوستان پر تسلط کیا؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے اس خوشنما کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ (قیمت عہ؍)

دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ــــ؟
اشاعت اسلام مکمل و مدلل!۔
تالیف حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند
عہد نبویؐ اور دورِ صحابۂ کرامؓ میں دینِ الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کی مفصل اور مستند تاریخ ہے اس کے مطالعہ کے بعد کسی معاند کے لیے بھی یہ کہنا مشکل ہوگا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا!۔
(قیمت ۔ ے؍)

چھوٹے بچوں کیلئے ایک نیا نصاب مرتبہ حکیم شرافت حسین صاحب رحیم آبادی

جس کے متعلق

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر "صدق" نے فرمایا ہے کہ

"اس غرض و مقصد سے یوں تو چھوٹی بڑی اچھی بُری کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن یہ رسالے ان سب پر سبقت لے گئے ہیں، افادہ اور دلآویزی دونوں کے لحاظ سے مصنف صحیح مذہبی واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات کے بھی ماہر ہیں، کیا اچھا ہو، اگر یہ کتابیں ہی پڑھائی جاتی ہوں مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کے لیے ان رسالوں کو ہاتھوں ہاتھ لیں۔"

اللہ کے رسولؐ	۶؍	حضرت ابوبکرؓ	۶؍	حضرت عمرؓ	۶؍
حضرت عثمانؓ	۶؍	حضرت علیؓ	۶؍	اچھی باتیں حصہ اول	۳؍
اچھی باتیں حصہ دوم	۳؍	اچھی باتیں حصہ سوم	۶؍		

صحابۂ کرامؓ اور بزرگانِ دین

آسان زبان میں سیرت کی کتابیں!

بچوں، عورتوں، اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرامؓ اور بزرگان دین کے حالات سے واقف کرنے اور ان میں دینی جذبات پیدا کرنے کیلئے سیرت کی مختصر کتابوں کا سلسلہ تیار کیا گیا ہے اور تجربے سے اپنے مقصد میں بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔

رسول اکرمؐ (۳ر) حضرت ابوبکرؓ (۱۰ر) حضرت عمرؓ (۱۰ر) حضرت خالد بن ولید (۱۰ر) حضرت بلالؓ (۴ر) حضرت طلحہؓ (۴ر) حضرت ابوذر غفاریؓ (۴ر) حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ (۴ر) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (۴ر) حضرت ابوعبیدہؓ (۴ر) حضرت سلمان فارسیؓ (۵ر) حضرت زبیر بن عوام (۵ر) حضرت زید بن حارثہ (۴ر) حضرت اسامہؓ (۴ر) حضرت ابن مسعود (۶ر) حضرت ابوہریرہ (۵ر) حضرت ابن عباس (۴ر) حضرت ابن عمر (۵ر) حضرت مصعب بن عمیر (۴ر) حضرت انس بن مالک (۴ر) حضرت ابوایوب انصاری (۴ر) حضرت جعفر طیار (۴ر) حضرت حمزہ (۴ر) حضرت سعد بن عبادہ (۴ر) حضرت خدیجہ (۳ر) نیک بیٹیاں (حضورؐ کی صاحبزادیوں کے حالات)۔ ۶ر

بزرگانِ دین: حضرت امام بخاری (۶ر) امام غزالی (۳ر) مولانا روم (۳ر) حضرت مجدد الف ثانی (۴ر) حضرت خواجہ معین الدین چشتی (۴ر) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (۳ر) خواجہ نظام الدین (۴ر) شیخ فریدالدین عطار (۳ر) جمال الدین افغانی (۲ر)

اردو زبان میں احادیثِ نبویؐ

ترجمان السنۃ ۔ یہ کتاب چند جلدوں میں مکمل ہوگی اور امید ہے کہ اپنی تحقیقی نوعیت اور جامعیت کے لحاظ سے اردو زبان میں حدیث نبویؐ کی شرح پر یہ پہلی قابل فخر کتاب ہوگی، ابھی صرف جلد اول شائع ہوئی ہے کتابت، طباعت وغیرہ نہایت اعلیٰ (قیمت عنہ)

زادِ سفر ۔ اخلاق و اعمال اور تہذیب و معاشرت بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق صحیح احادیث کا یہ مستند مجموعہ ہے۔ دراصل امام نووی کی مشہور کتاب "ریاض الصالحین" کا ترجمہ ہے۔ (قیمت ۔ للعہ)

خدا کی باتیں ۔ حدیث کے ذخیرہ میں جس قدر احادیث قدسیہ ملتی ہیں ان سب کو عام فہم اردو زبان میں جمع کر دیا گیا ہے، مختلف مضامین کی قریباً آٹھ سو حدیثوں کا مجموعہ ہے (قیمت مجلد عہ)

رسولؐ کی باتیں ۔ اسلام کے ضروری عقائد توحید، رسالت، قیامت، عالم برزخ، عذاب قبر، تقدیر، کتب آسمانی، ملائکہ وغیرہ۔ ان تمام ایمانی حقیقتوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ، مع مختصر تشریح۔

(قیمت ہر دو حصہ مجلد سوا دو روپئے)

جنت کی کنجی ۔ اس میں ۱۲۳۵ ایسی حدیثوں کا سلیس اور عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے۔ جن میں خاص خاص اعمال پر جنت کی بشارت دی گئی ہے، گویا ترغیبی حدیثوں کا مکمل مجموعہ ہے۔ مجلد (۱ہ ۴ر)

دوزخ کا کھٹکا ۔ اس میں ۸۰۴ ایسی حدیثوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جن میں برے اعمال پر دوزخ سے ڈرایا گیا ہے، قیمت مجلد ۔ (عہ ۴ر)

عربی سیکھنا اب بہت آسان ہوگیا

لوگ سمجھا کرتے تھے کہ عربی زبان سے واقفیت پیدا کرنے کیلئے ۸۔۹ سال محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن اب ایک ایسا نصاب تیار ہوگیا ہے جسکے ذریعہ صرف دو تین مہینے کی محنت سے آپ کو عربی زبان اتنی آسکتی ہے کہ آپ قرآن و حدیث سمجھکر پڑھ سکیں، اس نصاب کا بہت سے لوگوں پر تجربہ بھی کیا جاچکا ہے۔ وہ نصاب یہ ہے۔ **"عربی کے دس سبق"** (قیمت ۴ر) یہ کتاب دس دن میں ختم ہو جاتی ہے، اسکے بعد آپ **"قرآن مجید کی پہلی کتاب"** (قیمت عہ) شروع کر دیں بعد ازاں **قرآن مجید کی دوسری کتاب** (قیمت عہ) پڑھ لیں، پھر **قرآن مجید کی تیسری کتاب"** (قیمت عہ ۴ر) پڑھیں، اور ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ذیل کی کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھیں **تمرین الدرس** حصہ اول (۴ر) القرأۃ الرشیدہ حصہ دوم (۸ر) حصہ سوم (۱۲ر) **قصص الشہیرہ** (۴ر) **قصص النبیین** اول (۴ر)، دوم (عہ)، سوم (عہ ۴ر)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۷ نمبر (۴) رجسٹرڈ نمبر اے ۳۵۳

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے!
"الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے!
دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ پانچ روپیہ   فی پرچہ آٹھ آنہ

جلد ۱۷ | بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۰ء | نمبر ۴

(۲۰۷) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے [illegible] سے چھپوا کر دفتر الفرقان [illegible] لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولین

ایک بڑی اور پرانی انسانی کمزوری ہے کہ آدمی اسباب سے غفلت برتتا ہے اور نتائج پر چیں بہ جبیں ہوتا ہے، یہ کمزوری مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، انسان جس ذہنیت اور مزاج کا ہوتا ہے۔ اس کی یہ کمزوری اسی سلسلہ میں ظاہر ہوتی ہے، مثلاً اگر وہ دین پر اعتقاد رکھتا ہے اور اس سے اس کو محبت و تعلق ہے تو یہ کمزوری اس شکل میں نمودار ہوگی کہ جب تک دین کے مخالف اسباب و عوامل اپنا عمل کرتے رہیں گے وہ برابر غافل رہے گا اور اس کو کوئی توجہ اور احساس نہیں ہوگا، لیکن جوں ہی ان اسباب و عوامل کا طبعی نتیجہ برآمد ہوگا جس کا ظہور پہلے سے یقینی تھا تو اس کا ذہن سوتے سوتے جاگ پڑے گا، وہ اس نتیجہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگے گا اور اس پر تعجب و برہمی کا اظہار کرے گا، حالاں کہ دراصل دیکھنے والی آنکھوں کے لیے یہ نتیجہ اسی وقت ظاہر ہوگیا تھا جب ان اسباب و عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا طبعی عمل کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی، زمین میں بیج پڑنے اور پودہ لگ جانے کے بعد آدمی اس کے پھل کا اندازہ (اور اگر کوئی غیر معمولی رکاوٹ پیش نہ آئے) تو تجربہ اور عقل کی آنکھوں سے اس کے پھل کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

انڈونیشیا کے وزیر اعظم نے کہا کہ ان کی حکومت ایک غیر مذہبی ریاست ہوگی، وہ غیر مذہبی ریاست کے تصور پر پورا یقین رکھتے ہیں، انھوں نے اس کی بھی تصریح کی کہ جزائر بحر الہند کی یہ نئی آزاد ریاست جس میں مسلمان قریب ۹۵ فی صدی ہیں، کوئی اسلامی حکومت نہیں ہو وہ

ایک خالص قومی حکومت ہے، ترکی کے ایک وزیر نے پاکستان میں بیان دیا، کہ مذہب کی بنیاد پر اس وقت ممالک کا کوئی اتحاد اور نئی تنظیم ممکن نہیں ہے، ترکی اور اس کی موجودہ حالات میں کوئی گنجائش نہیں، اس وقت ممالک کا اتحاد صرف سیاسی و معاشی بنیادوں اور مشترک ضروریات و مسائل پر ہوسکتا ہے۔

ان دونوں بیانات کو پڑھ کر ہمارا دینی حلقہ سخت متعجب اور ناراض ہے کہ مسلمان ہو کر کوئی آدمی ایسے خیالات کا اظہار کس طرح کرسکتا ہے اصل پوچھیے تو تعجب کی چیز یہ تعجب ہے۔ حقیقتاً حیرت کی بات تو جب ہوتی جب ان "ترقی یافتہ" ملکوں کے یہ ذمہ دار حضرات ان خیالات کے مخالف خیالات ظاہر کرتے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت، اس ثقافت، اس دماغی سانچہ کا (جس کی یہ حضرات نمائندگی کرتے ہیں) قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کو زندگی کا مکمل دستور العمل، تمام انسانی مشکلات کا حل، دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں کے لیے واحد ذریعۂ نجات اور اس کی پابندی شخصی زندگی کے ادنیٰ معاملہ سے لے کر سیاسی زندگی کے اہم ترین معاملہ تک ضروری سمجھیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ کسی ایسی حکومت کا جس کے ذمہ دار مسلمان ہوں اور جس کی اکثریت مسلمان ہو، غیر مذہبی ہونے کا اعلان کرنا دین سے بغاوت اور مسلمانوں کے ساتھ غداری ہے۔ یا اس کا قدرتی نتیجہ وہ ہونا چاہیے جو ہمارے سامنے ہے؟ اگر یہ صحیح ہے کہ نتیجہ اسباب کے تابع ہوتا ہے تو پھر ہمیں ان بیانات پر تعجب کرنے اور رنجیدہ ہونے کا کوئی حق نہیں۔

ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جو ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوتا ہے، جہاں دینی زندگی کے صرف مٹے مٹے نشانات پائے جاتے ہیں۔ جب سے وہ ہوش سنبھالتا ہے اس کو اپنے ماحول میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو اس کے دل و دماغ پر اسلام کی عظمت کا نقش قائم کرے، اخلاقی اور دینی پستی، رسم پرستی، بے روح مذہبیت کے سوا اس کو پوری سوسائٹی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ کوئی ایسی مؤثر اور دل آویز دینی شخصیت اس کے سامنے نہیں آتی جس کی اخلاقی برتری، دماغی تفوق، علمی بلندی، بے نفسی، اور روحانیت کا اثر اس کا دماغ یا دل قبول کرے، اس عرصہ میں اس کو اگر دینیات کے نام سے کچھ پڑھایا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ عقائد کی ایک فہرست اور فقہی مسائل کا ایک مجموعہ ہوتا ہے

دین کی اصل طاقت اور دل آویزی (جس کا مقابلہ کسی زمانہ کی کوئی طاقت اور دل آویزی نہیں کر سکتی) اس غریب کے سامنے آنے نہیں پاتی، قرآن مجید اصل دعوت اسلام اور نبوت کے پیام سے وہ واقف ہی نہیں ہوتا، سیرت نبوی اور صحابہ کرام کے حالات زندگی جو انسانیت کا سب سے بیش بہا خزانہ اور عالم انسانی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں، اور جن میں قلوب کی تسخیر کی سب سے بڑی طاقت ہے، اس کے علم میں نہیں آنے پاتے، اسلام سے اس درجہ کی ناواقفیت اور بے تعلقی کے ساتھ وہ ایک ترقی یافتہ تعلیم گاہ میں قدم رکھتا ہے جہاں کے تعلیمی مضامین، زندگی کے ساتھ پوری ہم آہنگی اور ربط رکھتے ہیں اور جس میں ایک نوجوان کے لیے پوری جاذبیت اور کشش موجود ہے، ان مضامین کے استاد اپنے فن میں لائق، فن تعلیم اور علم النفس سے واقف اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندہ اور ذی روح انسان ہیں جو نوجوان طالبعلم کے دل و دماغ میں بہت جلد جم جاتے ہیں۔ اگر اس تعلیم گاہ میں اسلامی دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہوتا ہو تو یہ اس مسلمان طالبعلم کی مزید بدقسمتی ہوتی ہے، اس لیے کہ دینیات کے اس نصاب، طریقہ تعلیم، اور استادوں کے ذریعہ اس کے دل میں دینی تعلیم کی مزید حقارت اور بے توقیری پیدا ہوتی ہے اور وہ اسلام کے متعلق اس بلند تصور اور توقع سے بھی محروم ہو جاتا ہے جس کی دینی ناواقفیت کے ساتھ گنجائش رہی۔

اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک یہ مسلمان طالب علم (جس کی قسمت میں کسی مسلمان اکثریت والے ملک کا وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ بننا مقدر ہو) تعلیمی مراحل طے کرتا رہتا ہے، اس عرصہ میں اس کا دماغ نہ تو اسلام کا کوئی علمی اور ذہنی اثر قبول کرتا ہے، نہ اس کا دل کسی عملی نمونہ اور شخصیت یا صحبت سے متاثر ہوتا ہے، ایک طرف اس کے سامنے نئی تعلیم اور نئی تہذیب اور زندگی کے نئے تصورات اور فلسفے اپنے انتہائی دلکش اور سحر انگیز صورتوں میں آتے ہیں، دوسری طرف اسلام کی نمائندگی کرنے کے لیے کوئی حقیقی اور طاقتور چیز نہیں آتی، پھر اس عرصہ میں لادینی ادب کا اپنی تمام فسوں سازیوں کے ساتھ بڑا حملہ ہوتا ہے، حملہ آور طاقتور اور قوت مقابلہ مفقود ہوتی ہے، آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کمزور اسلامی بنیاد کا کیا حشر ہوگا جس پر اس قدر شدید اور مسلسل حملے ہوں۔

پھر اسی عرصہ میں اس کے ملک میں سیاسی تحریک شروع ہوتی ہے اور وہ اپنے جوش و جذبہ اور حب الوطنی کی بنا پر اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس تحریک کے چلانے والے سرتاسر لادینی یا خالص قوم پرستانہ ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں، اس کو اس تحریک میں عزم و جوش، ایثار و قربانی کے موقع اور اپنی حوصلہ مند طبیعت کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے، وہ اس تحریک کو خالص مغربی فلسفۂ سیاست کے خطوط پر چلاتا ہے اور اس کا ذہن مغرب کے سیاسی تصورات اور فلسفہ کو ہضم کر لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کی سیاسی جدوجہد اور قید و بند کے بعد اس کے ملک کو آزادی اور حکومت خود اختیاری حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی پچھلی قربانیوں اور دستوری و سیاسی واقفیت کی بنا پر اس آزاد قومی حکومت کا وزیر اعظم یا صدر منتخب ہو جاتا ہے۔

اب اس ساری پچھلی زندگی اور تعلیم و تربیت کو سامنے رکھ کر جواب دیجیے کہ جب اس کے سامنے طرز حکومت کا سوال آتا ہے تو اس کو کیا جواب دینا چاہیے۔ اس کے دماغ کا آزاد فیصلہ اور اس کے ضمیر کی بے لاگ آواز کیا ہوگی؟ کیا اسلامی حکومت جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا اور اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ نہیں پاتا؟ یا غیر مذہبی حکومت جس کے مطابق اس نے پوری تربیت حاصل کی ہے؟ خواہشات کو الگ کر کے دیکھیے، واقعات اور عقل عام کا فیصلہ کیا ہے؟

آج عالم اسلام کی یہی سب سے بڑی مصیبت ہے، ترکی و مصر سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کی زندگی پر وہی لوگ حاوی اور اقتدار و حکومت کی کرسی پر فائز ہیں جن کا دماغ حقیقی طور پر اور کم سے کم گہرے طریقہ پر مسلمان نہیں، دل و دماغ کے ڈھلنے اور زندگی کا سانچہ بننے کا جو زمانہ تھا اس میں اسلامی اثرات سے وہ بالکل دور اور دینی تعلیم و تربیت سے محروم رہے، اس وقت ان کی دینی تعلیم و تربیت اور ان میں اسلامی شعور پیدا کرنے سے مجرمانہ غفلت برتی گئی، حالانکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ تعلیم و تربیت اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے کل یہی لوگ ملک کے حکمران اور مسند نشین ہوں گے، اور ان میں سے ایک کی بے راہ روی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی گمراہی کا باعث ہوگی۔

آپ کہیں گے کہ بے شک بڑی غفلت اور چوک ہوئی لیکن سوال یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں ہم کس موقع شناسی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے رہے ہیں، اور اس طبقہ کی دینی تعلیم و تربیت اور اس میں اسلام کی واقفیت اور اس سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کر رہے ہیں، جن ملکوں کا سیاسی و تعلیمی نظم و نسق خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے وہ اس سلسلہ میں کیا کر رہے ہیں، اور حکومت چلانے والی نسل کو کس طرح تیار کر رہے ہیں۔ جن ملکوں میں تعلیمی تبدیلی کے مواقع حاصل نہیں ہیں وہ اپنے موجودہ ذرائع سے کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور جو کچھ وہ کر سکتے ہیں کہاں تک کر رہے ہیں، قبل اس کے کہ ہمارا محاسبہ ہو، ہم کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

مسرت انگیز تردید:-

الفرقان کی گزشتہ اشاعت (بابت ماہ ربیع الاول) میں انتخاب کے زیر عنوان صدق لکھنؤ سے ایک اقتباس بعنوان "پٹنہ کی مسجد میں مورتی پوجا" شائع ہوا تھا، ۱۰ر فروری کے صدق میں "مسرت انگیز تردید" کے عنوان سے اس کے متعلق ایک ادارتی نوٹ شائع ہوا ہے، ہم اپنا فرض سمجھتے ہوئے الفرقان میں بھی اس کو بلفظہٖ درج کرتے ہیں، جو لوگ اس طرح کی خبریں گڑھ کر اڑاتے ہیں وہ مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں ——————— مدیر

"مسرت انگیز تردید | مولوی سید صادق حسین صاحب شوق پھلواری اطلاع دیتے ہیں کہ صدق مورخہ ۲۰ر جنوری میں "سیکولر برکتیں" کے زیر عنوان پٹنہ کی ایک مسجد کی بے حرمتی کی خبر پڑھ کر دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف کو لکھا تھا۔ اس کا جواب انھیں حسب ذیل موصول ہوا ہے۔

مکرمی سلام مسنون، گرامی نامہ موصول ہوا میں نے پٹنہ سٹی اور بانکی پور کے متعدد لوگوں سے دریافت کیا جن میں قابل اعتماد اصحاب اور جمعیۃ العلماء کے کارکن بھی ہیں، وہ سب اس واقعہ کا انکار کرتے ہیں، ان لوگوں نے خبر کی تفتیش بھی کی تو معلوم ہوا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں مزید تفتیش کر رہا ہوں، اگر خبر میں خدانخواستہ کوئی صداقت ہوئی تو مطلع کروں گا۔ والسلام۔ محمد عثمان غنی عفی عنہٗ۔ ناظم امارت شرعیہ صوبہ بہار

اس تردید سے بڑھ کر مسرت کی چیز ہر مسلمان کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ خبر صدق میں ایک کانپوری معاصر کے واسطہ سے بمبئی کے ایک اخبار سے لی گئی۔ خدا معلوم راوی اول کو کیا اور کس طرح کی غلط فہمی واقع ہو گئی تھی۔"

(صدق - ۱۰ر فروری)

اصلی اسلامی زندگی
پھر سے پیدا کرنے کی ضرورت

(۲)

گذشتہ اشاعت میں مدیر الفرقان کی ایک تقریر کا ابتدائی حصہ زیر عنوان "اصلی اسلامی زندگی اور اُس کا مثالی نمونہ" ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا، ذیل میں اُس کا باقی حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ یہ تقریر بھوپال کے ایک تبلیغی اجتماع (منعقدہ دسمبر ۴۸ء) میں کی گئی تھی، اور اس کے قلمبند کرانے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔

حضرات! صحابۂ کرامؓ کے جن چھ عمومی اوصاف کا میں نے ابتک ذکر کیا ہے یہ سب دراصل اُن کی اسلامی زندگی کے لازمی اجزاء تھے جن سے ان کا کوئی فرد بھی خالی نہ تھا۔ اس طرح کی چند اور صفتیں بھی اُن میں عام تھیں، لیکن اس وقت سب کے ذکر کی ضرورت نہیں، آپ بس ان ہی چھ صفتوں کو یاد رکھئے اور اپنی زندگیوں پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ ہم میں کتنے ہیں جن میں یہ اوصاف صحابۂ کرامؓ کی طرح کامل درجہ میں نہ سہی کسی درجہ میں بھی موجود ہیں؟ —— دراصل اس وقت مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا حال یہ ہو چکا ہے کہ وہ بس نام و نسبت اور نسل یا قوم کے لحاظ سے مسلمان ہے، اس کی زندگی کسی درجہ میں بھی "اسلامی زندگی" نہیں، نہ اُن میں شعوری ایمان ہے، نہ دین کی ضروری اور بنیادی باتوں کا انھیں علم ہے، اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوئی فکر اور طلب ہے، نہ اللہ کے احکام پر عمل کا فیصلہ ہے، نہ آخرت کے حساب کتاب کا کچھ خیال۔

بزرگو اور دوستو! ہماری یہ موجودہ زندگی ہرگز ہرگز اللہ کی رحمت کے لائق نہیں ہے

بلکہ اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کی مستحق ہے۔ اور میں کسی کشف و ادراک کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ قرآن و حدیث سے جو کچھ میں نے سمجھا ہے اُس کی بنا پر مجھے خطرہ ہے بلکہ یقین ہے کہ اگر اس قوم کی حالت درست کرنے کی کوشش نہ کی گئی اور اسلام کے نام اور ایمان کے دعوے کے باوجود اصلی ایمان و اسلام سے قوم کی اکثریت یوں ہی محروم رہی تو پھر یہ قوم دنیا میں اور زیادہ تباہ و برباد ہوگی۔ اور دنیا کے بعد آخرت میں بھی اللہ کے غضب اور اس کے عذاب سے چھٹکارا مشکل ہوگا ——— یہ دینی دعوت و تحریک جس کے سلسلے میں آپ کا یہ اجتماع ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ ہم سب اپنی اور اپنی قوم کی اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا طبعی طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جن مسلمانوں کے دلوں میں دین کی اہمیت کا احساس اور دین کا درد بحمداللہ کچھ باقی ہے وہ اٹھیں اور اپنے دوسرے بھائیوں میں یہ احساس و درد پیدا کرنے کی اور اللہ سے اُن کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی فکر کریں۔ اگر یہ کام سلیقے اور طریقے سے کیا جائے تو انشاءاللہ اس جد و جہد کے ضمن میں خود کرنے والوں کی بھی پوری اصلاح و تربیت ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ ایک خاص معاملہ یہ ہے کہ اس کے دین کی حفاظت کے لئے جب کوئی خاص ضرورت پیدا ہوتی ہے تو حق تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کے دلوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا فرما دیتے ہیں اور اُس کام کی طرف ان کو متوجہ کر دیتے ہیں ——— جب قرآن مجید کا کتابی نسخوں کی شکل میں منضبط اور محفوظ ہونا ضروری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے وقت سے پہلے حضرت عمر رضہ کے دل میں اس ضرورت کا احساس ڈالا اور اس کام کو کرایا۔ اسی طرح جب حدیثوں کی تدوین ضروری ہوگئی تو اپنے کچھ بندوں کو اس خدمت پر لگا دیا۔ اور انھوں نے حدیث کے تمام مستند ذخیرے کو محفوظ کر دیا۔ الغرض جس وقت دین کی حفاظت اور بقا کے لئے جس طرح کی کوشش کی ضرورت ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کو اس طرف متوجہ فرما کر وہ کام کرا دیا ہے۔ اس امت کی پوری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے اس فضل کے آثار نظر آرہے ہیں۔

بلاشبہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میں دین سے غفلت اور دوری حد کو پہونچ چکی ہے،

اور انکار وانحراف یعنی کھلم کھلا ارتداد کے سوا سب برائیاں، اُمّت کے بہت بڑے حصے میں پھیل چکی ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں از سرِنو دینی زندگی پیدا کرنے کی جیسی فکر اِدھر چند سالوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں میں پیدا کی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کے لئے جیسی اصولی کوششیں ہو رہی ہیں، اور خالص دین کے لئے اور ایمانی زندگی کے پیدا کرنے کے لئے وقت اور محنت صرف کرنے کا جیسا رواج اب پڑ رہا ہے گذشتہ دور میں بہت دور تک آپ کو یہ بات نظر نہیں آئے گی۔ میں اس کو محض اتفاقی بات نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کے فضل کی نشانی سمجھتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حرکت میں برکت کرے گا اور انشاء اللہ دین پھر سرسبز ہوگا۔ هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ۝۔

اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی ایک بڑی علامت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے اس زمانہ میں جو بہترین طریق کار ہو سکتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اپنے بندوں کی پوری پوری رہنمائی فرما دی ہے۔

ذرا غور کیجئے! اس وقت ہمارے حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ کروروں تعداد والی قوم کی تعلیم وتربیت کے لئے لاکھوں مکتب اور مدرسے ہم نہیں کھول سکتے بلکہ جو مدارس اور مکاتب ابتک قائم تھے آئندہ شائد ان میں سے بھی بہت تھوڑے باقی رہ سکیں گے ــــــ اور دین سے غفلت اور بے پروائی اور دنیا پرستی کے غلبہ کی وجہ سے اس کی بھی اُمید نہیں کہ لوگ خود اہل دین کے پاس جاکر دین حاصل کریں، پھر زندگی پر مادیت اتنی غالب آچکی ہے اور دین سے طبیعتوں کی مناسبت اس قدر کم ہو چکی ہے کہ وعظ ونصیحت سُننے کا اگر کبھی موقع بھی ہوتا ہے تو عام طور سے زندگی پر اُس سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح بہتر سے بہتر مضامین اور عمدہ سے عمدہ کتابیں لوگ پڑھتے ہیں لیکن زندگی نہیں بدلتی۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اب تقریر و تحریر بے کار ہو گئی ہے بلکہ مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ ہم میں وہ صلاحیت نہیں رہی کہ صرف وعظ ونصیحت سُننے سے یا مضمونوں اور کتابوں کے مطالعہ سے ہم پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو اصلاحی کوشش کے ایک اور طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی۔ الحمدللہ یہ طریقہ رواج پا رہا ہے۔ ہم لوگ بھی اللہ کی توفیق سے اسی طریقے پر کچھ کام کر رہے ہیں، اور ہر جگہ اور ہر طبقے کے مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہماری دعوت اور ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہر مسلمان جو اللہ پر، رسول پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اور آخرت کے حساب کتاب کی اس کو کچھ فکر ہے، اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر جو راضی اور مطمئن نہیں ہے وہ اس مقصد کے لئے اپنا کچھ وقت صرف کرنے کا فیصلہ کرے، پھر اس وقت کے استعمال کے لئے ہم ایک خاص پروگرام دیتے ہیں، اس پروگرام میں خود اپنی اصلاح و تربیت کا بھی سامان ہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کی کوشش کی بھی صورت ہے۔ الحمدللہ یہ طریقہ اور یہ پروگرام مقبول ہو رہا ہے ـــــ فی الحال اس کے دو اہم جزو ہیں، ایک ہفتہ وار مقامی اجتماع، اور دوسرے جماعتیں بنا بنا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ آپ کے یہاں (بھوپال میں) چونکہ یہ کام بحمداللہ ہو رہا ہے اور آپ اس سے کچھ واقف ہیں اس لئے طریقۂ کار کے سلسلے میں، اس وقت زیادہ عرض کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔

مجھے تو آپ حضرات سے اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ میں سے جو حضرات اب تک اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں وہ متوجہ ہوں، کام میں حصہ لیں، اپنی اور اپنے غافل بھائیوں کی دینی حالت درست کرنے کی کوشش کرکے اللہ کی رضامندی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روح پاک کی مسرت و فرحت کا سامان کریں، اور جو حضرات پہلے سے شریک ہیں اور اس سلسلے میں کچھ کر رہے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کریں ـــــ یہ دنیا آج کل تحریکوں کی دنیا بنی ہوئی ہے اور بے حساب اور بے گنتی تحریکیں اس دنیا میں چل رہی ہیں اور ہر تحریک کے ساتھ سیکڑوں ہزاروں یا لاکھوں انسان وابستہ ہیں، مگر میں پوری بصیرت اور دیانت کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس تحریک اور کوشش کا رشتہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے جڑتا ہے وہ دینی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے ہی کی کوشش اور تحریک ہے ـــــ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اسی لئے آتے تھے کہ

انسانوں کو اُس راستے پر چلائیں اور زندگی گذارنے کا وہ طریقہ بتلائیں جو اللہ کو پسند ہے اور اسی کا مقرر کیا ہوا ہے۔ جب تک نبوت ختم نہیں ہوئی تھی یہ سلسلہ اس طرح جاری تھا کہ اللہ کے نبی آکر انسانوں کو اُس طریقے پر ڈال جاتے تھے اور زندگی کا دستور اُن کے حوالہ کر جاتے تھے۔ انسان کی فطرت میں چونکہ اچھے بُرے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس لئے کچھ مدت کے بعد شیطانی اثرات سے ان لوگوں میں پھر خرابیاں آجاتی تھیں اور پیغمبر کے بتائے ہوئے راستے سے یہ بھٹک جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت اور اصلاح کے لئے دوسرے پیغمبر کو بھیجدیتا تھا جو پھر سے ان کو خدا کے راستے پر لگانے کی کوشش کرتا تھا ——

خاتم النبیین (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بعثت تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام آتے رہے (کلما ھلک نبی خلفہ نبیٌ اٰخر) حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی آمد پر نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا، اس لئے نہیں کہ اب انسانوں کو ہدایت کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے آئندہ کے لئے اس کا طریقہ بدل دیا، ابتک اصلاح و ہدایت کے لئے پیغمبر آیا کرتے تھے اور اُن کے دو کام تھے، ایک اصلاح اور ہدایت کا علم وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا، اور دوسرا اللہ کے بندوں تک اس کو پہنچانا اور اس کے مطابق ان کو چلانے کی کوشش کرنا۔ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کو یوں بدلا کہ قیامت تک کے انسانوں کو اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے جس علم اور ہدایت کی ضرورت تھی اور اپنی پسندیدہ زندگی کا جو دستور اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا اس کو مکمل طور سے حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ بھیج کر قیامت تک کیلئے اس کو محفوظ کر دیا گیا اس لئے اب کسی ایسی ہستی کی ضرورت نہیں رہی جو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے وحی کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کا علم حاصل کرے۔

اب رہا دوسرا کام یعنی اللہ کی ہدایتوں اور اس کے حکموں کو بندوں تک پہونچانا اور ان کے مطابق ان کو چلانے کی کوشش کرنا، تو یہ کام امت کے سپرد کر دیا گیا اور قرآن مجید میں اس کا اعلان فرما دیا گیا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس — تم بہترین اُمت ہو، سب انسانوں کیلئے پیدا کئے گئے ہو

تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ ؕ ۔	تم حکم دیتے ہو نیکی کا، روکتے ہو برائی سے، اور ایمان رکھتے ہو (کامل ایمان) اللہ پر۔

اور اسی سورۃ میں دوسری جگہ فرمایا گیا:

ولتکن منکم امۃ ید عون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئٰک ھم المفلحون ؕ ۔	تم میں ایک امت ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اور وہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔

بس ہم آپ کو اسی کام کے لئے بلاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کا خاص فریضہ بتلایا ہے اور جو دراصل نبوت کی نیابت اور قائم مقامی ہے ——— بزرگو اور دوستو! یہ اس زمانہ کا "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ جہاد صرف قتال یعنی جنگ کی صورت میں منحصر نہیں ہے بلکہ بندوں کو بندگی کے راستے پر چلانے کے لئے اور ان کی زندگی کو اللہ کی بندگی والی زندگی بنانے کے لئے جس وقت جو کوشش ممکن ہو بس اسی پر اپنی قوتوں کو اخلاص سے صرف کرنا "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر علاقہ کے مسلمان دینی زندگی سے اس قدر دور اور خالی ہو چکے ہیں کہ خود اُن میں اس زندگی کو پیدا کرنے اور رواج دینے کے لئے مستقل کوشش کی ضرورت ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک مسلمان اسلام کا اچھا نمونہ پیش نہ کریں گے غیر مسلموں کے خیالات اسلام کے بارے میں درست نہیں ہو سکتے، اور اسلام کو سمجھنے کی اُن میں طلب پیدا نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی امت کو آپ کا نائب اور نمائندہ بنایا تھا، اور ہم ہی وہ آئینہ بن سکتے تھے جس میں دوسری دنیا اسلام کی صورت کو دیکھ سکتی تھی لیکن اللہ کے لئے انصاف سے غور کیجئے! کیا ہم اور آپ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی نیابت اور نمایندگی کر رہے ہیں اور کیا ہمیں دیکھ کر کوئی اسلام کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ بات بالکل الٹی ہو چکی ہے۔ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی نیابت میں آپ کے لائے ہوئے

جس طریقۂ زندگی کو دنیا میں پھیلانا ہمارے ذمہ تھا ہم خود اس کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں اور اس طرح دنیا سے دین کے مٹنے کا ذریعہ بن رہے ہیں اور جس اسلام کی ہم کو نمایندگی کرنی تھی اور دنیا کے سامنے جس کا نمونہ پیش کرنا تھا اپنی پوری زندگی سے ہم اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی اسلام کے خلاف سب سے بڑی دلیل ہے، اس لئے اس وقت کا سب سے اہم اور مقدم کام اور جہاد عظیم یہی ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے کی کوشش کی جائے ـــــ ہم آپ کو اسی کام کی دعوت دیتے ہیں اور اپنے تجربے کی بناء پر ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ کام ناممکن اور محال نہیں ہے بلکہ اُن بہت سے کاموں سے آسان ہے جن میں مسلمان اپنی قوتیں صرف کر رہے ہیں ـــــ خیر کے کاموں سے اور دین کی کوشش کے نتائج سے مایوس کر دینا شیطان کا بہت بڑا فریب ہے اور جب اللہ کا کوئی بندہ اس راہ میں قدم اٹھانے کے لئے تیار ہوتا ہے تو شیطان اس کی انتہائی کوشش کرتا ہے کہ اس کو مایوس کر کے پہلے ہی قدم پہ بٹھا دے، اس لئے جب آپ میں سے کسی کے دل میں یہ وسوسہ آئے کہ اب مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کسی طرح درست نہیں ہو سکتی اور ان کی زندگی پر اب دین کا رنگ کسی طرح نہیں آسکتا۔ تو آپ یقین کے ساتھ سمجھ لیں کہ یہ شیطان کی طرف سے ہی ہے وہ نہیں چاہتا کہ آپ اس سلسلہ میں کوئی کوشش کریں اور اللہ کا کوئی ایک بندہ بھی جس کو اس نے اللہ سے غافل کر کے اپنا شکار کر لیا ہے اُس کے جال سے نکلے۔

بزرگو اور دوستو! اگر کام کا انحصار صرف ہماری ہی کوششوں پر ہوتا تو بیشک ہم کو اپنی بے مائگی اور بے چارگی کی وجہ سے مایوس ہونے کی گنجائش تھی، کیونکہ دلوں اور دماغوں کا بدلنا ہمارے بس کی بات نہیں، لیکن جب واقعہ یہ ہے کہ دلوں کی تبدیلی اللہ ہی کے قبضے میں ہے، پہلے بھی جب کبھی بدلے تھے اسی نے بدلے تھے اور اب بھی اگر بدلے گا تو وہی بدلے گا اور اس کی قدرت میں کوئی کمی اور کمزوری نہیں آئی ہے اور ہمارا کام صرف کوشش کرنے کا ہے اور اُس کا یہ وعدہ اور قانون ہے کہ بندے اگر اخلاص کے ساتھ اپنی کوششیں صرف کریں گے تو وہ ان کی مدد کرے گا اور اپنی قدرت کو اُن کے لئے

استعمال کرے گا، تو پھر مایوسی کی ہمارے لئے کیا گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ اس راہ میں جو کچھ ہمیں کرنا ہے وہ دنیا کے کسی نفع کی خاطر تو کرنا نہیں، اللہ کو راضی کرنے کے لئے اور آخرت میں اجر و ثواب حاصل کرنے کے لئے کرنا ہے، اور اللہ کی رضا اور آخرت کا اجر و ثواب نتیجہ پر موقوف نہیں بلکہ صرف سعی اور کوشش پر موقوف ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزاہ

الجزاء الاوفیٰ

بہر حال اگر نتیجہ میں کامیابی کے آثار نظر نہ بھی آئیں تب بھی صرف اپنا فرض ادا کرنے کے لئے اور اللہ کی رضا اور آخرت کا اجر حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ کام کرنا چاہئے اگرچہ خود مجھے یہ یقین ہے کہ مسلمانوں کے جن طبقوں میں دین سے تعلق اور دین کا درد و فکر بحمد اللہ باقی ہے، اگر صرف وہ ہی طبقے اس کام میں لگ جائیں یعنی ہر جگہ کے دیندار اور دین کے دردمند تمام مسلمان یا اُن میں سے اکثر ہی اللہ کے دین کی اس خدمت کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو میرے حساب سے صرف پانچ برس میں انشاء اللہ صورتِ حال بدل سکتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اتنے عرصہ میں سب اولیاء اللہ ہو جائیں گے، ہاں اللہ کے بھروسے پر یہ عرض کرتا ہوں اور الحمد للہ اس پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ قوم کی اکثریت جو اس وقت صرف نام کی مسلمان ہے انشاء اللہ کام کی مسلمان بن جائے گی یعنی ان کا ایمان شعوری ایمان ہوگا، وہ اسلام اور غیر اسلام کے فرق کو سمجھنے لگیں گے، دین کی ضروری اور بنیادی باتوں سے وہ واقف ہو جائیں گے، دین کی طلب اور فکر خدا نے چاہا تو ان میں پیدا ہو جائیگی، احکام پر چلنا اور منکرات و محرمات سے بچنا انشاء اللہ ان کی زندگیوں میں نمایاں ہو جائے گا، دلوں میں خدا کا خوف اور آخرت کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ "انما المومنون اخوۃ" اور "المسلم اخو المسلم" کی جھلک بھی خدا نے چاہا تو پیدا ہو جائے گی اور دین کے لئے کوشش اور قربانی کا رواج بھی انشاء اللہ عام ہو جائے گا۔ اصلاح و تبلیغ کے جس طریقے کی ہم دعوت دیتے ہیں اُس میں اسلامی زندگی کے ان اہم اجزاء اور عناصر کی خاص رعایت ہے ــــــ لیکن آپ جانتے ہیں کہ حاذق سے حاذق حکیم کے اچھے سے اچھے

نسخہ سے صحت اور شفا جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب اس کو استعمال کیا جائے ـــــ عمل ہی سے سب کچھ ہے اور عمل کے بغیر کچھ نہیں۔ ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس عالمِ اسباب میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ بندے اپنی کوششوں کا حق ادا کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد آتی ہے، اگر ہم اپنی امکانی کوششوں میں کمی کریں یا قوم میں سے صرف دس یا پانچ آدمی اپنی سی کوششیں کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مدد کا آنا ضروری نہیں۔

میں نے ابھی آپ سے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں میں دینی زندگی پیدا کرنے کی اس جد و جہد کا اصل مقصد اللہ کی رضا اور آخرت کی نجات و فلاح ہے، اور اگر بالفرض ہماری یہ جد و جہد نتیجہ کے لحاظ سے زیادہ کامیاب نہ ہو تب بھی انشاء اللہ حق تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے اجر کے ہم مستحق ہو جائیں گے (بلکہ اس صورت میں کوشش اور دوڑ دھوپ کے ثواب کے علاوہ ناکامی کے غم کا بھی بہت بڑا اجر ملے گا) ـــــ لیکن اگر آپ حضرات کی کوششیں اپنے خلوص کی وجہ سے اللہ کی مدد کی مستحق ہوئیں اور حق تعالیٰ نے ان کو آپ کی آرزوؤں کے مطابق کامیاب کر دیا یعنی مسلمان قوم میں اسلامی زندگی وسیع پیمانے پر پھر سے پیدا ہو گئی تو مرنے سے پہلے اس دنیا میں بھی اس کی وہ برکتیں ظاہر ہوں گی جن کا اس وقت اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ جس قوم میں سچا ایمان، اللہ کا خوف، آخرت کے حساب کتاب کا ڈر، اور اس کے اثر سے معاملات میں ایمانداری اور راستبازی کی صفات پیدا ہو جائیں، اور اچھے اعمال اور اچھی سیرت اور اللہ کے دین کے لئے مخلصانہ جد و جہد اور اس راہ میں تکلیفیں برداشت کرنے اور مصیبتیں اٹھانے کی عادت عام ہو جائے اور قوم کی ایک بڑی تعداد ان اوصاف کی حامل ہو جائے تو اس دنیا میں بھی اس کا سر بلند ہونا اور چمکنا اور دوسروں کا اس کے سامنے جھک جانا اور ماند پڑ جانا ضروری ہے، یہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔ اس کا وعدہ ہے اور یہی عقل و درایت کا تقاضہ

اور تاریخ کا تجربہ بھی ہے۔

مسلمانوں میں ایمانی زندگی پیدا کرنے کا یہ کام ابھی کچھ بھی نہیں ہوا ہے، لیکن انھی چند دنوں میں اللہ کی مدد کی حیرت انگیز نشانیاں ہم نے دیکھی ہیں اور ہمارا یہ یقین اور زیادہ پختہ ہو گیا ہے کہ اگر اللہ کے دین کی فکر اور اس کے لئے کوشش ہم اُس طرح کریں جس طرح کہ کرنا چاہئے تو اللہ تعالیٰ اپنی پوری قدرت سے ہماری مدد فرمائیں گے اور اس دنیا میں اللہ کی قدرت کے معجزے ظاہر ہوں گے۔ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ایک اٹل اور محکم وعدہ ہے

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ	اور اللہ ضرور بالضرور اُن لوگوں کی مدد کرتا ہے
إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ	جو اُسکے دین کی مدد کریں یقیناً اللہ بڑی قوت والا
( )	اور غلبہ والا ہے۔

حضرات! میں نے اس صحبت میں جو کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ عرض کر چکا۔ میرا کام اتنا ہی تھا آگے اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھ کو اور آپ کو دین کی خدمت کا حق ادا کرنے کی توفیق دے، اور یہ کام واقعہ میں جس قدر اہم اور ضروری ہے اور دنیا اور آخرت میں جو نتیجے اس سے نکلنے والے ہیں ان کا پورا یقین ہم کو نصیب فرمادے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دجّالی فتنہ اور سُورۂ کہف

(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

(۳)

جس کے پاس سب کچھ ہے، اگر دستگیری کے لئے اُن کی طرف ہاتھ بڑھائے جن کے پاس کچھ نہیں ہے، اور یوں وہ بے یاروں کی یاوری، غمخواروں کی غمخواری، ناداروں کی دارائی کرے، اور ان کی خالی جھولیوں کو بھرے سے بھرے بھرتا چلا جائے۔

سوال یہی ہے کہ پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لئے کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے مقام رفیع سے یہ نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجھلاہٹ محسوس کرے۔

نزول کے بعد ارتقا الحمد للہ یعنی تمام قابلِ تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود کو بنیاد بنا کر نزول کے بعد ارتقا کا یہی وہ قرآنی نظریہ ہے جسے سورۂ الکہف کی پہلی سطر میں الحمد للہ کے بعد ان الفاظ میں ہم پاتے ہیں فرمایا گیا ہے الحمد للہ کی حقیقت کو پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:-

الذی انزل الکتاب علےٰ عبدہٖ — جس نے اتاری کتاب اپنے بندے پر

ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہے کہ عبد یا بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر الحمد والے اللہ نے یعنی جس کے پاس سب کچھ ہے اپنی کتاب اتاری، اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

نزول اور اتار کے بعد ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ

عہد جاہلیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے سمجھئے جس میں "کچھ نہیں" سے باور کرایا جاتا ہے کہ سب کچھ نکل آیا ہے، سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات وصفات کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا، جو اس کے لئے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے، بلکہ بذاتِ خود معدوم قطعاً معدوم تھے، جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب یہ عجیب وغریب ارتقائی لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں، کتنے پیچ در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہے، جس میں کچھ نہ تھا، اس میں ان مجہول ومعدوم کمالات وصفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی، اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے کامل صفات کو چنتے ہوئے وہ آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے، اور اسی بے جان بے عقل وتمیز طالب کو یہ معدوم مطلق معدوم صفات آخر کیسے مل گئے، کہاں سے مل گئے، جن سے آج مادّے کا وجود آراستہ وپیراستہ نظر آ رہا ہے۔

یہ کتنی ٹیڑھی کبڑی پیچ وخم والی راہ ہے جس پر "کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے" کے فلسفہ یا وسوسہ نے اُن کو ڈال دیا۔ جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ تفہیم کے اس طریقے سے انصاف شرط ہے سلجھتا ہے، یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطۂ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہے ورنہ توڑی اور مروڑی طبیعتوں میں یہی اُلٹی باتیں سیدھی بن بن کر اترتی چلی جارہی ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ عہد جاہلیت کی یہ باتیں سیدھی ہیں۔ لیکن سرشت بشری کے سب سے بڑے نباض عارف رومی کا فیصلہ تو یہ ہے، کہ :۔ ؎

چوں فسونِ دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش کج در پائے کج

ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگر فٹ ہو جائے تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور ہوتا کیا؟۔

بہرحال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ کہف کے مذکورۂ بالا الفاظ میں الحمد للہ پر بنیاد قائم کر کے نزول کے بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہے اس کی یعنی ارتقاء کی اس راہ پر چلانے والی الکتاب یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے کی پہلی خصوصیت :۔

لم یجعل لہ عوجا۔ ترجمہ اور نہ رکھی (کتاب کے اتارنے والے اللہ نے) اس میں کسی قسم کی کوئی کجی

جو بیان کی گئی ہے اُس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ و خم کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے، وہ خود سیدھی ہے، سیدھی بات بتاتی ہے، سیدھی راہ پر لے چلتی ہے، فکر و نظر کی مصنوعی ورزشوں، اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن کے دل، جن کے دماغ، الٹے پلٹے مسلے دلے نہیں گئے ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اُن کے اندر یہ کتاب اُتر جائے گی، اترتی چلی جائے گی، ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ کتاب ان کے لئے پیدا کی گئی ہے، مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں، اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں، پھرے ہوئے سروں سے یہ کتاب اچٹ جاتی ہے، نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں، اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انھیں محسوس کرا سکتی ہے۔

ان کے لئے بھینس کے انڈے اور انڈے سے روغنِ گل، روغنِ گل سے ساری دواؤں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے، آخر جس مادے میں کچھ نہ تھا، جب یہ مانا جاتا ہے کہ اسی سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور بھینس کے مذکورۂ بالا مشہور لطیفے میں کیا فرق ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، صفر سے عدد کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرائے ہیں، مگر جس تھیلی میں سو روپئے ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپئے کیسے نکلے؟ الحمد للہ کو خشتِ اول قرار دے کر قرآن کائنات کی تعبیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے، وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا ہے، کچھ نہ رکھنے والوں کو اسی سب کچھ رکھنے والے کے یہاں سے ملا ہے جو کچھ ملا ہے، مگر یہ شراب سائغ اور گوارا مشروبہ مفتوں طبائع کے لئے دارو‌ئے تلخ بنا ہوا ہے، اور "کچھ نہیں سے سب کچھ" کا ارتقائی وسوسہ سارے فکری امراض کی دوا تسلیم کر لیا گیا ہے۔

خود جس مسئلہ میں الجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، انھیں کانٹوں کی سیج پر انھیں نیند آگئی ہے اور یقین کئے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے اساسی سوالوں کی گرہیں الجھنوں کے

ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ بھی کھلتی چلی جائیں گی، اور یہ سب اسی لئے ہو رہا ہے کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا ہوتا اُن کے لئے سیدھا بن گیا ہے۔ مگر ان کی ذہنیت وفکر کی یہ مصنوعی کجی، جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی پا رہی ہے اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے۔ شائد اسی کو بتانے کے لئے اور اسی خارجی سمیت کو نکالنے کے لئے دوسری خصوصیت اس "الکتاب" اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک "قَیِّماً" کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے، دیکھنے میں ہے تو بہ ظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہے، اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی مؤید ہے یعنی علاوہ اس خصوصیت کے کہ اس کتاب اور اس کی تعلیمات میں کسی قسم کی کجی نہیں پائی جاتی۔

دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ لازوال، غیر فانی، اَبٹ اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ قیام وبقاء کی شدت، اور حد سے زیادہ استحکام واستواری پر "قیم" کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا، جو ایسا برقرار باقی رہنے والا ہے، اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہے سب کے قیام وبقاء کی ضمانت جس کی قدوس وپاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے اس کو "القیوم" بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم وبرقرار ٹھہرا ہوا ہے، اور سب کو وہی، اسی کا ارادہ قائم وبرقرار رکھے ہوئے ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے۔ خیر یہ تو "قیم" کے اس قرآنی لفظ کی گویا لفظی تحقیق تھی، اب غور کیجئے اس لفظ کی معنویت کے اس پہلو پر جس کی وجہ سے اس خاص مقام پر وہ داخل اور شریک کیا گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، طبائع میں کجی اور ٹیڑھ پیدا کرنے کے بعد ٹیڑھی باتوں کے اتار دینے میں کامیاب ہو جانا، اس میں شک نہیں کہ تجربہ کی اور سامنے کی بات ہے۔ کامیابی حاصل کرنے والے آج اسی راہ سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دوسری بات بھی جس کی طرف میرے خیال میں "قیم" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے، یہ بھی تو دور کی نہیں بلکہ قریب کی ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، آخر ہم ہوں یا آپ کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اعوجاجی خرافات اور دجالی نظریات جن کا چرچا دنیا میں آج پھیلا ہوا ہے،

تعمیر کے ساتھ ہی خرابی کی صورتیں بھی کتنی سرعت کے ساتھ اس میں مضمر ہوتی چلی جاتی ہیں، مشرق میں کسی پرانے ازکار رفتہ مسئلہ کو دقیانوس کی طرف منسوب کرکے کہدیا کرتے ہیں کہ یہ تو دقیانوسی خیال ہے، دقیانوس بے چارا خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار سال پہلے دنیا کا بادشاہ ہوا تھا، مگر آج عصری نظریات کی دقیانوسیت کے لئے کون نہیں جانتا کہ غریب ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی طرف منسوب کرکے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو "وکٹورین ایج" یعنی عہد وکٹوریہ کی بات ہے، حالانکہ ولادت کے نہ سہی، مگر اس ملکہ کی موت کے زمانے کے پانے والوں کی تعداد کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ابھی زندہ ہے۔ "قیم" کے برعکس بے ثباتی کی اس خصوصیت کے لئے اس سے زیادہ اعترافی شہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ ع "مردہ زایند از بطون الامہات" یہی دجالی عہد کے نظریات کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز ہے، کلیات تو کلیات جن کی بنیاد صرف تخمینی ٹٹول، یا ان تیروں پر عموماً قائم ہے جنھیں چلانے والے اندھیرے میں چلاتے رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے دیکھے بھالے جزئیات، مثلاً آدمی کے لباس کا مسئلہ کہ سوچ سمجھ کر آرام و آسائش زیب و زیبائش کے عام پہلوؤں کا لحاظ کرکے اس کی وضع و قطع متعین کی جاتی ہے، مگر سنتے ہیں کہ بسا اوقات بازار سے گون یا ٹوپی، یا اسی قسم کی کوئی چیز خریدنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ گھر کی طرف بھاگے یا بھاگا چلے یا چلی جارہی ہیں تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو استعمال کرلیں، ورنہ گھر پہونچنے تک ممکن ہے کہ اس خاص لباس فیشن اور چلن نہ رہے۔

جن سیمابی بے قراریوں پر "تمدن جدید" اور "دانش نو" کی بنیاد قائم ہے اسکی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لطیفہ ہو، مگر زود فریبی اور زود لاغری کی اس خصوصیت کے اظہار کی یہ بہت اچھی تمثیل ہے، بعض کارٹونی تصویروں میں اسی لطیفہ کو مصور کرکے دکھایا گیا تھا میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ عہد دجالیت کے صرف لباسی جزئیات ہی کا یہ حال نہیں ہے بلکہ دجالیت کا سارا فلسفہ، سارا تمدن دھوپ چھاؤں کا فلسفہ اور دھوپ چھاؤں کا تمدن ہے۔ اس کے نیچے پناہ ڈھونڈنے والوں کو نہ دھوپ ہی سے استفادہ کا موقع میسر آسکتا ہے اگر وہ دھوپ کھانا چاہتے ہوں، اور نہ چھاؤں کے سایہ میں آرام ہی کی امید لگانی چاہئے اگر اس سایہ کے نیچے کوئی آرام لینا چاہتا ہے۔

"قیم" کے مقابلے میں "غیر قیم" ہونا، اس فلسفہ یا تمدن کی یہی خصوصیت اس پیچ و خم، یا ٹیڑھ اور کجی کے راز کی غمازی کر رہی ہے جو "دجالی" یا "ارتقائی تمدن" کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کی رگوں اور ریشوں میں رواں دواں ہے۔ "ارتقاء" نام ہی اس کا ہے کہ ہر آنے والے دن میں گذرے ہوئے کل کی مسلمہ مانی ہوئی بات غلط ثابت ہو جائے۔ کل تک جمہوریت کا نظام انسانیت کے ارتقاء کا آخری نقطۂ عروج تھا، لیکن آج سرمایہ داری کے رسوا کن طوق کو گلے میں ٹانگے ہوئے، گلی کوچوں کے بچوں کی تالیوں کا وہ نشانہ بنا ہوا ہے۔

اور اب انسانیت کا "فردوس گم گشتہ" باور کرایا جا رہا ہے کہ اشتراکی نظام میں مل جائے گا۔ جن کو یہ فردوس مل چکی ہے کہتے ہیں کہ ان کو سب کچھ مل گیا ہے۔ جس کی تلاش میں آدم کی اولاد سرگشتہ پھر رہی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہم سُن رہے ہیں، دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ سنایا جا رہا ہے وہی دکھایا گیا یا نہیں دکھایا گیا؟۔

جوانی کے بعد بڑھاپے کا، صحت کے بعد مرض کا، زندگی کے بعد موت کا، صلح کے بعد جنگ کا، سیرابی اور خوش حالی کے بعد قحط اور خشک سالی کا، امن و عافیت کے بعد وباؤں اور جنگوں کے مصائب کا، الغرض یہ یا اسی قسم کے سارے خطرات جو بنی آدم کی زمینی زندگی کے لئے روح فرسا دھمکیاں بنی ہوئی ہیں، ان سب کا سدّ باب ہو گیا، جب تک اس کی بشارت نہیں سنائی جائے گی، جنت سے نکالا ہوا ہر انسان کیا صرف اس سے خوش ہو جائے گا کہ مرض کے بعد دوا کا، بھوک کے بعد کھانے کا، پیاس کے بعد پانی کا، پھٹنے کے بعد کپڑوں کا، بیمار پڑنے کے بعد دوا کا، مرنے کے بعد کفن و دفن کا اس کے نظم کر دیا جائے گا۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ سب کچھ تو اب بھی اس کو میسر ہے، لیکن زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں اب بھی اس کے غم کی گھڑیاں مسرت کی گھڑیوں سے زیادہ ہیں، اور جب تک یہ سارے خطرات زمین کے اس کرے پر اُسے دھمکاتے رہیں گے، اس وقت تک غم کے اوقات کا یہ اوسط مشکل ہی سے ختم تو کیا معنی شائد کم بھی نہیں ہو سکتا۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ "قیم" کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی الکتاب کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے۔ لازوال، غیر فانی حقائق کا یہ وہ

مجموعہ ہے، تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ نوحؑ نے بھی ان ہی کی طرف بلایا، اور ابراہیمؑ نے بھی، موسیٰؑ نے بھی اور عیسیٰؑ نے بھی سارے "النبیون" اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا جس کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر وہ رکھتا ہے۔ چاہیئے کہ وہ آگے بڑھے، اور جس کے پاس سب کچھ ہو اسی سے جو کچھ پانا چاہتا ہے پاتا چلا جائے۔ پہلوں کو جو "الکتاب" دی گئی اس میں بھی یہی تھا، اور اسی "الکتاب" کی آخری شکل میں بھی اسی کا صلائے عام دیا گیا ہے۔

(باقی آئندہ)

تصوّف و سلوک

(از۔ جناب مولنا عبدالباری صاحب ندوی سابق پروفیسر فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی)

اس کتاب کے جستہ جستہ کچھ حصے الفرقان کی گذشتہ چند اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے اور اس کا پورا ایک باب "حیاتِ طیبہ" کے عنوان سے گذشتہ سال الفرقان کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ پوری کتاب چھپ کر پریس سے آگئی ہے —— یہ واقعہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر زمانۂ حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق ایسی جامع اور محققانہ کتاب اُردو ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ہمارے علم میں نہیں ہے —— عہدِ حاضر کے تصوف کے مخالفین اور موافقین دونوں گروہوں کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں کی اصلاح کی اسمیں خاص کوشش کی گئی ہے، اور تصوف کی اصل حقیقت کو ہر طرح کے گرد و غبار سے صاف کرکے پیش کیا گیا ہے —— دراصل اسکے مضامین حکیم الامت حضرت مولنا تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کے ہیں، اور ترتیب و تعبیر مولنا عبدالباری صاحب کی ہے —— شروع میں ہندوستان کے مشہور صاحبِ علم و قلم جناب مولنا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقدمہ ہے۔

(ضخامت ۵۰۰ صفحات) کاغذ سفید چکنا ولایتی دجلد خوشنما) قیمت (صہ)

نبی کا طریقِ دعوت و اصلاح

(ترجمہ) مولوی محمد رابع ندوی

(۴)

صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت اور صاحبِ توفیق تھے کہ دین کے بارے میں رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر بھروسہ کیا اور ذات و صفات کے بے ضرورت کلامی مسائل کے بوجھ سے سبکدوش رہے۔ انھوں نے اپنی ذکاوت و طاقت کو محفوظ رکھا اور اپنی جد وجہد اور کوشش اور اپنے اوقات کو پس انداز کر کے دین و دنیا کی ضروریات میں صرف کیا۔ وہ دین کے مضبوط حلقہ کو تھامے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر دوسروں کے پاس دین کے متعلقات و تفصیلات تھے تو ان کے پاس دین کا مغز اور اس کا لب لباب تھا۔

اللہ و رسُولؐ اور یومِ آخرت پر ایمان اور کامل سپردگی نے زندگی سے پیچ وخم کو دُور کر دیا اور انسانی خاندان کے ہر فرد کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا، جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لئے باعثِ زینت تھی۔

اشخاص ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے، جن کے باپ آدمؑ تھے، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی، ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر۔

آپ فرماتے تھے (اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب کو دور فرما دیا اور تم کو آباء و اجداد پر فخر کرنے سے بھی محفوظ رکھا۔ لوگ دو طرح کے ہیں نیک اور خدا سے ڈرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں شریف اور دوسرے بد عمل بد بخت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ذلیل)۔

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان سے کہا:۔ "دیکھو! تم کسی سے نہ بہتر ہو اور نہ بڑے، ہاں بس اگر تقویٰ میں بڑھ جاؤ"۔
جب آپ اپنے رب سے رات کے آخری حصے میں مناجات کرتے تھے، تو فرماتے تھے:۔
"میں گواہ ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں"۔
نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جاہلیت کی جڑیں اور رگیں کھود کر پھینک دی تھیں اس کے مادہ کو کچل دیا تھا اور اس کے داخلہ کے تمام روزن بند کر دیئے تھے۔ فرمایا:۔
"جو عصبیت کا علمبردار ہو وہ ہم میں سے نہیں، اور جو عصبیت پر جنگ کرے ہم میں سے نہیں، اور جس کی موت عصبیت پر ہو وہ بھی ہم میں سے نہیں"۔
جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں تھے ایک مہاجر نے ایک انصاری کو کچھ کہہ دیا۔ اور انصاری پکار اٹھا: "انصاریو!" اور مہاجر پکار اٹھا: "مہاجرو!" تو نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "چھوڑو اس جتھے بندی کے نعروں کو، یہ نجس ہے"۔
آپ نے جاہلی حمیت کو ناجائز قرار دیا اور مدد و تعاون کے اس جاہلی اصول کو بدل دیا جس پر ساری زندگی چل رہی تھی، کہ (اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم)۔
نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "جس نے اپنے لوگوں کی باطل پر مدد کی، تو وہ اس اونٹ کی مثال ہے جو کنوئیں میں گرنا چاہتا ہو اور لوگ اس کو دم سے پکڑ پکڑ کر روکتے ہوں"۔ عربوں کی نفسیات اور ذہنیت ایسی تبدیل ہو گئی کہ اب اُن کا ذوق اس مشہور مثل کو ہضم نہ کر پاتا تھا۔ جب نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک بار یہ فرمایا: "اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم"۔ تو صحابۂ کرامؓ خاموش نہ رہ سکے، اور بے ساختہ بولے:۔ کہ "یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد تو بے شک کی جائیگی، مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟" آپؐ نے فرمایا: "اس کو ظلم سے روکو، یہی اُس کی مدد ہے"۔
اسلامی معاشرے میں مختلف طبقے شیر و شکر ہو گئے تھے، وہ ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار نہیں تھے۔ مرد عورتوں کے ذمہ دار و منتظم تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور چونکہ انھوں نے

اپنا مال بھی خرچ کیا ہے، اور عورتیں نیک اور وفا شعار امانت دار تھیں، ان کے حقوق مردوں پر تھے اور مردوں کے حقوق ان پر تھے۔

پورے معاشرے میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اب انسانی معاشرہ (سوسائٹی) ایک مجبور و بے اختیار اور مفلوج و معطل جماعت نہ تھی جو نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتی ہو نہ اپنے اختیار سے، اس کی عقل و بلوغ اور اس کا اختیار تسلیم تھا، اس کا ہر فرد ایک ذمہ دار و با اختیار شخص تھا جو اپنے اپنے دائرہ میں صاحب اختیار و ذمہ دار تھا، آدمی اپنے گھر کا سرپرست اور ذمہ دار ہوتا تھا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی منتظم اور ماتحتوں کے متعلق جواب دہ تھی، ملازم اپنے مالک کے مال میں ذمہ دار اور اس ذمہ داری کا جواب دہ تھا۔ اس طرح اسلامی معاشرہ ایک ذی ہوش اور صاحب اختیار معاشرہ تھا جو اپنے اعمال کا جواب دہ تھا۔

تمام مسلمان حق کے مددگار بن گئے، ان کا کام مشورہ سے ہوتا، خلیفہ جب تک خدا کا مطیع رہتا وہ اس کے مطیع ہوتے اور اگر نافرمانی کرتا تو اطاعت باقی نہ رہتی۔ اور حکومت کا شعار "لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" بن گیا تھا یعنے، خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ وہ مال اور خزانے جو سلاطین اور رئیسوں کا لقمۂ تر اور امراء کی ذاتی جائداد سمجھے جاتے تھے اب اللہ کی امانت سمجھے جانے لگے تھے۔ اس کی رضا میں خرچ اور صحیح محل پر صرف کئے جاتے، اور مسلمان اس دولت کے امین اور متولی تھے۔ خلیفہ کی مثال یتیم کے سرپرست کی سی تھی، اگر صاحب استطاعت ہوتا تو احتیاط کرتا، اور اگر حاجت مند ہوتا تو بقدر ضرورت لیتا، اللہ کی وہ زمین جس کو سلاطین اور امراء نے غصب کر رکھا تھا، جس کے لئے چاہتے وسعت دیتے تھے اور جس پر چاہتے تنگ کر دیتے تھے اور بعض اس میں کپڑے کی طرح کتر بیونت کرتے۔ اب اللہ کی زمین تھی جس کے متعلق یقین ہو گیا تھا اگر کسی کے ساتھ ایک بالشت بھر میں زیادتی کی جائے گی تو ساتوں زمینیں ہار بنا کر پہنا دی جائیں گی۔

انسانی سوسائٹی اپنا ارادہ و اختیار اور ذوق و نشاط کھو چکی تھی، وہ ایک گھٹی گھٹی سی

سوسائٹی بن کر رہ گئی تھی، اس کو بعض اوقات میدانِ جنگ محض حکمرانوں کی اغراض کے لئے دیکھنا پڑتا، حالانکہ اس میں چستی اور جوش وخروش کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ اور کبھی صلح اس حال میں کرنی پڑتی کہ جنگ سے طبیعت سیر نہ ہوئی ہوتی اور صلح کے لئے تیار نہ ہوتی، اس سوسائٹی کے افراد کو قربانی ایثار اور تکالیف کو جھیلنے، مشقتوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا، حالانکہ اس کو نہ تو اس کی خواہش ہوتی اور نہ اس سے کچھ فائدہ، نہ وہ افسروں کو پسند کرتے اور نہ افسران کو، وہ مجبور تھے کہ اس کی اطاعت کریں جسے وہ ناپسند کرتے ہوتے اور اپنی جان ومال کو اس پر قربان کریں جس سے وہ نفرت کرتے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں کی چنگاری بجھ گئی، جذبات سرد پڑ گئے، اور لوگوں کا اٹھان ریا، اور دھوکہ بازی پر ہوا توہین وحقارت اور ذلت کے برداشت کی طبیعتیں عادی ہو گئیں۔

وہ جذبہ جس کے سر انسانیت کے اکثر اعجوبۂ روزگار اور حیرت انگیز کارناموں کا سہرا ہے جس کو لوگ (محبت) سے یاد کرتے ہیں عرصہ سے حقیر اور مردہ تھا، صدیوں سے کوئی اس کو کام میں لگانے والا اور اس سے حقیقی فائدہ اٹھانے والا پیدا نہیں ہوا تھا، بس وہ چمک دمک اور حسن وجمال کے فانی مظاہر کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔

اسی حیرت زدہ اور مظلوم معاشرے میں محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہوئے آپ نے اس کے دل کی گرہ کھول دی، اس کے دل کی کلی کھل گئی، آپ نے اس کی زندگی میں وہ مقام حاصل کر لیا جو روح ونفس کا تھا آپ نے قلب وبصر کی جگہ پُر فرمادی۔ آپ وہ انسان تھے جن کے لئے اللہ نے جمال وکمال کی اعلیٰ صفات اور حُسن واحسان کے بلیغ معانی جمع فرمادیئے تھے، آپ کو جو اچانک دیکھتا ہیبت زدہ ہو جاتا، اور آپ سے جو تعارف کے ساتھ ملتا محبت کرنے لگتا آپ کا تعریف کرنے والا کہتا، آپ جیسا نہ آپ سے قبل دیکھنے میں آیا اور نہ آپ کے بعد۔ بس یہی محبت آپ کی طرف اس طرح بہہ نکلی جس طرح نشیب میں پانی بہہ نکلتا ہے، اور نفوس وقلوب اس طرح کھنچے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے، گویا کہ نفوس اور قلوب پہلے سے آپ کے منتظر اور آپ کے لئے بیتاب تھے۔ آپ کی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی اطاعت کی ہے جس کی مثال عشاق اور اہلِ محبت کی تاریخ میں سننے میں

نہیں آئی بجحت کے عجائبات آپ کی اطاعت و تابعداری میں اپنے کو بالکل مٹا دیتے، اور گھر بار مال و دولت لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپ سے قبل پیش آئے تھے اور نہ آئندہ ان کی امید ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے اسلام لانے کے بعد ان پر مکہ میں ایک روز دشمنوں نے حملہ کر دیا، عتبہ بن ربیعہ قریب آیا اور آپ کو جوتوں سے مارنے لگا اور اس قدر مارا کہ آپ کا چہرہ سوج گیا، حتیٰ کہ شناخت تک مشکل ہو گئی تھی۔ بنو تیم حضرت ابوبکرؓ کو کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر اٹھا لے گئے، ان کو آپ کی موت میں ذرا شک نہ تھا۔ آپ کو دن چھپتے ہوئے ہوش آیا تو سب سے پہلے بولے کہ "رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کیسا حال ہے؟" لوگوں کو اس پر بڑا غصہ آیا۔ آپ کو برا بھلا کہنے لگے، اور انھوں نے ان کی ماں ام الخیر سے کہا کہ دیکھو ان کو کچھ کھلا پلا دو۔ جب تخلیہ ہوا تو انھوں نے کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا آپ برابر کہتے رہے کہ "رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کیسے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "بخدا مجھے تمھارے ساتھی کا کچھ علم نہیں۔" انھوں نے کہا، تو "خطاب کی بیٹی ام جمیل کے پاس جاؤ اور آپؐ کے متعلق ان سے پوچھو۔" وہ نکلیں اور ام جمیل کے پاس آئیں اور یہ کہا کہ "ابوبکر محمد بن عبد اللہ کے متعلق پوچھتے ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "میں نہ ابوبکر کو پہچانتی ہوں اور نہ محمد بن عبد اللہ کو، اور اگر تمھاری یہ خواہش ہو کہ میں تمھارے ساتھ تمھارے بیٹے کے پاس چلوں تو ہو سکتا ہے۔" انھوں نے کہا "ہاں چلو" وہ ان کے ہمراہ چلی گئیں اور ابوبکر کو پڑا ہوا پایا، تو ام جمیل ان کے قریب پہونچیں اور ان کا حال دیکھ کر کہا "واللہ! جس قوم نے تمھارے ساتھ یہ برتاؤ کیا وہ فاسق و کفار ہیں، اور مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے تمھارا انتقام لے گا۔" انھوں نے کہا "رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے؟" وہ بولیں: "یہ تمھاری ماں سنتی ہیں۔" انھوں نے کہا کہ ان سے کچھ پردہ نہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔ "بخیر و عافیت ہیں۔" آپ نے فرمایا "کہاں ہیں؟" وہ بولیں "دار ابن ارقم میں" آپنے فرمایا: "میں تو بخدا اس وقت تک نہ کچھ کھا پی سکتا جب تک کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) تک نہ پہنچ جاؤں:" ۔۔۔ وہ ٹھہر گئیں جب رات ہوئی اور آمد و رفت موقوف ہوئی تو وہ ان کو لیکر نکلیں اور

رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) تک پہونچا دیا، آپ نے جب حضورؐ کو دیکھ لیا تو جان میں جان آئی، اور کھایا پیا۔

ایک انصاری عورت جس کا باپ بھائی اور شوہر احد کے دن رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ہمراہ تھے اور شہید ہو گئے تھے قیام گاہ سے نکلی اور پوچھنے لگی "رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے؟" لوگوں نے کہا: "بحمد اللہ عافیت سے ہیں جیسا تم چاہتی ہو" اُس نے کہا "مجھے دکھاؤ، میں آپؐ کو دیکھنا چاہتی ہوں" اس نے جب آپؐ کو دیکھ لیا تو بولی، اگر آپؐ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔

حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا، سب کہنے لگے کہو یہ پسند ہے کہ محمدؐ تمھاری جگہ ہوں۔ انھوں نے کہا خدائے تعالیٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپؐ کے پیر میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے۔

زید بن ثابت کہتے ہیں کہ احد کے روز رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مجھے سعد بن ربیع کی تلاش میں بھیجا اور مجھ سے فرمایا، ان کو اگر دیکھو تو میرا سلام کہو، اور کہو کہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ اپنے کو کیسا پاتے ہو، کہتے ہیں کہ میں مقتولین میں چکر لگانے لگا، پھر ان کے پاس پہونچا ان کا آخری وقت تھا اور اُن کے جسم پر تیر و تلوار اور نیزے کے ستر زخم تھے، میں نے ان سے کہا "اے سعد! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو سلام کہتے ہیں اور دریافت فرماتے ہیں کہ تمھارا کیا حال ہے؟" انھوں نے کہا رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو سلام کہو اور آپؐ سے کہدو یا رسُول اللہؐ جنت کی خوشبو پا رہا ہوں، اور میری قوم انصار سے کہدو کہ اگر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کچھ ہو گیا اس حال میں کہ تم میں ایک آنکھ بھی حرکت کر سکتی ہو تو اللہ کے یہاں تمھارا کوئی عذر نہیں، اور اسی وقت رُوح پرواز کر گئی۔

احد کے روز ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے ڈھال بنا دیا تھا، تیر اس پر لگتے تھے اور وہ حرکت نہ کرتے۔ مالک انصاری نے رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زخم چوس کر صاف کر دیا تھا، اُن سے آپ نے فرمایا تھوک دو، انھوں نے کہا:

"بخدا! میں کبھی بھی نہ تھوکوں گا۔"

ابوسفیان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس پہونچے، اور جب رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے اس کو لپیٹ دیا۔ انھوں نے کہا "اے بیٹی! مجھے خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا یا مجھ کو اس کے لائق نہ سمجھا"۔ انھوں نے کہا "نہیں! بلکہ یہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا بستر ہے، اور تم مشرک نجس ہو۔"

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیبیہ کی واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "کہ اے لوگو! بخدا میں سلاطین کے یہاں گیا، کسریٰ قیصر اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے، خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی، خدا کی قسم! وہ جب بھی تھوکتے ہیں ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا ہے وہ اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے، اور جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں، اور جب وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑنے لڑتے رہ جاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں تو وہ لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں، اور وہ لوگ بسبب تعظیم کے آپؐ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔

ذکر اللہ

(اب سے قریباً ڈیڑھ دو سال پہلے زیر عنوان "اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں" الفرقان کی کئی قسطوں میں ایک سلسلۂ مضمون شائع ہوا ہے جو تین سبقوں پر مشتمل تھا بعد میں وہ کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا تھا اب چھوٹے کتابی سائز پر اس کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ اس دفعہ بعض مستقل عنوانات کا اس میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ذیل میں جو سبق درج کیا جا رہا ہے وہ در اصل اسی کا ایک مستقل اضافہ ہے کیوں کہ یہ پورا سلسلہ ہی کم پڑھے لکھے اور عام لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے اس لیے مضامین اور طرز بیان میں بھی سہولت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ ...... مدیر)

چوں کہ اسلام کی تعلیم اور اس کا مطالبہ یہ ہے (بلکہ کہنا چاہیئے کہ اسلام در حقیقت نام ہی اس کا ہے) کہ اللہ کے بندے اپنی پوری زندگی احکام الٰہی کے ماتحت گزاریں اور ہر حال اور ہر معاملہ میں وہ اللہ کی فرماں برداری کریں اور چوں کہ یہ بات کامل طور پر جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ بندے کو ہر وقت اللہ کا خیال رہے اور اس کے دل میں اللہ کی عظمت و محبت پوری طرح بیٹھ جائے اس لیے اسلام کی ایک خاص تعلیم یہ ہے کہ بندے کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کریں اور اس کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثنا سے اپنی زبانیں تر رکھیں، دل میں اللہ کی محبت و عظمت پیدا کرنے کا یہ ایک خاص ذریعہ اور آزمودہ نسخہ ہے ——— یہ ایک فطری بات ہے کہ آدمی جس کسی کی عظمت و کمال کے خیال میں ہر وقت ڈوبا رہے گا۔ اور جس کے حسن و جمال کے گیت دن رات گاتا رہے گا۔ اس کے دل میں اس کی محبت و عظمت ضرور پیدا ہو جائے گی اور برابر ترقی کرتی رہے گی، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ذکر کی کثرت عشق و محبت کے چراغ کو روشن بھی کرتی ہے۔ اور اس کے شعلے کو بھڑکاتی بھی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کامل اطاعت و بندگی کی وہ زندگی جس کا نام اسلام ہے۔ وہ صرف محبت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ صرف محبت ہی وہ چیز ہے جو محب صادق کو محبوب کا کامل مطیع اور فرماں بردار بنا دیتی ہے۔ ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ——— اس لیے قرآن پاک میں اللہ کے

ذکر کی کثرت کی بڑی سخت تاکید فرمائی گئی ہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کی بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں مثلاً سورۂ احزاب میں ارشاد ہی۔

یا ایہا الذین آمنوا اذکروا اللہ	اے ایمان والو اللہ کا ذکر کرو بہت ذکر اور
ذکراً کثیراً و سبحوہ بکرۃً و اصیلاً	اس کی پاکی بیان کرو صبح و شام۔

اور سورۂ جمعہ میں ارشاد ہوا ہی۔

واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون۔	اور ذکر کرو اللہ کا بہت تاکہ تم فلاح پاؤ

عام طور سے دو چیزیں ایسی ہیں جن میں مشغول اور منہمک ہو کر یا ان کے نشہ میں مست ہو کر آدمی اللہ کو بھول جاتا ہی، ایک مال و دولت اور دوسرے بیوی بچے اس لیے ان دونوں چیزوں کا نام لے کر صراحتہً مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہی، سورۂ منافقون میں ارشاد ہی۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تلہکم	اے ایمان والو تمھیں تمھارے مال اور تمھاری اولاد
اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ	اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو ایسا کریں گے
ومن یفعل ذلک فاؤلئک ہم الخاسرون	وہی ٹوٹے اور گھاٹے میں رہنے والے ہوں گے۔

اسلام میں پانچ وقت نماز فرض ہی اور وہ بلا شبہ اللہ کا ذکر ہی بلکہ اعلیٰ درجہ کا ذکر ہی لیکن کسی ایمان والے کے لیے جائز نہیں ہی کہ وہ صرف نماز کے ذکر کو کافی سمجھے اور نماز کے باہر اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے بالکل غافل رہی بلکہ اسلام کا صاف حکم یہ ہی کہ نماز کے علاوہ بھی تم جب تک زندہ ہو اللہ سے غافل نہ رہو ہر حالت میں اس کو یاد رکھو اور اس کا ذکر کرو۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہی۔

فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ	اور جب تم پڑھ چکو نماز تو یاد کرو اللہ کو
قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبکم ۵	کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

حتیٰ کہ جو لوگ راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلے ہوئے ہوں انھیں بھی تاکید کے ساتھ حکم ہی کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں بلکہ کثرت سے اس کا ذکر کریں سورۂ انفال میں ارشاد ہی۔

یا ایھا الذین آمنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللّٰہ کثیراً لعلکم تفلحون

اے ایمان والو جب تمہارا مقابلہ ہو کسی فوج سے تو مضبوطی سے جم جاؤ اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیاب و بامراد ہو جاؤ۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا اور اوپر سورۂ جمعہ کی جو آیت نقل ہو چکی ہے (واذکروا اللّٰہ کثیرا لعلکم تفلحون) اس سے بھی معلوم ہوا تھا کہ ایمان والوں کی فلاح و کامیابی میں ذکر اللہ کی کثرت کو خاص دخل ہے اور سورۂ منافقون کی جو آیت اوپر نقل ہوئی اس سے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ کے ذکر سے غافل رہنے والے نامراد اور خسارے میں رہنے والے ہیں اور سورۂ رعد کی ایک آیت میں اللہ کے ذکر کی ایک خاصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے چین اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد ہے۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب

یاد رکھو اللہ کے ذکر ہی سے چین پاتے ہیں دل (یعنی ایمان والی روحیں)

قرآن مجید کی ان آیتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں بھی سن لیجئے۔

"ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کے دن کون لوگ اللہ کے بندوں میں سے زیادہ اونچے درجوں پر ہوں گے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کا ذکر کرنے والے خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں[۱]"

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کو یاد کرنے والے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے[۲] (یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور نہ یاد کرنے والا مردہ بلکہ مردار ہے)

"اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ہر چیز کے لیے کوئی صیقل ہوتا ہے اور دلوں کا صیقل اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کے عذاب

---

[۱] مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی [۲] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم

سے نجات دلانے میں کوئی چیز بھی اللہ کے ذکر سے زیادہ مؤثر نہیں[1]"

ذکر کی حقیقت یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ذکر کی اصل حقیقت یہ ہی کہ آدمی اللہ سے غافل نہ ہو وہ جس حال اور جس مشغلہ میں بھی ہو اس کو اللہ کا اور اس کے احکام کا خیال ہو اس کے لیے اگرچہ یہ ضروری نہیں ہی کہ ہر وقت اور ہر حال میں وہ زبان سے بھی ذکر کرے لیکن یہ واقعہ ہی کہ اللہ کے جن بندوں کا یہ حال ہوتا ہی ان کی زبانیں بھی ذکر اللہ سے تر رہتی ہیں اور یہ حال (کہ ہر وقت اللہ کا اور اس کے حکموں کا خیال رہی اور غفلت نہ ہونے پائے) عموماً انھیں بندگان خدا کا ہوتا ہی جو زبانی ذکر کی کثرت کے ذریعہ دل و دماغ میں یاد اور دھیان کی مستقل کیفیت پیدا کر لیتے ہیں اور اللہ سے اپنے قلبی تعلق کو بڑھا لیتے ہیں اس لیے ذکر لسانی (یعنی زبانی ذکر) کی کثرت بہرحال ضروری ہی۔ اس زمانہ کے بعض پڑھے لکھے لوگوں کو یہ سخت غلط فہمی ہی کہ وہ زبان سے اللہ کے ذکر کی کثرت کو ایک بے فائدہ عمل سمجھتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں صراحۃً اس کا حکم ہی اور حضور نے اس کی بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن بسر رضؓ سے روایت ہی کہ ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ اسلام کے احکام بہت ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ حضور نے فرمایا لا یزال لسانک رطباً من ذکر اللہ (تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہا کرے[2])

ایک حدیث قدسی میں ہی جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہی بندہ جب مجھے یاد کرتا ہی اور میرے ذکر سے اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوتی ہی تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں[3]

رسول اللہ صلعم کے تعلیم فرمائے ہوئے خاص خاص اذکار جو آیتیں اور حدیثیں اب تک مذکور ہوئیں ان سے اللہ کے ذکر کی اہمیت اور

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ دعوات کبیر للبیہقی [2] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ [3] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری

فضیلت معلوم ہو چکی اور اوپر یہ بھی بتلایا جا چکا ہے کہ اللہ کے ذکر کی کثرت سے اللہ کی محبت پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے اب ہم کو اور آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کیے ہوئے اور پسند فرمائے ہوئے ذکر کے خاص خاص کلمے معلوم کر لینا چاہئیں

افضل الذکر | حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب ذکروں میں افضل لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہے"[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے جو حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی بندہ دل کے پورے اخلاص سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کلمہ کے لیے آسمانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ سیدھا عرش تک پہونچتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بندہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرے"[2]

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ

"ایک دفعہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی مجھے کوئی چیز بتلائی جائے جس کے ذریعہ میں آپ کا ذکر کیا کروں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ میرا ذکر کیا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ ذکر تو سب ہی کرتے ہیں میں کوئی خاص کلمہ معلوم کرنا چاہتا ہوں ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ اگر ساتوں آسمان اور سب آسمانی مخلوق اور ساتوں زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں تو لا الٰہ الا اللہ والا پلڑا ہی جھک جائے گا"[3]

درحقیقت لا الٰہ الا اللہ کی شان ایسی ہی ہے مگر لوگ اس کو صرف ایک ہلکا سا لفظ سمجھتے ہیں اس عاجز نے اللہ کے ایک مخلص اور صادق بندہ سے سُنا ایک خاص حالت میں اس ناچیز ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اگر کوئی شخص جس کے قبضہ میں دنیا کے خزانے ہوں مجھ سے کہے کہ یہ سارے خزانے تم لے لو اور اپنا کہا ہوا ایک دفعہ کا لا الٰہ الا اللہ اس کے بدلے میں دے دو۔ الحمد للہ یہ فقیر اس پر راضی نہ ہوگا۔" کوئی ناواقف شاید اس کو مبالغہ آمیز دعویٰ سمجھے

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ [2] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی [3] مشکوٰۃ بحوالہ شرح السنۃ

لیکن سچی بات یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کی اللہ کے نزدیک جو عظمت ہے اور جو قدر و قیمت ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو اس کا سچا یقین نصیب فرما دیں تو اس کا حال یہی ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے خزانوں کے بدلے میں ایک دفعہ کا لا الہ الا اللہ دینے پر راضی نہ ہوگا۔

کلمہ تمجید یا تیسرا کلمہ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"سب باتوں میں افضل بات اور سب کلموں میں افضل کلمے یہ چار ہیں سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر"[1]

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر مجھے اس پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج نکلتا ہے[2]

درحقیقت یہ کلمہ بہت ہی جامع کلمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت کے سب پہلو اس میں آجاتے ہیں۔ بعض حدیثوں میں اللہ اکبر کے بعد لا حول ولا قوۃ الا باللہ بھی آیا ہے ہمارے ایک مخدوم بزرگ اس کلمہ کی مختصر تشریح یوں فرمایا کرتے تھے۔

سُبحان اللہ پاک ہے اللہ ہر عیب اور ہر نقص سے اور ان تمام چیزوں سے جو اس کی شان کے مناسب نہیں۔ الحمد للہ اور ساری خوبیاں اور کمال کی سب صفتیں اس میں موجود ہیں لہٰذا سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں۔ (الحمد للہ) اور جب اس کی شان یہ ہے کہ ہر نامناسب بات سے وہ پاک ہے اور خوبیاں اور کمالات سب اس میں موجود ہیں تو پھر وہی ہمارا معبود و مطلوب ہے (لا الہ الا اللہ) ہم اس کے اور بس اسی کے عاجز اور ناچیز بندے ہیں اور وہ بہت ہی بڑا ہے۔ (اللہ اکبر) ہم کسی طرح اس کی بندگی کا حق ادا نہیں کر سکتے اور اس کی عالی بارگاہ تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی مگر یہ کہ وہی ہماری مدد فرمائے۔ (لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔)

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم [2] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم۔

تسبیحاتِ فاطمہؓ مشہور حدیث ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر کا کل کام کاج خود کرتی تھیں حتیٰ کہ خود ہی پانی بھر کر لاتی تھیں اور خود ہی چکی پیستی تھیں ایک دفعہ انھوں نے حضور صلعم سے درخواست کی کہ ان کاموں کے لیے انھیں کوئی خادم دے دیا جائے تو حضور نے ان سے فرمایا کہ میں تمھیں خادم سے اچھی چیز بتلاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت ۳۳ دفعہ سبحان اللہ ۳۳ دفعہ الحمد اللہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو یہ تمھارے لیے خادم سے بدرجہا بہتر ہے[1]۔

ایک دوسری حدیث میں ان کلمات کی فضیلت اور خاصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو شخص ہر نماز کے بعد ۳۳ دفعہ سبحان اللہ ۳۳ دفعہ الحمد اللہ ۳۴ دفعہ اللہ اکبر پڑھا کرے اور آخر میں ایک دفعہ یہ کلمہ پڑھ لیا کرے

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ لہُ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شئ قدیر۔ تو اس کی سب خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ اگرچہ سمندر کے جھاگ برابر کیوں نہ ہوں[2]۔"

سُبحَانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص صبح شام سو سو دفعہ "سُبحَانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ" پڑھ لیا کرے تو قیامت میں کوئی شخص اس سے زیادہ ثواب کا سامان لے کر نہیں آئے گا سوائے اس کے جس نے یہی عمل کیا ہو یا اس سے بھی زیادہ کیا ہو[3]"

انہی حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" دو کلمے ہیں زبان پر بڑے ہلکے، میزان عمل میں بہت بھاری، اور اللہ کو بہت پیارے سُبحَانَ اللہِ وَبِحَمدِہٖ ، سُبحَانَ اللہِ العَظِیم[4]"

اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر اللہ کے اور بھی بہت سے کلمے مروی ہیں لیکن

[1] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم [2] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم [3] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم [4] ایضاً

ہم نے جو چند کلمے اوپر نقل کیے ہیں اگر اللہ کا کوئی بندہ ان ہی کو یا ان میں سے بعض ہی کو اپنا ورد بنالے تو کافی ہو۔

ذکر کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی خاص طور سے قابل لحاظ ہو اور وہ یہ کہ جہاں تک آخرت کے اجر و ثواب کا تعلق ہے اس کے لیے کوئی خاص قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہو، اللہ کے جو بندے ذکر کا جو کلمہ بھی اخلاص سے اور ثواب کی نیت سے جس وقت اور جس مقدار میں پڑھیں گے انشاءاللہ وہ اس کے پورے اجر اور ثواب کے مستحق ہوں گے۔ لیکن حضرات مشائخ دل میں کسی خاص کیفیت کے پیدا کرنے کے لیے مثلاً اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھانے کے لیے یا دل میں حضوری اور بیداری کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے یا کسی خاص روحانی اور قلبی مرض کے علاج کے لیے خاص خاص طریقوں سے جو ذکر بتلاتے ہیں، اس میں اس تعداد اور طریقہ کی پابندی ضروری ہو جو وہ بتلائیں کیوں کہ جس مقصد سے وہ ذکر کیا جاتا ہے وہ اسی طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی موٹی سی مثال یہ ہو کہ اگر کوئی شخص صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے الحمد شریف یا قرآن شریف کی کسی اور سورت کی تلاوت کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو کہ وہ ایک دفعہ صبح کو تلاوت کرلے ایک دفعہ دوپہر کو، ایک دفعہ ظہر کے وقت اور ایک دفعہ شام کو اور اسی طرح دو چار دفعہ رات میں، لیکن اگر وہ اس سورت کو حفظ کرنا چاہتا ہو تو اس کو مسلسل بلا کسی وقفہ کے بیسوں دفعہ ایک ہی نشست میں پڑھنا پڑے گا۔ اس کے بغیر وہ یاد نہیں کرسکے گا۔ بس یہی فرق ہے اس عام ذکر میں جو صرف ثواب کے لیے کیا جاتا ہے اور اس خاص ذکر میں جو حضرات مشائخ اہلِ سلوک کے لیے بطور علاج اور تدبیر کے تجویز کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو ذکر کی ان قسموں کا فرق معلوم نہ ہونے کی وجہ سے علمی اور فقہی الجھنیں ہوتی ہیں اس لیے یہ مختصر بات یہاں عرض کردی گئی۔

قرآن پاک کی تلاوت[1]

قرآن مجید کی تلاوت بھی اللہ کا ذکر ہو، بلکہ اعلیٰ درجہ کا ذکر ہو۔ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] آج کل کے بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کا خیال ہو اور وہ بڑے زور سے اس کی اشاعت کرتے ہیں کہ معنی مفہوم سمجھے بغیر

"اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت دوسرے کلاموں کے مقابلہ میں ایسی ہو جیسی اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر[1]"

ایک دوسری حدیث میں ہے (جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھے تو اس کے لیے ایک نیکی ہو اور اس ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ہو۔ پھر فرمایا میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ "الم" ایک حرف ہو، بلکہ اس کا الف ایک حرف ہو اور لام دوسرا حرف ہو، اور میم تیسرا حرف ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے جو حضرت ابو امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگو قرآن پڑھا کرو، قیامت کے دن قرآن اُن لوگوں کی شفاعت کرے گا جو

سمجھو قرآن شریف کی تلاوت بالکل فضول ہو۔ یہ بیچارے شاید یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح قانون یا اخلاق کی دوسری کتابیں ہوتی ہیں اسی طرح کی ایک کتاب قرآن شریف بھی ہو، اور جیسے کہ کسی قانونی یا اخلاقی کتاب کو اس کے نہ سمجھنے والے کا پڑھنا بالکل فضول اور لایعنی فعل ہو اسی طرح ان لوگوں کا تلاوت کرنا بھی ایک فعل عبث ہو جو قرآن کے معنی نہیں سمجھتے، حالانکہ دوسری کتابوں سے مختلف اللہ کی اس مقدس کتاب کی خصوصیت یہ ہو کہ یہ اللہ پاک کی کتاب ہو اسلیے ادب اور عظمت کے ساتھ اسکی صرف تلاوت بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عبدیت کے تعلق کو ظاہر کرنے والا ایک عمل ہو اسلیے یہ ایک مستقل عبادت ہو اگر قرآن کی تلاوت کا مقصد صرف سمجھنا ہی ہوتا تو ایک ایک نماز میں چار چار دفعہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم نہ ہوتا کیونکہ معنی اور مطلب کے سمجھنے کے لیے تو ایک دفعہ کی تلاوت کافی ہوتی۔ اس طرح کی غلط فہمیاں دراصل ان لوگوں کی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو دنیا کے حاکموں کی طرح کا بس ایک حاکم سمجھتے ہیں۔ اور اس کی شانِ محبوبیت و معبودیت سے ناآشنا ہیں، یا یوں سمجھئے کہ جنھوں نے صرف دماغ سے خدا کو جانا اور مانا ہو اور دل سے ماننا ابھی انھیں پوری طرح حاصل نہیں ہوا ہو —— اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن کا جو اصل مقصد ہو یعنی ہدایت و نصیحت، وہ سمجھنے ہی پر موقوف ہو اس لیے اس کو سمجھنا اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرنا یہ سعادت کا اعلیٰ درجہ اور اونچا مقام ہے، یہی اس مسئلہ میں نقطۂ اعتدال اور قول حق ہو۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۱۲

[1] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی

قرآن والے ہوں گے۔"

ذکر کے متعلق چند آخری باتیں

ذکر کرتے کرتے جن اللہ کے بندوں کے دل میں ذکر بس گیا ہو اور ان کی زندگی کا جز بن گیا ہو انھیں تو ذکر کے لیے کسی خاص پابندی اور اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ہم جیسے عوام اگر ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق بڑھانا اور ذکر کے برکات و ثمرات حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے ذکر کی کچھ تعداد اور اس کا وقت مقرر کرلیں، اور بہتر یہ ہو کہ کلمات ذکر کے انتخاب میں کسی صاحبِ ذکر سے مشورہ کرلیں یا مذکورۂ بالا کلمات ذکر میں سے جس ذکر سے اپنی طبیعت کو زیادہ مناسبت ہو اس کو مقرر کرلیں۔ اسی طرح قرآن شریف کی تلاوت کے لیے بھی وقت مقرر کرلیں۔

(۲) جہاں تک ممکن ہو جس کلمہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اسکے معنیٰ کا بھی دھیان رکھا جائے اور اللہ کی عظمت اور محبت کے شعور کے ساتھ ذکر کیا جائے اور اس پر یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ میرے پاس اور میرے ساتھ ہیں، اور میرے ہر لفظ کو سُن رہے ہیں۔

(۳) ذکر کے لیے وضو شرط نہیں ہو اس لیے وضو نہ ہونے کی حالت میں بھی بے تکلف ذکر کیا جا سکتا ہو۔ انشاء اللہ جس ثواب کا وعدہ ہو وہ پورا پورا ملے گا۔ لیکن وضو کے ساتھ ذکر کی تاثیر اور نورانیت بہت بڑھ جاتی ہو۔

(۴) اوپر ذکر کیا جا چکا ہو کہ ذکر کے تمام کلمات میں کلمۂ تمجید (تیسرا کلمہ) "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر" بہت جامع ہو اگر اسکو اپنا ورد بنا لیا جائے تو اس میں سب کچھ ہے اور اپنے اکثر بزرگوں کو دیکھا ہو کہ وہ عام طالبین کو مستقل ورد کے لیے یہی کلمہ اور اس کے ساتھ استغفار اور درود شریف بتلاتے ہیں۔

(استغفار اور درود شریف کا بیان انشاء اللہ مستقلاً کیا جائے گا)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ اس کے ذکر سے ہمارے قلوب معمور اور ہماری زبانیں تر رہیں اور اُس کے انوار و آثار اور برکات و ثمرات ہمیں نصیب ہوں۔

ہمارا شغل ہو راتوں کو رونا یادِ دلبر میں
ہماری نیند ہو محوِ خیالِ یار ہو جانا

ہم غریبوں کا بھی سلطانِ غریباں کو سلام

از محترم حضرت حمید صدیقی لکھنوی

ہمارے محترم حضرت زائر حرم سے جو حضرات واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیارِ نبی کے ساتھ آپ کو کیسا تعلق بخشا ہے اس سال آپ کو جب حضرت مدیر الفرقان کے عزمِ حجاز کا علم ہوا تو آپ ان کے ذریعہ اپنا سلام و پیام بھیجنا چاہتے تھے لیکن اتفاق کی بات کہ لکھنؤ سے بمبئی کے لیے روانگی اچانک پیش آگئی اور حضرت حمید صاحب سے ملاقات بھی نہ ہو سکی، بعد میں جب علم ہوا تو آپ نے مندرجۂ ذیل پیام و سلام حضرت مدیر الفرقان کے نام مدینہ طیبہ ڈاک سے روانہ کیا اور ایک کاپی خاکسار ناظم الفرقان کو بھی مرحمت فرمائی۔ ہمارا خیال تھا کہ ان شاء اللہ اس سال بھی ہم الفرقان کا دوسرا حج نمبر نکال سکیں گے اور اسکے لیے ہم نے اس سلام کو محفوظ رکھا تھا، لیکن اب الفرقان کی مالی حالت کچھ ایسی ہے کہ بظاہر اس سال حج نمبر نہیں نکال سکیں گے، اسلیے نمبر کی معذرت کے ساتھ یہ نظم آج ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں قارئین کرام پڑھیں اور محبت کے مزے لیں ــــ خاکسار ناظم الفرقان

زائرو پیش کرو جب شہِ ذیشاںؐ کو سلام
ہم غریبوں کا بھی سلطانِ غریباںؐ کو سلام

عرض کرنا بکمالِ ادب و شوق و نیاز
قبلۂ اہلِ وفا، کعبۂ ایماںؐ کو سلام

یاد رکھنا حرمِ پاک کے جانے والو
مجھ گنہگار کا اس رحمتِ یزداںؐ کو سلام

بھول جانا نہ کہیں وقتِ تلاوت بخدا
مَہبطِ رُوحِ امیں حاملِ قرآںؐ کو سلام

خوابگاہِ شہِ کونینؐ پہ ہر لحظہ درود
سحر و شام مرے حاصلِ ایماںؐ کو سلام

گوشہ گوشہ پہ شبستانِ رسالت کے درود
روضہ و منبر و محرابِ درخشاں کو سلام

قبۂ نور پہ ہوتے ہیں جو قرباں ہمہ شب
ان ستاروں کو سلام اس مہِ تاباں کو سلام

فرشِ پا ہوتی ہے جو مسکنِ حرم میں ہر سو
اس شبِ ماہ اور اس صبحِ درخشاں کو سلام

جس سے ہوتی ہیں مری ہجر کی راتیں روشن
حرمِ قدس کی اس شمعِ شبستاں کو سلام

گنبدِ سبز کا ہر روز جو کرتی ہیں طواف
ان شعاعوں کو اور اس مہرِ درخشاں کو سلام

جس سے روشن ہوئے دل ہم سے سیہ کاروں کے
اس درِ پاک کی قندیلِ فروزاں کو سلام

روضۂ خلد میں جو محوِ عبادت ہوں گے
ان کے حسنِ نظر و چہرۂ تاباں کو سلام

درِ اقدس پہ جو مصروفِ گہر باری ہو — نگہِ شوق کا اُس دیدۂ گریاں کو سلام
وہ جو احساسِ ندامت سے ہو طوفاں بہ کنار — ڈبڈبائی ہوئی اُس چشمِ پشیماں کو سلام
گم جو ہو جلوۂ بے رنگ کے نظارے میں — دلِ مشتاق اس دیدۂ حیراں کو سلام
باصد اخلاص و باندازِ غلامی کہتا — حرمِ پاک کے ہر خادم و درباں کو سلام
دل کو دل چشمِ توجہ سے بنایا جس نے — میرے اس راہبرِ منزلِ عرفاں کو سلام
جو پھرا کرتے ہیں مستوں کی طرح گلیوں میں — اُن سگانِ بلدِ شاہِ رسولاںؐ کو سلام
جن کو حاصل ہو شرف آپ کی پابوسی کا — اُس گلی کوچے کے ذراتِ درخشاں کو سلام
نگہِ سرورِ کونینؐ پڑی ہے جن پر — جادہ و منزل و کہسار و بیاباں کو سلام
اک نظر کوہِ اُحد پر مری خاطر پہلے — پھر اُسی وادیٔ فردوس بداماں کو سلام
محوِ آرام ہیں جس خاک پہ اصحابِؓ اُحد — ایک مہجور کا اُس گنجِ شہیداں کو سلام
جس میں ہو خلد در آغوش قبا کی مسجد — اُس خیاباں کو سلام، اُس چمنستاں کو سلام
رنگ و نکہت پہ شمیمِ چمنِ خلد نثار — غنچہ و لالہ و گل، سنبل و ریحاں کو سلام
جس میں ہر لحظہ مہکتی ہو نسیمِ رحمت — اُس گلستاں کو سلام اہلِ گلستاں کو سلام
سازِ دل گونج اُٹھا کیف نوا سنجی سے — چمنِ طیبہ کے مرغانِ خوش الحاں کو سلام
جن کے صدقے میں خلش ہوتی ہو اب تک دل میں — سنگریزوں کو اور اُن خارِ مغیلاں کو سلام
کیف و مستی میں فراموش نہ ہو جائے کہیں — قافلے والوں کو اور اُنکے حدی خواں کو سلام
مست و سرشار نظر آئیں جو کچھ ناقہ سوار — اُن کے بکھرے ہوئے گیسوئے پریشاں کو سلام
پاپیادہ جو ملے راہ میں دیوانۂ شوق — اُس غریب الوطن و بے سر و ساماں کو سلام
غازۂ خاکِ رہِ شوق ہو جس کے رُخ پر — اُسکے ذوقِ طلب و رنگِ پریشاں کو سلام
جس جگہ کرتے ہیں حجاج پہونچ کر منزل — اُن مقامات کو اُن کوہ و بیاباں کو سلام
نعت پڑھتا ہوا مل جائے جو کوئی یمنی — غائبانہ مرا اُس مست و غزلخواں کو سلام

اُن کی رحمت سے میسر ہوں وہ دن کاش حمید
خود کروں عرض شہنشاہِ رسولاںؐ کو سلام

سفرِ حجاز کے بعض تجربات اور تاثرات

۲

(۹) سب سے زیادہ رُوحانی تکلیف اور قلبی اذیت مکہ معظمہ میں اور خاص مسجدِ حرام میں جن بے عنوانیوں کے دیکھنے سے ہوتی تھی اور غضب الٰہی کے نزول کا جن سے خطرہ ہونے لگتا تھا اُن میں سے چند کا تعین کے ساتھ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان سطور کے پڑھنے والوں میں سے جن کو وہاں کی حاضری کی توفیق ہو وہ پہلے سے اس بارے میں خبردار ہو کر اور ان بے عنوانیوں سے بچنے کا پوری طرح عزم کر کے جائیں اور دوسرے جانے والوں کو بھی ان چیزوں کے متعلق خاص طور سے نصیحت اور وصیت کر کے اپنا فرض ادا کریں۔

حجر اسود کا چومنا بلا شبہ ایک سعادت ہے اور کسی دوسرے کو تکلیف دیئے اور خود تکلیف اٹھائے بغیر یہ سعادت اگر حاصل کی جا سکے تو ضرور حاصل کرنا چاہئے، لیکن اس تک پہونچنے کے لئے کسی مسلمان کو ستانا اور دکھ پہونچانا حرام ہے، ایسا حرام جس کی تلافی ہزار دفعہ حجر اسود چومنے سے بھی نہیں ہو سکتی، لیکن اللہ برا کرے جہالت اور ناتربیتی کا کہ بہت سے لوگ وہاں وہ چیرہ دستی اور پہلوانی دکھاتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ ایسی بے دردی اور قساوت سے پیش آتے ہیں کہ اللہ کی پناہ، یہ ظالم اتنا نہیں سوچتے کہ اگر کسی معمولی حاکم کے دربار میں کسی پر وہ ایسا ظلم اور ایسی جہالت اور بدتمیزی کریں تو کیسی سخت سزا پائیں۔

اسی طرح مقام ابراہیم کے پیچھے نوافل پڑھنے کی کوشش میں اکثر لوگوں سے جن بدتمیزیوں کا صدور ہوتا ہے اور اس مقدس و محترم مقام کے ادب کے خلاف اس سلسلے میں جو حرکتیں وہاں ہوتی ہیں نماز میں سکون ڈھونڈنے والی طبیعت بعض اوقات ان سے اتنی جھنجھلا جاتی ہے کہ نماز کے دوران میں نیت توڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔ خود اس عاجز کو

ایک دو دفعہ سے زیادہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ نماز پوری کرنی مشکل ہو گئی اور بالآخر نیت کو توڑ ہی دینا پڑا۔

علیٰ ہذا زمزم شریف پر بے ادبی اور بے تمیزی کے جو مظاہرے ہوتے ہیں (جن کی ذمہ داری حاجیوں کے علاوہ زمزم کے ان اجارہ داروں پر بھی ہے جن کا وہاں قبضہ اور تصرف رہتا ہے) ان کو دیکھ دیکھ کر بعض اوقات دل لرز جاتا تھا اور بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی شاید اس سے زیادہ بیہودگیاں اور بدعنوانیاں یہاں نہ ہوتی ہونگی۔

اور اس سب سے زیادہ تکلیف دینے والا منظر خانہ کعبہ کے داخلہ کا ہوتا تھا، بیت اللہ کا دروازہ عموماً مقفل رہتا ہے، زمانۂ حج میں کسی کسی دن تھوڑی دیر کے لئے کھولا جاتا ہے[1]، اگرچہ کعبۃ اللہ کے اندر جانا فرض، واجب، بلکہ موکدہ قسم کی سنت بھی نہیں ہے، بس مستحب درجہ کی ایک سعادت ہے جو اگر آسانی سے کسی معصیت کے ارتکاب کے بغیر حاصل ہو جائے تو الحمد للہ، ورنہ نہ جانا بہتر ہے۔ لیکن جہالت و بے خبری اور دینی ناتربیتی کی وجہ سے اکثر حاجیوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں اسی کا شوق اور اسی کی آرزو سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اس شوق کے پورا کرنے میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز ان کے سامنے نہیں رہتی۔ ادھر بدقسمتی یہ ہے کہ کعبہ کی کلید برداری متوارث طور پر جس خاندان میں چلی آ رہی ہے اس کے جن افراد کو اس وقت اس منصبِ عظیم کا شرف حاصل ہے، بہت ہی افسوس اور دلی رنج و قلق کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس عظیم الشان شرف کو بہت ہی گھٹیا درجہ کی کمائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ خاص کعبہ کے دروازہ میں بیٹھ کر جس مجرمانہ طریقے سے زائرین سے یہ لوگ پیسے وصول کرتے ہیں وہ شرعاً حرام اور واجب التعزیر ہونے کے علاوہ کعبۃ اللہ کی سخت بے توقیری بھی ہے ـــــ نجدی حکومت نے اپنے ابتدائی دور میں کچھ اصلاحات کی ہونگی لیکن اب تو وہاں بالکل نہیں محسوس ہوتا کہ یہاں کوئی ایسی حکومت قائم ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا فرض سمجھتی ہو اور جس کو برائیوں اور بے عنوانیوں کے روکنے سے

---

[1] موسم حج کے علاوہ بھی سال میں کئی بار مقررہ تاریخوں میں باب کعبہ کھلتا ہے۔ ۱۲

کوئی دلچسپی ہے۔

وہاں کی روک تھام تو ہمارے بس میں نہیں لیکن جانے والوں کو حتی الوسع ضرور بتلایا اور سمجھایا جائے کہ وہ وہاں ان برائیوں اور بے عنوانیوں سے بچنے کی خاص طور سے کوشش کریں۔

خواہ اس کو میری آنکھ کی بدبینی پر محمول کیا جائے یا اس کا سبب کچھ اور سمجھا جائے یہ واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ کے قریباً سوا مہینے کے قیام میں عبادت اور ذکر اللہ کے روح پرور مناظر سے میرا گنہگار دل اتنی مسرت حاصل نہیں کر سکا جتنا کہ ان بے عنوانیوں کے مشاہدہ سے اس نے رنج و غم کا حصہ لیا ——— اس کے سوا کیا کہوں کہ اپنی قسمت اور اپنا نصیب! ۔ فوا اسفا وواحسرتا! ۔ ع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

خدانخواستہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ روح کو خوش کرنے والے منظر وہاں دیکھے ہی نہیں ——— جہاں ہر وقت کی نماز میں ہزاروں ہزار اللہ کے بندے ایک ساتھ رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوں (جن میں نہ معلوم کتنے اللہ کے خاص ولی ہوں گے) اور جہاں ہر وقت سیکڑوں اور اکثر اوقات ہزاروں نیک بندے ذکر و تسبیح اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے ہوں اور جہاں ہر دم اور ہر آن بیت اللہ کے گرد طواف ہوتا ہو اور رات دن میں ایک منٹ کیلئے بھی مطاف خالی نہ رہتا ہو ۔ جہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے لیکر سیدنا حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تک کے ہزاروں انبیاء و رسل اور لاکھوں کروروں اولیاء و صلحاء کے ذکر و عبادت اور طواف و اعتکاف کے بے حد و حساب انوار ہوں اور ان سب سے بالاتر جہاں ہر آن بے حساب و شمار تجلیاتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہو وہاں کی روحانی بہاروں کا کیا ٹھکانا ہے ۔ ع

گلچین تو از تنگیٔ داماں گلہ دارد

لیکن چونکہ جی یہ چاہتا تھا کہ اللہ کے اس مقدس گھر اور اس مرکزِ انوار و تجلیات میں کوئی اخلاقی اور عملی گندگی آنکھ نہ دیکھے، اور پہلے سے کچھ تصور بھی ایسا ہی بندھ گیا تھا اس لئے

وہاں کی ہر برائی آنکھ میں بے حد چبھتی تھی اور دل کو اس سے سخت ترین تکلیف ہوتی تھی۔

---

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں ایک خاص انعام یہ فرمایا کہ مکہ معظمہ میں حج سے فراغت کے بعد بھی پورا ایک مہینہ قیام نصیب رہا اور وہ بھی شہر کے کسی محلہ میں نہیں بلکہ مسجد حرام کے مشہور دروازہ باب ابراہیم کے بالائی حصے پر، مدرسۂ فخریہ کے ایک کمرے میں، گویا خاص حرم شریف ہی کے ایک گوشہ میں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے یہاں قیام کا یہ موقع مرحمت نہ فرمایا ہوتا تو شائد اندازہ بھی نہ ہوتا کہ بیت اللہ شریف کے اتنے قریب رہنے میں کیا کیا فائدے اور کیا کیا برکتیں ہیں۔ مولانا قاری حبیب احمد صاحب (موجودہ مہتمم مدرسۂ فخریہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ صرف انہی کی عنایت سے یہ نعمت نصیب ہوئی۔ مولانا موصوف سے اس عاجز کا براہِ راست کوئی تعلق اور تعارف نہ تھا، ہاں رفیقِ محترم مولانا سید ابو الحسن علی کا اُن سے بہت پُرانا تعلق ہے اور اب سے دو ڈھائی سال پہلے جب مولانا موصوف حج کو تشریف لے گئے تھے تو آپ کا قیام بھی کئی مہینے اسی مدرسہ ہی کے ایک حصے میں رہا تھا، اس کے علاوہ میرے رفقاءِ سفر میں مردِ صالح مولانا قاری عبد الوہاب صاحب (مہتمم مدرسۂ فرقانیہ گونڈہ) کا بھی مولانا موصوف سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ بہرحال مدرسۂ فخریہ میں قیام ہونا بظاہر اسباب انہی تعلقات کا مُبارک نتیجہ تھا۔

اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کریمانہ رویہ سے بڑی اُمید ہے کہ مرنے کے بعد آخرت میں بھی اچھوں سے محبت و تعلق کی برکت سے انشاء اللہ اسی طرح کوئی اچھی جگہ مل جائیگی۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا مشہور ارشاد ہے :- "المرء مع من احب" یعنی قیامت میں آدمی اُس کے ساتھ کر دیا جائے گا جس سے اس کو محبت کا تعلق ہو گا۔

---

(۱۱) اپنی اور اپنے جیسے گندوں کی ان برائیوں اور نازیبا حرکتوں کے علاوہ جنکی طرف اوپر کچھ اشارات کئے گئے، مسجد حرام میں جو کچھ ہوتا تھا اور جو کچھ نظر آتا تھا وہ روحِ ایمانی کیلئے

زندگی اور تازگی ہی کا سامان ہوتا تھا لیکن اپنا دل ان میں سے جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا تھا وہ عشق و محبت کی وارفتگی اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ بعض بندگانِ خدا کا طواف اور ملتزم پر بعض اہلِ درد کی دُعا ہوتی تھی —— ایک دعا کرنے والے کی دعا کے چند ٹکڑے آپ بھی سن لیجئے، اللہ اکبر! کیسے درد سے کہتا تھا:۔

يَا غِيَاثِي عِنْدَ كُلِّ كُرْبَةٍ وَمَعَاذِي عِنْدَ كُلِّ شِدَّةٍ وَمُجِيْبِي عِنْدَ كُلِّ دَعْوَةٍ وَمُونِسِي عِنْدَ كُلِّ وَحْشَةٍ وَيَا رَجَائِي حِيْنَ تَنْقَطِعُ حِيْلَتِي. يَا غِيَاثِي يَا غِيَاثِي يَا غِيَاثِي! بِكَ أَسْتَغِيْثُ فَاَغِثْنِي وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ فَاكْفِنِي، يَا كَافِي اِكْفِنِي الْمُهِمَّاتِ مِنْ أُمُورِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ وَارْحَمْنِي يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔	ہر دکھ درد میں میری مدد کرنے والے اور میری فریاد سننے والے! ہر سختی کے وقت میں میرے پشت پناہ، میری ہر پکار سننے والے اور ہر وحشت کے وقت میرے لئے اُنس کا سامان کرنے والے! اور تدبیروں کے ختم ہو جانے کے وقت میرے سہارے!۔ اے میرے پروردگار میرے مددگار، میری فریاد پر پہنچنے والے!۔ میں تجھ سے ہی مدد چاہتا ہوں تو میری مدد کر، میں نے تجھ ہی پر بھروسہ کیا ہے تو میرے لئے کافی ہو جا، اے کافی ہونے والے دنیا اور آخرت کی سب مشکلات میں تو میرے لئے

کافی ہو جا، اور اے دنیا و آخرت میں رحمت کرنے والے تو مجھ پر رحم کر!

اِلٰهِي! عَبْدُكَ بِبَابِكَ فَقِيْرُكَ بِبَابِكَ سَائِلُكَ بِبَابِكَ مِسْكِيْنُكَ بِبَابِكَ ذَلِيْلُكَ بِبَابِكَ ضَعِيْفُكَ بِبَابِكَ ضَيْفُكَ بِبَابِكَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ	خداوندا! تیرا بندہ تیرے در پر ہے، تیرا منگتا تیرے در پر ہے، تیرا مسکین تیرے دروازہ پر ہے، تیرا ذلیل تیرے دروازہ پر ہے، تیرا کمزور اور ناتواں تیرے دروازہ پر ہے، تیرا مہمان تیرے دروازہ پر ہے اے سب

جہانوں کے پروردگار!

اِرْحَمْنِي يَا مَوْلَائِي يَا سَيِّدِي أَنْتَ [illegible]	رحم کر مجھ پر میرے مولا میرے آقا! تو

وَاَنَا الْمُسِیْئُ وَهَلْ یَرْحَمُ الْمُسِیْئَ اِلَّا الْغَفَّارُ مَوْلَائِیْ مَوْلَائِیْ اَنْتَ الْمَالِكُ وَاَنَا الْمَمْلُوْكُ وَهَلْ یَرْحَمُ الْمَمْلُوْكَ اِلَّا الْمَالِكُ، مولائی مولائی انت الرب وانا العبد وهل یرحم العبد الا الرب، مولائی مولائی انت الرازق وانا المرزوق وهل یرحم المرزوق الا الرازق مولائی مولائی انت الکریم وانا اللئیم وهل یرحم اللئیم الا الکریم مولائی مولائی انت العزیز وانا الذلیل وهل یرحم الذلیل الا العزیز مولائی مولائی انت القوی وانا الضعیف وهل یرحم الضعیف الا القوی مولائی مولائی انت الغفور وانا المذنب وهل یرحم المذنب الا الغفور۔

بخشنے والا ہے اور میں مجرم، اور بخشنے والا ہی مجرم پر رحم کرتا ہے۔ میرے مولا میرے آقا! تو مالک ہے اور میں تیرا مملوک اور مملوک پر مالک ہی رحم کرتا ہے۔ میرے مولا میرے آقا! میں تیرا بندہ ہوں اور تو میرا رب اور بندہ پر رب ہی رحم کرتا ہے — میرے مولا، میرے آقا تو رازق ہے اور میں مرزوق اور مرزوق پر رازق ہی رحم کرتا ہے میرے مولا میرے آقا تو کریم ہے اور میں لئیم، اور لئیم پر کریم ہی رحم کیا کرتا ہے، میرے آقا میرے مولا تو عزت والا ہے اور میں ذلیل اور ذلیل پر عزت والا ہی رحم کیا کرتا ہے۔ میرے مولا، میرے آقا! تو قوت والا ہے اور میں کمزور اور کمزوروں پر قوی ہی رحم کیا کرتا ہے۔ میرے مولا، میرے آقا! تو بخشنے والا ہے اور میں خطاکار، اور خطاکاروں پر بخشنے والا ہی رحم کیا کرتا ہے

اِلٰهی انت تعلم سری وعلانیتی فاقبل معذرتی واعطِ سؤلی ؛

اے میرے اللہ تو میرے باطن اور ظاہر کو خوب جانتا ہے، میری معذرت قبول فرمالے، اور میرا سوال پورا کر دے۔

الٰھی انی عبدك المذنب المخطی اجرنی من النار یا مجیر یا مجیر یا مجیر!!!

اے میرے معبود میں تیرا گنہگار خطاوار بندہ ہوں مجھے دوزخ کی آگ سے بچالے. پناہ دینے والے بچانے والے پناہ دینے والے، اپنی پناہ میں لینے والے!

اللّٰھم ان ترحمنی فانت اھل وان تعذبنی فانا اھل فارحمنی یا اھل التقویٰ ویا اھل المغفرۃ ویا ارحم الراحمین ویا خیر الغافرین۔

خداوندا! اگر تو مجھ پر رحمت فرمائے تو یہ تیری شان کے لائق ہے، اور تو اگر مجھے سزا دے تو میں اسی قابل ہوں، تو اے مولا میرے تو اپنی شان کے مطابق معاملہ فرما اور مجھ پر رحم کر اے تقویٰ کے قابل، اے مغفرت والے، اے ارحم الراحمین، اے خیر الغافرین۔

اللھم ارزقنی من فضلك وبارك لی فی رزقك واغنی عن خلقك واجعل غنائی فی نفسی واجعل رغبتی فیما عندك یا باسط الیدین بالعطیہ یا باسط یا باسط یا باسط — اللھم انك قلت ادعونی استجب لکم وانك لا تخلف المیعاد۔

خداوندا! مجھے اپنے فضل کے خزانہ سے رزق دے اور میرے رزق میں برکت دے اور اپنی مخلوق سے مجھے مستغنی کر دے اور میرے دل میں غنا کی صفت پیدا کر دے، اور جو نعمتیں تیرے پاس ہیں انکی رغبت اور طلب مجھ میں پیدا کر دے، اے دونوں ہاتھ بڑھا کر دینے والے، اے ہاتھ بڑھانے والے، اے ہاتھ بڑھانے والے اے ہاتھ بڑھانے والے! — اے میرے اللہ تو نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور تو وعدہ خلافی کرنے والا نہیں۔

اللہ کے اس بندہ کو کئی بار دیکھا کہ وہ اپنے داہنے ہاتھ سے باب کعبہ کی بائیں چوکھٹ تھامے اور دوسرا ہاتھ حجر اسود کی جانب بڑھائے بیت اللہ کی دیوار (یعنی ملتزم) سے چمٹ کر مختلف ماثورہ دعاؤں کے ساتھ بڑے درد اور بڑی اثر انگیز اضطراری کیفیت کے ساتھ یہ دعا کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ بھی مانگنے والے رب کریم کے دروازہ پر اپنے اپنے الفاظ اور اپنی اپنی زبانوں میں اپنی حاجتیں مانگتے ہی رہتے تھے، لیکن جیسا کہ عرض کیا ان میں سے بعض مانگنے والوں کی گریہ زاری اور ان کی اندرونی اضطراری کیفیت سے اپنے پر بھی بہت اثر پڑتا تھا اور جہاں تک اپنے احساس اور تاثر کا تعلق ہے شاید سب سے قیمتی لمحے وہی ہوتے تھے جبکہ طواف میں یا ملتزم پر اللہ کے کسی صاحب درد اور صاحب دل بندہ کا ساتھ نصیب ہو جاتا تھا۔

---

(۱۲) مکہ معظمہ کے قیام کی آخری رات کا واقعہ ہے وہاں کے حساب سے کوئی ۹-۱۰ بجے (ہندوستانی ٹائم کے حساب سے رات کے ۳-۴ بجے) یہ عاجز طواف کے لئے مطاف میں پہونچا، چونکہ اگلے روز مکہ معظمہ سے روانہ ہونا اور بیت اللہ سے رخصت ہونا تھا اسلئے دل چاہتا تھا کہ آج طواف میں استلام (حجر اسود چومنا) اور ملتزم پر دعا کا موقع کاش پورے اطمینان سے حاصل ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا پوری فرمادی حسن اتفاق سے اس وقت طائفین کا اژدحام بہت کم تھا، جتنے طواف ہو سکتے تھے پورے اطمینان سے کئے اور ہر چکر میں یا اکثر چکروں میں استلام کی سعادت بھی حاصل ہوئی —— طواف سے فارغ ہو کر اور مقام ابراہیم پر نوافل پڑھ کر دعا کے لئے ملتزم پر پہونچا تو الحمد للہ وہاں بھی سکون اور اطمینان کی فضا تھی لیکن یہاں ایک عجیب ماجرا ہوا طبیعت چاہتی تھی کہ اس وقت دل میں زیادہ سے زیادہ رقت اور قلب میں اضطرار کی کیفیت ہو اور آج آنکھیں خوب روئیں، لیکن اللہ کی شان صوفیہ کی اصطلاح میں ایسی قبض کی کیفیت طاری ہوئی کہ نہ دل میں رقت نہ آنکھ میں آنسو —— بیت اللہ سے رخصتی اور جدائی کا خیال تازہ کر کر کے ہر چند کوشش کی کہ کچھ سوز وگداز پیدا ہو لیکن کچھ اثر نہیں —— بڑی فکر ہوئی الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، میرا دل اور میری آنکھیں اس وقت کیوں ایسی بے حس اور پتھر بنی ہوئی ہیں؟ اسی سوچ فکر میں تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ میرے داہنی جانب آکر کھڑا ہوا اور اس نے بڑے درد اور بڑی بے قراری کے ساتھ رو رو کر بالجہر دعا کرنی شروع کی۔ گریہ وزاری اور قلب کی اضطراری کیفیت کے علاوہ اس کی دعائیں اپنے معانی اور مضامین کے لحاظ سے بھی بڑی پر اثر تھیں۔ الحمد للہ اس بندۂ خدا کی برکت سے اپنے دل کی حالت بھی بدل گئی

اور قبض کی وہ کیفیت جاتی رہی —— بالکل قریب بلکہ برابر برابر کھڑے ہونے کے باوجود بہت دیر تک میں نے اللہ کے اس بندہ کو نہیں پہچانا، بعد میں یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ یہ اپنے ہی ایک رفیق تھے۔

---

(۱۳) ہم کو مدینہ طیبہ کے جانے کے لئے جو لاری ملی تھی وہ دوپہر سے پہلے آکر کھڑی ہوگئی تھی، لیکن مطاف میں چونکہ سب سے کم اژدحام ان ایام میں ظہر کے بعد ہوتا تھا (اور یوں عام طور سے بھی دن کے تمام دوسرے اوقات کی بہ نسبت اسی وقت اژدحام کم رہتا ہے کیونکہ وہاں عموماً لوگ ظہر کے بعد ہی کھانا کھاتے اور آرام کرتے ہیں) اس لئے ہم نے یہی طے کیا کہ اسی اطمینان کے وقت میں طواف وداع کر کے روانہ ہوں گے، چنانچہ ظہر کے بعد ہمارے ساتھیوں نے طواف وداع کیا، مقام ابراہیمؑ پر رکعتین طواف پڑھیں، پھر ملتزم پر آکر جو کچھ اور جیسی کچھ اللہ نے توفیق دی دعائیں کیں اور جس کو جو مانگنا تھا اُس نے جی بھر کے اور دل کھول کے مانگا۔ خصوصاً زندگی میں پھر حاضری کی توفیق کی دعا تو سب ہی نے کی۔ اس دعا سے فارغ ہو کر اور آخری دفعہ یمین اللہ (حجر اسود) کا رخصتی استلام کر کے لاری پر سوار ہونے کے لئے مسجد کے دروازہ کی طرف چلنے لگے۔

۲۴-۲۵ دن کے قیام میں نہ معلوم کتنی دفعہ بلکہ کتنی سو مرتبہ مسجد حرام میں جانا اور وہاں سے باہر نکلنا ہوا ہوگا، لیکن اس وقت کا نکلنا چونکہ آخری دفعہ کا نکلنا تھا اور کسی کو یقین کیساتھ خبر نہ تھی کہ زندگی میں کبھی پھر ان در و دیوار کو دیکھنا اور یہاں کی مقدس خاک پر سر رکھنا نصیب ہوگا اس لئے ایک ایک قدم بڑی مشکل سے اٹھتا تھا اور ہر ایک مڑ مڑ کے بار بار حسرت سے بیت اللہ کو دیکھنے لگتا تھا، دلوں کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن آنکھوں کے آنسو کسی طرح تھمتے نہ تھے۔ الغرض ہمارے اکثر ساتھی اسی طرح روتے سسکتے لاری میں سوار ہوئے اور لاری ہمیں لے کر مدینہ طیبہ کے لئے جدہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

(باقی آئندہ)

دعوتِ اصلاح و تبلیغ

کے

رفقاء و کارکنان کے نام

از مرکز لکھنؤ

پچھلے نمبر میں مرکز لکھنؤ کا وہ گشتی مراسلہ شائع کیا گیا تھا جو اودھ کے دوسرے تبلیغی مرکزوں کو بھیجا گیا تھا، اس اشاعت میں اسی سلسلہ کا دوسرا خط شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ جس مضمون پر مشتمل ہے اس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ عام قارئین بھی اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور عملی کام کرنے والے اس کو پیش نظر رکھیں، بار بار اس مضمون کا اعادہ اور اس کے مطابق نفس کا محاسبہ ہو، جس حقیقت کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے وہ دعوتی عمل کی روح اور اس کا ایمانی وزن ہے۔
(مدیر)

مکرم و محترم! السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

مزاج گرامی! اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم لوگوں کو دین اور اس کی دعوت کی طرف متوجہ ہونے کی سعادت عطا فرمائی، یہ نعمت دولت ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت ہے، لہٰذا اس کا شکر اور اس کی قدر بھی سب سے بڑھکر ہونی چاہیئے۔ بڑی فکر اس بات کی ہے کہ جس چیز سے کسی عمل میں دینی روح اور حقیقت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت پیدا ہوتی ہے وہ ہماری نظر اور توجہ سے اوجھل نہ ہونے پائے اس احساس کے تحت اپنی اور اپنے دوستوں کی توجہ کے لیے یہ چند لفظ لکھے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع پہونچائے۔

کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل کی جان یہ ہے کہ وہ کام اللہ کی خوشی، اس کے وعدوں پر یقین اور اس کے ثواب کے لالچ میں اور آخرت کو سامنے رکھکر کیا جائے ادنیٰ سے ادنیٰ عمل اس دھیان اور ذہنیت کے ساتھ نہایت بلند اور مقبول اور اعلیٰ سے اعلیٰ عمل اس کے بغیر بے روح اور بے حقیقت ہے، اس کی مشق یوں تو ہمیں زندگی کے

ہر کام میں کرنی چاہئے، اور ہمارا دین و دنیا کا کوئی کام اس دھیان اور نیت سے خالی نہیں ہونا چاہئے لیکن یہاں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارا یہ اشتغال اور دین کی دعوت کا کام بھی اس روح سے معمور ہے یا نہیں، ہم اگر ان دو حقیقتوں کو اپنی نظر کے سامنے رکھیں اور اس پر ذہن کو جمانے کی مشق اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہیں تو انشاء اللہ چند دنوں میں وہ ہمارے کام کی روح اور زندگی کا جز بن جائیں گی۔

ا۔ دین کی یہ جد و جہد اور دعوت محض اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی تعمیل میں ہے جو تبلیغ و دعوت، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش اور دین کی اشاعت و ترویج کے متعلق شریعت میں موجود ہیں، نیز ان فضائل[1] کی بناء پر جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ اس کام کی غرض ان احکام کی تعمیل (جن کے بغیر عتاب اور غضب الٰہی کا خطرہ ہے) اور ان فضائل کے حصول کے سوا (جو اس جد و جہد اور دعوت کے متعلق وارد ہوئے ہیں) اور کچھ نہیں، نہ عزت و شہرت، نہ قوت و تنظیم، نہ کوئی اور مادی نفع اور دنیاوی غرض۔ اس لئے اس کام کو خالص اسی نیت اور ذہنیت سے کرنا چاہئے جس نیت اور ذہنیت سے ہم نماز پڑھتے ہیں تلاوت کرتے ہیں، اور دوسری عبادات میں مشغول ہوتے ہیں اس لیے کہ یہ دراصل اسلامی زندگی در بندگی ہی کا ایک جزء ہے، بندگی ایک میدان ہے جس میں کوئی حد فاصل نہیں، جو چیز کسی کام کو بندگی کا رنگ اور دینی حیثیت عطا کرتی ہے وہ محض حکم الٰہی ہے بس اپنا کرنا بھی اللہ کے حکم سے ہے اور دوسرے کو (اصول و قواعد شرعیہ کے مطابق) دعوت دینا بھی اللہ کے حکم سے ہے اور مقصود محض تعمیل حکم اور رضائے الٰہی ہے، ہم حکم الٰہی کے تابعدار ہیں، ہم جس جذبہ سے نماز پڑھتے ہیں اسی جذبہ سے دوسرے تک نماز پڑھنے کا حکم الٰہی (ایک مامور اور غلام کی طرح) پہونچاتے ہیں اور نماز کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہمیں اس دعوت اور دینی جد و جہد کا سارا کام جذبۂ عبادت، تعمیل حکم، اور شوق اجر میں کرنا چاہئے۔ اسی سے ہمارے اس کام میں روح اور نور پیدا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس عمل کے مقبول ہونے اور دنیا میں کامیاب

---

[1] ان احکام و فضائل کو رسالہ فضائل تبلیغ سے معلوم کرنا چاہئے، اور اسکو مطالعہ میں رکھنا چاہئے۔

ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

۲۔ ہمیں دین کو دوسروں تک پہونچانے اور دوسروں میں اس کی کوشش کرنے کے وقت یہ دھیان رکھنا چاہئے کہ اس سے ہم اپنے عمل میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنے لیے اس کمائی اور نفع کا راستہ پیدا کر رہے ہیں جو قیامت میں بہت کام آئے گا، اور اس کی بڑی قدر ہوگی اور ہم اپنی نااہلی اور بے بضاعتی و تہیدستی کی وجہ سے اس کمائی اور نفع کے بڑے محتاج اور ضرورت مند ہیں، اس لیے ہم جب کسی بھائی کو دین کی دعوت دیں، کسی حکم الٰہی کو اس تک پہونچائیں تو دھیان کریں کہ اس کے اس دعوت کو قبول کرنے اور اس حکم الٰہی پر کاربند ہو جانے سے اس کو کتنا ثواب ملے گا، پھر یقین کریں کہ یہ سارا ثواب اللہ اور اس کے رسول کے وعدوں اور یقین دہانی کے مطابق ہمارے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوگا اور اس دن ہمارے کام آئے گا جس دن ہم بہت پریشان اور رتی رتی ثواب کے محتاج ہوں گے اس لیے اس ذوق اور اس ذہن کے ساتھ ہم دین کی باتیں دوسروں تک پہونچائیں کہ یہ سب ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بن رہا ہے اور ہمارے حساب میں جمع ہو رہا ہے، یہ شوق اور یہ یقین اس دعوت کی روح، قیمت اور سب سے بڑی طاقت ہے اور ہمیں اسکی بڑی حفاظت کرنی چاہئے کہ یہ اصل سرمایہ ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس کام کے بڑے داعی اور "ایمان واحتساب" کے فن کے امام تھے اپنے خطوط میں جابجا اس مضمون پر زور دیا ہے، یہاں چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں، تاکہ ہم ان کو پیش نظر رکھیں اور وقتاً فوقتاً ان کو تازہ کرتے رہیں:

"الدال علی الخیر کفاعلہ (بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا خود عمل کرنے والے کی طرح ہے) کے مضمون کو قوت کے ساتھ دھیان میں رکھتے ہوئے اپنی کوشش سے جتنا بھی کوئی نماز قرآن اور ذکر وغیرہ میں مصروف ہو ان میں سے ہر ایک کے کیے ہوئے کو اپنے لیے ذخیرۂ آخرت یقین کرنا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے تفصیلی ثواب کو دھیان رکھنا ہے۔"

"دین کے کام اس وقت پائیدار اور جاری رہتے ہیں کہ آدمی قیامت کے منظر کو سامنے رکھے اور قیامت میں کام دینے والے ان کارناموں کو جو آدمی نے

یہاں کیے ہیں، حضور کی بڑائی کو ذہن نشین کرتے ہوئے اور ان کارناموں کے اس معاوضہ کو جو حضور نے بتلایا ہے (بشرطیکہ اللہ کے یہاں قبول ہو گئے ہوں) اپنے لیے ذخیرہ تصور کرے۔

جوں جوں یہ تصور جمیگا حق تعالیٰ شانہ تصدیقی ایمان کی حلاوت نصیب فرمائے گا، اور جوں جوں حلاوت نصیب ہوگی شوق بڑھے گا اور شوق میں برکت ہوگی مثلاً تمہاری وجہ سے جتنے بے نمازی نمازی ہوگئے تلاش کرو کہ شریعت میں اس کا کتنا ثواب ہے۔ فی نماز جتنا ثواب شریعت نے بتلایا ہے خوب دھیان جماؤ کہ وہ سب ذخیرہ مجھے ملے گا۔"

حق سمجھتے ہوئے اور اپنے اوپر ایک آنے والا دن یقین کرتے ہوئے، قیامت کا دھیان کیا کرو پھر جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کیا کرو کہ جو حضور بتلا گئے ہیں وہی آخرت میں کام آنے والا ہے۔"

"کلمۃ اللہ کے اعلا اور وحی کے نشر میں سعی اور کوشش خالص اپنے مولیٰ کو مولیٰ سمجھکر اس کی رضا کے لیے ہو اور موت کے بعد کے سامان کے یقین کے ساتھ ہو، حق تعالیٰ کے یہاں سے فیضان موعود اسی زندگی کے ساتھ ہے۔ ان الذین اٰمنوا و الذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولٰئک یرجون رحمۃ اللہ (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں کوشش کیں پس وہی اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں)"

"اپنے نفس کو تجربہ سے البا گندہ ناقص، خود غرض اور کام کا بگاڑنے والا، دل سے یقین کرے کہ الطاف خداوندی کا قصہ تو کچھ اور ہی یہ موت تک راست ہوتا نظر نہیں آتا لہذا اس نیت سے سعی کرے اور حضور کی باتیں دوسروں میں پھیلادے کہ میرے علاوہ اللہ کے سب بندے جو اپنی ذات سے نیک طینت اور پاک نفس ہیں دین کے جس کام کو کریں گے وہ ظاہر و باطن میں اچھا عمل ہوگا، حق تعالیٰ بقاعدہ الدال علی الخیر کفاعلہ اپنے الطاف سے ان پاک ہستیوں کی برکت سے مجھے بھی اس سی

حصہ عطا فرمائے۔

فکر کوئی بڑی چیز نہیں ہے تنہائیوں میں بیٹھکر اپنے نفس سے یہ کہنا کہ قطعاً یہ چیز اللہ کو راضی کرنے والی ہے اور موت جو یقیناً ایک آنے والا وقت ہے تیری نفسانی زندگی کو قطعاً درست کرنے والا ہے اور "الدال علی الخیر کفاعلہ" کو سچ سمجھکر اس نکتے کی وجہ سے جتنی نیکیاں وجود میں آتی ہیں یا آسکنے والی ہوں ان سب کو جمع کر کے اللہ کی خوشنودی کو ان سے بتکلف یقین کے ساتھ وابستہ کرنا بس یہی فکر ہے"

امید ہے کہ یہ دونوں حقیقتیں آئندہ سے ہمارے پیش نظر رہیں گی اور اس معیار سے ہم اپنی طبیعتوں کا محاسبہ اور کام کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ انسان کی نگاہ بیحد پھسلنے والی، کام کے تقاضے اور وقتی مطالبات اپنے میں مشغول کرنے والے، ماحول مادیت پرور اور ایمان سوز ہے، اس کا ہر وقت اندیشہ ہے کہ ہماری نگاہ چوک جائے اور کام کا ڈھانچہ روح اور حقیقت سے خالی رہ جائے، اس لیے اس مضمون کو ہمیں وقتاً فوقتاً تازہ اور ذہن نشین کرتے رہنا چاہیئے، اور اس کا اطمینان نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ہمارے ذہن کی گرفت میں آگیا ہے اس کے لیے اصلی طاقت تو قوت فکریہ اور احتساب نفس ہے لیکن اس سے بھی مدد ملے گی کہ ہم اس خط کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہیں اور اس کے مضمون کو دھراتے رہیں، مجمع میں بھی اس خط کو پڑھکر سنانا مناسب ہوگا اور تنہائیوں میں بھی اس کا دیکھنا مفید ہوگا، خاص کارکن اور رفیق اس کی نقل اگر رکھ لیں تو نامناسب نہیں ہوگا۔

امید ہے کہ آپ سب بعافیت ہوں گے، رفقائے کرام کی خدمت میں سلام

والسلام

مرکز ——— لکھنؤ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۷ نمبر (۵)

رجسٹرڈ نمبر اے ۳۵۳

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!

"الفرقان" اور "کتبخانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں

لہذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے!

دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

نمونہ کا پرچہ ۸ آنہ

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

ماہنامہ

الفرقان

لکھنؤ!

جلد ۱۷ | جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۵۰ء | نمبر ۵

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۲۳-ع لون روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

نگاہِ اوّلیں!

قوم کی بیداری اور زندگی کی بہت سی علامتیں قرار دی جاسکتی ہیں، ایک آدمی کہہ سکتا ہے کہ علوم و فنون کی ترقی قوم کی بیداری کا ثبوت ہے، ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ سیاسی تحریکات سے بڑھ کر قوم کی زندگی کا کوئی ثبوت نہیں، تیسرا شخص کہے گا کہ مجلسی زندگی، اخبارات و رسائل کی کثرت قوم کی زندگی اور بیداری کی علامت ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی صحیح زندگی اور حقیقی بیداری کی واقعی علامت نہیں، اصل علامت ضمیر کی بیداری ہے، اور اس کا ثبوت صحیح و غلط میں امتیاز اور مجرمین کی مذمت و ملامت کی جرأت ہے۔ جس طرح فرد کا ایک نفس لوّامہ (غلطی اور گناہ پر ملامت کرنے والا ضمیر) ہوتا ہے اُسی طرح جماعت اور قوم کا بھی نفس لوّامہ ہوتا ہے، فرد کا یہ اخلاقی شعور صرف اپنے کو ملامت کرتا ہے اور چھوٹے دائروں اور شخصی معاملات میں اس کی طاقت ظاہر ہوتی ہے، اور قوم کا یہ اخلاقی شعور پوری قوم کو ملامت کرتا ہے اور وسیع دائروں میں اور قومی و اجتماعی امور میں ظاہر ہوتا ہے لیکن دونوں حالتوں میں وہ ایک بڑی طاقت اور قابل قدر دولت ہے، اور فطرت انسانی کی اتنی بڑی خوبی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ لا اقسم بیوم القیمۃ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ۔

اس معیار سے آپ اگر دنیا کی قوموں کو جانچیں گے تو بیداری اور زندگی کے لحاظ سے آپ کو قوموں کی ایک نئی تقسیم کرنی پڑے گی، ممکن ہے کہ وہ مشہور و مسلّم تقسیم کے خلاف ہو، مغربی قوموں کی بیداری اور زندگی ایک مسلّم حقیقت سمجھی جاتی ہے جس میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں معلوم ہوتی، جو شخص اس کے خلاف لب کشائی کرے وہ اپنی جہالت کا

ثبوت دے، لیکن اس خطرہ کے باوجود اس کے اظہار میں کچھ باک نہیں، کہ یورپ و امریکہ سیاسی و ذہنی حیثیت سے ضرور بیدار ہیں لیکن اخلاق و ضمیر کے لحاظ سے ان کو بیدار کہنا مشکل ہے۔ ان کا شعور و ادراک، اور ان کے نفس لوامہ کی قوت اور فعل تمام تر سیاست اور مجلسی و دستوری زندگی اور شہری نظام کی طرف منعطف ہو گیا ہے۔ کسی دستوری ملک میں سیاسی احتساب و تنقید اتنی بے لاگ اور طاقتور نہیں جتنی یورپ و امریکہ میں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون ساز مجالس اور نمائندوں کے ایوانوں میں ہر جگہ ایک ایسی حزب مخالف موجود ہے جو حکومت کی غلطیوں پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور اس پر بے لاگ تنقید کرتی ہے، اور کسی کمزوری اور غلطی کے موقع پر اس کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ سیاسی بیداری کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومتیں اس حزب مخالف کے وجود کو ضروری سمجھتی ہیں اور اس کی تنقید و مخالفت کو گوارا کرتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم میں سیاسی شعور اور جمہوری روح موجود ہے، لیکن اسکے برخلاف آپ کو اخلاقی ضمیر کا افسوسناک فقدان اور اخلاقی احتساب و ملامت کی کھلی ہوئی کمی نظر آئے گی، جو قوم بادشاہ کی تقریر میں فولاد کی صنعت کو قومی بنانے کا تذکرہ نہ ہونے پر حکومت کو چیلنج کر سکتی ہے اور اس پر رائے شماری کی نوبت آسکتی ہے وہ بعض اوقات اپنے ذمہ داروں کے بڑے بڑے اخلاقی جرائم سے چشم پوشی کر جاتی ہے، اور پوری قوم میں کوئی نہیں ہوتا جو ان کا اخلاقی محاسبہ کرے اور ان کے خلاف پر زور آواز بلند کرے۔ ایک شخص تاج کا نمائندہ ہے ایک ملک میں انتظام و قیام امن کی اہم ترین ذمہ داری پر فائز ہے، اپنے ذاتی رنج اور غصہ کی بنا پر اس ملک کے لاکھوں افراد کو اپنے تغافل سے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، حد درجہ سنگدلی اور بے دردی کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر اپنی مدت نیابت ختم کر کے اپنے ملک کو واپس جاتا ہے اور کوئی اس سے نہیں پوچھتا کہ اس نے اتنی خونریزی کیوں ہونے دی، اور اس نے اس کے انسداد کی کوشش کیوں نہیں کی، اس لئے کہ ایشیائی انسانوں کا خون اور انکی آبروریزی مغربی قوموں کی نگاہ میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی ایک معمولی سیاسی غلطی یا دستوری بے عنوانی، اور اس لئے کہ سیاسی شعور کے مقابلے میں ان مغربی قوموں کا اخلاقی شعور صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔

خود ایشیاء کی قوموں میں ہمیں اس اخلاقی شعور اور نفس لوامہ کے وجود کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ ہمیں ان کی علمی ترقیوں، سیاسی بیداری، تمدن وتہذیب کی ظاہری چمک دمک اور قانون ساز مجلسوں میں حزب مخالف کی باریک بینی اور نکتہ آفرینی سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ قومیں حقیقی طور پر زندہ اور بیدار ہیں۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، قوم کے غلط رجحانات ناجائز خواہشات اور صریح غلطیوں کے خلاف ہم کو وہ تنقید اور احتساب اور مجرموں کے لئے وہ مذمت وملامت نہیں ملتی جو اخلاقی شعور اور ضمیر کی بیداری کی قدرتی علامت ہے، ہمیں ان قوموں اور ملکوں میں کثرت سے وہ لوگ ملتے ہیں جو زبان وادب، تہذیب وتمدن، لباس ومعاشرت کے مسئلہ میں تو بڑے ذکی الحس اور غیور معلوم ہوتے ہیں اور جن کی قوت شامہ دور سے دور چیز کو فوراً محسوس کرلیتی ہے، جو ایک بدیشی لفظ کو گوارا نہیں کرسکتے، جو کسی دوسرے رسم خط کے روادار نہیں، جن کے نزدیک کسی قوم اور کسی تہذیب کے ملکی بننے کیلئے ایک ہزار برس کی مدت بھی کافی نہیں، جو کسی ایسی بات کے روادار نہیں جو کسی بین الاقوامی اور عالمگیر تعلق کو ظاہر کرتی ہو اور جس کا تعلق ہندوستان سے باہر کے کسی مذہبی یا روحانی مرکز سے ہو، وہی لوگ اپنی قوم اور اکثریت کی بڑی سے بڑی اخلاقی غلطیوں اور مجرمانہ افعال کو دن رات نظر انداز کرتے رہتے ہیں، اور ان چیزوں کے بارے میں اتنے زیادہ وسیع النظر اور فراخ دل معلوم ہوتے ہیں کہ کبھی یہ چیزیں ان کو قابلِ ملامت نظر ہی نہیں آتیں۔ انکی زود رنجی، تنک مزاجی، خورده گیری، باریک بینی، بسیار گوئی، تلخ نوائی اور آتش بیانی خدا جانے اس موقع پر کہاں چلی جاتی ہے، جو سیاسی مقاصد اور زبان وتہذیب کی وحدت کے لئے مہینے میں دس دورے کرتے ہیں، ان کو مظلوموں کی حمایت اور عدل وانصاف کو قائم کرنے اور لوگوں کو رواداری اور فراخ دلی کی تلقین کے لئے ایک دورہ کی بھی فرصت نہیں ملتی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اخلاقی شعور کی کمی خطرناک حد تک ہے اور یہ کمی کسی ملک میں غلہ کی کمی سے کسی طرح کم تشویشناک بات نہیں۔

مغربی ممالک ہوں یا ایشیائی، مسلم اقوام ہوں یا غیر مسلم، اگر آپ ان کی بیداری اور حقیقی زندگی کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ آپ وہاں کے علمی اداروں اور تعلیمی مرکزوں کو شمار کرنے لگیں، اور جس ملک میں سب سے زیادہ یونیورسٹیاں، کالج اور صنعتی و فنی تعلیم کی درسگاہیں ہوں اس کو سب سے زیادہ نمبر دیں، نہ یہ طریقہ ہے کہ آپ وہاں کے کروڑپتی اور لکھ پتی افراد کو گننا شروع کر دیں، اور جس ملک میں سب سے زیادہ تجارتی فرم سب سے بڑی کمپنیاں اور سب سے زیادہ سرمایہ دار ہوں اس کو ترقی و بیداری میں اوّل درجہ دیں، نہ حقیقی و اعزازی سندوں و ڈگریوں کی زیادتی، نہ نئے نئے اداروں کا افتتاح، نہ بین الاقوامی جلسوں میں نمائندگی، نہ ہاکی و کرکٹ کے ٹیموں کی کامیابی، نہ سینما و تفریحات کی کثرت کسی قوم کی زندگی و بیداری کا ثبوت ہے، قوم کی زندگی اور صحیح بیداری کا معیار صرف بیدار و بیباک ضمیر اور آزاد و بے لاگ قوت تنقید ہے۔

آپ اگر واقعی کسی قوم کی بیداری اور اس کی زندگی کی صلاحیتوں کو جانچنا چاہتے ہیں اور یہ اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انسانی امانتوں کی کہاں تک اہل، اور اقوام کی قیادت و رہنمائی کی کہاں تک مستحق ہے۔ تو یہ دیکھئے کہ اس میں کتنے ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو تنقید کے موقع پر اپنے پرائے کی تمیز نہ کرتے ہوں، جو صریح غلطی کے موقع پر، بڑی سے بڑی اکثریت اور بڑی سے بڑی طاقت و حکومت کو برملا ٹوک دیتے ہوں، جو مظلوموں اور کمزوروں کیلئے سینہ سپر بن جاتے ہوں، اور بگڑے ہوئے حالات میں عیش کے ایوانوں کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح پھرنے لگتے ہوں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے ہوں، جن کو آئندہ کے فوائد یا وقت کے مصالح کسی کلمۂ حق سے باز نہ رکھ سکتے ہوں، جو حق کی حمایت اور اعلان میں اپنی قوم کے معتوب بننے کو اپنی قوم کا محبوب بننے پر ترجیح دیتے ہوں، جب سارے ملک میں زیادتی اور حق تلفی کی ہوا چل رہی ہو تو وہ اپنا کھانا پینا بھول جائیں اور حالات کو درست کرنے کے لئے اپنی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں، جو وقت کے مسئلہ کے سامنے تمام مسائل کو بالائے طاق رکھ دیں، ہر طرح کے اختلافات کو بھلا دیں اور بلا کسی تمیز قومیت و ملت انسانی جان و آبرو کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دیں، اگر ایسے افراد اس قوم کی

تعداد کے مناسب اور ضرورت کے مطابق پائے جاتے ہیں، تو اس قوم کی طرف سے اس کے مستقبل کی طرف سے پُر اُمید رہیئے، اس کی ہر پریشانی دور ہو جائیگی ہر کمی پوری ہو جائیگی، اس کے دشمن اس کے دوست بن جائیں گے اور اس کی اخلاقی برتری کے معترف ہوں گے۔ اس کے ملک میں خوشحالی اور سرسبزی و شادابی کا دور آکر رہے گا، اس کی بین الاقوامی حیثیت بہت بلند ہو جائے گی، قومیں اور ممالک نازک حالات میں اور بین الاقوامی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے اس کی مدد کے طالب ہوں گے۔

لیکن اگر واقعہ یہ نہیں اور ایسے افراد کی اس قوم میں نمایاں کمی نظر آتی ہے، اور بڑے بڑے اہلِ دماغ یا تو اخلاقی بحران کے شکار نظر آتے ہیں یا اپنے کو مجبور و بے بس سمجھ کر خاموش بیٹھ گئے ہیں، اور خود ان کے دماغی توازن اور اعتدال میں فرق آگیا ہے، کوئی شخص ایسا نہیں جو اس وبار عام سے کسی نہ کسی درجہ میں متاثر نہیں، تو پھر درحقیقت یہ ملک اور قوم کسی بیرونی خطرے میں نہیں بلکہ بالکل اندرونی خطرے میں مبتلا ہے، اسکے درختِ اقبال کو گھن لگ چکا ہے، زندگی کی صلاحیتیں روز بروز گھٹ رہی ہیں اور قلب کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، جسم کی ظاہری فربہی اور نمائشی آسودگی اس ڈوبتے ہوئے دل کو تھام نہیں سکتی۔

خدا کا قانون بے لاگ ہے، مغربی ہوں یا مشرقی، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس کا قانونِ فطرت سب پر نافذ ہے، وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا اور کسی کو معاف نہیں کیا کرتا۔ ؏

"ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گُہر"

مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟:-

مولنا ابو الحسن علی ندوی کی تازہ تصنیف جسمیں ایک کتبخانہ کا مواد اور معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی قیادت اور انکے عروج سے زندگی، اخلاق و معاشرت، تہذیب و تمدن اور خیالات و افکار میں کیا گہری تبدیلیاں ہوئیں اور دنیا کا رخ کس طرح جاہلیت سے ہمہ گیر خدا پرستی کی طرف تبدیل ہوا پھر ان کے تنزل سے کس طرح جاہلی قومیں برسر اقتدار ہوئیں، ان کا فلسفہ اور نظامِ حیات کیا ہے، انکی رہنمائی میں دنیا کس رُخ پر جا رہی ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے — ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ قیمت صرف۔ ۳ر

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان ... لکھنؤ۔

مُسلمان کے معنی اور دنیا میں اُس کا امتیاز

عبدیت اور ایمان والی زندگی کی طاقت

ذیل میں مدیر الفرقان کی ایک تقریر کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے جو جمادی الاولیٰ کے پہلے ہفتہ میں ایک تبلیغی اجتماع میں کی گئی تھی۔

حضرات!

اس دنیا میں حالات کے بدلنے سے بہت سے لفظوں کے معنی بھی بدل جاتے ہیں یعنی ایک زمانہ میں ایک لفظ کا مطلب کچھ سمجھا جاتا ہے اور دوسرے زمانہ میں حالات کے تبدیل ہوجانے سے اسی لفظ سے دوسرا مطلب سمجھا جانے لگتا ہے —— پہلے میری اس بات کو آپ ایک معمولی سی مثال سے سمجھ لیجئے۔ اب سے دس بارہ سال پہلے ہمارے اس ملک میں چاندی کا روپیہ چلتا تھا تو اس زمانہ میں جب روپیہ کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر سننے والے کا ذہن اُس سے اُسی چاندی والے روپیہ کی طرف جاتا تھا گویا اُس زمانہ میں روپیہ کے لفظ کے معنی چاندی کا وہ انگریزی سکہ تھا جو قریباً ۱۱-۱۲ ماشہ کا ہوتا تھا اور اس پر بادشاہ کی تصویر بنی ہوتی تھی —— اب اُس کے بجائے روپیہ ہی کے نام سے ایک اور سکہ چل رہا ہے جو چاندی سے نہیں بلکہ اور معمولی دھاتوں سے بنایا جاتا ہے جس کو لوگ نِکل کا روپیہ کہتے ہیں، اب روپیہ کے لفظ سے ہر سننے والے کا ذہن اسی سکہ کی طرف جاتا ہے گویا اب روپیہ کے معنی ہیں یہی نِکل والا سکہ

بالکل اسی طرح سمجھ لیجئے کہ مومن اور مسلم کے لفظ کا حشر بھی یہی ہوا ہے۔ اب سے قریباً ۱۴-۱۵ سو برس پہلے ہماری یہ دنیا ایمان کی حقیقت سے اور مومنین کے وجود سے تقریباً خالی ہو چکی تھی، اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اپنا رسُول

بنا کر بھیجا، اور آپ کے ذمہ یہ کام کیا کہ دنیا کو آپ ایمان کی حقیقت بتائیں، اُس کی طرف دعوت دیں، اور مومنین کی جماعت بنائیں۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے جد وجہد کی، اور چند روز میں ایمان اور اسلام والوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ ان سب کی ایک خاص طرح کی زندگی تھی، اور ان میں اور دنیا کے دوسرے لوگوں میں بعض نہایت گہرے اور بنیادی قسم کے فرق تھے ــــــ مثلاً ایک فرق یہ تھا کہ دنیا میں اُس وقت عام طور سے لوگ اپنی خواہشات پر چلنے کے عادی تھے اور من مانی زندگی کا عام چلن تھا، لیکن یہ لوگ جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ایمان و اسلام کی دعوت کو قبول کر کے مومن و مسلم ہو گئے تھے اُن کا حال مختلف تھا، انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم اب اپنے جی کی خواہشوں پر نہیں چلیں گے اور من مانی زندگی نہیں گذاریں گے، بلکہ اپنے پیدا کرنے والے کے جو احکام ہم کو اُس کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) سے معلوم ہوں گے ہم اُن کے پابند ہو کر زندگی گذاریں گے، اور وہ ایسا ہی کرتے تھے۔

اسی طرح ایک دوسرا فرق اُن میں اور دنیا کے دوسرے لوگوں میں یہ تھا کہ اُسوقت کی ساری دنیا میں صرف اسی دنیا کی ضرورتوں اور ترقیوں کے لئے جد وجہد کا عام رواج تھا، اور مرنے کے بعد والی زندگی کی فکر سے لوگ عموماً غافل تھے، اور اگر بعض لوگوں میں آخرت کی کچھ فکر تھی بھی تو وہ دنیا کی فکر کے مقابلہ میں روپیہ میں آنہ دو آنہ بھر بھی نہیں تھی لیکن رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جو لوگ تھے اور جو اُس وقت مومن و مسلم کہلاتے تھے، اُن کا حال یہ تھا کہ وہ دنیا سے بیسوں پچاسوں گنا زیادہ آخرت کی فکر رکھتے تھے، اور دنیا کے راحت و آرام کے لئے جتنا کچھ وہ کرتے تھے اُس سے سیکڑوں گنا زیادہ آخرت کے چین و آرام کے لئے کرتے تھے، وہ اپنی قابلیت اور محنت سے جو کچھ کماتے تھے اپنے ذاتی عیش پر خرچ کرنے کے بجائے اُس کا زیادہ حصہ آخرت کے ثواب کی لالچ میں غریبوں محتاجوں پر خرچ کر دیتے تھے، غلاموں کو خرید خرید کے آزاد کرتے تھے، دوسرے قرضداروں کے قرضے ادا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ دین کی کوششوں اور دوسرے نیک کاموں میں خرچ کرتے تھے۔ اسی طرح دنیا والے جب راتوں کو آرام سے سوتے تھے تو یہ اپنی آخرت کی فکر میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر

اللہ کی عبادت کرتے تھے، اور زمین پر سر رکھے سجدوں میں روتے تھے۔ بہر حال دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ان مسلمان کہلانے والوں کا ایک خاص امتیاز یہ بھی تھا کہ یہ دنیا کو بس ایک درمیان کی منزل اور سرائے فانی سمجھتے تھے، اور اصلی وطن اور مستقل ٹھکانہ آخرت ہی کو جانتے تھے، اس لئے دنیا سے سیکڑوں گنا زیادہ ان کو آخرت کی فکر رہتی تھی، اور یہ بات اُن کی زندگی میں ہر دیکھنے والے کو بالکل صاف نظر آتی تھی۔

اسی طرح کی، دنیا سے نرالی ایک بات اُن میں یہ بھی تھی کہ عام دنیا اپنے محسوسات، مشاہدات اور تجربات پر ہی یقین رکھتی تھی، اور آج بھی ساری دنیا کا حال یہی ہے کہ زندگی کی پوری بنیاد بس محسوسات و مشاہدات اور مادی اسباب و تجربات ہی پر قائم ہے۔ لیکن وہ لوگ جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کو قبول کر کے مومن بنے تھے اُن کا حال یہ تھا کہ اُنکو اپنے مشاہدات اور تجربات سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کے اُن وعدوں وعیدوں اور اُس کی اُن صفتوں پر یقین تھا جن کا علم اُن کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بتلانے سے حاصل ہوا تھا ——— مثلاً دنیا کی نفع پہونچانے والی چیزوں سے نفع ہونا اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے نقصان پہونچنا، یہ وہ علم ہے جو ہم سب کو اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوا ہے اور اسی کی وجہ سے ہم سب لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہاں کی نفع پہونچانے والی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور نقصان پہونچانے والی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اُن مومنین کا حال یہ تھا کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جن اعمال کے آخرت میں نافع ہونے یا ضرر رساں ہونے کی اُن کو اطلاع دی تھی ان کے نفع اور ضرر کا یقین ان کو دنیا کی ان چیزوں کے نفع اور ضرر سے زیادہ تھا جن کی منفعت اور مضرت کا تجربہ اور مشاہدہ انھوں نے ساری عمر کیا تھا اور برابر کر رہے تھے۔ اس کو اور زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے آپ ایک متعین مسئلہ لے لیجئے۔

اس دنیا کا یہ عام تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ مادی اسباب کی طاقت اور زیادتی سے قومیں اور جماعتیں اس دنیا میں قوت اور غلبہ حاصل کر لیتی ہیں اور جس فریق کے پاس مادی اسباب کم اور کمزور ہوں وہ مغلوب ہوتا ہے، یہ علم وہ ہے جو تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوا ہے

صحابۂ کرامؓ بھی اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے اس حقیقت کا علم رکھتے تھے، لیکن اسکے مقابلہ میں ایک علم اُن کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے اور حاصل ہوا تھا، اور وہ یہ کہ اگر کوئی قوم اللہ پر سچا ایمان رکھتی ہو اور زندگی میں اُس کے حکموں پر چلنے والی ہو، یعنی اُس کی زندگی بندگی والی زندگی ہو، تو اپنی تعداد کی کمی اور اسباب کی قلت کے باوجود، زیادہ تعداد اور زیادہ اسباب رکھنے والی غیر مومن اور نافرمان دوسری قوم کے مقابلے میں وہ اللہ کی غیبی مدد سے غالب ہو گی اور اللہ تعالیٰ ضرور اُسے سربلند کرے گا۔

تو یہ دوسرا علم وہ تھا جس کا انھوں نے کبھی تجربہ اور مشاہدہ نہیں کیا تھا، صرف رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انھیں ایسا بتلایا تھا، لیکن اپنے اور ساری دنیا کے مشاہدہ اور تجربہ کے مقابلے میں انھوں نے حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اس اطلاع پر زیادہ یقین کیا ——
بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن مومنین کو اپنے تجربے اور مشاہدے سے زیادہ غیب کی اُن باتوں پر یقین تھا جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اُن کو بتلائی تھیں۔

اسی طرح ساری دنیا سے نرالی اُن کی ایک صفت یہ تھی کہ ان کو اپنے ذاتی دنیوی مقاصد اور شخصی مفادات سے کم سے کم دلچسپی تھی بلکہ گویا تھی ہی نہیں، ساری دلچسپی بس اس ایک کام سے تھی کہ زندگی کے جس ایمانی طریقے کو اچھا سمجھ کر ہم نے اختیار کیا ہے، اور جو انسانوں کیلئے واقع میں سب سے بہتر اور اُن کے پیدا کرنے والے کا پسند کیا ہوا طریقہ ہے، کسی طرح زیادہ سے زیادہ انسان اس کو اپنا لیں اور اس دولت میں ہمارے شریک ہو جائیں۔ یہ دُھن اُن پر اس درجہ سوار تھی کہ اپنے کاروبار کو ترقی دینے بلکہ بیوی بچوں کے پالنے سے بھی زیادہ انھیں اس کی لگن اور فکر تھی، ان کی اس حالت کو دیکھ کر اُن کے وہ اعزہ اور اقربا جو ایمان نہیں لائے تھے انھیں مجنوں اور پاگل سمجھتے تھے۔

بہر حال اسلام کے دورِ اوّل کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی زندگی میں یہ چند گہرے اور بنیادی فرق تھے جن کو ہر وہ شخص محسوس کرتا تھا جس کا کبھی ان مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تھا —— اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں مسلمان کے معنی ایسے آدمی کے تھے جسمیں یہ باتیں پائی جاتی ہوں، یعنی جو توہمات اور خواہشات کی پیروی اور من مانی زندگی کے اصول کو چھوڑ کر

خدا اور رسول کے احکام کی تابعداری کو اپنا اصولِ زندگی بنا چکا ہو، اور جس کو دنیا سے بہت زیادہ فکر آخرت کی ہو، اور جو اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے زیادہ اللہ و رسول کی بتلائی ہوئی غیبی حقیقتوں پر یقین رکھتا ہو۔ اور جس کو اپنے ذاتی کاموں اور ذاتی فائدوں سے زیادہ فکر اور دلچسپی اللہ کی باتوں کو دنیا میں پھیلانے اور اس کے بندوں کو اللہ کی راہ پر چلانے سے ہو۔

لیکن جب سے مسلمانوں کی حالت بدلی اور انھوں نے اپنی ان امتیازی صفات کو کھو دیا تو دنیا کی نظر میں مسلمان کے معنی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے، اب جب مسلمان کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی وہ ہوتے ہیں جو آج کل ہم مسلمانوں کی عام حالت ہے ——— مسلمان کے معنی میں یہ تبدیلی بالکل اسی طرح کی ہے جس طرح روپیہ کے متعلق میں نے آپ کو بتلایا کہ جب ہمارے اس ملک میں چاندی والا روپیہ رائج تھا، تو اس وقت روپیہ کے معنی اُس چاندی والے روپیہ کے تھے، اور اب جبکہ نکل کا روپیہ رائج ہے تو ہر شخص کا ذہن روپیہ کے لفظ سے اُسی نکل والے روپئے کی طرف جاتا ہے۔

بزرگو اور دوستو!

مسلمانوں کی حالت اور ان کی زندگی میں یہ جو فرق ہو گیا ہے، درحقیقت یہ چاندی والے روپئے، اور نکل کے روپیہ کے فرق سے بھی بہت بڑا اور بہت گہرا ہے ——— مسلمان کی اصل روح اور طاقت اس کی وہی امتیازی صفات تھیں جن میں وہ دنیا سے نرالا تھا اور اللہ کی طرف سے دنیا اور آخرت میں سرفرازی کی جو خوش خبریاں قرآن و حدیث میں سنائی گئی تھیں، اور رحمت و نصرت کے جو وعدے کئے گئے تھے وہ سب دراصل ان ہی اصلی مسلمانوں کیلئے تھے اور ہیں، جن میں وہ ایمانی صفات موجود ہوں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا، یعنی اُنکی زندگی عبدیت اور اطاعت والی زندگی ہو، اُن کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ہو، شہود سے زیادہ ان کو غیب پر یقین ہو، اور اپنی ذاتی ترقیوں سے زیادہ انھیں اللہ کے دین کے فروغ سے دلچسپی ہو۔

رہے ایسے لوگ جو اپنے کو مسلمان تو کہتے ہوں لیکن انھوں نے عملی زندگی میں خدا کے احکام کو پس پشت ڈال رکھا ہو، اور آخرت کو بھول کر صرف دنیا کو اپنا مقصد بنا لیا ہو، اور

ان کی پوری زندگی صرف اپنے مشاہدہ اور تجربے کے یقین پر چل رہی ہو، اور غیب کے یقین کی اُن کی عملی زندگی میں کوئی نشانی موجود نہ ہو، اور اُن کی ساری سعی و محنت اور دوڑ دھوپ صرف اپنے یا اپنے بال بچوں کے دنیاوی عیش و راحت کے لئے ہو، تو ایسے نام کے مسلمانوں کیلئے ہرگز اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خوشخبری نہیں ہے، بلکہ ایسوں کے لئے تو قرآن میں صاف صاف غضب اور لعنت کی وعیدیں ہیں ——— خدارا سوچئے کہ اس وقت مسلمان کہلانے والی قوم میں، ان دونوں قسموں میں سے کس قسم کے مسلمان زیادہ ہیں۔

بزرگو اور دوستو!

یہ دینی دعوت و تحریک جس کے سلسلے میں آج کا یہ اجتماع ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں میں اُس اصلی اسلامی اور ایمانی زندگی کو پھر سے پیدا کرنے اور رواج دینے کی کوشش کی جائے، جس کو لے کر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) آئے تھے، اور جس کو دنیا میں رواج دے کے آپؐ تشریف لے گئے تھے، اور بعد کے زمانہ میں جس کی حفاظت اور ترقی آپؐ اُمت کے سپرد کر گئے تھے ——— ہم خود بھی اس کے لئے کوشش کرنا چاہتے ہیں، اور آپ کا بھی اسمیں تعاون چاہتے ہیں۔ ہماری دعوت اور اپنے نفس سے، اور آپ سے ہمارا مطالبہ صرف یہی ہے کہ اگر اصولاً ہم آپ اس چیز سے متفق ہیں تو اپنے میں اور اپنے بھائیوں میں اس تبدیلی کے پیدا کرنے کے لئے جو کوشش کر سکتے ہیں اُس کے لئے کمر ہمت باندھ لیں ——— موجودہ مسلمانوں کی حالت دیکھتے ہوئے اُن کی زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی بظاہر بہت مشکل معلوم ہو گی، لیکن طریقہ سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے، ہمارے سامنے بھی مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اس تبدیلی کے لئے ایک طریق کار اور پروگرام ہے جس کے متعلق غور و فکر اور تجربے کے بعد ہمیں اس کا پورا یقین ہے کہ اس مقصد سے اصولی اتفاق کرنے والے اور دین کا درد و فکر رکھنے والے ہر جگہ کے مسلمان اگر سچائی کے ساتھ اس کو اپنا لیں اور موجودہ حالات میں جو جد وجہد اُس کے لئے کر سکتے ہیں اخلاص اور دل کے درد کے ساتھ وہ کریں تو انشاء اللہ صرف چار پانچ برس میں قوم کی اکثریت کی حالت تبدیل ہو سکتی ہے۔

افسوس! مسلمان ایمانی زندگی سے خالی ہو کر اُس کی طاقت اور تاثیر کو بھی بھول گئے،

حالانکہ سچ یہ ہے کہ ایمان والی زندگی ہی اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے۔

آپ ذرا تصور تو کیجئے نفس پرستی اور غرض پرستی کی اس دنیا میں اگر کوئی قوم ایسی ہو جو اپنی نفسانی خواہشوں کے بجائے اللہ کے احکام پر چلتی ہو اور اپنی ذاتی ترقیوں اور دنیوی فائدوں سے زیادہ اس کو دنیا کی فلاح و بہبود سے دلچسپی ہو، اور یہاں کی لذتوں اور خوش عیشیوں سے زیادہ اس کو آخرت کی طلب اور فکر ہو، اور اللہ پر سچے ایمان اور اس کی تقدیر پر سچے یقین کی وجہ سے موت کا ڈر اس کے دل سے نکل چکا ہو ــــ تو ذرا سوچئے ــــ کہ دنیا میں ایسی قوم کا مقام کیا ہوگا اور دوسرے اس کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

بزرگو اور دوستو!

ایمان اور عبدیت والی یہ زندگی ایک مقناطیس ہے جس کی طرف وہ تمام روحیں آپ سے آپ کھنچتی ہیں جن میں نیکی اور بھلائی پسندی کی کچھ بھی رمق باقی ہو۔

آج ہندوستان کے مسلمان اپنے مستقبل کی طرف سے سخت مایوس اور ہراساں ہیں کیونکہ جن چیزوں کو انھوں نے اپنا سہارا سمجھا تھا اور جن پر بھروسہ کیا تھا آہستہ آہستہ وہ سب اُن کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں اور اب وہ اپنے کو ایک ایسی آٹھ گنی اکثریت کے بس میں پاتے ہیں جس کے بڑے حصے میں ان کی طرف سے سخت عناد اور نفرت ہے، اور جس کے بعض عناصر اُنکی بدخواہی اور بیخ کنی پر کمر باندھے ہوئے ہیں ــــ کاش! کسی طرح ان پریشاں حال اور خوف زدہ ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات اُتر سکتی کہ ان کی ان مشکلات کا حل بھی ایمانی زندگی ہی میں ہے ــــ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس یہی زندگی تھی جس سے انھوں نے لاکھوں دلوں کو فتح کیا۔ حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ کے متعلق آپ نے سنا ہوگا کہ یکے بعد دیگرے کتنے آدمی ان کے قتل کے ارادے سے آئے لیکن جو آیا اُس نے کلمۂ اسلام پڑھا اور اُن کے خادموں میں شامل ہو گیا۔

دوستو!

میں اپنے دل کے پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہاں کے مسلمانوں کا اگر صرف متوسط طبقہ بھی (جس کی تعداد ۲۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگی) اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا کر لے اور اُنکی

زندگی ان چند بنیادی باتوں میں یہاں کے غیر مسلموں سے واضح طور پر ممتاز ہو جائے یعنے ایسی صورت ہو جائے کہ جس کا اُن سے واسطہ پڑے، وہ صاف دیکھ لے کہ ان کی زندگی دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح نفس پرستی اور غرض پرستی کی زندگی نہیں رہی، بلکہ یہ وہی کرتے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کا حکم ہے، اور دوسروں کی طرح یہ لوگ صرف دنیا کی منفعتوں اور لذتوں ہی کے طلبگار نہیں ہیں بلکہ دنیا سے بہت زیادہ فکر ان کو آخرت کی زندگی کی ہے، اور یہ لوگ اپنی قوتوں کو ذاتی ترقیوں اور دنیوی فائدوں سے زیادہ دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی میں صرف کرتے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں، اور یہ کہ اللہ پر اور اس کی قدرتوں پر اُن کو ایسا ہی یقین اور بھروسہ ہے جیسا کہ ایک سچے مومن کو ہونا چاہئے۔

—— تو میں اپنے دل کے پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے صرف متوسط طبقہ کی اس تبدیلی سے بھی یہاں کے حالات انشاءاللہ قطعاً بدل جائیں گے، اور دو باتوں میں سے ایک بات یقیناً ہو کر رہے گی، یا یہ کہ مسلمانوں کے بدخواہوں کی بدخواہی اور دشمنی محبت اور عقیدت سے بدل جائے گی (اور کچھ زیادہ بعید نہیں ہے کہ اس کا آخری انجام وہ ہو جو تاتاریوں کا ہوا تھا) اور یا یہ کہ عبدیت اور ایمان والی اس زندگی کے مسلمانوں میں پیدا ہو جانے کے بعد بھی جو شریر عناصر اُن کو اس ملک سے مٹانا اور ختم کرنا ہی چاہیں گے سنت اللہ کے مطابق وہ خود فنا ہو جائیں گے —— یہ کوئی کشفی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کے واضح اشارات، اللہ کی دی ہوئی کچھ بصیرت و فراست اور حق و اہلِ حق کی تاریخ کے مسلسل تجربہ کی روشنی میں پورے یقین کے ساتھ میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔

بہر حال یہاں کے مسلمانوں کا معاملہ دوسروں کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں ہی کو اپنا فیصلہ کرنا ہے، اگر خدانخواستہ اُن کا فیصلہ یہی ہے کہ ایمان و اسلام کے نام کے ساتھ وہ عرصۂ دراز سے جیسی زندگی گذار رہے ہیں اسی پر قائم رہیں گے یا نئے ہندوستان کی آب و ہوا کو سازگار بنانے کے لئے کچھ نئے کافرانہ شعائر اور مشرکانہ رسوم اور کچھ نئے بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کو اپنی زندگی میں اور شامل کر لیں گے، تو پھر ایک ملت کی حیثیت سے اس ملک سے ان کا مٹ جانا یقینی ہے —— اور اگر انھوں نے اور کم از کم اُن کی نمائندگی کرنے والے

متوسط طبقہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم خواہش پرستی اور دنیا پرستی کی موجودہ زندگی کو چھوڑ کر حقیقی ایمان، اور عبدیت والی زندگی گذاریں گے اور نفسانیت و منفعت کے تقاضوں کے بجائے اللہ کے احکام پر چلیں گے اور دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر کریں گے، اور اس زندگی کو رواج دینے اور عام کرنے میں بقدرِ امکان اپنی قوتیں صرف کریں گے۔ تو پھر اُن کی زندگی اللہ کی امانت ہے، اور پھر انشاء اللہ اُسے کوئی خطرہ نہیں۔

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے قریباً تین سَو ایمان والے رفیقوں کو جو اپنی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے جسمانی حیثیت سے بھی کمزور تھے اور جن کے ہاتھ ضروری سامانِ جنگ سے بھی خالی تھے، جب بدر کے میدان میں مکّہ کی طاقت ور فوج کے مقابلے میں اتارا تو سجدہ میں پڑ کر اللہ تعالیٰ سے ان لفظوں میں سفارش کی تھی :۔

"اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ لَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ بَعْدُ"

آپؐ کی اس دُعا کا مطلب یہ تھا کہ :۔

"اے اللہ! اگر میرے ساتھیوں کی اس چھوٹی سی جماعت کی آج تو نے مدد نہ فرمائی، اور ان کا کثیر التعداد طاقت ور دشمن اُن کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا، تو دنیا سے تیری عبدیت والی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ یہی تیرے وہ بندے ہیں جنھوں نے عبدیت والی زندگی کو قبول کیا ہے، اور اس کو دنیا میں پھیلانے کا عہد کیا ہے۔"

خوب سمجھ لینا چاہئے اور ہم کو کسی دھوکہ میں نہ رہنا چاہئے کہ مسلمان نامی کسی قوم کا اللہ پر کوئی حق نہیں ہے، ہاں اُس جماعت اور اُس اُمت کی حفاظت اور مدد اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے جو ایمانی زندگی کی حامل اور دنیا میں اس کے فروغ کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔

(۱) کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝	ہم پر حق ہے ایمان والوں کی مدد کا،
(۲) وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ	اللہ ضرور مدد کریگا اُنکی جو اُسکے دین کی مدد کریں
لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (القرآن)	بلاشبہ اللہ بڑی قوت والا اور غلبہ والا ہے۔

سوزِ جگر!

حضرت جگر مرادآبادی

پہلے تو حُسنِ عمل، حُسنِ یقیں پیدا کر / پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

یہی دنیا کہ جو بتخانہ بنی جاتی ہے / اسی بتخانے سے کعبے کی زمیں پیدا کر

رُوحِ آدم، نگراں کب سے ہے، تیری جانب / اُٹھ! اور اک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر

خس و خاشاکِ توہّم کو جلا کر رکھ دے / یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

غم میسّر ہے، تو اس کو غمِ جاوید بنا / دل حسیں ہے، تو محبت بھی حسیں پیدا کر

آسماں مرکزِ تخئیل و تصوّر کب تک / آسماں جس سے خجل ہو، وہ زمیں پیدا کر

دلِ ہر قطرہ میں طوفانِ تجلّی بھر دے / بطنِ ہر ذرّہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن / ناز جس پر کریں سجدے، وہ جبیں پیدا کر

پستیِ خاک پہ کب تک ترے بے بال و پری / پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

عشقِ ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگر / عشق کو عام بنا، ذوقِ یقیں پیدا کر

"جہادِ اکبر"

(از۔ جناب مولانا سید احمد قادری استاذ شمس الہدیٰ پٹنہ)

نفس پہلو میں ایک اژدر ہے
اس سے لڑنا جہادِ اکبر ہے

عام طور پر انسانی مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کی فکر زیادہ کرتا ہے، اور خود اپنے وجود کے اندر چھپے ہوئے دشمن سے نہ صرف یہ کہ بے خبر رہتا ہے بلکہ اسکی اطاعت کرکے تباہی کی طرف دوڑتا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اس اندرونی دشمن کا سر کچل دے تو بیرونی دشمنوں کی ایذا رسانی کم ہو جائے، اور اگر وہ اس پر آمادہ بھی ہوں تو ان کا مقابلہ آسانی سے کیا جاسکے۔ یہ اندرونی دشمن انسان کا خود اپنا نفس ہوتا ہے، شیطان کے علاوہ نفس سے بڑا دشمن کوئی اور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مہبطِ وحی "روحی فداہ" نے نفس سے لڑتے رہنے کو "جہادِ اکبر" قرار دیا ہے۔ میدانِ جنگ میں خارجی و بیرونی دشمنوں سے لڑائی چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو پھر بھی ایک عارضی اور وقتی چیز ہوتی ہے۔ لیکن نفس سے لڑنا پوری زندگی کا ہمہ وقتی کاروبار ہے، اس سے عہدہ برآ ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بڑے بڑے سورماؤں کے قدم یہاں پھسلتے ہیں، لیکن ہے یہی کہ سلطانِ کائنات کے سامنے سرخ روئی جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ پوری زندگی نفس کے مقابلے میں سپاہیانہ و مجاہدانہ بسر کیجائے۔

یہاں دو خطوں کے ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں۔ پہلا مکتوب حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز کا ہے، یہ مکتوب دربار اکبری و جہانگیری کے مشہور دیندار امیر شیخ فرید کے نام لکھا گیا تھا۔ دوسرا مکتوب حضرت مجدد کے خلف الصدق خواجہ محمد معصوم (رحمۃ اللہ علیہ) کا ہے، یہ مکتوب اورنگ زیب عالمگیر کو ان کے ایام شاہزادگی میں لکھا گیا تھا۔ اس مکتوب کے

دراصل بڑے دو حصے ہیں "جہادِ اصغر" اور "جہادِ اکبر" یہاں صرف جہادِ اکبر کا حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا مکتوب

میرے مخدوم و مکرم!

نفس امارہ کی جبلت میں، جاہ و مرتبہ اور ریاست و حکومت کی محبت داخل ہے اس کی تمام تر ہمت، اقران و امثال پر بلندی و ترفع کے درپے ہے، یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بالذات اس بات کا خواہشمند ہے کہ تمام مخلوق اسکی محتاج اور اس کے اوامر و نواہی کی مطیع و فرمانبردار ہو، یہ خود کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو۔ یہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت و حکومت میں شرکت کا دعویٰ ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہ کمبخت شرکت پر بھی راضی نہیں ہے، چاہتا ہے کہ صرف اپنی خدائی کا ڈنکا بجائے، حاکم یہ ہو اور سب کے سب صرف اس کے محکوم ہوں۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:-

عاد نفسك فانها انتصبت بمعاداتی۔ — اپنے نفس کے دشمن ہو جاؤ، اسلئے کہ وہ میری دشمنی پر کھڑا ہوا ہے۔

بنابریں، نفس کو جاہ و مرتبہ، ریاست و حکومت اور ترفع و تکبر کی غذا دینا درحقیقت دشمنِ خدا کی امداد کرنا اور اس کو تقویت پہونچانا ہے۔ اس معاملے پر اچھی طرح غور کرنا چاہئے۔ حدیث قدسی میں وارد ہے:-

الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی فی شیٔ منہما ادخلتہ فی النار ولا ابالی۔ — عظمت اور بڑائی صرف میرے لئے مخصوص ہیں جو شخص بھی اسمیں مجھ سے منازعت کرے گا میں اُسے جہنم میں داخل کروں گا، اور مجھے کوئی پروا نہ ہوگی

دنیائے دنی جو اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا حصول، خواہشاتِ نفس کے حصول میں معاون و مددگار ہے، لہٰذا جو چیز

دشمنِ خدا کو مدد پہونچائے وہ مستحقِ لعنت ہوگی ——— فقر، فخرِ محمدیؐ کیوں ہوا؟ محض اس لئے کہ فقر و احتیاج میں نفس کی نامرادی اور اس کی خواہشات کے حصول سے عاجزی ہے۔ بعثت انبیاء کا مقصود اور تکلیفات شرعیہ کی حکمت، اسی نفس امارہ کی تخریب ہے۔ شریعتیں اسی لئے نازل ہوئی ہیں کہ ہوائے نفسانی کا علاج کیا جائے۔ مقتضائے شریعت پر جتنا زیادہ عمل ہوگا اُسی قدر ہوائے نفسانی رو بہ زوال ہوگی۔ احکامِ شرعیہ میں سے کسی ایک حکم پر عمل کرنا ہوائے نفسانی کے ازالے میں، اپنی ایجاد کردہ ہزار سالہ ریاضت و مجاہدہ سے زیادہ مفید ہے، بلکہ وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو شریعت کے علی الرغم ایجاد کی گئی ہیں، ہوائے نفسانی کی مؤید و مقوی ہیں۔ برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضتوں اور مجاہدوں میں کمی نہیں کی ہے لیکن وہ کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکے اور اُن کا نفس قوی ہی ہوتا گیا۔

مثال کے طور پر زکوٰۃ میں، (جس کا حکم شریعت نے دیا ہے) ایک درم صرف کرنا تخریب نفس کے لئے اُن ہزار اشرفیوں سے زیادہ مفید ہے جو اپنی خواہش سے خرچ کی گئی ہوں ——— شریعت کے حکم سے عید الفطر میں غذا کرنا خواہشِ نفس کے ازالے میں اپنی مرضی سے برسوں روزہ رکھنے سے زیادہ نافع ہے ——— صبح کی دو رکعتیں جماعت سے ادا کرنا اس سے بہتر ہے کہ تمام شب نفل میں کھڑا رہے اور صبح کی نماز بے جماعت ادا کرے ——— خلاصہ یہ ہے کہ جب تک نفس کا تزکیہ نہ ہو جائے وہ اپنی بڑائی کے مالیخولیا سے پاک نہ ہوگا، اور نجات محال ہوگی۔ اس مرض کے ازالے کی فکر ضروری ہے تاکہ یہ ابدی موت تک نہ پہنچائے۔

کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جو آفاقی و انفسی تمام ماسوی اللہ کی نفی کیلئے موضوع ہے، نفس کے تزکیہ و تطہیر میں مفید ترین چیز ہے۔ اکابر طریقت قدس اللہ اسرارہم نے تزکیۂ نفس کے لئے اسی کلمہ کو اختیار کیا ہے۔ ؎

تا بجاروب لا نہ روبی راہ
نرسی در سرائے الا اللہ

جب کبھی نفس سرکشی کرے اور اللہ کے عہد کو توڑنے پر آمادہ ہو تو اس کلمہ کی تکرار سے تجدید ایمان کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے "جددوا ایمانکم بقول لا الہ الا اللہ" اس کلمہ کے شعور اور اس کی تکرار کی ضرورت ہر وقت ہے اس لئے کہ نفس امارہ ہمیشہ درپے ہے۔ اس کلمہ کی فضیلت میں یہ حدیث آئی ہے کہ آسمان و زمین کو اگر ایک پلّے میں رکھیں اور اس کلمہ کو دوسرے پلّے میں، تو یقیناً اس کا پلّہ بھاری ہوگا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ علیہ وعلیٰ الہ الصلوٰۃ والتسلیمات۔

(مکتوب ۵۲، جلد اوّل)

دوسرا مکتوب

حدیث میں ہے:-

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر۔	ہم جہادِ اصغر (یعنی جہادِ اعداء) سے جہادِ اکبر (یعنی جہادِ نفس) کی طرف لوٹے۔

انسان کا نفس امارہ، تصدیق قلبی اور اقرار لسانی کے باوجود اپنے کفر و انکار پر مصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا۔ "انا ربکم" کی صدا اس کے اندر سے سر اٹھاتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفس سے دشمنی رکھنا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہے، اور یہی سبب ہے کہ حکم شریعت کے موافق اس کی مخالفت اور اس سے جہاد، جہادِ اکبر قرار پایا۔ آفاقی دشمنوں سے جنگ اتفاقی ہوتی ہے، اور اندرونی دشمن سے جنگ دائمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا حال یہ ہے کہ اس نے ایمان کے حصول اور عذاب دائمی سے نجات کیلئے تصدیق قلبی کو کافی قرار دیا، نفس کے اذعان و یقین کو ضروری قرار نہ دیا۔

چشم دارم کہ دہد اشک مرا حُسنِ قبول
آنکہ در ساختہ است قطرۂ بارانی را

ہاں افرادِ انسانی میں بعض کاملین ایسے ہوتے ہیں جنھیں نفس کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور ان کا نفس احکامِ الٰہی کا اس طرح مطیع ہو جاتا ہے کہ مخالفت کی مجال باقی نہیں رہتی۔ وہ آیۂ کریمہ "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اسی مقام میں ایمانِ کامل اور اسلامِ حقیقی جلوہ افروز ہوتا ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جو زوال اور خلل سے محفوظ ہے، بخلاف ایمان سابق کہ وہ زوال و خلل سے محفوظ نہیں۔ یہی وہ ایمانِ کامل ہے جس کی دُعا، اُمت کی تعلیم کے لئے، رسولِ خدا (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کی ہے: "اللھم انی اسئلک ایمانا لیس بعدہ کفر"۔ اسی طرح آیۂ کریمہ "یا ایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللہ" اور آیۂ کریمہ "والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم" میں اسی ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ اور حدیث نفیس "لن یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ" (ہرگز تم میں کا کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات نفس میری شریعت کے تابع نہ ہو جائیں) میں یہی ایمان مراد ہے۔

صوفیائے کرام کے طریقے میں اوّلین مطلوب اسلامِ حقیقی کا حصول ہی، اور وہ اسلام جو اطمینان نفس سے پہلے محض تصدیق قلبی سے حاصل ہوتا ہے، صوفیہ اسے اسلامِ مجازی کہتے ہیں، مجاز کی نفی ہو جاتی ہے لیکن حقیقت ثابت رہتی ہے اور اس کی نفی نہیں کی جاتی۔ ارکانِ اسلام، نماز، روزہ، حج، جہاد، اور تمام اعمالِ حسنہ جو اطمینان نفس سے پہلے وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ گویا صورتِ اعمال ہے، اس لئے کہ جب تک نفس امارہ اپنی سرکشی و انکار پر قائم ہے حقیقت اعمال کا وجود کس طرح ہو سکتا ہے۔ جب نفس کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ سرکشی و طغیانی سے باز آجاتا ہے تب کہیں اعمال کی حقیقت جلوہ نما ہوتی ہے۔ اس صورت و حقیقت کے تفاوت سے اندازہ ہی

آخرت میں جنتوں کے درجات اور مراتب قرب و رویت حق میں تفاوت ہوگا۔ اسی سے سمجھ لو کہ مقربین کی جنتوں اور عوام مومنین کی جنتوں کے درمیان کیا نسبت ہوگی۔ قطرے اور دریا کی نسبت تو سمجھ میں آتی ہے۔ قلت وکثرت کی نسبت جنس ایک ہی ہو لیکن ایک کم ہو ایک زیادہ۔ مگر صورت کو حقیقت کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ اسی طرح رویت اخروی بھی سبھوں کیلئے یکساں نہیں ہے بلکہ دیکھنے والوں کے لحاظ سے اس میں بھی درجات و مراتب ہیں، جیساکہ امام غزالی قدس سرہٗ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اب تصور کرو کہ اہلِ صورت و اہلِ حقیقت کی رویت کے درمیان کیا نسبت ہوگی۔ ؎

بود کہ صدر نشینانِ بارگاہِ قبول
کنند گوشۂ چشمے باہلِ صف نعال

یہ صورت و حقیقت دونوں ہی دائرۂ شریعت کے اندر داخل ہیں، ایک صورتِ شریعت ہے، اور ایک حقیقتِ شریعت۔ لہذا تمام کمالات کا مخزن شریعتِ حقہ ہی ٹھہری، کوئی کمال ایسا نہیں ہے جو شریعتِ محمدیؐ سے ماوراء ہو، ہمیں کسی کمال کے حصول کیلئے شریعتِ محمدیؐ سے باہر تاک جھانک کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی تمام و کمال فنائے نفس و اطمینان نفس کیساتھ مربوط و متعلق ہے۔ ؎

ہیچ کس را تا نگردد او فنا   نیست رہ در بارگاہ کبریا

ان تمام باتوں کا حاصل کلام یہ ہے کہ عقلمندوں کیلئے ناگزیر ہے کہ اپنے حاصل کا روز نقد روزگار کا جائزہ لیں، جس شخص کے پاس یہ دولتِ مطلوبہ موجود ہو فطوبیٰ لہ و بشریٰ اسے بشارت ہو، اور جسے یہ دولتِ مطلوبہ حاصل نہ ہو اسکی طلب سے اُسے فارغ نہ ہونا چاہیئے، اور اسکے حصول کی تگ و دو میں لگ جانا چاہیئے۔ ؎

ترسم کہ یار با ما نا آشنا بماند   تا دامنِ قیامت ایں غم بما بماند

(مکتوب ۶۴، از خواجہ محمد معصوم)

جہادِ اکبر :-

(حضرت عروج قادری)

کوئی فرعون ہے کوئی نمرود — کوئی معبود ہے کوئی مسجود

دوسروں کا خدا جو بنتا ہے — اپنے ہی نفس کا وہ بندا ہے

دوسروں کیلئے جو اژدر ہے — نفس کے سامنے کبوتر ہے

جس کے تیور سے شیر بھی بھاگے — بھیگی بلّی ہے نفس کے آگے

شیر کو آنکھ جو دکھاتا ہے — نفس سے اپنے مات کھاتا ہے

دوسروں کا بنا جو ہے مخدوم — نفس کا اپنے ہے محکوم

ناگ ہے ناگ نفس پہلو میں — آگ ہے آگ نفس پہلو میں

پرچمِ فتح جنگ لہرانا — نام کا اپنے ڈھول بجوانا

ملک کا ملک زیر کر لینا — یعنی کچھ ہیر پھیر کر لینا

فتح آساں بہت ہے قلعے کی — ملک کی، شہر اور ضلعے کی

یہ تو کرتا ہے زورِ باطل بھی — علم والا بھی، اور جاہل بھی

نفس کی فتح کار مشکل ہے — یہ نہیں ہی تو سب ہی باطل ہے

نفس کی سرکشی مٹانی ہی — حق کی قوت مجھے دکھانی ہی

ہے کبھی زہد کا غرور مجھے — ہے کبھی علم کا سرور مجھے

دلق کے نیچے زور پوشیدہ — اور کبر و غرور پوشیدہ

دوسروں پر زباں برستی ہی — نفس سے اپنے کور دبتی ہی

حکم پر اس کے سر بہ خم ہوں میں — بول سکتا نہیں کبھی چوں میں

جسم دُبلا ہے، نفس موٹا ہی — ہے تو سکہ، مگر یہ کھوٹا ہی

اب تو آتی ہی اس سے گھن مجھ کو — لڑتے رہنا ہی رات دن مجھ کو

ہر گھڑی ضبط، ہر گھڑی قدغن — جب ہی ہوگا درست یہ دشمن

ہاتھ اور پاؤں اسکے پکڑوں گا — حق کی ڈوری میں اس کو جکڑوں گا

معتدل کیسے ہو مزاج اس کا؟ — حق کا قانون ہی علاج اس کا!

فکر عقبیٰ کی اور خوفِ خدا — اس سے بہتر نہیں ہی اسکی دوا

نفس کی سرکشی خدا کی پناہ — کر رہی ہے یہ آدمی کو تباہ

نفس پہلو میں ایک اژدر ہے — اس سے لڑنا "جہادِ اکبر" ہی

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(از۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ)

(۴)

بہرحال "لم یجعل لہ عوجا" (نہ رکھی اس میں کسی قسم کی کجی) کی سلبی یا منفی خصوصیت اور اسی کے ساتھ "قیما" (لازوال، غیر فانی، امٹ، اور اٹل) ہونے کی ایجابی و مثبت خصوصیت، قانون نزول کے تحت ناقصوں کو ساحل کمال تک پہونچانے کے لئے وجود کامل، یا الحمد والے اللہ کی طرف سے الکتاب یعنی زندگی کا جو دستور العمل دیا گیا ہے اسی دستور العمل کی مذکورۂ بالا دونوں منفی و مثبت یا سلبی و ایجابی ایسی دو خصوصیتیں ہیں کہ ان کی روشنی میں "دجالی ادبیات" کی تاریکیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔ آپ جائزہ لیتے چلے جائیے، واضح ہوتا چلا جائے گا کہ ہر سیدھی سادی بات تک عہد دجل میں پیچیدہ ترین راہوں سے پہونچنے اور پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دل کا سکون، قلب کی راحت، جو مٹی کے لوٹے میں بھرے ہوئے پانی سے وضو کر لینے اور وضو کے بعد کسی کے قدموں پر سر ڈال دینے سے جس وقت چاہے حاصل ہو سکتی ہے، مگر غم غلط کرنے کے اسی مقصد کے لئے دیکھئے کروربار روپے کی سینمائی تصویریں تیار ہو رہی ہیں، اربوں کی لاگت سے ملک کے طول و عرض میں "تماشا گھروں" کا جال بچھا دیا گیا ہے، اور ملک نہیں ایک ایک شہر بلکہ اب تو قصبات تک کے باشندوں کی کمائی کا معقول حصہ روزانہ غم غلط کرنے کے اسی قصے میں بھسم ہو رہا ہے، اور پھر بھی جو خنکی وضو کے مفت پانی، اور بغیر کسی ٹیکس کے لاہوتی دربار کی باریابی سے دلوں کو میسر آ رہی ہے، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ خنکی اور ٹھنڈک کی اس کیفیت کو اس سارے جال جنجال سے حاصل کرنے میں آپ قطعی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ امن و امان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے اخلاقی تصحیح کی ضرورت کا احساس

آج بھی کیا جا رہا ہے جیسے پہلے کیا جاتا تھا، لیکن اسی غرض کو حاصل کرنے کے لئے پیچ و خم کی کتنی ٹیڑھی ترچھی راہ اختیار کی گئی ہے، آئندہ دنیا میں جو نسلیں پیدا ہونے والی ہیں، پیدا ہونے سے پیشتر ان کو ان کے خیال، صرف خیال کو دماغوں میں ابھار ابھار کر دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ موجودہ نسلوں کو اپنی اخلاقی غلطیوں کا جواب ان ہی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کو دینا پڑے گا، اس وقت دینا پڑے گا جب جواب دینے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں گے۔ کبھی تاریخ کے فن کو پیشہ بنانے والے یعنی مؤرخین سے ڈرایا جاتا ہے کہ جب وہ کتابیں لکھیں گے، یا مدرسوں میں سبق پڑھائیں گے تو تمہارا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کریں گے۔ کیسی عجیب بات ہے، جب امید باندھی جاتی ہے کہ اخلاقی بدکاروں کو ان دھمکیوں کے دباؤ سے دبا لیا جائے گا، کامیابی کی یہ راہ ان کو سیدھی راہ نظر آئی، اور پیدا ہونے والوں کو اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے کھڑا کر کے جواب دہی کی ذمہ داری ان میں جو ابھاری جاتی تھی، یہی راہ ان کو ٹیڑھی راہ دکھائی دے رہی ہے، وہم اور صرف وہم سے زیادہ جو اور کچھ نہیں ہے باور کرایا جا رہا ہے کہ وہی واقعہ ہے، اور واقعہ ہی کو وہم ٹھہرایا جا رہا ہے بغیر کسی معاوضہ کے جس نے وجود بخشا، وجود کے کمالات بخشے، اسی بخشنے والے ارحم الراحمین، علی کل شئی قدیر کی رحمتوں، اور دستگیریوں پر بھروسہ کرنے والے وہم کے شکار ٹھہرائے گئے، مگر وہم کے ان ہی الزام لگانے والوں کی زبانوں سے جب یہ یا اسی قسم کے فقرات نکلتے ہیں کہ میں تو فطرتاً رجائی پیدا ہوا ہوں، پر امید رہنا، اور مستقبل سے مایوس نہ ہونا یہی ہماری جبلت ہے مگر جب پوچھا جاتا ہے کہ اس رجا اور امید کی بنیاد کیا ہے، تو پھر ان کی اعوجاجی ذہنیتوں، اور ژولیدہ الجھی ہوئی توجیہوں کی گتھیاں اتنی دل چسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی کو روک سکتا ہے، اور میں کہاں تک گناؤں، مجھے تو دجالی زندگی کے ہر پہلو میں "پیچا پیچ" اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلم، یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز، پہلی نظر میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہی "عوج" وہی "پیچا پیچ" کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے[۱]۔

اور یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ "قانون ارتقاء" کو بنیاد بنا کر زندگی کا جو دستور العمل بھی

---

[۱] حاشیہ صلا۲۶ پر ملاحظہ فرمائیے۔

مرتب کیا جائے گا، اس کا مطلب ہی یہ ہو گا کہ آج جو کچھ مان لیا گیا ہے کہ وہی سچ اور صرف سچ ہے، کل تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہی جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا، ورنہ جو کچھ آج مانا جا رہا ہے اگر کل بھی وہی مانا گیا تو ارتقاء کا یہ لفظ ہی بے معنی اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے گویا ارتقائی اصول پر ساحلِ مراد تک پہونچانے کے لئے انسانیت کے آگے نجات کی "جو کشتی" پیش کی جاتی ہے اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ساحل تک پہونچانے کا سوار ہونے والوں کو یقین نہیں دلایا جا سکتا، بلکہ ممکن ہے کہ منجدھار میں پہونچ کر وہی چیز جس کا نام آج نجات کی کشتی ہے ممکن ہے کہ کل وہی "گرداب بلا" اور "لطمۂ موت" کی شکل اختیار کر لے۔ اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا "جہاز" بھی کھڑا ہوا ہے جسمیں ضمانت کی جاتی ہے؟

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۵)

۱؎ اس موقع پر ایک دلچسپ مثال کا خیال آ رہا ہے، حاشا وکلا کسی کی دل شکنی مقصود نہیں ہے بلکہ جو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں اسکی صرف توضیحی مثال کی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ سرسید مرحوم نے جب علیگڈھ کالج قائم کیا تو انھوں نے اعلان فرمایا کہ

"ہم اُس دن خوش ہوں گے جبکہ ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کیلئے بلکہ
اپنی قوم کے لئے کوشش کرے گی، اور کہے گی کہ میں اپنے ہاتھ اپنے پاؤں، اپنی جان،
اپنی محنت اپنے روپے کے بدلے نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں، اور نہ بہشت کو، بلکہ اپنی قوم کو"

(تہذیب الاخلاق ص ۵۵ و ص ۵۶)

الغرض یہ سیدھی سادی راہ کہ بغیر کسی معاوضہ کے جسکے دینے کا تجربہ تم کر چکے ہو اسی کی راہ میں دو، معاوضہ میں جتنا تم دو گے اس سے بہت زیادہ پاؤ گے۔ سید صاحب بیچارے نے اس کا انکار کیا، آمدنی مسلمانوں سے جتنی توقع تھی وصول نہ ہوئی تو اُن ہی سید صاحب نے جو فرماتے تھے کہ "اللہ کے لئے، ثواب کے لئے، جنت کے لئے جو دے گا میں اُس سے خوش نہ ہوں گا" ان کو دیکھا گیا کہ کالج کی آمدنی کی توفیر کے لئے جیسا کہ مولوی طفیل احمد صاحب نے "روشن مستقبل" میں لکھا ہے "سرسید نے روپیہ حاصل کرنے کیلئے یورپ کے طریقے مثل لاٹری بیسی چٹھی وغیرہ کے اختیار کئے" اور اسی پر بس نہیں فرمایا "بلکہ ایک بار علیگڈھ کی سالانہ نمائش میں قومی تھیٹر کے نام سے ٹکٹ لگا کر ایک قومی مظاہرہ کیا" یعنی باضابطہ تماشے کا نظم کیا گیا، اور "خود سرسید اور انکے شرکاء کار کا جسمیں حصہ تھا" ص ۲۰۹ بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے ان بزرگوں نے ایکٹروں کا فرض انجام دیا، مگر سیدھی راہ کو چھوڑ کر اس ٹیڑھی ترچھی راہ میں بھی جیسا کہ طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے "ان تمام طریقوں میں کوئی حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی" ص

(ص ۲۰۹ روشن مستقبل)

کہ سیدھی راہ سے لے جانے والوں کو لے جائے گا اور قطعی طور پر ہر ایک کو ڈگمگائے بغیر ساحل تک پہنچا دیا جائے گا۔ اس ضمانت نامے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ نوح کی، ابراہیم کی، موسیٰ کی، عیسیٰ کی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) الغرض سارے انبیاء اور بنی آدم کے سارے رہنماؤں کے دستخط روشن حروف میں اس ضمانت نامے پر جگمگا رہے ہیں۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ ان دونوں سفینوں میں سے اپنی "نجات" کے لئے جس کا جی چاہے انتخاب فرما لیجئے۔ اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ان حدیثوں کا مطلب جن میں فرمایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں کے یاد رکھنے والے دجال کے فتنے سے محفوظ رہیں گے، حالانکہ ابھی آپ کے سامنے کہف کے ابتدائی حصے کی پہلی سطر سے حاصل کئے ہوئے صرف ان ہی نتائج کو پیش کیا گیا ہے جن کے متعلق یہ اُمید کی جاتی ہے کہ خواص کے ساتھ عوام بھی اگر غور کریں گے تو مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسی سطر کے بعض الفاظ سے کچھ اور بھی چیزیں سمجھ میں آرہی ہیں، خصوصاً عبد کے لفظ کی اضافت، بجائے ذاتی یا صفاتی اسم کے "ہ" کی ضمیر غائب کی طرف جو کی گئی ہے، اپنے خاص مقام کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے، مگر اس کی تشریح میں غیر معمولی طوالت بھی ہوگی، اور عوام بے چاروں کی رسائی سے اندیشہ ہے کہ کہیں دُور نہ ہو جائے[لہ]۔

لہ حال ہی میں جب الحاج مولانا [illegible] مدیر الفرقان نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا بھی ہو کہ مضمون کی جو رفتار ہے یعنی سورۂ کہف کی پہلی سطر کے مطالب کیلئے تین قسطیں بھی کافی نہ ہوئیں تو خاتمہ تک پہونچتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ہم میں کتنے زندہ رہیں گے۔ مولانا دام مجدہ نے کچھ ایسے انداز میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ میں خود حیران ہو گیا۔ بعض دفعہ جی چاہا کہ قصّہ کو مختصر کر دوں لیکن یہ خیال آیا کہ آج دجال باطن کا ایک طومار ہے جو مسلمانوں میں پھیل رہا ہے، خود تراشیدہ قصّوں اور کہانیوں کے اس طومار کو جب دنیا برداشت کر رہی ہے [illegible] کو قلم بند کر کے پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں تو اللہ کی باتوں سے جو مطالب سمجھ میں آرہے ہیں ان کو محض اپنے [illegible] روک دوں اور اس سے بھی زیادہ بخل کا یہ فعل ہوگا کہ اپنی ذات کی حد تک ان کو محدود [illegible] کی کوشش کروں۔

پس الکہف کی پہلی سطر یا پہلی آیت کے متعلق جو کچھ بھی ادا کرادیا گیا اُسی پر قناعت کرکے آیئے اب آگے بڑھئے۔ لِیُنْذِرَ (تاکہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہے، اور بجائے کنائے اور اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے، جیساکہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہے، قدرتی طور پر تین ہی سوالات اس دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورہ میں دی گئی ہے۔

۲۔ کیا یہ دھمکی عام ہے یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات و احساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رُخ ہے۔

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رُخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہے، اور یہی بیان بھی کیا گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن کی طرف دھمکی کا رُخ ہے اُن کے خصوصیات کیا ہیں، اور جن کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اس دھمکی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے اُن کو ڈرنا نہ چاہئے اُن کے صفات و خصوصیات کیا ہیں؟۔

ان ہی تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے، اب میں آپ کے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرتا ہوں۔

(۱)

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہے؟ یہی پہلا سوال تھا، دجالی فتنے کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں، ذرا اُن کو دماغ میں تازہ کر لیجئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمینِ عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا۔

کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا وہ "باس" کا لفظ ہے، یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ منتہی الارب میں "باس" کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کئے ہیں یعنی "بیم و عذاب، و سختی، و قوت در حرب و دلیری" مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کئے جاتے ہیں، قدر مشترک ان کا

مگر نکالا جائے تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی ایک تعبیر "باس" بھی ہے، مگر یہ تو "باس" کی لغوی تشریح ہے، قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "باسھم بینھم شدید" یا عذابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے، اسی طرح عذاب ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر "یذیق بعضھم باس بعض" کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہو۔
اسی طرح سورۂ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے "وحین الباس" بھی فرمایا گیا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں "باس" کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب و قتال یا جنگ کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہونچتی ہے۔ قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو "باس" کہتا ہے گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہے اس محاورے کو پیش نظر رکھئے۔ اب سوچئے ان قرآنی الفاظ کو

لینذر باسا شدیدا من لدنہ — تاکہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہو

"باس" کا مفہوم تو متعین ہی ہو چکا، جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہے، آگے "شدید" کی قید کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا مادہ شدت ہے، شدت سختی کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہے وہ معمولی نہ ہوں گے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوتی، قرآن میں شدید کے بعد "من لدنہ" کا لفظ ہے "لدنی" اسی کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ علم کی دو قسموں یعنی ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے، اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہے جو عالم کو اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہے، اسی قسم کا نام اردو میں بھی "علم لدنی" مشہور ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ محاورہ اسی سورۂ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہے، یعنی موسیٰ (علیہ السلام) کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نام خضر (علیہ السلام) تھا، ان ہی کی دوسری

خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت

اٰتَیْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا　　دیا تھا ہم نے اس کو (یعنی خضر علیہ السلام کو)

اپنے حضور سے علم!

بھی بتائی گئی ہے۔

بہرحال "باس شدید" کے ساتھ "من لدنہ" کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے، بغیر کسی تاویل اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شدید جنگ جس کی دھمکی دی گئی ہے، اسباب وعلل سے بالاتر ہوگی، اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے "من لدنی" حالات پیش آئیں گے، کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنے والوں کے سارے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ ودو، ذہنی ادھیڑ بن سب بے کار ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہ سے ہو رہی ہوں، لیکن اسباب کا حجاب جب اٹھا دیا جائے، اور من لدنی قانون کے تحت براہ راست جن حالات کو قدرت کا ہاتھ بپا کرے ان کا مقابلہ کس کے بس کی بات ہے۔[1]

---

[1] بلکہ قرآن کی دوسری سورۃ جس کا نام سورۂ "دخان" ہے، اس کو بھی پڑھئے اسمیں بیان کیا گیا ہے کہ لوگ جب خدا کے متعلق [illegible] کھیلنے لگ گئے، اور ان کے بیچ جو کھلا ہوا رسول یعنی "رسول مبین" آیا تھا، جو تاریخی عہد کا رسول تھا مشرق والوں سے بھی اسی قدر قریب تھا جتنا مغرب والوں سے نزدیک تھا، اسکی اندرونی و بیرونی زندگی کے دونوں پہلو سب کے سامنے تھے، مگر باوجود اس کے اسی "رسول مبین" پر "معلم ومجنون" ہونے کا الزام لگایا گیا، یعنی یہود ونصاریٰ وغیرہ مذہبی اقوام کے علما اور کتابوں سے کچھ سیکھ لیا ہے، اور یہ کہ دماغی فتور مثلاً صرع (مرگی) وغیرہ جیسے امراض میں مبتلا ہے گویا تحقیقات کے نام سے "رسول مبین" کے متعلق یورپ کی لائبریریوں کو جن کتابوں سے بھر دیا گیا قرآن نے مذکورہ بالا دو لفظوں میں سب کا خلاصہ کر دیا ہے، بہرحال ان دونوں جرائم کی پاداش میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ بالآخر یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ انا منتقمون (اس دن ہم پکڑیں گے، بڑی پکڑ کے ساتھ اور اس دن ہم انتقام لینے والے ہوں گے) جو ظاہر ہے کہ "من لدنی" عذاب ہی کی ایک تعبیر ہے، اسی سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ بطشہ کبریٰ (بڑی پکڑ) سے پہلے لوگوں پر دخان مبین یعنی دھوئیں کا عذاب آئے گا۔ یہ "دخان مبین" کیا ہے، مفسرین کسی واضح نتیجے تک نہیں پہونچ سکے، (بقیہ صفحہ ۳۱ پر دیکھئے)

بہرحال پہلے سوال کے جواب کی جو نوعیت قرآنی الفاظ کی روشنی میں متعین ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے، وہ آپ کے سامنے پیش کر دی گئی، اسی کے ساتھ ایک اور چیز کا اضافہ بھی کر لیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دھمکی کے متعلق باقی دو سوالوں کے جوابات کا تفصیلی ذکر تو آئندہ ترتیب کے ساتھ کیا جائے گا، مگر سردست یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دھمکی تو دی گئی ہے جنگ کی، اور جن لوگوں کو دھمکایا گیا ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، یہ وہ قومیں ہیں جنھوں نے خالق عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کو منسوب کیا ہے، یعنی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کے بیٹے تھے، قرآن نے اعلان کیا ہے کہ وہی اس جنگی دھمکی کے حقیقی نشانہ ہیں، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر ممکن ہے کہ واقعہ آپ کے سامنے بھی بے نقاب ہو کر آ جائے گا۔ (باقی)

(صـ۳۰ کا بقیہ حاشیہ)

قیامت سے اس دخانی عذاب کا تعلق اس لئے نہیں ہوسکتا کہ یہ ٹلتا رہے گا، فرمایا گیا ہے انا کاشفوا العذاب (ہم عذاب کو ٹالنے والے ہوں گے)۔ اب اسی کے ساتھ سوچئے کہ عہد جدید کی لڑائیوں میں سارے آتشیں آلات جو استعمال ہوتے ہیں سب میں دخان یعنی دھواں ہی مشترک جز ہے، ہیروشیما میں ایٹم بم جو گرایا گیا تھا تو کہتے ہیں کہ چالیس میل طویل دھواں پیدا ہوا، اور قطر بھی اس دھوئیں کا میلوں کا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲۔

نبی کا طریقِ دعوت و اصلاح

(مترجمہ :- مولوی محمد رابع ندوی)

اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے جب صحابہ کرامؓ محبت کی دولت سے مالامال ہوئے تو انھوں نے اپنی ساری طاقت آپؐ کی اطاعت میں صرف کر دی اسکی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنی اور جماعتِ انصار کی جانب سے بدر سے قبل کہا تھا:-

"میں انصار کی طرف سے شرحِ صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور اُن کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں جس کا تعلق چاہیں قائم رکھیں اور جس کا چاہیں توڑیں، اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دیدیں، اور جو کچھ کہ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہو گا جو آپ چھوڑ دیں گے، اور جس بارے میں آپ جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے، اور بخدا اگر آپ برک غمدان تک چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے۔"

ان کی اطاعت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان تین شخصوں سے گفتگو ممنوع قرار دی تھی، جو غزوۂ تبوک نہ جا سکے تھے، تو لوگوں نے آپ کی بات مانی، اور مدینہ ان تینوں کے لئے شہر خموشاں بن گیا، جہاں کوئی بات کرنے والا اور بات کا جواب دینے والا نہ تھا۔ کعب کہتے ہیں:-

"رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہم تینوں سے گفتگو منع فرما دی تھی، لوگ ہم سے کترانے لگے اور ان کی نگاہیں بدل گئیں، حتیٰ کہ مجھے زمین تنگ محسوس ہونے لگی گویا وہ زمین ہی نہ تھی جس کو میں جانتا تھا، یہاں تک کہ جب لوگوں کی میرے ساتھ

بے رخی بہت بڑھ گئی، میں چلا اور ابو قتادہ کی دیوار پھاند کر اُن کے باغ میں گھس گیا، یہ ابو قتادہ وہ ہیں جو میرے محبوب چچازاد بھائی تھے اور میرے سب سے زائد چہیتے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا، بخدا انھوں نے مجھے جواب بھی نہ دیا تو میں نے اُن سے کہا اے ابو قتادہ میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہوں، وہ خاموش رہے، میں نے پھر دہرایا ان کو واسطہ دیا اور وہ خاموش رہے، میں نے پھر لوٹایا اور ان کو واسطہ دیا تو وہ بولے کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، میری آنکھیں بھر آئیں اور میں پلٹ پڑا اور دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔"

ان کی اطاعت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ ناراضگی و بے رخی کے ہدف تھے، کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا قاصد آتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علٰحدہ رہنا۔ وہ بولے "طلاق دیدوں یا کیا کروں؟" وہ بولا "نہیں۔ بلکہ الگ رہو اُن کے قریب مت جاؤ" تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہدیا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، اُن ہی کے پاس رہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں کچھ فیصلہ کر دے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کی محبت و تعلق کا یہ حال تھا کہ ہر ایک پر آپ کو ترجیح دیتے تھے۔ عین اس مقاطعہ کے زمانہ میں غسان کا بادشاہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دربار کی پیشکش کرتا ہے، اس بے رخی اور عتاب کے زمانے میں یہ حقیقتاً سخت آزمائش تھی، لیکن وہ رد کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مدینہ کے بازار میں میں چل رہا تھا کہ اُن شامی نبطیوں میں سے جو مدینہ غلہ فروخت کرنے آتے تھے ایک نبطی کہتا ہے کعب بن مالک کو کوئی بتا دے۔ یہ سُن کر لوگ میری جانب اشارے کرنے لگے، اُس نے میرے پاس پہونچ کر شاہ غسان کا ایک خط حوالے کیا، میں پڑھا لکھا تھا، میں نے اُس کو پڑھا، اُس میں تحریر تھا کہ

"ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تمھارے آقا نے تم سے بے رخی اختیار کر لی ہے، اللہ تعالیٰ نے تم کو ذلت کے لئے نہیں رکھا اور وہ تم کو ضائع کرنا نہیں چاہتا ہے، بس

تم ہم سے مل جاؤ، ہم تمہارا بہت خیال کریں گے۔"

میں نے جب پڑھ لیا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، اور میں نے جاکر اُسے تنور کی نذر کر دیا۔

اطاعت اور فوری تعمیل حکم کی ایک عجیب مثال وہ واقعہ ہے جو شراب کی حرمت کے حکم کے وقت پیش آیا۔ حضرت ابوہریرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ

"ہم مجلسِ شراب میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اُٹھا تاکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضری دوں اور سلام کروں، ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی "یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان الخ" تو میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا، اور میں نے یہ آیت ھل انتم منتھون (کیا تم رک جاؤگے) تک پڑھ کر سنادی، کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں ساغر تھا، کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا، جو شراب ہونٹوں میں پہونچ گئی تھی وہ فوراً تھوک دی گئی۔"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور اپنے نفس پر، گھر والوں اور خاندان والوں پر، آپ کو ترجیح دینے کی عجیب و غریب مثال یہ ہے، کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلایا اور فرمایا "دیکھتے ہو تمہارے والد کیا کہتے ہیں؟" وہ بولے "یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں کیا کہتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "کہتے ہیں کہ اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دیگا" وہ بولے "خدا کی قسم یا رسول اللہ! انھوں نے سچ کہا، بخدا آپ معزز ہیں اور وہ ذلیل ہیں، یا رسول اللہ آپ مدینہ تشریف لائیے، اور اہلِ یثرب کو اس کا علم ہے کہ وہاں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں، اگر اللہ و رسول کی مرضی یہ ہے کہ میں اس کا سر لے آؤں تو میں حاضر ہوں۔"
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "نہیں!"

جب لوگ مدینہ پہونچے تو عبداللہ بن عبداللہ بن ابی مدینہ کے دروازے پر تلوار لے کر

اپنے باپ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے، جب ان کے والد آئے تو بولے :۔

"تم ہی کہتے تھے اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہو گا وہ ذلیل کو نکال دے گا، خدا کی قسم! تم کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ معزز کون ہے؟ خدا کی قسم! تم مدینہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے بغیر رہ نہیں سکتے۔"

اُس نے کہا :۔

"اے خزرج کے لوگو! دیکھو میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے، اے خزرج کے لوگو! میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے۔"

وہ بولے :۔

"خدا کی قسم! یہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ اکٹھا ہو گئے اور ان کو سمجھایا، انھوں نے کہا :۔

"خدا کی قسم! یہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا!"

لوگ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے، آپؐ کو خبر دی، آپؐ نے فرمایا :۔

"جاؤ اور عبد اللہ سے کہہ دو کہ آنے دو۔"

لوگ واپس آئے، انھوں نے کہا :۔

"ہاں! اب جبکہ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت آ گئی ہے، وہ مدینہ میں داخل ہو سکتا ہے۔"

اس وسیع و عمیق ایمان، اس محکم پیغمبرانہ تعلیم، اس دقیق و حکیمانہ تربیت، اپنی عجیب و غریب طاقت و شخصیت، اور اس محیر العقول آسمانی کتاب کے ساتھ کہ جس کے عجائب و غرائب ختم ہونے کو نہیں آتے، اور جس کی تازگی میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی شکل میں پڑے پڑے ضائع ہو رہے تھے، جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی،

اور جن کو جہالت کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا، آپؐ نے اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیا، اسمیں خدا کی مدد سے ایمان وعقیدہ پیدا فرما دیا، زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اُجاگر کر دیں، پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا کہ اسی کے لئے اس کا وجود تھا، اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی، اور گویا کہ بے جان پتھر تھا اب وہ ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا، اور گویا بے حس وحرکت مردہ تھا اب زندہ ہو کر دنیا پر حکومت کرنے لگا، پہلے نابینا تھا جس کو خود رستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دنیا کا رہبر و رہنما بن گیا۔

اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنالہ	بھلا وہ جو مردہ ہو ہم نے اسکو زندہ کیا اور اسکو
نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ	ایک نور عنایت کیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں
فی الظلمت لیس بخارج منھا	چلتا ہو اس جیسا ہے جو اندھیروں میں گم ہو
	نکل نہ سکتا ہو

آپؐ کی توجہ وتعلیم سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب ہوا کہ دنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو عجوبۂ روزگار اور دنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں، وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ ان کو جھڑکا کرتے تھے اور جو کہ قوت وعزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں تھے، جن کو کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہ تھا، ان کے معاصر ان کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے، وہی عمرؓ تھے کہ یکبارگی تمام عالم کو اپنی عظمت وصلاحیت سے متحیر بنا دیتے ہیں اور قیصر وکسریٰ کو تخت وتاج سے محروم کر دیتے ہیں، اور ایسی اسلامی سلطنت کی بنا ڈالتے ہیں جو بیک وقت ان دونوں حکومتوں پر حاوی ہے اور تدبیر وحُسنِ انتظام میں ان سے فوقیت رکھتی ہے، ورع وتقویٰ اور عدل کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو وہ ضرب المثل ہیں۔

یہ ولید کے فرزند ہیں قریش کے نوجوان حوصلہ مندوں میں سے ایک شخص تھے، مقامی جنگوں میں انھوں نے نام پیدا کیا تھا، قریش کے سردار قبائلی جنگوں میں ان سے مدد لیتے تھے انھوں نے جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کوئی بڑی شہرت بھی حاصل نہیں کی تھی، اچانک وہ

آسمانی تلوار (سیف من سیوف اللہ) بن کر چمکتے ہیں، جو چیز سامنے آتی ہے کٹ جاتی ہے، یہ خدائی تلوار روم پر بجلی بن کر گرتی ہے اور تاریخ کے طول و عرض میں اپنے تذکرے چھوڑ جاتی ہے۔

یہ ابو عبیدہ ہیں جن کی امانت اور نرمی کی تعریف کی جاتی تھی اور مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی قیادت کر لیا کرتے تھے، ان کو دیکھئے مسلمانوں کی سب سے بڑی قیادت کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں، اور ہرقل کو شام کے ہرے بھرے ملک سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتے ہیں غریب اس پر وداعی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے، اے ملکِ شام تجھ کو رخصتی سلام، ایسا سلام جس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

یہ عمرو بن العاص ہیں جن کا شمار قریش کے سمجھدار لوگوں میں تھا، قریش اُن کو حبشہ سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ مسلمان مہاجرین کو واپس لے آئیں مگر ناکام واپس ہوتے ہیں، ان کو دیکھئے، مصر فتح کرتے ہیں اور زبردست اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔

اور یہ سعد بن ابی وقاص ہیں اسلام سے قبل ان کے متعلق نہ کسی بڑی فوجی قیادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی ماہر جنگ کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے، ان کو دیکھئے مدائن کی کنجیاں سنبھالتے ہیں اور عراق و ایران کو اسلامی سلطنت میں شامل کر کے ہمیشہ کے لئے فاتح عجم کہلاتے ہیں۔

یہ سلمان فارسی ہیں، ایک مذہبی عہدہ دار کے بیٹے تھے، فارس کا ایک گاؤں وطن تھا، ایک غلامی سے دوسری غلامی اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت دیکھتے ہوئے، مدینہ پہونچتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں، ان کو دیکھئے؟ اپنی ہی قوم کے عظیم الشان دارالسلطنت (مدائن) کے حاکم بن کر پہونچتے ہیں، کل جہاں کی رعیت کے ایک فرد تھے آج اس ملک کے حکمران ہیں، اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سے ان کے زہد و سادگی میں فرق نہیں پڑتا، لوگ ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک جھونپڑی میں قیام ہے، سر پر بوجھ ڈھوتے ہیں۔

یہ بلال حبشیؓ ہیں، فضیلت و عزت میں اس درجہ کو پہونچتے ہیں کہ امیر المومنین ان کو اپنا سردار کہتے ہیں۔

یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں جن میں حضرت عمرؓ کو خلافت کی صلاحیت نظر آتی ہے فرماتے ہیں :۔ "اگر حیات ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا۔"

یہ زید بن حارثہ ہیں، جنگ موتہ کے سلئے مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہیں، اور اسی لشکر میں جعفر بن ابی طالب، خالد بن ولید جیسے ممتاز لوگ بھی موجود ہیں۔ اور ان کے بیٹے اسامہ اُس لشکر کی قیادت کرتے ہیں جس میں ابو بکرؓ، عمرؓ جیسے افراد موجود تھے۔

یہ ابو ذر مقداد، ابو الدرداء، عمار بن یاسر، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب ہیں جن پر اسلام کی بادِ بہاری کا ایک جھونکا چل جاتا ہے، اور وہ دنیا کے نامور زاہدوں اور جلیل القدر عالموں میں دیکھتے دیکھتے شمار ہونے لگتے ہیں۔

یہ علی بن ابی طالب اور عائشہ اور عبد اللہ بن مسعود اور زید بن ثابت اور عبد اللہ بن عباسؓ ہیں جو نبی امیؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی گود میں پل کر دنیا کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہونے لگے۔ جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے، قلب کے سچے، علم میں گہرے اور تکلف سے دُور، بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے، خطاب کرتے ہیں تو دنیا کے مورخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔

پھر تھوڑا عرصہ بھی نہیں گذرتا کہ متمدن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ خام اشیاء جو بکھری پڑی تھیں، جن کی معاصر قوموں نے بھی ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا، اس سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعۂ کمالات نہیں دیکھا، جیسے ایک ڈھلا کرہ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا سرا کدھر ہے، یا بارانِ رحمت کی طرح کہ اس کا پتہ نہ چل سکے کہ اس کا پہلا چھینٹا مبارک ہے یا آخری، ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے، دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لئے اس کے پاس سامان موجود ہے اس لئے اس کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، لیکن دنیا اس کی مدد کے لئے تیار نہیں۔

اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی، نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی، حالانکہ اس کو اس سے پہلے

اس کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس کے باوجود اس کو ذرا ضرورت نہ پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے، یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے۔ ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا سکّہ دو بڑے براعظموں کے وسیع رقبہ میں چلتا تھا، اس کے پاس ہر شعبہ اور ہر ضرورت کے لئے متعدد آدمی ایسے تھے جو اپنی لیاقت، کارکردگی، امانت و دیانت، قوت، اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر تھے۔ یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اس نوزائیدہ قوم نے جس پر تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اس کو پورے آدمی فراہم کئے جن میں کوئی عادل حاکم تھا کوئی امانت دار خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گذار قائد، کوئی پرہیزگار اور متقی فوجی تھا۔ اس دینی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی، اس اسلامی حکومت کو اہل ترین، خدا ترس، فرض شناس و مستعد کارکن ملتے رہے۔ حکومت کی ذمہ داری ان ہی اشخاص کے سپرد ہوتی جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے، جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے مبلغ و ہادی سمجھتے، جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح، اور دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہوتا۔ ان کے اثر سے اسلامی تہذیب اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، اور دین کے برکات اس طرح وجود میں آئے کہ پھر کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

حقیقت میں محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا اور اس کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آگئے۔ آپ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی، اور اس کے طلسم کو پاش پاش کردیا آپ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کردیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہو۔ یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔

(من الجاھلیۃ الی الاسلام)

سفرِ حج کے

بعض

مشاہدات اور تجربات

۳

اس سلسلہ کی گذشتہ قسط میں مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ کے لئے روانگی کا ذکر کیا جا چکا ہے، بعد میں مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام کا ایک قابل ذکر واقعہ اور یاد آیا شائد ناظرین کے لئے فائدہ مند ہو۔ اس لئے پہلے اسی کا ذکر کر کے پھر سلسلہ وہیں سے شروع کیا جائے گا جہاں سے اس سے پہلی قسط میں چھوٹا تھا۔

---

(۱۴) مقام ابراہیم پر دوگانہ طواف پڑھنے کی کوشش میں حجاج میں جو کشمکش اور مزاحمت کبھی کبھی ہوتی ہے اور بعض لوگوں سے اس سلسلہ میں جو بے عنوانیاں ہو جاتی ہیں اُن کا کچھ ذکر پہلے کیا جا چکا ہے —— اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ —— ایک حاجی صاحب جو غالباً یو۔ پی۔ ہی کے تھے، مقام ابراہیم پر ایک رات نماز پڑھ رہے تھے، ایک دوسرے بنگالی حاجی صاحب اسی جگہ نماز پڑھنے کے ارادہ سے (غالباً نادانستہ) اُن پہلے صاحب کے سامنے آکر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ نہ اُن کے لئے رکوع کی گنجائش رہی نہ سجدہ کی۔ انھوں نے غصہ سے مغلوب ہو کر نیت توڑ دی اور اُن بنگالی حاجی صاحب کو کچھ تکلیف بھی پہنچائی، بیچارے بنگالی حاجی صاحب نے ان کی اس زیادتی کو صبر سے برداشت کیا اور جگہ ملنے پر نماز پڑھ کے خاموش وہاں سے چلے گئے —— کچھ دیر کے بعد دیکھا کہ یوپی کے وہ صاحب آنسوؤں سے روتے ہوئے اپنے مظلوم اُن بنگالی حاجی صاحب کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں

—— دیر کے بعد انھوں نے مُطاف میں ان کو پالیا اور روتے چیختے یہ کہتے ہوئے اُن کے قدموں میں گر گئے کہ میں بڑا ظالم اور ناپاک ہوں، میں نے آپ کو بڑی تکلیف پہنچائی، خدا کیلئے میرے اس جرم کی سزا آپ مجھے ابھی دے لیجئے!۔

بنگالی حاجی صاحب خود بھی رونے لگے اور اُلٹے اُن ہی سے معافی مانگنے لگے اور اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے جب تک کہ ہر ایک نے دوسرے کو معاف نہ کر دیا، پھر دونوں نے رو رو کر ایک دوسرے کے لئے وہیں دُعا کی —— اللہ اکبر اللہ کے محاسبہ اور آخرت کے مواخذہ کا خوف بھی کیا چیز ہے۔ کیا دنیا کی کسی اور چیز میں بھی ایسی طاقت ہے کہ کسی طاقتور کو کسی کمزور کے قدموں میں گر جانے پر وہ اس طرح مجبور کرے۔

مکہ معظمہ سے مدینۂ طیبہ:۔

(۱۵) ۸ محرم کو ظہر و عصر کے درمیان ہماری لاری جدہ کی طرف روانہ ہوئی تھی، عصر کی نماز راستہ میں پڑھی اور مغرب جدہ میں ادا کی۔ لاری میں کچھ مرمت کی ضرورت تھی جس میں کئی گھنٹے لگے، اس لئے (ہندوستانی ٹائم سے) رات کے ۱۱ بجے کے قریب جدہ سے روانگی ہو سکی۔ وہاں کے رواج کے مطابق رات بھر لاری چلتی رہی، صبح صادق سے کچھ پہلے رابغ جا کر دم لیا۔ سب پر تھکن اور نیند کا غلبہ تھا اس لئے سب پڑ کر سو گئے، طلوع آفتاب سے کچھ پہلے اللہ تعالیٰ نے بعض ساتھیوں کو بیدار کر دیا، انھوں نے جلدی جلدی دوسروں کو جگایا، عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے ایک پانی والے کو بھیج دیا اُس سے ڈوڑھ ٹین پانی خرید کے سب نے وضو وغیرہ کیا اور فجر کی نماز ادا کی —— رابغ کی منزل پر تلی ہوئی مچھلی بہت افراط سے ملتی ہے، وہی خریدی گئی، سب نے اُسی کا ناشتہ کیا، اوپر سے چائے پی۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر طلوع آفتاب کے بعد پھر سفر شروع ہو گیا، اور دن کے ۱۰ بجے کے قریب بستان پہونچ کر چند گھنٹے کے لئے لاری ٹھہر گئی (کیونکہ گرمی کے موسم میں مکہ اور مدینہ کے درمیان ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک لاریاں چلانے کی ممانعت تھی)۔

۳-۴ بجے کے قریب پھر لاری ہمیں لے کر چلی اور مغرب کی نماز ذراتا خیر سے

مسجد جاکر پڑھی۔ مدینۂ طیبہ کے راستہ کی یہ سب سے زیادہ بارونق منزل۔ ہے، چائے اور کھانے کے علاوہ یہاں پھل بھی خوب مل جاتے ہیں، یہاں سے مدینۂ طیبہ تک صرف دو منزلیں اور پڑتی ہیں —— مدینۂ طیبہ کی جو خاص اور بہت محسوس برکت ہے، دل کی سکینت اور ٹھنڈک، معلوم نہیں کیوں مسجد ہی سے بہت واضح طور پر اس کا احساس وادراک شروع ہوجاتا ہے —— خیر مسجد میں مغرب کی نماز اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم پھر لاری پر سوار ہوگئے۔ اگلی منزل پر عشاء کی نماز پڑھی اور وہاں سے چل کر ذوالحلیفہ (بیر علی) پر مقام کیا۔ رات کافی باقی تھی سب اطمینان سے لیٹ گئے، چونکہ معلوم ہوچکا تھا کہ یہاں سے مدینۂ طیبہ کا راستہ اب گھنٹوں کا بھی نہیں صرف منٹوں کا رہ جاتا ہے اس لئے شوق کی بیتابی سے بعض ساتھیوں کی آنکھ بہت سویرے کھل گئی، وقت آجانے پر سب نے فجر کی نماز پڑھی، اکثر نے یہیں کپڑے بدل لئے اور بعض نے مدینۂ طیبہ پہونچ کر۔

اس عاجز کی طبیعت کئی دن پہلے سے کچھ ناساز تھی، بلکہ مکۂ معظمہ سے روانگی کے وقت بھی حرارت کا اثر تھا، اور اتنے لمبے اور دشوار گذار سفر سے طبیعت کے زیادہ خراب ہوجانے کا بہت خطرہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہوا کہ طبیعت نہ صرف یہ کہ زیادہ خراب نہ ہوئی بلکہ الحمد للہ ذوالحلیفہ پہنچتے پہنچتے بالکل ہی اچھی ہوگئی۔

طلوع آفتاب کے بعد لاری ہم کو لے کر چلدی بس چند منٹ ہی گذرے تھے کہ پہلے مدینۂ طیبہ کے سرسبز باغات اور اس کے بعد مدینہ شریف کی پیاری آبادی آنکھوں کے سامنے تھی، گنبدِ خضرا، ساری عمر سے جس کا صرف نام سنا تھا، اس آبادی کے وسط میں نگینہ کی طرح نظر آرہا تھا، اب روح کا تقاضا تھا کہ لاری کو چھوڑ کے اور ہوسکے تو جسم سے بھی آزاد ہوکے بس اسی آن کسی طرح اُڑ کے وہاں پہونچ جائے۔ ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

بوئے یارے مہربانم میرسد — بوئے جاناں سوئے جانم میرسد

الحمد للہ سب ساتھیوں کی زبان پر درود شریف تھی اور اکثر کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو۔

۵

پردۂ اشک میں مسرت ہے
آج آنکھوں کا غسلِ صحت ہے

(۱۶) لیجئے یہ مدینۂ طیبہ کا دروازہ "باب العنبریہ" آگیا، اور ہماری لاری اس میں داخل ہوگئی۔ حجاج کی ہر لاری چند منٹ کے لئے یہاں ٹھہرائی جاتی ہے، حکومت کے آدمی وہاں کے قوانین کے مطابق کچھ دیکھ بھال اور لکھا پڑھی کرتے ہیں، چنانچہ دس پندرہ منٹ ہم کو بھی رکنا پڑا، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اُس وقت کا یہ رکنا کتنا شاق گذرا ـــــ اس قانونی کارروائی سے فارغ ہوکر لاری آگے چلی اور اللہ بھلا کرے ڈرائیور کا جس نے بجائے اڈے پہ اُتارنے کے خاص مسجد شریف کے قریب بلکہ گویا بابِ مجیدی کے سامنے لے جاکر اُتار دیا۔ یہاں بالکل قریب ہی میں "مدرسۂ شرعیہ" کی عمارت اور اُس کے مکانات میں، اس عاجز کو وہیں قیام کرنا تھا۔ حضرت مولٰنا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کے صاحبزادے مولٰنا اسعد میاں سلّمہ کو مکۂ معظمہ سے لکھ بھی دیا تھا۔ لاری سے اُترتے ہی اللہ تعالیٰ نے اُن سے ملاقات کرادی، انھوں نے فوراً مکان کا بندوبست کردیا اور اس انتظام سے مطمئن ہوکر یہ عاجز اپنے چند رفیقوں کے ساتھ مولٰنا سید محمد ثانی صاحب کی رہنمائی میں مسجد شریف کی پہلی حاضری اور اللہ کے بعد اپنے سب سے بڑے محسن اور آقا کے حضور میں پہلا سلام عرض کرنے کے لئے چلدیا۔ باب جبرئیل سے داخل ہوکر حسب قاعدہ پہلے مسجد شریف کے اُس حصے میں پہونچ کر جس کے متعلق آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے "روضۃ من ریاض الجنۃ" (جنت کی ایک کیاری) فرمایا ہے۔ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی، دُعا مانگی، اور اس بارگاہ قدس کی حاضری پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اسکے بعد ہم سب سلام کے لئے مواجہ شریف میں حاضر ہوئے حُسنِ اتفاق سے اس وقت یہاں ہجوم بھی زیادہ نہ تھا، سکون اور اطمینان کی فضا تھی، لیکن معلوم نہیں دل کی کیا کیفیت ہوئی ـــــ اس پہلی حاضری میں عرض کرنے کے لئے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور درود و سلام اور عرض و معروض کا ایک مختصر سا دفتر الفاظ و عبارات کے ساتھ ذہن میں مرتب تھا، لیکن مواجہ شریف میں کھڑا ہونا جیسے ہی نصیب ہوا دل و دماغ پر تحیر اور

ہمہ فراموشی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جو کچھ عرض کرنے کا ارادہ تھا اُس کا اکثر حصہ اس وقت یاد ہی نہ آسکا، ان آنکھوں میں اللہ برکت دے جنھوں نے اسوقت دل و زبان کی کچھ نیابت کی، بہرحال اس پہلی حاضری میں مختصر سا درود و سلام اور اپنا کچھ مدعا نا تمام عرض کر کے چند منٹ کے بعد جگہ دوسرے حضرات کے لئے خالی کر دینی پڑی ——— لیکن یہ حالت صرف پہلی حاضری میں ہوئی اس کے بعد تو سب کچھ عرض کیا، خوب خوب عرض کیا، اور بار بار عرض کیا، اپنے متعلق بھی، اپنے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی، اپنے محسنوں اور مخلصوں محبوں کے متعلق بھی، حتیٰ کہ الفرقان سے محبت رکھنے والوں کے متعلق بھی، نیز جن احباب یا اعزہ نے کچھ عرض کرنے کو کہا تھا، جہاں تک یاد تھا یا اپنی یادداشت میں نوٹ تھا حتی الوسع سب کے سلام و پیام پہونچائے ——— اس سلسلہ میں دینی تعلق و محبت اور راہِ خدا کی رفاقت و اخوت کی قوت اور پائداری کا اندازہ بھی خوب ہوا ——— مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں ملتزم پر دعا کے وقت اور مواجہ اقدس میں سلام عرض کرتے وقت اپنے بعض دینی محسنوں اور دینی رفیقوں کے حق میں کچھ عرض کئے بغیر اپنی معروض کا ختم کرنا گویا بس ہی میں نہ تھا ——— اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معروض کے باقی حصے بھی انشاءاللہ اس جز کی برکت سے مسموع و مقبول ہوں گے۔

---

(۱۷) مدینۂ طیبہ میں کل ۱۳ دن قیام نصیب رہا، الحمد للہ یہاں طبیعت اور صحت اتنی اچھی رہی کہ اس پورے سفر میں کہیں بھی ایسی نہیں رہی۔ موسم نہایت خوشگوار، کھانے پینے کی ہر چیز نہایت لذیذ، پانی ایسا نفیس اور شیریں اور دل کو ایسی تسکین اور ٹھنڈک بخشنے والا کہ جنت اور کوثر کے سوا شاید کہیں نہ ملے گا، اور سب سے زیادہ حیات بخش مسجدِ نبوی کی معطر اور روح پرور فضا اور محبوب رب العالمین کا مکانی قرب (صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ)۔

(۱۸) اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدینۂ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں یہ معمول رہا کہ کھانے سونے یا دوسری ضروری حاجات کے لئے تو باہر جانا ہوتا باقی سارا وقت جبکہ مسجد کے دروازے کھلے ہوتے بحمد اللہ مسجد نبوی ہی میں گذرتا ——— کچھ ہمارے رفیق اور رہنمائے سفر

مولٰنا سید محمد ثانی نے اپنے سابقہ تجربے کی بناء پر بتلایا اور ایک دو ہی دن میں کچھ خود اندازہ ہوا کہ دن رات میں چار وقت خاص طور سے ایسے ہوتے ہیں جن میں مواجہ شریف پر زائرین کا زیادہ ہجوم نہیں ہوتا اور اطمینان سے کچھ عرض معروض کا موقع مل ہی جاتا ہے۔ ایک (ہندوستانی ٹائم کے حساب سے) دن کے ۱۰-۱۱ بجے۔ دوسرے مغرب سے قریباً پون گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے۔ تیسرے رات کے ۱۰-۱۱ بجے، جب مسجد شریف کے دروازے بند کئے جاتے ہیں۔ چوتھے صبح صادق سے گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے تہجد کے وقت جب مسجد شریف کے سب دروازے ایک ساتھ کھولے جاتے ہیں —— اگرچہ اس وقت دروازوں پر پہلے سے مشتاقوں کا گھٹا لگا رہتا ہے اور ایک دم سیکڑوں داخل ہوتے ہیں، لیکن عام طور سے یہی دیکھا کہ اس وقت پہونچنے والے عموماً "روضۂ جنت" میں جگہ حاصل کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ دیر تک مواجہ شریف کی طرف اُن کا رُخ نہیں ہوتا۔ یہ دیکھ کر اس عاجز نے معمول بنالیا تھا کہ اس وقت باب جبرئیل سے مسجد میں داخل ہو کر تحیۃ المسجد کی مختصر دو رکعتیں پڑھتا، اور اس کے بعد سلام کے لئے جلدی سے مواجہ شریف میں حاضر ہو جاتا، اسی طرح مذکورۂ بالا باقی تین وقتوں میں بھی حاضری اور عرض سلام کا مستقل معمول رہا اور ان اوقات کے علاوہ بھی جب موقع مناسب دیکھا۔

(۱۹) مدینۂ طیبہ کے زمانۂ قیام میں اپنے بعض بزرگوں کے مشورہ کے مطابق جہاں تک ہو سکا اپنے وقت کا زیادہ حصہ دو چیزوں میں صرف کرنے کا خصوصیت سے اہتمام کیا۔ ایک درود شریف کی کثرت، دوسرے نفل نمازوں میں اور ان کے علاوہ بھی قرآن مجید کی تلاوت اور تجربے کے بعد دوسرے حضرات کو بھی یہی مشورہ دینے کو جی چاہتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کو وہاں سے بہت ہی خاص الخاص مناسبت ہے۔ بعض صاحبان کے متعلق تو معلوم ہوا کہ وہ روضۂ اقدس کی مغربی جالیوں کے بالکل برابر میں بیٹھ کر (یعنی جدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک ہے) حضورؐ کو سنانے کے ارادہ سے ہلکے سے جہر سے تلاوت کرتے تھے اور ان کو یقین حاصل ہوتا تھا کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) توجہ اور مسرت سے ان کی تلاوت سُن رہے ہیں۔

(۲۰) مدینۂ طیبہ کا قدیم قبرستان "جنت البقیع" مسجد نبوی سے قریب ہی ہے، بس چند منٹ کا راستہ ہے۔ اللہ اکبر! کیسا خوش نصیب زمین کا یہ قطعہ ہے، اہل بیت نبوی اور صحابۂ کرامؓ اور ہر قرن کے صلحاء و اولیاء کی کتنی بڑی تعداد اس میں آسودۂ خواب ہے۔ بقول رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کے۔ ع

"دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز"

مسجد نبوی سے باہر شوق کے ساتھ ایک دفعہ تو جبل اُحد جانا ہوا اور ایک ہی دفعہ مسجد قبا، اور چند بار بس بقیع، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے ہمارے رفیق اور اس پورے سفر میں ہمارے رہنما، جوان صالح مولانا سید محمد ثانی کو، بقیع کی قبور کے متعلق اتنی تفصیلات انھیں حفظ ہیں کہ مدینۂ طیبہ کے عام مزوّرین کے پاس بھی اُن سے زیادہ پختہ اور تحقیقی معلومات شاید نہ ہوں گے ہر ہر موقع پر لیجا کر وہ ہمیں بتاتے تھے کہ یہ مثلاً اہل بیت نبوی کی قبور ہیں، انمیں یہ قبر مبارک سیدۃ النساء فاطمہ زہراؓ کی ہے، یہ سیدنا حضرت عباسؓ عم رسول اللہؐ کی، یہ سیدنا حسنؓ کی، یہ سیدنا زین العابدینؓ کی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح امہات المومنین، سیدنا ابراہیم فرزند رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم)۔ امیرالمومنین سیدنا عثمان بن عفانؓ۔ سیدنا عثمان بن مظعونؓ امام دار الہجرۃ مالک بن انس اور ان کے استاد نافع، اور بقیع کے دوسرے خواص مدفونین ان سب کی قبروں کی انھوں نے ہی تفصیلی زیارت کرائی ——— معلوم نہیں اپنے تخیل اور تصور کا کرشمہ تھا یا کچھ اور، کہ بقیع میں حاضری کے وقت اور اسی طرح احد پر حاضری کے وقت بھی دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا جو کبھی اور کہیں محسوس نہیں ہوا۔

(۲۱) یہ ایک عجیب بات تجربہ اور مشاہدہ میں آئی کہ اگرچہ مسجد نبوی میں بھی مختلف ممالک سے آئے ہوئے وہی حجاج تھے جو موسم حج میں مکۂ معظمہ میں تھے، لیکن مسجد حرام (مکۂ معظمہ) میں جس ملک کے حجاج سے واسطہ پڑتا یہی اندازہ ہوتا تھا کہ سب کے ہی مزاجوں میں حدت اور شدت، اور سب کے دلوں میں سختی اور گرمی ہے۔ لیکن مسجد نبوی میں عام طور سے سب کے مزاج ٹھنڈے، اور سب کی طبیعتیں نرم معلوم ہوتی تھیں ——— اپنے بعض بزرگوں سے سنا تھا کہ بیت اللہ اور مسجد حرام کی تجلیات میں جلال کا غلبہ ہے، اور مسجد نبوی میں جمال اور لطف و مہر کا،

شاید دونوں مقامات پر بندوں کے مزاج میں یہ فرق اسی کا نتیجہ ہو۔ واللہ اعلم

(۲۲) مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ میں کل عالم اسلام کے لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ ہر سال اسی طرح ساری دنیا سے لاکھوں مسلمان یہاں آتے ہیں اور حج و زیارت کے سلسلہ میں کم از کم مہینے دو مہینے اور بہت سے اس سے بھی زیادہ قیام کرتے ہیں، بڑی شدت کے ساتھ دل میں یہ حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش ہمارے یہ دونوں روحانی مرکز اسلامی اور ایمانی زندگی کا ایسا نمونہ ہوتے کہ مختلف ملکوں سے آنے والے لاکھوں مسلمان یہاں اسلام کو ایک عمومی زندگی کی شکل میں دیکھ سکتے، اور یہاں کی آمد اُن کے غلط افکار و خیالات کی تصحیح اور بگڑی ہوئی زندگی کی اصلاح کا ذریعہ بن سکتی، لیکن کیا عرض کیا جائے کہ اس لحاظ سے وہاں کتنی کمی دیکھی اور کس قدر مایوسی ہوئی ——— اتنا ہی نہیں بلکہ مکہ اور مدینہ کے جن طبقوں کا حجاج سے سب سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے خصوصیت سے اُن میں صدق و صفا، اخلاص و تقویٰ، تعلق باللہ، معاملات میں دیانت و امانت اور مکارم اخلاق کی اتنی کمی ہے کہ عام حاجی اُن کی زندگی سے کوئی اچھا اثر تو کیا لیتے، صاف محسوس ہوا اور آنکھوں نے دیکھا کہ اکثر و بیشتر کچھ بُرے اثرات ہی لے کر واپس جاتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ دینی زندگی کی تجدید و احیاء کی سب جگہ سے زیادہ ضرورت یہاں ہے کیونکہ حرمین شریفین ساری اسلامی دنیا کے لئے گویا قلب ہیں کہ وہاں کا دینی فساد ساری اسلامی دنیا میں فساد پھیلنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اسی طرح وہاں کا صلاح پوری دنیائے اسلام میں صلاح پھیلنے کا وسیلہ بن سکتا ہے[1]۔

(باقی آئندہ)

---

[1] الفرقان کے اکثر ناظرین کو غالباً معلوم ہوگا کہ اس سلسلہ میں کچھ کوشش ایک عرصہ سے وہاں جاری بھی ہے اور جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں میں پھر سے دینی زندگی پیدا کرنے کی جد وجہد ایک خاص طرز پر ہو رہی ہے (جس کی دعوت الفرقان کا خاص موضوع ہے) اسی طرح ۳-۴ سال سے ہمارے بعض احباب مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ میں بھی کچھ کام کر رہے ہیں، لیکن ابھی تک ہمارے ان رفیقوں اور دوستوں کی کوششوں سے (بقیہ ص۴۲ پر)

(صفحہ ۴۷ کا بقیہ حاشیہ)

وہاں کی فضاء پر کوئی محسوس اثر اس لئے نہیں پڑ سکا کہ خود وہاں کے حضرات میں اس کام کی ابھی کوئی فکر اور اس کے لئے کوئی حرکت و جنبش پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

گذشتہ سال اس سلسلہ میں ایک نیا قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی نے (جنھیں اللہ تعالیٰ نے دوسرے بہت سے کمالات کے ساتھ عربی خطابت و انشار پر بھی خاص قدرت دی ہے) اہلِ عرب کی خاص نفسیات کو سامنے رکھ کر اس دعوت کے سلسلہ میں دو رسالے تالیف فرمائے، اور چھپوا کر وہاں کے خواص (اہلِ علم اور اہلِ اثر) کے لئے کافی تعداد میں بھیجے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل دو نوجوان عالموں کو خاص اسی مقصد کے لئے بھیجا کہ وہ ایک دعوت کے طور پر ان رسالوں کو حجاز اور دوسرے عربی ممالک کے خواص تک پہونچائیں اور مکۂ معظمہ میں مستقل قیام کر کے اس مقصد کے لئے مسلسل جد وجہد کریں ——
اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو ٹھکانے لگائے اور خود اہل عرب کے دلوں میں دینی زندگی کے احیاء و تجدید اور اس کی خدمت و دعوت کا داعیہ پیدا کرے۔

تصوّف و سلوک

(از جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی سابق پروفیسر فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی)

یہ واقعہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر زمانۂ حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق ایسی جامع اور محققانہ کتاب اُردو ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ہمارے علم میں نہیں ہے —— عہدِ حاضر کے تصوف کے مخالفین اور موافقین دونوں گروہوں کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں کی اصلاح کی اس میں خاص کوشش کی گئی ہے، اور تصوّف کی اصل حقیقت کو ہر طرح کے گرد و غبار سے صاف کر کے پیش کیا گیا ہے —— در اصل اسکے مضامین حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے ہیں، اور ترتیب و تعبیر مولانا عبد الباری صاحب کی ہے —— شروع میں ہندوستان کے مشہور صاحب علم و قلم جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقدمہ ہے۔

(ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ جلد خوشنما۔ قیمت صرف ؎ مع)

دعوتِ اِصلاح و تبلیغ

کے

رفقاء اور کارکنوں کے نام!

(از مرکز لکھنؤ)

تیسرا گشتی مراسلہ جو اودھ کے دوسرے تبلیغی مرکزوں کو جمادی الاولیٰ میں بھیجا گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخوان دینی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اس سلسلہ کا جو خط اس سے پہلے روانہ کیا گیا تھا (جو الفرقان کی گذشتہ اشاعت میں شائع بھی ہو چکا ہے) اس میں اس اصلاحی دعوت اور دینی جد وجہد کے سلسلہ کی ایک نہایت اہم چیز کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جس کو ہمارے اس کام کی روح کہنا چاہئے۔ اس میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دین کی اس دعوت اور جد وجہد کے سلسلہ میں ہمارا ہر چھوٹا بڑا عمل صرف اس خیال اور اس ارادہ سے ہونا چاہیئے کہ ہمارے پیدا کرنے والے کا ہم کو یہ حکم ہے اور وہ ہمارے اس عمل سے راضی ہوگا اور مرنے کے بعد عالم آخرت میں انشاء اللہ ہم کو اس کا وہ اجر ملے گا جس کی بشارت قرآن وحدیث میں دی گئی ہے، اور اگر ہماری اس کوشش کے نتیجہ میں اللہ کے کچھ بندوں نے دینی زندگی اختیار کر لی تو اس کا جو اجر و ثواب آخرت میں اُن کو ملے گا انشاء اللہ اسی کے بقدر اللہ تعالیٰ اپنے قانون اور وعدے کے مطابق ہم کو بھی مرحمت فرمائے گا ——— الغرض دین کی اس راہ میں ہمارے لئے قوت محرکہ بس یہی دو خیال ہونے چاہیں۔ خواہ اس کام کی برکت سے اور اس کے ضمن میں ہم کو اس دنیا میں بھی

بہت کچھ مل جائے (اور ہم اُس کے محتاج اور اللہ سے اس کے متمنی بھی ہیں) لیکن اس جد و جہد کے سلسلہ میں ہمارا اصل مقصود اور مطمح نظر بس یہی دو چیزیں ہونی چاہیں یعنی ایک اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی وجہ سے اس کی رضا کا حصول ——— دوسرے آخرت کے موعود ثواب کی اُمید اور اللہ کے دوسرے بندوں کی اصلاح کا ذریعہ بن کر اُن کے نیک اعمال کا اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص۔

یہ چیز تو وہ ہے جس کی طرف اس سلسلہ کے اس سے پہلے خط میں توجہ دلائی گئی تھی آج اسی سلسلہ کی چند اور اہم باتیں عرض کرنی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ دین کی دعوت دینے والے اور اس راہ میں جد و جہد کرنے والے کی پوزیشن قدرتی طور پر کچھ ایسی ہوتی ہے کہ شیطان بڑی آسانی سے اُس میں اپنی بڑائی اور برتری کا زعم اور دوسروں کی کمتری اور حقارت کا احساس پیدا کر سکتا ہے اور یہ چیز داعی کے اجر و ثواب کو برباد کر دینے والی اور اللہ کی رضا اور رحمت سے اس کو محروم کر دینے والی ہے اس لئے ضروری ہے کہ جن بندوں کو دین کی دعوت اور جد و جہد میں حصہ لینے کی توفیق نصیب ہو وہ شیطان کے اس حملہ سے بہت ہوشیار اور چوکنے رہیں اور اپنے دل پر برابر نظر رکھیں جس کی عام تدبیر یہ ہے کہ تنہائیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کو سوچا کریں اور نہایت باریک بینی کیساتھ اپنے نفس پر تنقید اور اس کا محاسبہ کیا کریں، اگر وہ ایسا کریں گے تو انھیں اپنا ہی نفس مجمع عیوب نظر آئے گا ——— اسی طرح دوسرے لوگوں میں محاسن کے پہلو تلاش کرنے کی عادت ڈالیں اور پوری باریک بینی سے دوسروں کی خوبیاں دیکھنے کی کوشش کیا کریں۔ جو لوگ اس عمل کے عادی ہو جائیں گے انشاء اللہ وہ کبر و خود پسندی اور دوسروں کی تحقیر کے وبال سے محفوظ رہیں گے۔

اسی سلسلہ میں ایک یہ بات بھی خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ جو حضرات ہمارے اس خاص طرز پر دینی دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں اور اپنی صوابدید کے مطابق کسی اور طریقہ سے دین کی کوئی اچھی خدمت انجام دے رہے ہیں اُنکی بھی پوری عظمت اور قدر کی جائے۔ اصل چیز اللہ کی رضا طلبی اور دین کا درد و فکر اور اس کی خدمت ہے باقی کسی خاص طریقے اور خاص سلسلہ کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس یقین کو بار بار دل میں تازہ کیا جائے کہ سب کچھ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو کچھ ہوگا صرف اُسی کی قدرت اور مشیت سے ہوگا، اور ہماری کوشش صرف ایک ظاہری تدبیر ہے جس کا ہم کو حکم ہے، لہٰذا دوڑ دھوپ ہی کی طرح پورے اہتمام سے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کی جائیں اور اس بارے میں ہماری حالت وہ ہو جائے جو کسی سنگین مقدمہ میں پھنسے ہوئے یا کسی موذی مرض میں مبتلا آدمی کی ہوتی ہے کہ وہ بار بار بلبلا بلبلا کے اللہ سے دعا کرتا ہے اور دوسروں سے بھی دعا کراتا ہے بہرحال دعا کی کثرت اور اس کا اہتمام بھی ہمارے اس کام کا گویا ایک اہم جزء ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس وقت اپنی کوشش کے کچھ نتیجے نکلتے نظر آئیں اور اللہ کے کچھ بندے آپ کی دعوت سے متاثر ہوں تو اس کو ہرگز اپنی کوشش کا اثر، یا کسی قابلیت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ محض اللہ کا فضل اور اس کی مدد و توفیق کا کرشمہ یقین کریں اور اس کا شکر ادا کریں اور مزید کے لئے اُس سے دعا کریں۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جب کسی کام کی توفیق ملے، تو ہمیشہ یہ سمجھ کر کہ اللہ کا اور اُس کے دین کا کام جیسا اور جس طرح ہونا چاہئے تھا میرے قصور کی وجہ سے ویسا نہیں ہو سکا، دل سے استغفار کیا کریں، بہرحال اس سلسلہ کے ہمارے ہر چھوٹے بڑے عمل کا خاتمہ استغفار پر ہونا چاہئے ـــــــ کام کے ظاہر و باطن میں جو قصور رہ جاتا ہے، استغفار اگر دل سے ہو تو بڑی حد تک اس کی تلافی کر دیتا ہے۔ والسلام

(صفحہ ۶ کا بقیہ)

زبان میں تو انھیں لفظ "اسلامی رقص" کہنا چاہئے تھا۔ اسی طرح جس طرح پاکستان کے سربراہ کا "مسلم قوم پرست لیڈر" "اسلامی اشتراکیت" وغیرہ کی اصطلاحیں استعمال فرمایا کرتے ہیں ـــــــ افسوس کسی فن یا نظام حیات کو اسلامی یا مسلم قرار دینے کیلئے لوگ نہ قرآن کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، نہ سنتِ رسول کی، بلکہ ان کے نزدیک سب سے بڑی سند صرف مسلمان بادشاہوں کا طرزِ عمل ہے ـــــــ حالانکہ اسلام میں "مسلم رقص" اور "اسلامی اشتراکیت" ہی نہیں (مسلمان بادشاہوں) کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں۔

"الانصاف" الہ آباد

اِنتخاب

۱۵ر-۲۰ر فروری کو جمعیۃ علماء صوبۂ یو-پی کی ایک کانفرنس جونپور میں منعقد ہوئی تھی؛ جس کی صدارت حامد الانصاری غازی مدیر "مدینہ بجنور" نے فرمائی، موصوف کے خطبۂ صدارت کا کچھ حصہ ۱۵ر جمادی الاولیٰ کے مدینہ میں شائع ہوا ہے، اُسکے دو ٹکڑے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

زمانہ کا انقلاب

حضرات! زمانہ کا انقلاب، حالات کی تبدیلی، موسم کا تغیر! ہمارا قافلہ کہاں سے چلا تھا کہاں پہونچ کر ٹھہر گیا، اب ہمارے خالی ہاتھ میں اُس معصوم پیاس کے علاوہ کیا ہے جسے ہم چھوڑ چکے ہیں۔

فغاں بھی، کوششِ ضبطِ فغاں بھی بے اثر نکلی
بڑی اُمید افزا ابتدا کی یہ خبر نکلی

عجیب و غریب حالات ہیں، نہ معلوم ساتھی کہاں گئے، عمر بھر کے دوست کدھر سے کدھر نکل گئے، اور نہ جانے خود ہم کیا ہوئے؟ سیاست کا دور ہے، گرما گرمی کا زمانہ ہے، برسات کا موسم ہوتا تو شبنم سے منہ ٹھنڈا کر لیتے، اب ہموطن حال پوچھتے ہیں، حال کسے بتائیں اور بتائیں تو کیا بتائیں؟

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں　　سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش　　شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

"مدینہ بجنور"

---

(۲)

شکایت نہیں حکایت

جمعیۃ علماء ہند سیاست سے دستبردار ہو گئی، حکومت جن کو ملنی تھی مل گئی، زخموں کو سمیٹنے کا کام جمعیۃ علماء کے حصے میں آیا، پرانے ساتھی حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر اس پر بھی برہم ہیں۔ شکایت

کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے لگائے ہوئے زخموں کا خون سمیٹنے والے تم کون ---؟ مگر ہم اس پر بھی ان سے ناراض نہیں۔ سہ

کی وفا ہم نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

مجھے اس موقع پر قرۃ العین کے چند شعر یاد آگئے، افسوس اب ان اشعار کو ہمارے سوا سمجھنے والا کوئی نہ رہا۔ سہ

تو و ملک و جاہ و سکندری من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش است تو درخوری دگر ایں بدست مرا سزا

اگر آں صنم زرہِ ستم پئے کشتنِ منِ بے گنہ
لقد استقام بسیفہٖ فلقد رضیت بما رضا

ہمہ اہل مسجد و صومعہ پئے ورد صبح و دعائے شب
من وذکر طلعۃ و طلعت تومن الغداۃ الی العشا

اگر میں نے ان اشعار کے اظہار میں کوئی غلطی کی تو معافی چاہتا ہوں، اس لئے کہ اب میرے وطن اور میرے صوبہ کی سرکاری اور مادری زبان جبریہ ہندی ہے۔ یہ شکایت نہیں حکایت ہے۔

"مدینہ بجنور"

بے مثل تاریخ دانی

ایک ہندو روزنامہ مورخہ ۸ر فروری (بحوالہ الجمعیۃ دہلی)

"جس کسی نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہ کرسکے گا کہ مصر کو چھوڑ کر کسی بھی اسلامی ملک میں کوئی اقلیت نہیں، ان ممالک نے اقلیت کو ختم کردیا، اُسے مسلمان بنادیا یا اُسے بھگادیا، پاکستان کی حالت میں تاریخ غلط نہیں ہوسکتی"۔

بیشک تاریخ کہاں غلط ہوسکتی ہے۔ تاریخ ہی یہ بتارہی ہے کہ مسلمانوں نے شام میں، فلسطین میں، مصر میں، عراق میں، شرق اردن میں، ترکی میں، ایران میں ایک عیسائی، ایک یہودی، ایک غیر مسلم زندہ نہیں چھوڑا۔ افغانستان میں ایک ہندو، ایک سکھ باقی نہیں رہنے دیا۔ انڈونیشیا میں غیر مسلموں کا خاتمہ کردیا۔ دہلی کے تخت پر مسلمان صدیوں تک رہے اُن ایبکوں نے، خلجیوں نے، تغلقوں نے،

سیدوں نے، بودیوں نے، اور آخر میں مغلوں نے ایک ہندو کو بھی جیتا نہ چھوڑا۔ ادھر گولکنڈہ میں بیجاپور میں، اور سب سے بڑھ کر حیدرآباد میں قطب شاہیوں نے، عادل شاہیوں نے، آصف جاہیوں نے کب کسی ایک ہندو کی، پارسی کی، یہودی کی، جان، مال و عزت کوئی چیز باقی رہنے دی۔ رہی اودھ کی واجد علی شاہی، تو یہاں تو غیر مسلموں کے بچہ بچہ کو زندہ چنوا دیا گیا۔ اور پھر بھوپال اور رامپور اور ٹونک اور جوناگڈھ اور مرشدآباد وغیرہ جو کل تک اسلامی ریاستیں کہلاتی تھیں اُن کے تو قریب بھی جا کر کسی ہندو کا زندہ رہنا محال تھا! ——— اس بے مثل و بے مثال تاریخ دانی کی داد کے لئے الفاظ بھی کہاں سے تلاش کر کے لائے جائیں!۔

"صدق" لکھنؤ

پھر وہی وفاداری

بمبئی ۹ فروری۔ وزیر داخلہ مسٹر مرارجی ڈیسائی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ:۔

"صوبہ کی پولیس میں اب بھی مسلمان دس فی صدی ہیں، اور اُن پر محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں عدم اعتماد ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف سے آواز آئی:۔ کہ اگر ہند اور پاکستان کے تعلقات خراب ہو جائیں جب مسلمان پولیس پر اعتماد کیا جائے گا۔

جواب میں وزیر صاحب نے کہا:۔ کہ کسی مسلمان پولیس افسر کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر غیر وفادار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جب حیدرآباد کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا تو حیدرآباد کے سلسلہ میں اقدامات کرنے میں مسلمان پولیس افسران نے انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا ہے، اور بعض مسلمان پولیس افسروں نے تو اپنی جانیں تک ان کارروائیوں کے سلسلہ میں دی تھیں"۔ (خبر)

تو یہ کہئے "مسلمانوں کی وفاداری" پر سوال کرنے اور شبہ ظاہر کرنے کا دلچسپ مشغلہ پریس کانفرنس کے حلقہ میں اب تک جاری ہے! اور اگست ۴۷ء سے لیکر فروری ۵۰ء تک "وفاداری" کے مسلسل امتحان پر امتحان کا نتیجہ اب تک صفر ہی نکلا ہے!——— اور امتحان ایسا

کہ جس کے متحمل ہونے کا حق گویا چھوٹے بڑے ہر ہندو کو حاصل ہے۔

اچھا ہے جو قوم خدائے تعالیٰ سے اپنی وفاداری کا رشتہ توڑ دے، اور بجائے یہ کہنے کی جرأت رکھنے کے کہ "ہمارا اصلی رشتہ وفاداری صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، اور ہم کسی بھی مخلوق کے سو فی صدی وفادار نہیں" ہر کس و ناکس سے ڈرنا، لرزنا، سہمنا، شروع کر دیا، وہ اسی طرح مخلوق کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کے تازیانے کھاتی رہے۔

"صدق" لکھنؤ

اسبابِ جرم

ہندوستان کے چیف جسٹس جناب ہیرالال جی کانیا نے لکھنؤ میں تعزیراتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"دو بڑے عوامل جن کی وجہ سے مجرمانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ افلاس اور جہالت ہیں، اگر جرم کو روکنے اور ان خرابیوں کو دور کرنے کے ذرائع سوچ لئے جائیں، جو ارتکاب جرم پر ابھارتے ہیں، تو بہت کچھ پریشانیوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا قدم افلاس کا خاتمہ اور تعلیم کی کثرت ہے، اگر ان دونوں باتوں کے حصول میں کافی حد تک کامیابی ہو جائے تو آزادی، سلامتی، اور ملکیت —— جو کسی بھی امکانی حالت میں خطرے میں پڑ جاتی ہیں —— بہت قیمتی خیال کیجائینگی، اور انھیں آسانی سے خطرے میں نہ ڈالا جا سکے گا۔"

اپنی پوری تقریر میں کانیا صاحب نے پورا زور، انھیں دونوں عوامل کی اہمیت جتانے اور ان کا خاتمہ کرنے پر صرف کیا ہے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی بھی ایسا آدمی جو مغربی ممالک کے حالات سے واقف ہو، اس قسم کی باتیں کہنے کی جرأت کس طرح کر سکتا ہے۔ امریکہ میں یہ دونوں عوامل ختم کر دیئے گئے ہیں، مگر کیا امریکہ میں جرائم کی تعداد میں کوئی کمی آگئی ہے، ہم تو دن رات اس کے برخلاف وہاں جرائم کی تعداد میں اضافے ہی کی خبریں پڑھتے ہیں۔

در اصل مجرمانہ ذہنیت پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری انسان کے اس احساس پر ہے کہ اسے اپنے اعمال کا جواب کسی ایسی عدالت میں نہیں دینا ہے جس کی گرفت سے بچنا ممکن نہ ہو۔

"الانصاف" الہ آباد

بددیانتی کیسے ختم ہو؟

یو، پی کے وزیر خوراک مسٹر جی، سی، گپتا نے الہ آباد میں کانگریس کارکنوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"بددیانتی کا خاتمہ صرف بددیانتی کے خلاف آواز اٹھانے سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے خاتمہ کے لئے ہر فرد کو اپنی جگہ پر پوری کوشش کرنی ہوگی، وہ لوگ جو روزانہ بددیانتی کرتے ہیں، اور پھر یہ آواز اٹھاتے ہیں کہ بددیانتی ختم ہونی چاہیئے، اُن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی چور خود کو بچانے کیلئے چور چور کی آوازیں لگائے۔"

غور کیا جائے تو وزیر خوراک کی یہ تمثیل بالکل مبنی برحقیقت ہے۔ آج ہماری سوسائٹی کے بیشتر افراد کی حیثیت واقعی اس چور کی سی ہے جو خود کو بچانے کیلئے خود ہی چور چور کی صدائیں بلند کرتا ہے۔ سوسائٹی میں اس کی عملی مثالیں ہر قدم پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک اپنے فائدے کا تعلق ہوتا ہے لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے، مگر جوں ہی کسی بددیانتی سے خود کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے فوراً بددیانتی کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کردیتے ہیں۔

مگر اس کا علاج وزیر خوراک نے کچھ نہیں بتایا۔ کیا انھیں اُمید ہے کہ صرف اُنکی نصیحت لوگوں کو با اخلاق بنادے گی؟ یا حکومت کو بھی اس کی طرف کوئی عملی قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

"الانصاف" الہ آباد

مُسلم رقص

بمبئی کرانیکل اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ مشہور رقاصہ مس ازوری نے جو حال ہی میں یورپین ممالک میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد واپس آئی ہیں پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہاں "مسلم رقص" کو تقویت پہونچا سکیں مس ازوری نے ایک پریس انٹرویو میں بتایا کہ "لوگوں کا خیال ہے مسلم رقص کوئی چیز نہیں ہے وہ صرف ہندوستانی رقص و موسیقی کو جانتے ہیں" یہ خیال بالکل غلط ہے مغل بادشاہوں نے اس فن کی ترقی کیلئے بہت کچھ کیا، مشہور "کھٹک ناچ" مسلم ایجاد ہے، اور تنی پور ناچ میں مسلم عناصر پائے جاتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مس ازوری نے معاملہ "مسلم رقص" تک ہی محدود رکھا، ورنہ مسلم قوم پرستی کی (بقیہ ص۵۱ پر)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۷ نمبر (۶) رجسٹرڈ نمبر اے ۳۵۳

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

مُدیرِ مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھیے!

"الفرقان" اور کتبخانہ الفرقان بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
لہٰذا جملہ خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کیلئے ذیل کا پتہ یاد رکھیے!

دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو۔پی)

چندہ سالانہ پانچ روپیہ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ

ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ

جلد ۱۷ | بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۵۰ء | نمبر ۶

جمادی الاولیٰ کا الفرقان :—

دفتر میں بالکل ختم ہو گیا ہے، اور ہمیں چند پرچوں کی ضرورت ہے، جو حضرات فائل نہ رکھتے ہوں وہ اگر اپنا پرچہ دفتر کو واپس کر دیں تو اُن کی مدّتِ خریداری میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

ناظم "الفرقان" لکھنؤ

(مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔)

ضروری اعلان

"الفرقان" کی آئندہ اشاعت "حج نمبر"

سالگذشتہ الفرقان کا جو "حج نمبر" شائع ہوا تھا اُسکے مطالعہ سے سیکڑوں ہزاروں لوں میں حج وزیارت کا جو شوق وجذبہ پیدا ہوا، اور لاتعداد حج کرنے والوں نے اس مقدس سفر میں اپنے ساتھ رکھ کر اُس سے ہر منزل و موقع پر جس طرح رہنمائی حاصل کی، اور جس کثرت کے ساتھ وہ جہازوں پر اور پھر مکہ اور مدینہ میں پڑھا گیا اور عشق و محبت کی خاص کیفیات پیدا کرنے میں اسکی جس تاثیر کا تجربہ ہوا اگر یہ خاکسار مدیر الفرقان امسال خود نہ گیا ہوتا اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اسکی اس مقبولیت وافادیت کا ہرگز صحیح اندازہ نہ ہوسکتا —— ان ہی چیزوں کو دیکھ کر مخدومی حضرت مولٰنا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے (جو اس سال بھی حج کو تشریف لے گئے تھے) ایکدن مسجد حرام میں اس عاجز سے فرمایا کہ آئندہ کیلئے اس سلسلہ کو مستقل کر دینا چاہئے اور الفرقان کا "حج نمبر" ہر سال نکلنا چاہئے۔

حضرت مخدوم کے اس ارشاد پر اس عاجز نے کچھ ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن پاکستان سے روپیہ کی آمد بند ہونے کی وجہ سے امسال الفرقان کی مالی حالت چونکہ بہت کمزور رہی اسلئے یہ ارادہ ختم کر دیا گیا تھا —— اب موسم حج قریب آنے پر جب پھر اُن مناظر اور اُن صحبتوں کی یاد تازہ ہوئی تو پھر داعیہ پیدا ہوا سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اگر گذشتہ سال کی طرح زیادہ ضخیم نہ ہو سکے تو کم از کم سو سوا سو صفحہ کا ہی نکال دیا جائے اور اس کو دو مہینے کا مشترک شمارہ قرار دے دیا جائے، اس طرح الفرقان پر کوئی الگ مالی بار بھی نہیں پڑے گا، اور "حج نمبر" بھی نکل جائے گا —— چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب اس اشاعت کے بعد جو آپکے زیر نظر ہے رجب و شعبان کا مشترک شمارہ انشاء اللہ "حج نمبر" کی شکل میں ہی آخر شعبان یا شروع رمضان میں شائع کیا جائے گا۔ تیاری شروع کر دی گئی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں!

دوسری یا تیسری فروری کی بات ہے اپنے ہی صوبہ کے ایک نیک دل اور با اصول "سچے" کانگریسی ہندو سے ایک خاص تقریب سے ملاقات ہو گئی اور ملک کی موجودہ حالت کے متعلق دیر تک اُن کی اچھی اور سچی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ــــــ اس گفتگو کے دوران میں انھوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے قضیہ کا بھی ذکر کیا اور بڑی فکر اور تشویش کے ساتھ اس سلسلہ میں اس حقیقت کا بھی انھوں نے اظہار کیا ــــــ کہ ہماری قوم کے کچھ شر پسند عناصر قتل و غارت کے اُس طوفان کو جو ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد ملک میں اٹھا تھا اور گاندھی جی نے اپنی جان کی قربانی دے کر جس کو اُس وقت روک دیا تھا، اب پھر نئے سرے سے اُٹھانا چاہتے ہیں، اور مجھے خاص ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے لئے انھوں نے چند قدم سوچے ہیں ــــــ وہ ہندو عوام کو زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ لینے کے لئے ایسے کئی مسئلے اُٹھائیں گے جن سے مُلک کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی بڑھے اور باہم نفرت و عداوت پیدا ہو ــــــ انھوں نے بتلایا کہ بابری مسجد کا قضیہ دراصل اسی سلسلہ کا پہلا قدم ہے، اور اس کے بعد وہ مسلسل اس طرح کے بہت سے قدم اُٹھائیں گے ــــــ موصوف نے بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ اس کا بھی اظہار کیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد سے ان مسائل پر صاف ذہن سے سوچنے والے ہندو بہت کم رہ گئے ہیں، اور جو ہیں اُن میں بھی یہ جرأت نہیں ہے کہ وہ قوم کے بگڑے ہوئے جذبات کے خلاف میدان میں آکے حق و انصاف کی بات کہیں، اور عوام کی ناراضی اور اُس کے نتائج برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں، اس لئے قوم کو گمراہ کرنے والا یہ فساد پسند عنصر بڑی تیزی سے کامیاب ہو رہا ہے اور پوری قوم کا ذہن زہریلا ہوتا جا رہا ہے۔

یہ اس طویل گفتگو کا خلاصہ ہے، تفصیلات دانستہ حذف کردی گئی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ ملاقات اور گفتگو فروری کی کسی ابتدائی تاریخ میں ہوئی تھی، اس سے چند روز بعد ہی مغربی اور مشرقی بنگال میں فسادات اور پناہ گزینوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ہندو عوام کو مشتعل کرنے کا ایک خاص موقع اُس شر پسند عنصر کے لئے پیدا ہوگیا جس کے مفسدانہ عزائم کا ذکر اُن صاحب نے کیا تھا۔ چنانچہ ہندو مہا سبھا کے پلیٹ فارم سے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں —— جن کا سلسلہ اب تک بھی جاری ہے —— اُس میں اُن لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنے عزائم اور ارادوں کو بہت صاف صاف بیان کیا، بعض مقامات پہ تو ایسی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور ہندو عوام کو مسلمانوں کے خلاف اس قدر مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی کہ اُس کے نتیجے میں وہاں کے مسلمانوں پر اگر بڑی سے بڑی کوئی تباہی آجاتی تو تعجب نہ ہوتا —— خود لکھنؤ میں بھی جو صوبہ کا دار الحکومت ہے بعض تقریریں بہت خطرناک قسم کی ہوئیں پھر شروع میں اکثر مقامات پر ہولی کے سلسلے میں مسلمانوں کو چھیڑنے کیلئے جو جو شرارتیں[1] کی گئیں، اور اُن کے جذبات کو مجروح اور مشتعل کر کے فساد کی صورتیں پیدا کرنے کی کوششیں جس طرح کی گئیں، جن کے نتیجے میں چند مقامات پر فسادات ہو بھی گئے —— ان تمام واقعات نے

---

[1] راقم سطور کو خود بھی اس شرارت کا تجربہ ہوا —— والدہ ماجدہ کی علالت کی اطلاع پر یہ عاجز ۳ مارچ کی صبح کو دلی اکسپریس لینے کے ارادہ سے اپنے مکان سے اسٹیشن چار باغ لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا، حالانکہ یہ دن رنگ پاشی کا نہ تھا (یعنی رنگ پاشی کا اصل دن ۴ مارچ کو تھا) پھر بھی اسٹیشن کے راستے میں دو جگہ رنگ کی پچکاریوں اور نہایت تکلیف دہ غیر شریفانہ آوازوں کا نشانہ بننا پڑا، جن میں ایک آوازہ یہ بھی تھا کہ "پاکستان جاؤ، پاکستان جاؤ" ان لوگوں کے رویہ سے بالکل صاف ظاہر تھا کہ ان کا مقصد و منشا صرف یہی ہے کہ اُنکی ان بدتمیزیوں سے مشتعل ہو کر کوئی اُن سے اُلجھے اور انھیں اپنا منصوبہ پورا کرنے کا موقع ملے۔ یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی مختلف مقامات کے متعلق جو جو سننے میں آئیں اُن کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ ۱۲

اس نیک دل ہندو کے اس بیان کی پوری پوری تصدیق کر دی کہ ملک کے شرپسند عناصر روز بروز طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں اور وہ اس کے درپے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کے خلاف کسی طرح وہی طوفان پھر برپا کر سکیں جو اگست ۴۷ء میں شروع ہو کر جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کی جان لے کر رک گیا تھا۔

نیز یہ حقیقت بھی بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے کہ برادرانِ وطن میں ایسے معقولیت پسندوں اور حق و انصاف کے حامیوں کی بہت کمی ہے جو جرأت کے ساتھ اس طوفانِ بدتمیزی کا مقابلہ کرنے، اور اپنی قوم کو انصاف اور سچائی کی راہ دکھانے کے لئے تیار ہوں — ان حالات و واقعات نے ہندوستانی مسلمانوں میں بے اطمینانی اور خوف و ہراس کی پھر وہی صورت پیدا کر دی ہے جو ۴۷ء کے ہنگاموں نے پیدا کی تھی، اور بعض لوگ ہندوستان سے مسلمانوں کے مکمل تخلیہ کے مسئلہ پر غور کرنے لگے ہیں۔ اور جزوی تخلیہ تو خود ہمارے صوبہ کے بہت سے شہروں سے بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔

ہم نے پہلے بھی بار بار عرض کیا ہے اور آج پھر اس کے اعادہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اولیں فرصت میں تذبذب اور بے اعتمادی کا رویہ قطعاً ترک کر کے پورے عزم و یقین کے ساتھ چند فیصلے کر لینے چاہئیں۔

اول یہ کہ چار کروڑ کی آبادی کا تخلیہ اور تبادلہ قریب قریب ناممکن ہے، اور آج کی دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو اتنی بڑی تعداد کے رہنے بسنے کا انتظام کر سکے۔ اس لئے ہندوستان چھوڑ کر کہیں جانے کا مسئلہ اور اس بارے میں غور و فکر ایک دفعہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہئے، اور اللہ پر توکل و اعتماد کرتے ہوئے ایمان و عزم کے ساتھ فیصلہ کر لینا چاہئے، کہ انشاء اللہ ہمیں اسی سرزمین میں رہنا اور جینا اور مرنا ہے اور دانشمندی اور ہمت سے اور اللہ کی مدد سے اپنے مسائل کو حل کرنا ہے۔ زمین اللہ کی ہے اور ہم اس کے بندے ہیں۔ ؎

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

پھر اسی کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے دوسرا فیصلہ ہم مسلمانوں کو یہ کرنا چاہئے کہ ابتک ہماری زندگی کا جو طرز رہا کہ اسلام کے دعوے کے باوجود ہماری زندگی کے زیادہ پہلو غیر اسلامی ہے ہم اس کو بدلنے کی اور ایمان و عمل صالح والی زندگی خود اختیار کرنے اور مسلمانوں میں اس کو عام کرنے کی جدوجہد کریں گے اور دنیا کی دوسری خدا سے غافل اور آخرت فراموش اور اغراض پرست قوموں کی طرح ایک قوم بننے کے بجائے ایمانی اصولوں پر چلنے والی اور دنیا کو اللہ کی طرف بلانے والی اُمت بن کر اس ملک میں رہیں گے —— اگر مسلمانوں نے اور کم از کم ان کی نمایندگی کرنے والے متوسط طبقے ہی نے اپنی زندگی میں یہ تبدیلی کر لی تو پھر دیکھنے والی آنکھیں دیکھیں گی کہ حالات کس طرح بدلتے ہیں اور دل کیسے پلٹتے ہیں —— افسوس ہو کہ ہم مسلمانوں کی غالب اکثریت اُس زندگی اور اُن صفات سے بالکل خالی ہے جن پر اللہ کی طرف سے رحمت اور نصرت کا وعدہ ہے۔ دینی زندگی رکھنے والوں اور دین کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہو کہ وہ ان کی مدد کرے گا اور انکے پاؤں جمائے گا۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔	اگر تم اللہ کی (یعنی اُسکے دین کی) مدد کروگے تو اللہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے پاؤں جمادے گا۔

ہر ملک کا مالک اور افراد یا اقوام کو عزت یا ذلت دینے والا اللہ ہی ہے، اُس کے اور صرف اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

تیسری ایک بات جس کا فیصلہ ہندوستانی مسلمانوں کو پورے عزم سے کر لینا چاہئے یہ ہے کہ اُن کے بدخواہ فسادی عناصر کی طرف سے جب اور جہاں اُن کے جذبات کو مجروح اور مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے وہ آخری امکانی حد تک صبر اور ضبط سے کام لیں، اور جذبات کو عقلِ دور اندیش کے تابع رکھیں، اور اس طرح ہر مفسدانہ کوشش اور سازش کو

اپنے دانشمندانہ رویہ سے ناکام بنادیں۔ ہندوستان میں جو شر انگیز عناصر خاص طور سے مسلم دشمنی پر کمر بستہ ہیں اور جو اس ملک سے مسلمانوں کا وجود ختم کردینا چاہتے ہیں اُنکے پاس اس وقت سوائے فساد اور ہنگاموں کے اور کوئی پروگرام نہیں ہے، اور مسلمانوں کا دانشمندانہ صبر و ضبط اُن کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ بزدلی کی وجہ سے خطروں سے بھاگنا اور صرف اپنے جان و مال کی محبت میں ذلتیں اور ٹھوکریں برداشت کرنا تو موت سے بدتر ہے لیکن عقل اور دین کے فیصلے کے مطابق اپنے عزم اور ارادہ سے صبر و ضبط سے کام لینا اور جذبات کی باگیں روکے رکھنا بہت اونچے درجے کی چیز ہے ـــــ اسی کے متعلق قرآنمجید میں فرمایا گیا ہے:-

اِنَّ ذَالِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ　　　یعنی یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے

بہرحال صبر و ضبط کو ہمیں اپنا قومی فیصلہ اور قومی پالیسی بنالینا چاہئے ـــــ پھر اگر مسلمانوں کے صبر و ضبط کے باوجود فساد پسند عناصر کہیں فساد برپا کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور مسلمان دینی جان اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے کسی حفاظتی اور دفاعی کارروائی پر مجبور ہوں تو صرف فسادیوں کا زور توڑنے اور اُن کے مفسدانہ اور ظالمانہ ارادوں کو ناکام بنادینے تک اپنی کارروائی کو محدود رکھیں، اور حملہ آور فسادیوں کے علاوہ کسی اور ہندو سے ہرگز تعرض نہ کریں اور نہ ان کو اپنا دشمن جانیں، بلکہ اگر کسی جگہ ہندو ایسے پوزیشن میں ہوں کہ مسلمانوں کے کسی نادان اور ناسمجھ گروہ سے اُن کو کوئی دکھ اور نقصان پہونچنے کا خطرہ ہو تو سمجھ دار اور ذمہ دار مسلمان اپنا اسلامی اور انسانی فرض سمجھ کر اپنے بال بچوں کی طرح اُن کی حفاظت کریں۔

پاکستانی بھائیوں سے

اس سلسلہ میں ایک بات اپنے پاکستانی بھائیوں سے بھی عرض کرنی ہے ہمیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہو کہ دینی رشتہ کی بناء پر آپ کو ہمارے ساتھ محبت اور ہمدردی ہے اور یقیناً آپ کی یہ دلی خواہش ہوگی کہ ہم بھی ہندوستان میں عافیت

کے ساتھ رہ سکیں، اس سلسلہ میں آپ کی طرف سے ہماری مدد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے یہاں کی اقلیت کو محفوظ اور مطمئن رکھنے کی کوشش کریں، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس بارے میں آپ کی کسی معمولی غلطی سے ہندوستانی مسلمانوں پر کیا کیا مصیبت آسکتی ہے۔

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
تپیدن دل مرغان رشتہ بر پارا

بہرحال ہندوستانی مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ سے اگر واقعی آپ کو دلچسپی ہے اور آپ اس سلسلہ میں ہماری کوئی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اپنے یہاں کی اقلیت کو آپ محفوظ اور مطمئن رکھنے کی کوشش کریں —— اور قطع نظر ہمارے مسئلہ سے جو لوگ آپ کے ملک کے شہری بن چکے ہیں اُن کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت تو آپ کا اور آپ کی حکومت کا اسلامی اور دینی فریضہ بھی ہے۔ آپ اپنی اقلیت کی حفاظت اور ان کے امن و اطمینان کے قانوناً و اخلاقاً بھی ذمہ دار ہیں اور شرعاً بھی۔ اس بارے میں آپ دنیا کے سامنے بھی جوابدہ ہیں اور اُس اللہ رب العالمین کے سامنے بھی آپ کو جواب دینا ہے جس نے آپ کو اختیار اور اقتدار کا یہ موقع فراہم کیا ہے۔

پاکستان کے ہر سمجھدار اور دین شناس مسلمان کا فرض ہے کہ نہ جاننے والے عوام کو وہ بتلائے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ یہاں کے کسی شریر طبقے کی طرف سے اگر بالفرض کوئی بڑی سے بڑی زیادتی بھی ہو تب بھی پاکستان میں رہنے والے پرامن ہندوؤں کو ذرا بھی دکھ پہونچانا کسی مسلمان کے لئے ہرگز جائز نہیں —— اور جو لوگ ایسا کریں گے وہ اپنی آخرت کو بھی تباہ کریں گے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اور زیادہ مصیبت کا سبب بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل اور دین دے۔

یہ مضمون مارچ میں لکھا گیا تھا اس کے بعد اپریل کے پہلے ہفتہ میں دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے درمیان اقلیتوں کے تحفظ اور اطمینان کے متعلق نئی دہلی میں جو معاہدہ ہوا ہے اُس سے اچھی امیدیں ہیں۔ لیکن اسکی کامیابی کا بڑا انحصار پھر بھی دونوں ملکوں کے عوام ہی پر ہے۔

ہماری دینی دعوت

[مدیر "الفرقان" کی ایک تقریر، جو جمادی الاولےٰ کے آخری ہفتہ میں
بارہ بنکی کے ایک تبلیغی اجتماع میں کی گئی تھی۔]

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ
لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلیٰ کل
من اتبعھم باحسان

بزرگو دوستو اور دینی بھائیو!

اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوقات میں انسان کو ایسا بنایا ہے کہ اگر وہ ترقی کرنا چاہے تو فرشتوں سے بڑھ سکتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

انسان کو یہ استعداد اور قابلیت دینے کے ساتھ دوسرا کرم اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اس کی رہنمائی اور تربیت و ترقی کے لئے نبوت کا سلسلہ جاری کیا، اور ہر زمانے میں اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجتا رہا۔ ان نبیوں کا کام یہی تھا کہ انسانوں میں جو ترقی کا جوہر ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی جو صلاحیت اور استعداد ہے اُسے سیدھے راستے پر لگائیں اور نبوت کی روشنی میں چلائیں۔ چنانچہ ہزاروں سال یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ قوموں اور ملکوں کی ہدایت کیلئے ضرورت کے مطابق اللہ کے پیغمبر آتے رہے اور لوگوں کو نیکی کا راستہ بتاتے رہے۔

اب سے قریباً پونے چودہ سو برس پہلے خاتم النبیین حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ نبوت اس لئے نہیں ختم کی گئی کہ دنیا کو اب پیغمبروں کی ہدایت کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ جس کام کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بعد اُس کا انتظام دوسرا کر دیا گیا —— نبی کے

دو کام ہوتے ہیں ایک ہدایت کا علم وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا ـــــ اور دوسرے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو بندوں تک پہونچانا اور ان کو اُسکے مطابق چلنے کی دعوت دینا اور ماننے والوں کی تربیت کرنا ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے پہلے کام کا انتظام تو یہ کیا کہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ایک ایسا مکمل اور جامع ہدایت نامہ نازل فرمادیا جو دنیا کے خاتمہ تک یعنی قیامت تک انسانوں کی ہدایت کے لئے کافی ہو اور اس میں ان کی اصلاح و تربیت کے پورے اصول موجود ہیں۔ پھر قیامت تک اُسکے بالکل محفوظ رہنے کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود لے لی، اور اس ہدایت نامہ ہی میں ان دونوں باتوں کا اعلان بھی فرمادیا ـــــ ـــــ حفاظت کی ذمہ داری کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ — ہم نے اس نصیحت نامہ (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور تکمیلِ دین کی خوشخبری "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" کے الفاظ میں سنائی گئی اور خاص حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے دن یہ آیت نازل کرکے آپ کی زبان مبارک سے اس اہم موقع پر یہ اعلان کرادیا گیا ـــــ الغرض قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہدایت کا انتظام تو یہ کیا گیا کہ ہر دور میں اور ہر حال میں کافی ہونے والی کامل مکمل ہدایت نازل کردی گئی اور اس کو ہمیشہ کے لئے ہر قسم کی تحریف اور دست برد سے محفوظ کردیا گیا اس لئے اب کسی نئی ہدایت کے آنے کی، اور اسی طرح کسی نئے ہدایت لانے والے کی ضرورت نہیں رہی ـــــ اور پیغمبروں کا جو دوسرا کام ہوتا تھا ـــــ یعنی اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو بندوں تک پہونچانا اور ان کو اس کی روشنی میں چلنے کی دعوت دینا، اور انکی تعلیم و تربیت کرنا ـــــ اس کا انتظام یہ کردیا گیا کہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی امت اور خاصکر اس کے خواص کے سپرد یہ خدمت کردی گئی ـــــ اور قرآن مجید ہی میں اس کا بھی اعلان کردیا گیا، ایک جگہ فرمایا گیا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

جس کا مطلب یہی ہے کہ یہ امت لوگوں کی ہدایت اور خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور اللہ پر ایمان ویقین والی زندگی گذارنا اس کا مقصدِ وجود ہے ـــــ دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ"

یعنی تم میں ایک مستقل جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کا خاص وظیفۂ حیات یہی ہو کہ وہ لوگوں کو خیر اور بھلائی کی دعوت دے، اچھی باتوں کا حکم کرے، اور برائیوں سے روکے۔

اور رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اس سے زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ مختلف موقعوں پر اپنی امت کو اس کی طرف سے اطمینان دلایا کہ دنیا سے میرے جانے کے بعد بھی دین کی دعوت اور بندگانِ خدا کی اصلاح و تربیت کا سلسلہ قائم رہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں میری امت میں ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو دینِ حق پر خود چلنے والے ہوں گے، اور اللہ کے دین کو تروتازہ رکھنے اور پھیلانے کی جدوجہد کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن سے دین کی حفاظت وخدمت اور بندوں کی اصلاح وہدایت کا کام لیتا رہے گا۔[1]

الغرض اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم کر کے جس طرح قیامت تک قرآن پاک کے محفوظ رہنے کا انتظام فرمایا اسی طرح یہ بھی انتظام فرمایا کہ قرآن پاک انسانوں کو جو دعوت دیتا ہے، اُس دعوت کا حامل اور علمبردار ایک گروہ بھی اس دنیا میں ہمیشہ رہے گا اور ہر دور کی ضرورت کے مطابق دین کی دعوت وخدمت کا سلسلہ جاری رہے گا ـــــ

---

[1] "لا تزال طائفة من امتی" (الحدیث) اور "یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله" (الحدیث۔) اور "ان الله یبعث لهذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها" جیسی احادیث میں دراصل اللہ تعالیٰ کے اسی انتظام کی اطلاع دی گئی ہے اور امت کو مطمئن کیا گیا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبارک زمانہ سے لیکر ابتک یہ سلسلہ برابر جاری ہے ——— اور اپنے اپنے زمانہ میں اللہ کے وفادار بندے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت اور نمایندگی کرنے والے آپ کے امتی اپنی بصیرت اور قدرت و استطاعت کے مطابق یہ خدمت انجام دیتے رہے ہیں (اللہ تعالیٰ اُن سب سے راضی ہو، اور اُن کی محنتوں کا بہتر سے بہتر اجر اُن کو عطا فرمائے) ——— رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ہر زمانہ کے یہ خادمانِ دین ہمارے محسن ہیں، اور اگر یہ حضرات دین کے وہ کام نہ کرتے جو انھوں نے کئے ہیں تو دین کے ساتھ اور اللہ و رسول کے ساتھ آج ہمارا جو ٹوٹا پھوٹا تعلق ہے شاید یہ بھی نہ ہوتا، اور خدا جانے کہ ہم گمراہی کے کس حال میں ہوتے۔

اس وقت مجھے جس کام اور دین کی جس دعوت کی طرف آپ کو توجہ دلانی ہے وہ بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

گذشتہ سَو سَوا سَو برس میں قریباً سارے عالم کی حالت میں ایک خاص فرق پڑا ہے اور وہ یہ کہ خدا فراموش یورپین اقوام کے سیاسی غلبہ کی وجہ سے، اور علوم و فنون میں اُنکی قیادت کی وجہ سے دنیا بھر میں مادہ پرستی، خدا سے بے تعلقی، دنیا میں انہماک اور آخرت فراموشی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور دوسری قوموں کی طرح خود مسلمانوں کی حالت بھی اس اعتبار سے بہت گر گئی ہے، اللہ سے اور دین سے ان کا تعلق روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے، اور آخرت سے بے فکری اور دنیا میں انہماک روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ——— ایسی حالت میں ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو کھڑا کرے جو مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور ایمانی صفات تازہ کرنے کے لئے اور اسلامی زندگی کو ان میں پھر سے پیدا کرنے اور عام کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر جدوجہد کریں، اور خدا فراموشی، آخرت سے بے فکری، اور دنیا پرستی کی گمراہیوں سے انھیں نکالنے کے لئے امکانی کوششیں صرف کر کے نبوت کی نیابت کا فرض انجام دیں ——— چنانچہ گذشتہ چوتھائی صدی میں امت کے مختلف حلقوں میں اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کا احساس پیدا کیا اور اپنے بہت سے بندوں کے دلوں کو اس طرف متوجہ فرمایا ———

اللہ کے انہی بندوں میں ہمارے ایک بزرگ مولانا محمد الیاس (رحمۃ اللہ علیہ) بھی تھے، ان میں اللہ تعالیٰ نے اس کام کی ایسی فکر اور لگن پیدا کر دی تھی کہ کم از کم ہم نے اس کی کوئی اور مثال نہیں دیکھی۔ اب سے قریباً ۲۰-۲۵ سال پہلے وہ اس کام کی طرف متوجہ ہوئے، ہمیں بھی اسکی اہمیت کا زیادہ احساس اُن ہی کی حالت دیکھ کر اور اُنکی باتیں سُنکر ہوا — اللہ تعالیٰ نے جس طرح اُن میں اس کام کا خاص جذبہ اور عشق پیدا فرما دیا تھا، اسی طرح اس کام کے بعض بہت قیمتی اصول بھی ان کو سُجھا دیئے تھے — ہم نے ان کو بزرگ اور خدا رسیدہ سمجھ کر صرف ان کی تقلید میں نہیں بلکہ اپنے غور و فکر اور تجربے سے بھی ان اصولوں کو صحیح سمجھا ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت اور آپ کے دین کی دعوت و خدمت کے اس کام میں لگیں۔

ہم مسلمانوں کو کسی نئی بات اور نئے کام کی دعوت نہیں دیتے، ہم انھیں کسی خاص جماعت یا پارٹی کی شرکت کے لئے بھی نہیں کہتے، بلکہ ہم اُن سے صرف یہ کہتے ہیں کہ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے جس دین کو اور زندگی کے جس طریقے کو ہم اور آپ عقیدہ میں سچا اور اچھا سمجھتے ہیں اور جس کا ہم اپنی زبانوں سے دعویٰ اور اقرار کرتے ہیں اسی کو ہم اپنی زندگی بنا لیں اور اصلی مسلمان بن جائیں۔ ہمارے پاس آپ کے لئے کوئی جدید پیام اور نیا پروگرام نہیں ہے۔ ہماری دعوت بس یہ ہے کہ مسلمانوں جس کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو تم زبانوں سے پڑھتے ہو اور جس کو دل سے تم حق جانتے اور مانتے ہو اُسی کو اپنی زندگی بھی بنا لو، یعنی زبانی اقرار اور دل کے عقیدے کے علاوہ عملی زندگی میں بھی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے بندے بن جاؤ، اسی کی عبادت اور بندگی کرو، ہر معاملے میں صرف اسی کا حکم مانو، تمھارے دل کی خواہشات اور نفسانی اغراض جب اُس کے کسی حکم سے ٹکرائیں تو اغراض اور خواہشات کی غلامی نہ کرو بلکہ اللہ کے حکم کی تابعداری کرو، اسی طرح جب رواج اور فیشن اللہ کے کسی حکم کے خلاف ہوں تو اُن کو پاؤں سے روندھ کر اور اللہ کا حکم مان کر اللہ کی بندگی کا ثبوت دو۔ اسی طرح سب سے زیادہ اللہ سے ڈرو، سب سے زیادہ اُسی سے محبت کرو، ہر مشکل اور مصیبت میں اُس کی طرف رجوع ہو، اور اُسی پر اعتماد اور بھروسہ کرو۔ اور اسی سے دعائیں مانگو

اسی طرح ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم جس طرح کلمہ میں زبان سے مُحمّد رّسُول اللہ کہتے ہو، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبی و رسُول ہونے پر دل سے عقیدہ رکھتے ہو اسی طرح اپنی عملی زندگی میں بھی آپ کو اپنا ہادی اور امام بنالو، یعنی ہر معاملے میں اور زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی پیروی کرو، آپ کی لائی ہوئی شریعت پر چلو، آپ نے جو فرائض بتلائے ہیں اُن کو ادا کرو، جن بُری باتوں سے منع فرمایا ہے اُن سے پرہیز کرو۔

اسی طرح ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم قیامت کو جس طرح زبان سے برحق مانتے ہو اور مرنے کے بعد کے حساب کتاب اور جزا سزا پر جس طرح تم دل سے عقیدہ رکھتے ہو اسی طرح اپنی زندگی بھی اس زبانی اقرار اور عقیدے کے مطابق بنالو یعنی تمہاری زندگی قیامت کی فکر والی زندگی ہو، جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکے کہ واقع میں تم مرنے کے بعد کے حساب کتاب پر یقین رکھتے ہو، اور آخرت میں اللہ کے سامنے پیش ہونے کو ایک یقینی واقعہ سمجھتے ہو۔

حضرات!

بس یہی ہماری دعوت اور یہی ہمارا پیام ہے، ہم آپ سے صرف یہی کہتے ہیں: کہ

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا — اے ایمان والو! سچے اور پورے مومن بن جاؤ

ہم اپنی اس دعوت کے ذریعہ مسلمانوں میں جو تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں برسہا برس کے تجربے کے بعد ہمیں اس کا پورا یقین ہے کہ اس وقت جبکہ امت کا سوادِ اعظم دین سے اس قدر دور ہو چکا ہے اس کی زندگی میں اتنی بڑی اور اتنی گہری تبدیلی صرف ہماری تقریروں سے نہیں ہو سکتی —— اس کے لئے ہمارے سامنے ایک عملی پروگرام ہے جس کے دو خاص جز ہیں ایک ہفتہ وار مقامی شبینہ اجتماع —— دوسرے دعوتی اور تربیتی قافلوں کی نقل و حرکت —— یہ دونوں چیزیں کچھ ایسی ہیں کہ جن حضرات نے ہمارے اِن دو کاموں میں کبھی شرکت نہیں کی ہے ہم انھیں صرف تقریر سے ان کی پوری حقیقت اور ان کی افادیت سمجھا نہیں سکتے اس لئے ایسے سب حضرات سے اسلامی اخوت کے حق کی بنا پر یہ استدعا ہے کہ وہ کم از کم واقفیت اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے ہی ہمارے

ہفتہ وار اجتماع میں دو چار دفعہ شرکت کریں، رات وہیں گذاریں، اور اسی طرح اس سلسلہ کی کسی دعوتی اور تربیتی جماعت کے ساتھ ہفتہ عشرہ کا یا کم از کم ۳-۴ ہی دن کا کوئی سفر کریں — اس عملی تجربے کے بعد ہی وہ یہ سمجھ سکیں گے کہ ہم شہروں اور بستیوں میں جو مستقل ہفتہ وار اجتماعات قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی زندگی حاصل کرنے کے لئے اور دوسروں میں اس کی دعوت کو پہونچانے کے لئے قافلوں اور جماعتوں کی نقل و حرکت کی جو دعوت دیتے ہیں اس سے ہمارا کیا مطلب ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحیح فکر و بصیرت عطا فرمائی ہے تو اس تجربے کے بعد آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ اس پروگرام کے ذریعہ مسلمانوں میں اسلامی زندگی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

طریقۂ کار اور پروگرام کے سلسلہ میں میں اس دعوت کے دو اصولوں کا اور ذکر کرنا چاہتا ہوں — ایک یہ کہ مسلمانوں کے تمام طبقوں کے سامنے ہم یہ دعوت اس بنیاد پر پیش کرتے ہیں کہ الحمد اللہ اُن میں ایمان موجود ہے، اور جو خرابی آئی ہے وہ صرف بُرے ماحول کے اثر سے اور غفلت کی وجہ سے آئی ہے، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس دعوت کے سلسلہ میں کسی مسلمان کے ساتھ ہمارا رویہ تحقیر اور تذلیل کا نہ ہو بلکہ اکرام اور شفقت کا ہو۔ اس زمانہ میں جو شخص بھی ایمانداری سے اپنا جائزہ لے گا وہ محسوس کرے گا کہ شاید میں ہی سب سے بدتر اور سب سے بڑا مجرم اور خطاوار ہوں۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم اسلامی زندگی کی سب جزئیات اور شریعت کی ساری تفصیلات کو عام مسلمانوں کے سامنے رکھ کر ان سب کا مطالبہ ان سے نہیں کرتے، بلکہ ہم عام دعوت دین کی صرف اُن بنیادی چیزوں کی دیتے ہیں جن کے متعلق ہم نے یہ سمجھا ہے کہ اُن کے پیدا ہو جانے سے پورے دین پر چلنے کی استعداد آدمی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا مطلب اور اس کی حقیقت کو سمجھیں، اور اس کی عظمت اور اہمیت کو محسوس کریں، اور دھیان فکر کے ساتھ کثرت سے اس کو پڑھ پڑھ کے اپنے ایمانوں کو تازہ کیا کریں[1] — یہ کلمہ صرف ایک قول نہیں ہے بلکہ ایک بڑا بھاری فیصلہ اور معاہدہ ہے اور انسان کی

[1] حدیث میں ہے حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم "لا إله إلا الله" کی کثرت کر کے اپنے ایمانوں کو تازہ کرتے رہا کرو۔ مختصراً۔۱۲

پوری زندگی سے اس کا تعلق ہے۔

کلمہ کے بعد دوسری چیز جس کی ہم خصوصیت کے ساتھ دعوت دیتے ہیں وہ نماز ہے۔ دین میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ نماز کی ایک خصوصیت قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ صحیح طریقے سے پڑھی جائے تو اُس کا اثر آدمی کی پوری ظاہری اور باطنی زندگی پر پڑتا ہے ــــ جو مسلمان نماز سے غافل اور اس کے تارک ہیں ہم اُن سے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اور پابندی سے نماز ادا کرنے کا فیصلہ کریں، جو پڑھتے ہیں لیکن صحیح اور زیادہ اچھی نماز پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے ہم اُن سے کہتے ہیں کہ وہ صحیح یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بتلائے طریقے کے مطابق اور خشوع خضوع کی کیفیت کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کریں اور اس کی عادت ڈالیں۔ انسان کے اعمال میں اللہ سے سب سے زیادہ قریب کرنے والی نماز ہے، اور مسلمان کو اللہ کی رحمت سے سب سے زیادہ دور کرنے والی چیز، نماز نہ پڑھنا ہے۔ یہاں تک کہ حدیث میں اس کو "کفر" کہا گیا ہے۔

تیسری چیز جس کی ہم عام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں یہ ہے کہ وہ دین حاصل کرنے اور اُس کے سیکھنے کی فکر اپنے اندر پیدا کریں۔ دین کوئی نسلی اور موروثی چیز نہیں ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہو کر آدمی خود بخود مسلمان ہو۔ بلکہ دین تو زندگی کے اُس طریقہ کا نام ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے تھے، اور وہ حاصل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، لہذا بقدرِ ضرورت دین سیکھنا اور اُس پر چلنے کا فیصلہ کرنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے ــــ بہرحال کلمہ اور نماز کے بعد اسلام کی جس تیسری تعلیم کی طرف ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان دین کا ضروری علم حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا لازمی جز بنائیں، اور جس طرح ہر شخص کھانا پہننا ضروری جانتا ہے اسی طرح ہر مسلمان اپنے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے دین کا سیکھنا ضروری سمجھے، خواہ اس کے لئے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔

چوتھی چیز جس کی ہم ہر مسلمان کو دعوت دیتے ہیں یہ ہے کہ دین کی ان تینوں بنیادی چیزوں کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش میں ہر شخص حصہ لے۔ ہر ایک دوسروں کو انکی دعوت دے، اور دینی زندگی کی ان بنیادوں کو مسلمانوں میں عام کرنے کے لئے اخلاص کیساتھ

اور مرنے کے بعد والی زندگی میں ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے جد وجہد کرے، اور اس سلسلہ کے اجتماعات میں اور اس کی دعوت دینے والے قافلوں کے ساتھ ضرور اپنا کچھ وقت گذارا کرے تاکہ دین سے اور اس کی دعوت سے اس کا تعلق بڑھے، اور ان دینی صحبتوں سے دینی اثرات اور دینی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔

بس یہی چند بنیادی باتیں ہیں جن کی ہم عام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں؛ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی چار باتیں اگر مسلمانوں میں عام طور سے پیدا ہو جائیں تو پوری اسلامی زندگی کی نہ صرف یہ کہ اُن میں استعداد پیدا ہو جائے گی بلکہ ہمیں یقین ہے کہ ان کی زندگی پوری پوری اسلامی ہو جائے گی، یعنی ہر شعبے کے فرائض وہ ادا کرنے لگیں گے اور ہر قسم کے فواحش اور منکرات سے وہ بچنے لگیں گے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ ابتک جو کچھ میں نے عرض کیا اُس سے آپ نے ہماری دعوت کو اور اس کے سلسلہ میں ہمارے پروگرام اور طریقۂ کار کو بڑی حد تک سمجھ لیا ہوگا ——
اب میں یہ اور بتلانا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری اس دعوت کو عام مسلمانوں نے قبول کر لیا تو اُن کے حق میں اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

اس بارے میں آپ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اصل اہمیت آخرت کی ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے، دنیوی زندگی تو ہر شخص کی چند روزہ ہے اصل اہمیت اُس اُخروی زندگی کی ہے جو شروع ہو کر کبھی ختم نہ ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ　　اے اللہ: زندگی تو بس آخرت ہی کی زندگی ہے

پس ہمارا یہ کام چونکہ انبیاء (علیہم السلام) ہی کے سلسلہ کا کام ہے اور گویا یہ دعوت ان ہی کی دعوت ہے، اس لئے ہم صاف کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نتیجہ تو آخرت ہی میں نکلے گا، انشاء اللہ اس دعوت کے ماننے والوں کو اور اس راہ میں جد وجہد کرنے والوں کو وہ جنت ملے گی جسکی ایک ایک نعمت پر یہ ساری دنیا قربان۔ اور انشاء اللہ جنت سے بھی بڑی چیز اور بہت

بڑی چیز اللہ کی رضامندی حاصل ہوگی۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ

اللہ کی نازل کی ہوئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی مقدس کتاب (قرآن مجید) ان وعدوں اور بشارتوں سے بھری ہوئی ہے —— لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ سب کچھ انشاء اللہ آخرت میں اور مرنے کے بعد والی زندگی میں ملے گا اور یقیناً ملے گا۔

لیکن آخرت سے پہلے اس دنیا کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو قوم اللہ کے پسند کئے ہوئے اور اس کے رسول کے بتلائے ہوئے طریقۂ زندگی کو اختیار کرے گی اور دنیا میں اُس کے رواج اور فروغ کے لئے کوشش کرے گی اور اس راہ میں محنتیں اور مشقتیں برداشت کرے گی اللہ تعالیٰ اس کو اپنی خاص رحمت سے نوازے گا، اس کو اچھی عزت اور اطمینان والی زندگی دے گا، اور مشکلات اور مصائب میں اپنے خاص غیبی ذرائع سے اُس کی مدد فرمائے گا —— یہ وعدہ بھی قرآن مجید میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے[1]۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن مصیبتوں اور مشکلوں میں مبتلا ہیں اور ان پر خوف وہراس اور مایوسی و بے اطمینانی کی جو کیفیت چھائی ہوئی ہے جس نے ان کی زندگی موت سے بدتر بنا رکھی ہے، اس سے نجات حاصل کرنے کی ایک اصولی اور یقینی تدبیر یہ بھی ہے بلکہ یہی ہے کہ مسلمان اپنا موجودہ غیر اسلامی طرزِ زندگی چھوڑ کر اللہ کی رضامندی والا طریقۂ زندگی پھر سے اختیار کرلیں، اور اللہ کی رحمت اور رضا کے مستحق ہوجائیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے کا ذمہ دار اور ضامن ہے۔

کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ حق ہے۔

بہرحال ہماری موجودہ دنیوی مشکلات کا حل بھی یہی ہے کہ ہم سچے مومن بن جائیں یعنی ایمان ہمارا قول ہو، ایمان ہمارا عقیدہ ہو، اور ایمان ہماری زندگی ہو۔

جن حضرات کی سمجھ میں یہ بات اس طرح نہ آسکتی ہو وہ اس کو دوسرے طور پر یوں

[1] اس مضمون کی تفصیل مدیر الفرقان کے رسالہ "مسلمانانِ عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب اور قرآنی طریقۂ علاج" میں دیکھی جائے۔ ۱۲

سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں اگر وہ تبدیلی پیدا ہو جائے جس کی ہم دعوت دیتے ہیں یعنی ان کی زندگی ایمان والی زندگی ہو جائے تو اس کا ظہور اسی طرح تو ہو گا کہ مسلمان عقیدہ اور عمل کے سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں گے یعنی وہ اللہ ہی کو اپنا مالک و مولیٰ سمجھیں گے، صرف اسی کی عبادت اور بندگی کریں گے، صرف اسی کے قبضہ اور اختیار میں ہر نفع اور ہر ضرر سمجھیں گے، صرف اسی سے ڈریں گے اور اسی سے اُمید رکھیں گے، زندگی کے ہر شعبہ میں اُسکے حکموں پر چلیں گے، معاملات میں سچائی اور انصاف کو اپنا اصولِ زندگی بنائیں گے، دیانت اور امانت ان کا شیوہ ہو گا، اُن میں جو تاجر اور دُکاندار ہوں گے وہ ایمانداری کو اپنی تجارت کا اصول بنائیں گے اور کبھی کسی کو دھوکہ نہ دیں گے، چور بازاری نہ کریں گے، اسی طرح ان میں جو حاکم ہوں گے وہ ہمیشہ انصاف کریں گے اور کسی حال میں رشوت نہ لیں گے، جو سرمایہ دار ہوں گے وہ ضرورت مندوں کو بلا سود اپنا روپیہ قرض دیا کریں گے اور صدقات سے غریبوں کی مدد کیا کریں گے ـــــ اسی طرح جو ان میں مزدور ہوں گے وہ پوری محنت اور ایمانداری کیساتھ وہ کام کیا کریں گے جو اُن سے متعلق ہو گا ـــــ علیٰ ہذا جو ملازم پیشہ ہوں گے وہ بھی دیانت داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیں گے ـــــ ظاہر ہے کہ اسلامی زندگی پیدا ہو جانے کے بعد قوم کے تمام طبقوں میں اس سیرت کا پیدا ہو جانا ضروری ہو گا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سیرت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے ـــــ اب آپ خود سوچیں کہ آج کی غرض پرست دنیا میں اور مختلف طبقات میں بٹی ہوئی دنیا میں کسی امت اور کسی جماعت کی زندگی اگر ایسی ہو تو کیا دنیا اس کو عزت کا مقام دینے پر مجبور نہ ہو گی۔ ہر معمولی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر آج دنیا میں کوئی ایسی قوم اور ایسا گروہ پیدا ہو جائے تو یقیناً وہی اس تاریک دنیا میں ستاروں کی طرح چمکے گا ـــــ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں تمھارے لئے وہ پیام لایا ہوں کہ تم اس کو اگر قبول کر لو تو تمام دنیا میں تم کو عظمت اور برتری حاصل ہو جائے گی۔

(تدین لکم العرب والعجم)

میرا منھ نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے ایسی کوئی بات کہوں لیکن رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے اس ارشاد پر ہم سب مسلمانوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

حضرات!

میں نے اس صحبت میں آپ سے جو کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ میں کر چکا، اگر آپ اس دعوت کو (جو در اصل میری دعوت نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ہے اور میں اس کا صرف منادی اور پیش کرنے والا ہوں) قبول فرمائیں یعنی اصلی اسلامی زندگی کو خود اختیار کرنے اور دوسروں میں اسکو پھیلانے کی جدوجہد کا فیصلہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے بہت بڑی بشارت ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ	بشارت دو اور خوشخبری سناؤ میرے
الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ	اُن بندوں کو جن کا حال یہ ہے کہ وہ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ	غور سے بات کو سنتے ہیں، اور اچھی
اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ	بات کو قبول کرتے اور اسکی پیروی
اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے

ہدایت دی ہے، اور یہی عقل والے ہیں

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(مولنا سید مناظر احسن گیلانی)

(۵)

اسباب کی راہ سے جب تک چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان کا مقابلہ اسباب کی راہ سے ممکن ہے، جو صرف اسباب ہی اسباب کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لامحدود اسباب کی راہ سے سر نکالنے والے حوادث جو اس دنیا میں پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کی انتہا کسی مسبّب واحد پر نہیں ہوتی۔ یعنی کثرتوں سے بھری ہوئی اس دنیا کا شیرازہ بند، خالق حیّ وقیوم کا ارادہ قاہرہ نہیں ہے بلکہ اسباب وعلل میں بنٹی اور بکھری ہوئی یہ دنیا ان کے نزدیک واقع میں بھی بنٹی اور بکھری ہی ہوئی ہے، ان بے چاروں کا تو سارا دارومدار ہی اسباب ہی کے الٹ پھیر پر ہے، اس سبب سے نہیں تو اس سبب سے۔ اس راہ سے نہیں تو اس راہ سے، مقاصد واغراض کو تلاش کرنا، اسی پاپڑ کو بیلتے ہوئے کامیابی پر کبھی خوش ہونا۔ ناکامی میں جھنجھلانا، اسی چکر میں اپنی زندگی وہ ختم کرتے ہیں، اپنے آپ کو وہ ایک ایسے بیابان میں پاتے ہیں جس میں درندے چھوٹے ہوئے ہیں، ان کو کچھ نہیں معلوم کہ درندہ ان کو شکار کرلے گا یا وہ درندوں کو شکار کرلیں گے، گویا باگ ڈور توڑ کر جیسے گھوڑا چھوٹ گیا ہو اور بگٹٹ بھاگا جاتا ہو، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس سے ٹکرّ لے گا۔ اور کس کی کھوپڑی اس کے ٹاپوں سے چکنا چور ہو جائے گی۔ اسی قسم کی ذہنیت میں وہ مبتلا رہتے ہیں، عالم کثرت کے متعلق انتشار وپراگندگی کا جو فلسفہ ان کے دل ودماغ پر مسلط رہتا ہے، اس کا یہ لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ تاہم ایک سبب سے ناکامی کا تجربہ ان کے اندر دوسرے سبب کی آزمائش کا خیال مسلسل چونکہ پیدا کرتا رہتا ہے، یہی رحمت کا ایک پہلو ہے

جس سے اپنے منکروں کو بھی ارحم الراحمین نے محروم نہیں فرمایا ہے۔
اسی طرح جو عالم کی ساری کثرتوں کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ قادرِ مطلق کی آخری مشیت اور ناقابلِ شکست لاہوتی ارادے کے ساتھ ان کا نظم وابستہ ہے۔
اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک شریک نہیں ہوسکتی جب تک اس کی شرکت کا ارادہ کرکے پیدا کرنے والا اسے پیدا نہ کرے۔
الغرض گوناگوں کثرتوں میں الجھی ہوئی یہ دنیا الجھی ہوئی نہیں بلکہ سب سے بڑی سلجھانے والی قوت کے ساتھ بندھی چلی آرہی ہے اور بندھی چلی جارہی ہے، بحمداللہ وہ اس قسم کی ذہنی پراگندگیوں میں تو مبتلا نہیں رہتے، مگر جب تک خالق کا "واحد ارادہ" ان ہی گوناگوں اسباب وعلل کے قالب میں چیزوں کو پیدا کرتا رہتا ہے اس وقت تک ان کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ خدائی نعمتوں کو اسباب کے ان ہی مختلف سانچوں اور قالبوں میں ڈھونڈھتے رہیں، ایک قالب میں نہ ملے تو دوسرے قالب کی طرف توجہ کریں۔ حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا مشہور قول

نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ — ہم خدا کی تقدیر سے خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں

اس کا یہی مطلب ہے۔ مرض بھی خدا ہی کی تقدیر سے پیدا ہوتا ہے، اور مرض کے ازالہ کی خاصیت دواؤں میں جو پائی جاتی ہے یہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے۔
بہرحال مومن ہو یا غیر مومن جب تک "مسبّب" براہ راست سامنے نہ آجائے، اسباب کے تجربے کی راہیں دونوں پر کھلی رہتی ہیں۔ لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب "باس شدید" کا ظہور "من لدنی" رنگ میں آدم کی اولاد کے سامنے ہونے لگے، کہ اسباب کے ترکش کے سارے تیر اس وقت بے کار ہوجائیں گے، جن کے نزدیک عالم کا اسبابی نظام کسی "واحد مسبّب" کے ارادے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ ان کے تجربوں کا سلسلہ تو شاید اس وقت بھی باقی ہی رہے گا۔ لیکن ان کے یہی تجربات ہی بتاتے چلے جائیں گے، کہ ؎

جتنا پھڑکو جال کے اندر
جال گھسے گا کھال کے اندر

یہ "من لدنی" عذاب کا دور ہو گا، اس وقت العیاذ باللہ "اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ" کے اعلان کے ساتھ وہ سامنے آجائے گا۔ یہ پھسپھسے عنکبوتی تاروں سے بھی زیادہ کمزور اسباب. اب کیا کام دیں گے۔

مگر اسباب وعلل میں جکڑی ہوئی اس دنیا میں جن کی نظر "مسبّب" کی طرف سے نہیں ہٹی ہے۔ کیا "مسبّب" کے سامنے آجانے کے بعد وہ بھی اسی طرح بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے، جیسے بغیر "مسبّب" والے اسباب میں اُلجھے ہوئے لوگ اپنے آپ کو بے سہارا پائیں گے؟۔

"من لدنی باس شدید" کی دھمکی کے بعد اسی سوال کا جواب

ویبشر المومنین الذین	اور بشارت دیتا ہے ان ماننے والوں کو
یعملون الصالحات۔	جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں۔

دیا گیا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ براہ راست "مسبّب" کا سامنے آجانا، اس میں ان کیلئے کیا دہشت ہے جو شروع ہی سے ۔

ہر لحظہ بہ شکل دگر آں یار بر آمد

کے یقین پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہیں، اسباب کی راہ سے جب چیزیں پیدا ہو رہی تھیں تو ان کو بھی وہی پیدا کر رہا تھا اور آج اگر وہ اسباب کے حجاب کو اٹھا کر سامنے آگیا ہو، تو جو کچھ بھی پیدا ہو گا اسی کے ارادے اسی کے حکم، اسی کے اذن سے پیدا ہو گا۔ یہ "المومنین" کا گروہ ہو گا۔

انھوں نے اس کو پہچانا اور مانا جسے خالق تعالیٰ نے اپنی مرضی سے آگاہ فرمایا تھا، اور حکم دیا تھا کہ اسی "مرضی" کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ ان لوگوں سے کیا جائے جو ہماری پیدا کی ہوئی دنیا میں رہتے ہیں اور خود وہ بھی ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں،

اسی کا نام "ایمان" ہے، اور خالق کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام "عمل صالح" ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "بے ایمانی" صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ خدا کا انکار کیا جائے۔ بلکہ "خدا" کو مان کر خدا کی مرضی کی تلاش کو غیر ضروری ٹھہرانا، یا خدا کی بخشی ہوئی آگاہی سے باغی ہو کر خود اپنے تراشیدہ و بافیدہ خیالات و وساوس کے متعلق یہ سمجھنا کہ یہی "خدا کی مرضی" ہے۔ اور اپنی ان ہی من مانی باتوں کی پیروی کے متعلق سمجھنا کہ ہم خدا کی مرضی کی پیروی کر رہے ہیں، "بے ایمانی" کے دائرے میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔

پس تباہی اور بربادی اگر ہے تو صرف اُن ہی کے لئے جنھوں نے "ایمان" کی راہ کو چھوڑ کر "بے ایمانی" کا راستہ پکڑا، اپنے آپ کو مسبّب کی مرضی کے مطابق بنانے کا جو موقع ان کو دیا گیا تھا، اس قیمتی موقع کو کھو دیا۔

پس اسباب کا پردہ ہٹا کر جب براہِ راست مسبّب ہی سامنے آجائے تو اس وقت اس کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ہر خواہش اور ہر احساس کے مخالف پائیں گے۔ اور وہی "باس شدید" کے رنگ میں ان کے ظاہر و باطن کو محیط ہو جائے اور اسی کی آگ ان کے اندر اور باہر کو پکڑ لے، تو جو کچھ انھوں نے کیا تھا، خود سوچنا چاہئے کہ اس کا انجام بجز اس کے اور کیا ہوتا۔

بہر حال ان لوگوں کو جو "مسبّب" کی مرضی سے آگاہ کرنے والے کو مان کر اسی کی مرضی کے مطابق جینے اور مرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، قرآن نے اس "من لدنی" عذاب اور اس کے نتائج کی طرف سے قطعی طور پر نڈر اور بے خوف بنا کر یہ بشارت دی ہے کہ اب تو "اسباب" کا قصّہ ختم ہو گیا۔ تم اب کیوں ڈرو، بلکہ خوش ہو جاؤ کہ تمھاری سعی و عمل جس کا رُخ "مسبّب" ہی کی طرف تھا، اب اس کی قیمت تمھارے سامنے آئے گی، اسباب فانی تھے، اس لئے ان کے نتائج بھی فانی تھے، لیکن انسانی توانائیوں کے وہ نتائج جو غیر فانی طاقت کی مطابقت کی راہ سے پیدا ہوتے رہے، چاہئے کہ وہ بھی غیر فانی ہوں،

اسی کی اطلاع

إِنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا۔ — بلاشک وشبہ اُن کیلئے اجرِ حسن ہے، مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

کے الفاظ میں دی گئی ہے، یعنی حق تعالیٰ یا مسبب الاسباب کی مرضی کے مطابق جینے کی کوشش جس اجر اور معاوضہ کو پیدا کرے گی، یہ ایسی چیزیں ہونگی جو فطرتِ انسانی اور اس کے احساسات کے مطابق ہوں گی، اور اپنی اپنی کوششوں کے اس معاوضے سے کوشش کرنے والے اس طرح مستفید ہوتے رہیں گے کہ استفادہ کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ بلکہ "اجر" کے ساتھ "حسن" کی صفت کا اضافہ جو کیا گیا ہے، یہ اضافہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ مادّہ اس لفظ کا "حُسن" ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کا علم حاصل کرکے جو اس پر اور اس کے نتائج پر غیر متزلزل اعتماد اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا، اور خدا کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عزم راسخ کرکے مرجانے کا قطعی فیصلہ کرچکا ہے، وہ ایمان اور عمل صالح والی اس زندگی کے نتیجہ کو ایسی شکل میں اپنے سامنے پائے گا جس کا سب سے بڑا نمایاں امتیاز حُسن وجمال ہوگا، اور فطرتِ انسانی کا سچ پوچھئے تو سب سے بڑا مطالبہ یہی "حسن وجمال" ہے۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار، بہتے ہوئے پانی، ہرے بھرے باغ، کھلے ہوئے پھول، گدرائے ہوئے پھل، الغرض نباتی، حیوانی، انسانی، یا اس کے سوا سارے کونی طبقات میں آدمی کی فطرت حُسن ہی کو تلاش کرتی ہے، جمال ہی کی جستجو اس کی سرشت کا سب سے بڑا امتیازی سرمایہ ہے، جو نہ گدھوں میں پایا جاتا ہے اور نہ گھوڑوں میں، آخر بھینسوں کو بین باجے پر سر دھنتے کس نے پایا ہے، کس بکرے کو دیکھا گیا ہے کہ کسی "پیکر جمیل" کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا ہو، لب جو سبزہ زاروں کے کنارے پہونچ کر اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہو۔ اجر کے ساتھ "حسن" کے لفظ نے میرے ذہن کو تو ان ہی "جمالی مظاہر" کی طرف منتقل کردیا،

جن کی قرآنی تعبیر " الجنۃ " سے کی گئی ہے۔

قرآن کی وہی " الجنۃ " جس میں فطرتِ انسانی کے سارے مطالبات کی تکمیل کی پوری پوری ضمانت لی گئی ہے، مگر کیا کیجئے کہ " دجالیت " کے اس عہد میں قرآن کی اس " انسانی جنت " کے متعلق پھیلا دیا گیا ہے کہ حیوانی مطالبات کی تشفی کے سوا دہ اور کچھ نہیں ہے، یہ عیسائیوں نے پھیلایا ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ جو آدمی بن کر پیدا ہوا ہے ایمان و عمل صالح کی زندگی اسی آدمی کو سارے انسانی احساسات سے معرّا کر کے فرشتہ بنا دیتی ہے۔

لیکن قرآن نے " انسان " کے سامنے اسی معاوضہ اور اجر کو رکھا ہے، جو انسانی فطرت کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔

(باقی آئندہ)

تصوّف و سلوک

(از۔ جناب مولنا عبد الباری صاحب ندوی سابق پروفیسر فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی)

یہ واقعہ ہے کہ تصوف کے موضوع پر زمانۂ حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق ایسی جامع اور محققانہ کتاب اُردو ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ہمارے علم میں نہیں ہے ــــ عہدِ حاضر کے تصوف کے مخالفین اور موافقین دونوں گروہوں کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں کی اصلاح کی اس میں خاص کوشش کی گئی ہے، اور تصوف کی اصل حقیقت کو ہر طرح کے گرد و غبار سے صاف کر کے پیش کیا گیا ہے ــــ دراصل اس کے مضامین حکیم الامت حضرت مولنا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے ہیں، اور ترتیب و تعبیر مولنا عبد الباری صاحب کی ہے ــــ شروع میں ہندوستان کے مشہور صاحبِ علم و قلم جناب مولنا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کا مقدمہ ہے۔

(ضخامت ۵۰۰ صفحات) کاغذ سفید چکنا ولایتی

(جلد خوشنما) ــــ (قیمت :- صؔر)

خواجہ محمد معصوم (رحمۃ اللہ علیہ) کے "چند مختصر خطوط"

(مولٰنا سید احمد قادری)

ان خطوط میں پہلا خط خصوصیت کے ساتھ اس لائق ہے کہ بار بار اسے پڑھا جائے اور ذہن نشیں کیا جائے۔ خواب، کشف، بشارت، یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ انکی حقیقت اور صحیح حیثیت نہ جاننے کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ علم تصوف کو متأثر کیا ہے بلکہ صوفیائے کرام کے بہتیرے افعال و اعمال کیلئے یہ چیزیں سند اور حجت بن کر رہ گئی ہیں۔

تمام علمائے امت اور اہل علم و اہل حق صوفیہ و مشائخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ غیر نبی کے خواب، کشف اور بشارت سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوسکتا، لیکن حیرت ہے، کہ اس متفقہ فیصلے کے باوجود خوابوں، کشفوں اور بشارتوں کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اور آج بھی ہزاروں افراد ایسے موجود ہیں جو کسی ولی و بزرگ کے خواب، کشف اور بشارت کو شرعی حجت سے کم درجہ نہیں دیتے، خواجہ محمد معصوم (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان کی حقیقت بتا کر یہ بھی واضح کردیا ہے کہ سیر و سلوک کا اصل مقصد کیا ہے۔ اب خطوط کے ترجمے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

میرے مخدوم! کشف، خواب، بشارتیں، صحیح بھی ہوتی ہیں غلط بھی، اور چونکہ صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ دشوار ہے، اس لئے ان پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔

کمال ان چیزوں کے ساتھ متعلق و مربوط نہیں ہے۔ لائقِ اعتماد اور نجات دہندہ صرف کتاب وسنّت ہے، اس لئے اپنی ساری ہمّت اس چیز پر صرف کرنی چاہئے کہ مقتضائے کتاب وسنّت کے مطابق عمل میسر ہو۔ ذکر، مامورات شرعیہ میں داخل ہے اس لئے دوام ذکر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اپنے تمام اوقات اس میں مستغرق رکھیں۔ اللہ والوں کے یہاں، کمال، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس میں فنا ہو جانا ہے۔ فنا سے مقصود یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی گرفتاری سے، عام ازیں کہ وہ آفاقی ہو یا انفسی، چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ایمان میں جلا پیدا کی جائے، کامل طور پر احکام شرعیہ کی اطاعت کیجائے، امتثال اوامر اور اجتناب نواہی میں سہولت میسر ہو، حصول اخلاص کیلئے عُجب و ریا کو دفع کر دیا جائے، نفس امارہ کو، جو بالذات احکام الٰہی کا دشمن ہے، مطمئن کر لیا جائے، اور اسلام حقیقی کا درجہ حاصل ہو۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیر وسلوک اور فنا و بقا کا اصل مقصود تحصیل بندگی ہے تاکہ احکام و لوازم احکام کو بقدر امکان اس طرح ادا کیا جائے جس طرح ادا کرنا چاہئے۔ سیر وسلوک اور فنا و بقا کا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ بندہ حلقۂ بندگی سے سر باہر نکال کر دعوائے خواجگی و مختاری کرنے لگے، اور نہ یہ مقصد ہے کہ غیبی صور و انوار کا مشاہدہ ہو۔ محسوس صور و انوار ہی کیا کم ہیں کہ کوئی اسے چھوڑ کر غیبی صور و انوار کی ہوس کرے۔ آخر دونوں ہی مخلوق ہیں اور داغ حدوث سے داغدار، رویت و مشاہدۂ حق کا تعلق آخرت سے ہے، جیسا کہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا اس پر اجماع ہے۔

دنیاوی زندگی میں جو کچھ ہمارے لئے ضروری ہے وہ حصول ایقان ہے، لہٰذا، دنیا میں صوفیۂ عظام کے طریقے کا نتیجہ احکام شرعیہ کا اکمال اور انکی تعمیل ہے۔ مشاہدہ و قرب وہ نتیجہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے، آپ کو چاہئے کہ کمر ہمّت احکام شرعیہ کی تعمیل کے لئے چست باندھئے، اور

امر معروف و نہی منکر کو اپنا شیوہ بنائیے، نیز متروک سنتوں کے احیاء کو بھی اہم امور میں شمار کیجئے، خواب اور واقعے پر اعتماد نہ کیجئے، اگر کوئی شخص خواب میں بادشاہ اور قطب وقت ہو جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے، بلند ہمت لوگ اس قسم کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ والسلام

(مکتوب نمبر ۱۷۷)

(۲)

جہنم سے نجات، جنت میں داخلہ، اللہ کی رضا، یہ ساری چیزیں پیروئ رسول کے ساتھ مشروط ہیں، جوانانِ سعادت مند اور طالبانِ ہوشمند پر لازم ہے کہ ظاہراً و باطناً اتباع نبوی میں کوشاں ہوں، اور جو کچھ اس کے منافی ہو اس سے اپنی آنکھیں بند کرلیں، یقین رکھیں کہ اگر کسی شخص کے پاس ہزاروں ہزار فضائل و خوارق ہوں لیکن وہ اتباع سنت میں سست و بے پرواہ ہو تو اس کی صحبت و محبت سم قاتل ہے، اور اگر کسی شخص کے پاس ان فضائل و خوارق میں سے کچھ نہ ہو لیکن اتباع سنت پر اس کا قدم جما ہوا ہو تو اس کی صحبت و محبت تریاق کا حکم رکھتی ہے۔

(مکتوب نمبر ۱)

(۳)

قرب قیامت کا وقت ہے، دنیا تاریکیوں کے بھنور میں غوطے کھا رہی ہے، ایک ایسے جواں مرد کی ضرورت ہے جو اس زمانے میں سنت کو زندہ اور بدعت کو ختم کرے۔ انوار سنن نبوی کے بغیر راہ پانا محال، اور اطوار نبوت کے التزام کے بغیر نجات ڈھونڈھنا محض خیال ہے۔ اتباع سنت کے بغیر نہ تو طریق صوفیہ میں سلوک ہی درست ہے اور نہ محبت ذاتی تک وصول ہی ممکن ہے، آیۂ کریمہ "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" اس پر

شاہد عدل ہے۔ بنا بریں اپنی سعادت اس میں سمجھے کہ عادات، عبادات، معاملات، ہر شے میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مناسبت حاصل ہو، کمالات صوری و معنوی حضورؐ ہی کی محبت سے متعلق و مربوط ہیں، ہر عمل اسوۂ نبوی کی ترازو پر تل کر ہی باوزن ہوتا ہے۔

(مکتوب نمبر ۲۲)

(۴)

چونکہ اب آخری زمانہ ہے، دین کمزور ہو گیا ہے، سنّت متروک اور بدعت رائج ہو گئی ہے اس لئے علوم شرعیہ کی تحصیل اور نشر و اشاعت اس عہدِ تاریک کا اہم ترین کام اور سنّت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا احیاء عظیم ترین مقصد ہے۔ کمر ہمّت علوم شرعیہ کی تحصیل و نشر اور سنّت محمدی کے احیاء کے لئے چست باندھو۔ دوسری بات یہ ہے کہ احوال و مواجید کی کچھ فکر نہ کرو کیونکہ اس کا کمال آخرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یاد رکھو وہ امور جن سے وقت کے صوفی خوش ہیں یا تو سراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً کے مصداق ہیں یا ان کی تسلّی کے لئے ہزار میں سے ایک ظاہر کئے گئے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:۔

"احوال و مواجید وہ خیالات ہیں جن سے اطفال طریقت
کی تربیت کی جاتی ہے۔"

یہ دنیا عمل کا گھر ہے، مردانہ وار ادائے اطاعات میں مشغول رہو۔

(مکتوب نمبر ۱۷۸)

(۵)

اس وقت عہد نبوت سے دوری اور قربِ قیامت کی وجہ سے بدعت عام ہو گئی ہے اور اس کی تاریکیاں دنیا پر چھا گئی ہیں، سنّت اجنبی بن گئی ہے اور اس کا نور مستور ہو گیا ہے۔ بنا بریں سنن متروکہ کے احیاء اور

علوم شرعیہ کی تحصیل کے لئے کمر ہمت چست باندھئے اور اسے اللہ تعالیٰ کے کمال رضامندی کا وسیلہ بنائیے، نیز بارگاہ محمدی کا قرب بھی اسی کام میں ڈھونڈھئے۔ ایک حدیث کا مضمون ہے، کہ

"جس نے میری کسی متروک العمل سنت کو زندہ کیا اُس کو سَو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔"

احیاء کا اوّل مرتبہ یہ ہے کہ خود اس پر عمل کیا جائے، اور اس کا کمال یہ ہو کہ اس کی نشر و اشاعت کی جائے، اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے۔

(مکتوب نمبر ۲۲۸)

سلسلۂ "تجدید دین" کی سب سے اہم اور سب سے بڑی کتاب

"جامع المجدّدین"

(از - جناب مولٰنا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی)

مولٰنا موصوف نے دین کے مختلف شعبوں میں حکیم الامت حضرت مولٰنا تھانوی قدس سرہٗ کی تجدیدات اور امت کی علمی و عملی غلطیوں کی اصلاحات پر جو چند اہم کتابیں برسہا برس کی محنت سے لکھی ہیں (جن میں سے ایک "تصوّف و سلوک" پہلے شائع ہو چکی ہے) یہ کتاب (جامع المجدّدین) اس سلسلہ کی سب سے اہم سب سے بڑی اور ترتیب کے لحاظ سے پہلے نمبر کی تصنیف ہے، جو اسی ہفتہ چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ خاص اسوقت اس کتاب کی تیاری اور اشاعت گویا ایک لطیفۂ غیبی ہے۔

اسکے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح و صلاح کا مدار تمامتر پورا پورا مسلمان بننے پر ہے اور یہ پورا پورا مسلمان بننا کسی ایسی چیز پر قطعاً موقوف نہیں جو کسی فرد کی بھی انفرادی استطاعت و وسعت کے باہر ہو اس میں ہماری زندگی کے تمام شعبوں کی کوتاہیوں اور بیماریوں کا جائزہ لیکر علاج کی ایسی سہل اور کارگر تدابیر بتلائی گئی ہیں جو بالکل اپنے اختیار میں ہیں۔ (ضخامت قریباً ۶۰۰ صفحات) (قیمت: عـــہ/) مجلد مع خوبصورت گرد پوش

(حضرتِ عروج قادری)

کچھ اور تو نہیں تسکین سی مَیں پا لیتا
تمھیں جو اپنی کہانی کبھی سنا لیتا

مجھے نہ جلوۂ کثرت فریب دے جاتا
اگر تصورِ وحدت، رچا بسا لیتا

میں انتشارِ خیالات میں نہ مبتلا ہوتا
دل و دماغ پہ پہرے اگر بٹھا لیتا

عمل میں ضبط بھی آتا، خلوص بھی ہوتا
تری رضا کو میں محور اگر بنا لیتا

کرم وسیع ہے، دُھلتے گُناہ کے دھبّے
کبھی تو اشکِ ندامت اگر بہا لیتا

بہ چشمِ نم، جو ادھر تو قدم بڑھا دیتا
تجھے وہ دامنِ رحمت میں خود چھپا لیتا

فرار تو جو نہ ہوتا خود اپنے آقا سے
تجھے وہ قیدِ غم و حزن سے چھڑا لیتا

یہ غفلتیں تجھے برباد کر نہ دیں غافل
یہی تو وقت ہے دنیا میں کچھ کما لیتا

عروج کتنی مسرت کی بات یہ ہوتی!
تو اپنے آپ کو اب بھی اگر بچا لیتا

معاشرہ کی اصلاح

(عتیق الرحمان سنبھلی)

جس طرح کسی انسان کے جسم پر پھوڑے پھنسی یا کسی دوسرے ظاہری فساد کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے باطن میں مادۂ فاسد بھرا ہوا ہے اور اس سارے ظاہری فساد کی جڑ یہی ان دیکھا فساد ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ کو دیکھ کر یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ کسی اندرونی خرابی کا نتیجہ ہے اور جس طرح پہلی صورت میں علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اصل توجہ مادۂ فاسد کو جڑ سے نکال دینے اور اس کو ختم کر دینے پر کی جائے اسی طرح دوسری صورت (یعنی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ) کے علاج میں بھی یہی طریقۂ علاج صحیح اور کارگر ہے اور اسی سے سوسائٹی (معاشرہ) کی پائدار صحت مندی کی توقع کرنا صحیح ہے۔ اس اصول کو چھوڑ کر اگر علاج کیا جائے تو ممکن ہے کہ ظاہری فساد کچھ دیر کے لئے دب جائے مگر مٹ نہیں سکتا۔

پہلا طریقہ نبض شناس اطباء کا ہے اور دوسرا نبض سے بے بہرہ ظاہر بیں جراحوں کا، بیشک ایسا ہوتا ہے کہ پھوڑوں سے بھرا ہوا جسم جراح کے علاج اور اُس کی مرہم پٹی سے بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور مریض کو صحت کا سکون مل جاتا ہے، مگر اس پر یہ سمجھ لینا کہ صحت تام حاصل ہو گئی بڑی خطرے کی بات ہے اس لئے کہ اندرونی مادہ کو مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اندر ہی اندر بگڑتا اور سڑتا رہے اور پھر کسی دوسرے وقت میں پہلے سے زیادہ شدت وقوت کے ساتھ ظاہری جسم پر حملہ کرے لہٰذا اندرونی فساد کو ختم کئے بغیر ظاہری سکون پر اطمینان دانش مندی کے خلاف ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرہ کی حالت بالکل اسی انسان کی سی ہو جس کا جسم زہریلے پھوڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے معاشرہ کے پھوڑے کیا ہیں بداخلاقی، بے حیائی، ظلم، حقوق تلفی، رشوت، بددیانتی، اور اسی قسم کی سیکڑوں برائیاں۔ یہ وہ زہریلے پھوڑے ہیں جن کی وجہ سے چین وسکون سماج سے کوسوں دور ہو گیا ہے۔ صحیح اصول علاج کے ماتحت ہمیں ان امراض کے اسباب کا پتہ لگانا چاہیئے، صرف وعظ ونصیحت کے مرہم یا کسی آہنی نظام کے دباؤ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔

بعض مدعیان نبض شناسی کی تشخیص یہ ہے کہ سوسائٹی میں یہ بگاڑ عام غریبی اور طبقاتی ناہمواری سے آیا ہے اگر ہر شخص کو بقدر ضرورت دولت مل جائے تو یہ مریض معاشرہ صحت مند ہو سکتا ہے۔ جب اس تشخیص پر نگاہِ فکر پڑی تو اس کے سامنے یہ سوال آ کھڑا ہوا کہ سوسائٹی میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جن کے پاس بقدر ضرورت یا زائد از ضرورت مال ودولت موجود ہے پھر ان سے یہ امراض کیوں دور نہیں ہوئے؟ بلکہ برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دوا ان کے امراض کی شدت میں مزید اضافہ کرتی ہو۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بسا اوقات کم پیسے والا اتنا بداخلاق نہیں ہوتا جتنا زیادہ روپیہ والا۔ اگر غریب ظالم ہوتا ہے تو امیر ظلاّم۔ اگر ایک کانسٹبل دوچار روپیہ رشوت لیتا ہے تو تھانہ کا انچارج سیکڑوں کے وارے نیارے کرتا ہے۔ اگر ایک تھوڑی تنخواہ والا کلرک رشوت لیتا ہے تو سیکڑوں پانے والا آفیسر اس سے بدرجہا زیادہ گندی کمائی کرتا ہے، فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ ایک طرف برائی عریاں اور بے ڈھنگی ہوتی ہے دوسری طرف کوئی خوبصورت آڑ اور نظر فریب پردہ مہیا ہو جاتا ہے۔ برائی یہاں بھی وہی برائی ہے۔ اور وہ برائی یقیناً زیادہ بری ہے جس کی قباحت وشناعت عام طور سے محسوس نہ کی جاسکتی ہو۔

اس سوال کی روشنی میں ہمیں صاف نظر آجاتا ہے کہ افراد کو بقدر ضرورت دولت مل جانا سوسائٹی کے پھوڑوں کا علاج ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ دوا جب معاشرہ کے بعض افراد کو فائدہ نہ دے سکی تو کیسے ضمانت کی جاسکتی ہے کہ پورا معاشرہ اس سے صحت پائے گا۔

تجویز کی غلطی ہمارے نزدیک تشخیص کی خطا کی طرف اشارہ کرتی ہے، مگر بعض حکمائے وقت نے تشخیص سے اتفاق کرتے ہوئے تجویز میں کچھ ضروری اضافہ کیا ہے وہ ہے "نظام حکومت کا آہنی شکنجہ" یعنی سماج کا جسم اس طرح کس دیا جائے کہ اندرونی مواد کو پھوڑے بن کر اُبھرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن زمانۂ ماضی کے انقلابات و حوادث کی تاریخ اگر محفوظ ہے اور اُس سے عبرت و بصیرت حاصل ہوتی ہے تو ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ سارے گذشتہ نظاموں کی طرح اس نظام کے اعضاء میں بھی اضمحلال کا عمل ضرور ہوگا، اسکی گرفت یقیناً ڈھیلی ہو جائے گی، اور برسوں کے سڑے ہوئے مواد کو اُبھرنے کے بجائے اُبلنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ اور اس وقت اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اُس وقت سماج کا بگاڑ کس درجہ پر ہوگا۔ ممکن ہے موجودہ پیمانہ اس کو ناپ بھی نہ سکے —— اس آخری تجویز پر اگر عمل کر لیا جائے تو نتیجہ ثابت کرے گا کہ اشرف المخلوقات انسان اور ایک سرکش گھوڑے میں کوئی فرق نہیں، کہ جب تک چاروں طرف سے چار رسیوں میں جکڑا کھڑا ہے معقول ہے، اور جہاں بندش دور ہوئی پھر وہی شرارت اور سرکشی۔

ایک انسانی مثال لے لیجئے کہ بعض لوگوں میں چوری یا ڈکیتی کی عادت ہو جاتی ہے جو بیشک سوسائٹی کے لئے ایک ایسا ہی زہریلا پھوڑا ہے جیسے چند اوپر ذکر ہوئے۔ ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے جیل خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، مار پیٹ کی جاتی ہے، لیکن کتنے چور اور ڈاکو ہیں جو جیل خانہ سے نکلنے کے بعد اس حرکت سے باز آجاتے ہیں اور اس طریقۂ علاج سے ان کا مرض دور ہو جاتا ہے، بیشک وہ قید کی مدت میں یہ کام نہیں کر پاتے مگر باہر نکلتے ہی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں —— یہ تو تھی انسانی دماغوں کی تشخیص اور تجویز جس کی غلطی اور ناکامی ہمیں صاف نظر آرہی ہے۔ اس سے بالکل الگ ایک تشخیص اور تجویز وہ ہے جس کو ایک انسان نے وحی کی روشنی میں ساری دُنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے مختصر الفاظ یہ ہیں:-

الا وان فی الجسد لمضغۃ اذا	معلوم ہونا چاہئے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک
صلحت صلح الجسد کلہ و اذا	ایسا ٹکڑا ہے جس پر انسان کی اچھائی برائی کا مدار ہے

فسدت فسد الجسد کلہ الاوھی القلب۔ وہ جب ٹھیک ہوتا ہے تو[۴]
عقلیت اور تجدد کا مضحکہ خیز مظاہرہ ہوگا اگر اس کو صرف اس لئے رد کردیا جائے کہ یہ نظریہ ڈیڑھ ہزار برس پرانا ہے —— یہ نظریہ ہماری اس فطرت کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے جو اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ انیسویں صدی میں ملیریا کیلئے کُنین کا استعمال اس لئے نہیں ترک کیا جا سکتا کہ اس کی دریافت کسی گذشتہ صدی میں ہوئی تھی اگر ملیریا کے اسباب نہیں بدلتے تو دوا کیسے بدل دی جائے۔ صحیح طریقے پر کُنین کے استعمال سے لاتعداد مریضوں کا ملیریا سے نجات پانا تشخیص و تجویز کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تاریخ اگر کسی زمانے میں کسی جگہ سماجی امراض کے بالکلیہ ازالہ کا پتہ دیتی ہے تو وہ انسانیت کے صحیح اور کامل ارتقاء کا صرف وہی دور ہے اور وہی ملک ہے جس میں اس نسخہ کا تجربہ صحیح طریقے پر کیا گیا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ تاریخ میں اس زمانہ کا پتہ لگا کر اور اسکی تفصیلات دیکھ کر اطمینان کرلیں کہ مدعی کا یہ دعویٰ صحیح ہے، اور یہ بھی دیکھ لیجئے گا کہ وہ معاشرہ کسی آہنی نظامِ حکومت میں کسا اور بندھا ہوا تو نہ تھا۔

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ایک تحصیلدار عبداللہ بن رواحہ رضؓ کو خیبر کے یہودیوں سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں، وہ یہودی ٹیکس میں تخفیف کرانے کے لئے بغیر کسی طلب کے رشوت کی پیش کش کرتے ہیں۔ عبداللہ بن رواحہؓ جانتے ہیں کہ جاسوسی کا کوئی سسٹم نہیں ہے، اُن پر کوئی نگرانی نہیں ہے، مگر ان کا ضمیر بالکل نہیں پھسلتا اور پوری نفرت اور حقارت کے ساتھ اس ناپاک پیش کش کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہودی ان کا منھ تکتے رہجاتے ہیں اور اُن کی زبان نقارۂ خدا بن کر کہتی ہے کہ "بیشک اسی انصاف کے بل پر زمین و آسمان قائم ہیں"۔

دوسری مثال لیجئے عمر بن عبدالعزیزؒ (جو صحابی نہیں ہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد پیدا ہوئے) کو پوری اسلامی سلطنت (روم و ایران کی سب سے بڑی شہنشاہیاں جس کا جز بن چکی تھیں) سپرد کی جاتی ہے۔ وہ اپنے پیشروؤں کی روایات سے فائدہ اُٹھا کر اس اقتدار کو اپنی ذات اور خاندان کے لئے استعمال کر سکتے تھے مگر ہوا کیا؟ انھوں نے اُن تمام جاگیروں اور

---

[۴] انسان ٹھیک رہتا ہے اور جب بگڑ جاتا ہے تو انسان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ اس کا دل ہے۔

اموال کو جو شاہی خاندان اور امراء سلطنت کی ذاتی ملکیت بن گئے تھے، ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر عوام کے خزانہ بیت المال میں واپس کر دیا حتی کہ اپنی بیوی (جو سابق خلیفہ کی صاحبزادی تھیں) کے گلے میں اس قسم کا ایک قیمتی ہار باقی رکھنا بھی گوارا نہ کر سکے اور صاف کہدیا:

"اے فاطمہ یا تم اس کو بیت المال میں واپس کر دو یا مجھ سے تعلق ختم کر لو"

کیا نام نہاد جمہوریت اور "غریب راج" نے ایسی کوئی ایک مثال بھی پیش کی ہو جبکہ اسلام نے ٹھیٹ شہنشاہیت اور ملوکیت کے دور میں اپنی تاریخ میں ایسی انگنت مثالیں چھوڑیں ——— مگر برا ہو نابینائی کا کہ اس پر تو سورج بھی اثر کرنے سے عاجز ہے! گو میرا مقصد مثالوں کا شمار کرانا نہیں ہے نہ خود کو اتنی فرصت نہ اوراق میں اتنی وسعت، مگر ایک مثال اور پیش کرنا چاہتا ہوں شاید مساوات کے سچے جویا کچھ غور کریں۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے سچے اور مخلص مساواتیوں کیلئے بھی مساوات ابتک لیلیٰ خیال سے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جی چاہتا ہے کہ وہ چشم تصور کی مدد سے چند لمحوں کے لئے اُس دور پر ایک نظر ڈالیں، جس میں اسلام کا صحیح تجربہ ہوا ہے، ممکن ہے وہ اپنی اس ذہنی محبوبہ کو پیکرِ حقیقت میں دیکھ پائیں۔

حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) اسلامی حکومت کے تیسرے خلیفہ ہیں (انھیں خلافت اُس وقت ملی ہے جب اسلامی فوجیں روم و ایران میں اپنی فتوحات قریباً مکمل کر چکی تھیں) اُن کی اس حیثیت کو اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کے بعد ذرا ایک واقعہ سُنئے۔

ایک مرتبہ غصہ میں آکر اپنے کسی غلام کا کان کھینچ دیا، فوراً تنبہ ہوا اور اُس سے کہا:-

"تو اس کے بدلے میں میرا کان کھینچ"۔ اُس غریب کو کیسے جرأت ہو سکتی تھی لیکن انھوں نے خوشامدانہ اور حاکمانہ لہجوں کی پوری طاقت استعمال کرکے اُسے اس پر آمادہ کیا۔ اُس نے تعمیلِ حکم میں مشکل کان پکڑ لیا، مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا، یعنی کھینچنا، اس کی جرأت کہاں سے لائے۔ بہت کہنے سننے سے کھینچا بھی تو بہت آہستہ سے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے کہا:- "تجھے اتنی ہی زور سے کھینچنا ہوگا جتنی زور سے میں نے کھینچا تھا، میں اس کے بغیر

نہیں مانوں گا۔"

اب میں اپنے اصل مدعیٰ کی طرف آتا ہوں جو تشنۂ تفصیل رہ گیا تھا یعنی نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس قول کی تشریح کہ "الا ان فی الجسد لمضغۃ الخ" جو تشخیصی حیثیت رکھتا ہے اور اس تشخیص کی بنیاد پر آپ کی تجویز۔

آپ کی تشخیص کا حاصل تو یہ ہے کہ معاشرہ کا بناؤ بگاڑ، صلاح و فساد، اہلِ معاشرہ یعنی افراد کے دل کی حالت پر موقوف ہے، اگر دل میں بگاڑ آگیا ہے تو معاشرہ میں یہ امراض پیدا ہو جائیں گے اور افراد کا دل اگر درست ہے تو ان افراد کی ترکیب سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس کی حالت بھی درست ہوگی۔ گویا سوسائٹی کے ان امراض کو دیکھتے ہی افراد کے دل کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، اگر دل کی حالت بدل دی گئی تو بہت آسانی سے ان برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے ورنہ تو پوری عمر اسی میں صرف ہو جائے گی اور امراض کا استیصال پھر بھی نہ ہو پائے گا، آج ایک پھوڑا اچھا ہوگا تو کل دوسرا پھوڑا دوسری جگہ نکل آئے گا، غرض جبتک دل میں سیلاب فساد موجود ہے وہ روز نت نئے راستوں سے باہر آتا رہے گا، سبب سے تعرض کئے بغیر نتیجہ کے ظہور کو کوئی پیش بندی نہیں روک سکتی، کسی تیز دریا پر بند باندھ کر اُس کا راستہ روکا نہیں جا سکتا، تبدیل کیا جا سکتا ہے —— اس بنا پر افراد انسانی کے قلوب کی اصلاح کیلئے آپنے دو بنیادی چیزیں پیش فرمائیں، ایک ایمان باللہ۔ دوسرے ایمان بالیوم الآخر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس متین حقیقت پر ایمان لائے کہ میرا اور ساری کائنات کا خالق ایک اللہ ہے، اسی طرح اس حقیقت کا بھی یقین کرے کہ اس سب کا حقیقی مالک اور حاکم بھی وہی ہے، ہر وقت ہر چیز پر اس کی نظر ہے، نہ اسے دھوکا دیا جا سکتا ہے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے، وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے، غرض ساری اعلیٰ صفات اس میں پائی جاتی ہیں —— کائنات کا وجود اور بقا پھر اس میں یہ ہمہ گیر نظم و ضبط عقلی طور پر بھی تقاضہ کرتے ہیں، ایک ایسی ذات اور اس کی ان صفات کا۔

اسی طرح یقین کرے کہ موت سے کتاب زندگی بند نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک دوسرا باب،

شروع ہوتا ہے۔ عمل کا باب ختم ہو کر جزا و سزا کا باب شروع ہوتا ہے، وہاں اس زندگی کا کیا دھرا سامنے آئے گا، بازپرس ہوگی اور حسب استحقاق بہترین انعام یا بدترین عذاب دیا جائے گا۔ یہی عقل اور انصاف کا تقاضہ بھی ہے، لیکن عقل اگر اس زندگی کا پورا ادراک نہیں کر سکتی تو کیا بات ہے، یہ عقل کا قصور ہے نہ کہ ایک حقیقت کے بطلان کا ثبوت، خصوصاً جبکہ عقل کی شکست و درماندگی اب کوئی چھپی ہوئی بات نہیں رہ گئی ہے، اور بڑے بڑے فلاسفہ وعقلا اس اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ (العقل لیس کل شیٔ) عقل ہی سب کچھ نہیں ہے کہ ہر بات کا فیصلہ کر سکے ——عقل میدان چھوڑ چکی —— اب اس خالی میدان میں ایک شخص کہتا ہے کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں اور اس نے مجھے خبر دی ہے کہ دوسری زندگی ضرور آئے گی اور اس کی تفصیلات یہ ہیں۔ آپ تردید کس بنیاد پر کر سکتے ہیں جبکہ اس کو غیر ممکن بتانے کے لئے عقل کے پاس دلائل نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اس شخص کی تردید یا تائید کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس شخص کی پوری زندگی کو سچائی کی کسوٹی پر کسا جائے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے پرکھنے کا یہ عمل مسلسل ہو رہا ہے، لیکن نتیجہ برابر ایک ہی رہا کہ صرف سچائی نہیں بلکہ ہر پہلو سے اس کی سیرت عام انسانی سطح سے بہت بلند ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی سیرتوں کے پیمانے اسے ناپنے کے لئے بیکار ہیں، یہ سیرت کسی اور ہی پیمانے کی ہے، یہ سیرت اگر کہیں اور بھی پائی جاتی ہے تو صرف انھیں انسانوں میں جن کو انسانیت محضہ کے علاوہ نبوت یا رسالت کا منصب عطا ہوا ہے (ان افراد کی تصدیق خود یہ شخص کر رہا ہے جس کو ہم اللہ کے آخری پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

عقل نے خود کو عاجز پا کر سیرت سے شہادت طلب کی، بیان کے ہر ہر فقرہ سے ٹپک رہا ہے "حاش للہ ما ھذا بشراً ان ھذا الا ملک کریم"۔ لیکن وہ خود اپنے متعلق صفائی سے پکار رہا ہے نہیں! ہرگز نہیں!! میں پیکر نوری نہیں، تمھاری ہی طرح جسد خاکی ہوں، ہاں بس فضیلت اتنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا ہے

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ	اسکے سوا کچھ نہیں کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں
اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ	وحی کی گئی ہے میری طرف کہ تمھارا معبود و مالک

يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا	ایک اللہ ہی پس جو اُمید رکھے اپنے اس رب سے ملنے کی
وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا	تو عمل کرے اچھے اور شریک نہ کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

ممکن ہے کہ ضمنی بات کی طوالت نے اصلی بات بھلادی ہو، اس لئے پھر اجمالی اعادہ کرتا ہوں۔ اللہ کے پیغمبر نے اللہ کی جانب سے ان امراض کے ازالہ کیلئے یہ چند یقین پیش کئے ہیں۔ اللہ کی ذات کا یقین، اس کی صفات کا یقین، موت کے بعد جزا و سزا والی زندگی کا یقین۔

دنیا انصاف سے کہے، کیا جس معاشرہ کے افراد کے دل ان چند یقینوں سے لبریز ہوں گے وہاں یہ امراض پنپ سکیں گے جو آج عام ہیں؟ یہ برائیاں باقی رہ سکیں گی جو آج غالب ہیں؟ —— گویا یہ مادۂ فاسد کے مقابلے میں صالح مواد ہے، خراب خون کے مقابلے میں اچھا خون ہے، خارجی صحت مندی جس کے تابع ہوتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ یقین زندہ اور طاقتور ہوں، جن میں بری خواہشات کے آڑے آنے کی طاقت ہو جو مادۂ فاسد کے عمل کو روک سکیں۔ اچھے خون کے یہ قطرے اگرچہ چند ہیں مگر کافی ہیں بشرطیکہ گرم ہوں، اگر گرمی کی جگہ سردی لے لے تو پھر اس مقصد کے لئے اُن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے

—— مسلمانوں میں ہیں مگر سرد ——

اللہ کے رسولؐ نے عبادات کا نظام اس آگ کو ہوا دیتے رہنے ہی کے لئے پیش کیا ہے لیکن یہ عبادات اگر صرف رسوم بن کر رہ جاتی ہیں تو اس مقصد کے لئے مفید نہیں رہتیں —— مسلمانوں کی عبادات کا آج یہی حال ہے اور انکی بے اثری کا یہی راز ہے۔

ہاں اس اندرونی اصلاح کی طرف اصلاً اور اولاً توجہ دینے کے ساتھ ساتھ خارجی علاج کا بھی پورا اہتمام کیا جائے، یعنی غریبوں کی بھوک اور افلاس کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔ مالداروں کے اموال کو خزانوں کی شکل نہ اختیار کرنے دی جائے، فضول خرچی کے مواقع ختم کئے جائیں۔ مثلاً جوا، شراب، سنیما، اور تعیش کے وسائل، کہ یہ چیزیں بہت سی برائیوں کیلئے ترغیبات بنتی ہیں۔ جیسے رشوت، بددیانتی وغیرہ۔ بے حیائی اور بداخلاقی کی ترغیبات دور کی جائیں۔ مثلاً بے پردگی، غیر مردوں عورتوں اور لڑکوں لڑکیوں کا اختلاط۔ وغیرہ ان مذکورہ

اوران جیسی بہت سی غیر مذکورہ بد پرہیزیوں کی موجودگی میں مکمل اصلاح کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

حاصل مدعا یہ ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ طبیب انسانیت کے اس نسخہ کو اس کی پوری ہدایات کی رعایت کرکے استعمال کرے تو صحت کامل میں کوئی شبہ نہیں، اطمینان کیلئے پہلا تجربہ موجود ہے، ورنہ صرف ظاہری لیپ پوت اور خارجی مرہم پٹی پر اعتماد اور اس غلط طریقۂ علاج کے ماتحت روز نئے نئے تجربات کی مشق ستم اس مریض کو وہیں پہونچا کے رہے گی جو اس غلط اندیشی کی آخری منزل ہو۔

فانتظروا انا معکم منتظرون

(صفحہ ۲۶ کا بقیہ)

یا اپنی کسی پارٹی کی طرف نہیں بلاتے، بلکہ اللہ کی طرف اور دین کی طرف بلاتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک دوسری قابل ذکر اصولی بات یہ ہے کہ ہم عام دعوت دین کی ان بنیادی باتوں کی دیتے ہیں جو بالکل متفق علیہ ہیں اور جن کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ ان بنیادی چیزوں کے مسلمانوں میں نہ رہنے کی وجہ سے ہی ان کی زندگی اسلامی نہیں رہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لئے ہم نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے کہ ان کے سامنے دین کے سب اوامر و نواہی اور شریعت کے سارے تفصیلی احکام پیش کرکے ان پر عمل کرنے کا ان سے مطالبہ کریں، بلکہ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم دین کی صرف چند بنیادی باتوں کی انھیں دعوت دیتے ہیں، اور صرف انھی کے ان میں پیدا کرنے کی براہ راست کوشش کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان بنیادوں کے صحیح ہوجانے کے بعد ہی مسلمانوں میں اسلامی زندگی پیدا ہوسکتی ہے۔

اس مختصر خط میں مقصد اور طریقۂ کار کی اس سے زیادہ وضاحت نہیں کی جاسکتی، اس سے زیادہ تفصیل معلوم کرنے کے لئے رسالہ "دعوت اصلاح و تبلیغ" کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس تحریک کے پس منظر اور اس کی بنیادوں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے "مولنا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت" کو غور سے اور بار بار پڑھنا چاہئے۔ والسلام

دعوتِ اصلاح و تبلیغ کے رفقاء اور کارکنوں کے نام!

(از مرکز لکھنؤ)

چوتھا گشتی مراسلہ جو جمادی الاخریٰ میں مرکز لکھنؤ کی طرف سے اودھ کے دوسرے تبلیغی مرکزوں کے لئے لکھا گیا

اخوانِ دینی! وفقنا اللہ وایاکم لما یحب و یرضیٰ سلام و رحمت!

خدا کرے مزاج بعافیت ہو، اور دین کی فکر اور خدمت کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہی ہو۔

"دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کے عنوان سے، اور کہیں صرف "تبلیغ" کے نام سے مسلمانوں میں اصلی اسلامی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کی جو کوشش ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے جس میں کچھ حصہ لینے کی توفیق ہم آپ کو بھی دے رکھی ہے ـــــ اُس کے متعلق اپنے ہی بعض نئے رفیقوں کی باتوں سے کبھی کبھی ایسا اندازہ ہوا ہے کہ اُس کے مقصد اور طریقِ کار کے بارے میں اُن کے ذہن پوری طرح صاف نہیں ہیں ـــــ کوئی اس کو صرف کلمہ صحیح کرانے یا کلمہ یاد کرانے کی تحریک سمجھتا ہے، کوئی کلمہ اور نماز کی تحریک کہتا ہے۔ بعض پڑھے لکھے حضرات کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے اس کو مسلمانوں میں صرف خانقاہی مشاغل (ذکر و مراقبہ اور کثرتِ نوافل وغیرہ) کے رواجِ عام کی کوشش سمجھا ہے۔

اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہر جگہ کے کارکنوں اور داعیوں کا

ذہن صاف کرنے کی بار بار کوشش کی جائے، اگر خدانخواستہ اُن کے ذہنوں میں اُلجھاؤ رہ گیا تو دوسروں کا ان الجھنوں میں مبتلا ہونا اور رہنا یقینی ہے، اس لئے آج کے اس خط میں اس دعوت کی توضیح اور مقصد و طریقۂ کار کی تشریح کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

(۱) ~~ہمارے~~ لئے اس کام کا محرک :-

مسلمانوں کی حالت سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت انکی بہت بڑی تعداد اسلام کی حقیقت اور اُس کے ضروری اصول و احکام سے بھی ناواقف ہے اور اسلام کے ساتھ اس کا تعلق بس برائے نام ہے ـــــ اور ایک خاصی تعداد ہم میں ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اسلام سے اگرچہ اتنے ناواقف اور بے خبر تو نہیں ہیں لیکن اُن کی عملی زندگی اسلامی نہیں ہے، اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ اگرچہ جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے لیکن نہیں پڑھتے، جانتے ہیں کہ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے لیکن نہیں ادا کرتے۔ اسی طرح جانتے ہیں کہ جھوٹ، فریب، ظلم، خیانت، سود، رشوت وغیرہ اسلام میں قطعاً حرام ہیں لیکن ان برائیوں سے پرہیز نہیں کرتے ـــــ مختصر یہ کہ وہ اگرچہ زبان سے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہتے ہیں اور اس پر عقیدہ بھی رکھتے ہیں، لیکن ان کی زندگی اس اقرار اور عقیدے کے مطابق نہیں، علیٰ ہذا اگرچہ قیامت اور آخرت کے حساب کتاب کے وہ منکر نہیں ہیں لیکن دنیا کی لذتوں اور منفعتوں میں انہماک کی وجہ سے اپنی عملی زندگی میں آخرت سے گویا وہ بالکل غافل ہیں ـــــ اور اپنی اس حالت کی وجہ سے وہ اللہ کی نظرِ کرم سے بھی گر گئے، اور دنیا کی میزان میں بھی اُن کا کوئی وزن اور وقار نہیں رہا ہے۔ نیز اُن کے اس طرزِ عمل سے دنیا کی رائے اسلام کے بارے میں بھی روز بروز غلط ہوتی جا رہی ہے۔

ایسی حالت میں از روئے دین ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان ناواقف اور غافل مسلمانوں میں حقیقی ایمان اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اللہ کے نزدیک سخت مجرم اور گنہگار ہوں گے[1]۔

---

[1] اس مضمون کی پوری تفصیل معلوم کرنے کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ "مسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ"

بس مسلمانوں کی یہ حالت۔ اور اللہ کا یہ حکم اور اُس کے غضب اور عذاب کا خوف اور اُس کی رضا اور جنّت کی طلب دراصل ہمارے اس کام کے اصل محرکات ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ہمیں اس کام کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ گویا یہ کام ہم اسی طرح دینی فرض سمجھ کے کرتے ہیں جس طرح نماز، روزہ وغیرہ دوسرے دینی حکموں پر عمل کرتے ہیں۔

(۲) مقصد :-

محررہ بالا سطروں ہی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس دعوت و تحریک کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلی اسلامی زندگی اور ایمانی روح پیدا ہو، یعنی عام مسلمان حقیقتِ اسلام سے واقف اور اُس کے احکام پر عامل ہو جائیں۔ اللہ و رسولؐ اور دین سے ان کا تعلق صرف زبانی اور برائے نام نہ ہو، بلکہ وہ اُن کی زندگی ہو جس کو ہر شخص اُن کے عمل و کردار میں دیکھ سکے۔

(۳) طریقۂ کار :-

اس مقصد کے لئے موجودہ زمانہ میں جس طریقِ کار کو ہم صحیح سمجھتے ہیں وہ چونکہ سراسر عملی ہے، اور ہمارے اس زمانہ میں کسی اور دینی یا دنیوی تحریک کا وہ طریقہ نہیں ہے اس لئے نئے اور ناواقف حضرات تو عملی شرکت اور تجربہ کے بعد ہی اس کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں، البتہ جن حضرات کا کام سے کچھ تعلق ہے طریقۂ کار کے متعلق اُن کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لئے چند اصولی باتیں عرض کی جاتی ہیں، لیکن دوسرے حضرات بھی کچھ ابتدائی اور اجمالی درجہ کی واقفیت انشاء اللہ اس سے حاصل کر سکیں گے۔

مسلمانوں میں وہ تبدیلی پیدا کرنے کے لئے جو اس دعوت کا مقصد ہی تقریر و تحریر کے ذریعہ تبلیغ و اشاعت کے علاوہ ہم دو کام اور ضروری سمجھتے ہیں :-

ایک یہ کہ ہر شہر اور قصبہ میں دینی دعوت کے ایسے مرکز قائم کئے جائیں[1] جہاں ہفتہ کی کم از کم ایک رات کو وہاں کے ہر طبقہ کے مسلمان جمع ہو جایا کریں اور پوری رات وہیں

[1] ہماری مسجدیں ہمارے دینی مرکز ہیں، لہٰذا بستی کی کسی وسیع مسجد کو اس کے لئے منتخب کر لیا جائے۔

گذارا کریں، وہاں اُن کو دینی زندگی کی دعوت دی جائے، دین کی اہمیت اور اُس کے بنیادی اور ضروری اصول و احکام سے واقف کیا جائے، اور کم ازکم اس ایک رات میں اسلامی زندگی کی کچھ جھلک پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ تقریر و تعلیم کے علاوہ اس اجتماع کی ایمانی اور نورانی فضا سے بھی ہر آنے والا اچھے اثرات لے سکے ــــ گویا یہ اجتماع ایک مجلسِ درس و تعلیم بھی ہو اور اپنی کیفیات کے لحاظ سے ایک معمولی خانقاہ بھی: یہاں دینی زندگی کی دعوت اور اسلام کے بنیادی احکام کی تعلیم و تلقین بھی ہو اور ذکر و شغل اور دل کے سوز و گداز کی خانقاہی فضا بھی جس میں آکر ہر غافل کو بھی اللہ اور آخرت یاد آجائے۔

ان ہفتہ وار مقامی اجتماعات کے علاوہ دوسرا جو کام ہم اس مقصد کیلئے ضروری سمجھتے ہیں اور جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ دینی زندگی کی اس دعوت کو شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہونچانے کے لئے اور خود دینی تربیت حاصل کرنے کے لئے دعوتی اور تربیتی قافلے اور جماعتیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کریں، اور اس سفر کے زمانے میں ضروری آرام اور کھانے پینے جیسی بشری ضروریات کے علاوہ اپنا سارا وقت مناسب تقسیم کے ساتھ تین کاموں میں صرف کیا کریں :-

۱۔ اپنی تعلیم و تربیت

۲۔ دوسرے مسلمانوں میں تبلیغ و دعوت

۳۔ ذکر و عبادت

مثلاً صبح کو ۱۱ بجے تک اپنی تعلیم میں مشغول رہیں، ان میں جو دین کے واقف اور زیادہ جاننے والے ہوں وہ دوسرے ساتھیوں کو دین سکھائیں اور کم جاننے والے اُن سے سیکھیں ــــ اور شام کے وقت اس دعوت کے سلسلہ میں وہاں کے لوگوں میں گشت کریں اور اُن کو اپنا پیام پہونچائیں، اور اس گشت ہی کے ذریعہ وہاں کے مسلمانوں کو کسی اور مناسب جگہ جمع کرکے اپنا مقصد تفصیل سے انھیں بتائیں اور اس دینی کام کی ان کو بھی دعوت دیں ــــ ان دونوں کاموں سے جو وقت بچے وہ کسی بیکار اور لاحاصل و لایعنی

مشغلے میں گذارنے کے بجائے اللہ کی عبادت اور اس کی یاد میں گذاریں ـــــ نیز اس سفر میں اپنی بُری عادتیں چھوڑنے اور اچھی عادتیں اختیار کرنے کی خاص طور سے کوشش کریں۔ یہ چیز اپنے گھر پر اور اپنے روزمرہ کے ماحول میں بڑی مشکل ہوتی ہے لیکن اس طرح کے دینی اور تربیتی سفروں میں آسان ہوجاتی ہے۔

الغرض ہمارے نزدیک ان دعوتی اور تربیتی قافلوں کی حیثیت متحرک عوامی مدرسوں اور خانقاہوں کی ہے جس سے وہ عام مسلمان بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو اپنی عمر اور اپنے خاص حالات اور مشاغل کی وجہ سے نہ مدرسوں میں جاکر دین سیکھنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں اور نہ خانقاہوں میں جاکر وہاں کا روحانی فیض حاصل کرسکتے ہیں۔

اس طرح کے دعوتی اور تربیتی قافلوں کے ساتھ سفر کے لئے مہینہ میں اگر صرف تین ہی دن دینے کا رواج مسلمانوں میں عام ہوجائے اور ہر مسلمان اس کو اپنے لئے ضروری سمجھ لے تو انشاء اللہ ۳-۴ برس میں مسلمانوں کے وہ طبقے جو آج صرف نام و نسل کے لحاظ سے مسلمان ہیں اصلی مسلمان بن سکتے ہیں اور اُن میں ایمانی روح اور اسلامی زندگی پیدا ہوسکتی ہے۔

طریقۂ کار کے سلسلہ میں ہمارے دو اصول اور بھی قابلِ ذکر ہیں :۔

ایک یہ کہ ہم نے اس کام کے لئے کوئی خاص انجمن یا پارٹی نہیں بنائی ہے جس کے کچھ ممبران اور ارکان اور عہدہ داران ہوں، بلکہ ہمارے سامنے صرف یہ مقصد ہے اور اس کے لئے ہمیں مذکورۂ بالا طریقۂ کار پر یقین ہے، اس لئے ہم ہر مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے صرف اس کام کی دعوت دیتے ہیں ـــــ یعنی ہماری دعوت یہ نہیں ہے کہ آپ کسی پارٹی کے ممبر یا کسی جماعت کے رکن بن جائیں اور کسی جماعتی نظام میں شامل ہوجائیں، بلکہ ہماری دعوت صرف یہ ہے کہ یہ کام (یعنی اپنی اور اپنے بھائیوں کی دینی اصلاح کی کوشش) ضروری ہے، از روئے دین فرض ہے، اس لئے آپ اس کام کو کریں ـــــ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں سمجھئے کہ ہم اس کام کو سیاسی اور قومی تنظیمی جماعتوں کے طرز پر نہیں کرتے، بلکہ دینی مصلحین کے طریقہ پر صرف دعوت دیتے ہیں، اپنی طرف

(بقیہ صہ ۴۱ پر)

اِسلام میں فساد و بربریت کی گنجائش نہیں!

(مترجمہ:- عتیق الرحمن سنبھلی)

"ذیل کا مضمون مصر کے مشہور مصنف "مصطفےٰ منفلوطیؒ" کے ایک عربی مقالہ کا ترجمہ ہے، جو موصوف نے ۱۹۰۹ء میں اُس وقت لکھا تھا جبکہ سلطنت عثمانیہ کے ایک علاقہ میں وہاں کی غیر مسلم اقلیت "عیسائیوں" کے خلاف مسلم اکثریت میں اندھا تعصب اور اشتعال پھیل گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں (اخباری اطلاعات کے مطابق) بہت سے بے گناہ مارے جارہے تھے، انسانیت کا احترام رخصت ہو گیا تھا، اور ہمجنس کے خون کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

منفلوطی مرحومؒ نے انسانی شرافت اور ایمانی جرأت کے ساتھ اپنے ہم مذہبوں کو بروقت ٹوکا اور بے دھڑک اعلان کیا کہ تم تنہا عیسائیوں کو قتل نہیں کر رہے ہو۔ ان کے ساتھ اسلام کو بھی ذبح کر رہے ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان و پاکستان میں اُسی بربریت کا بھوت پرے جمائے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ خاصکر اپنے پاکستانی بھائیوں تک مرحوم منفلوطیؒ کی یہ آواز پہونچا دیں۔ خدا کرے ہندوستان کی اکثریت کے سمجھدار بھی اس مضمون سے سبق حاصل کریں۔"

مسلمانو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مسیحیوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ تمھاری

چھریوں اور تلواروں سے ذبح ہوں، تمھارے نیزوں اور بھالوں کا نشانہ بنیں، اور تمھاری لگائی ہوئی آگوں میں جل بھُن کر کباب ہوں ـــ اگر تم نے ایسا خیال کیا ہے تو اپنے پروردگار کے ساتھ تم نے بہت بڑی بدگمانی کی ہے، اور اُس کے افعال واعمال کو تم نے حکمت و تدبیر سے خالی ٹھہرایا ہے ـــــ اور ایک ایسے بے عقل و بے دماغ انسان کی طرح تم نے اس کو سمجھا ہے، جو مکان بناتا ہے مگر اس لئے نہیں بناتا کہ اس میں رہا جائے بلکہ اس لئے کہ اس کو ڈھایا جائے، کھیت بوتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ اس سے غلّہ پیدا کر کے فائدہ اُٹھایا جائے بلکہ اس لئے کہ جب وہ تیار ہو جائے اور اس کی بالوں میں دانے آجائیں تو اس کو آگ لگا کے تماشہ دیکھے، کوئی کپڑا سیتا یا سلواتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ اس کو خود پہنے یا کسی اور کو پہنائے بلکہ اس لئے کہ کسی کے ہاتھ سے اس کی دھجیاں بکھرتی دیکھے، یا مثلاً منتشر موتیوں سے وہ ہار بناتا ہے لیکن اسلئے نہیں کہ کسی گلے کی زینت بنے بلکہ اس لئے کہ کوئی اس بنے بنائے ہار کو توڑے، اور یہ اس کے موتیوں کے پھر سے بکھرنے کا تماشہ دیکھے (غرض اس مہمل انسان کی ہر تعمیر برائے تخریب ہو، تو کیا تم نے رب العالمین کو کسی ایسے عبث کار اور بے عقل انسان کی طرح سمجھا ہے ؟)۔

حیرت ہے کہ تم نے اپنے پروردگار کے ساتھ ایسی بدگمانی کیوں کی، حالانکہ اُس رب کریم کا معاملہ ہر پیدا ہونے والے انسان کے ساتھ تم برابر یہ دیکھ رہے ہو کہ جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ایک بے حقیقت نطفہ ہوتا ہے اُسی وقت سے اللہ تعالیٰ اپنی خاص شفقت و رحمت کی شان کے ساتھ اس کی خبر گیری اور نگرانی کرتا ہے، پھر اپنے کرم و احسان کے سایہ میں اس کو بڑھاتا اور پالتا رہتا ہے اور اسی بند اندھیری کوٹھری میں حسب ضرورت اس کے لئے ہوا، اور غذا کا انتظام فرماتا ہے، اور اُس کی ننھی اور کمزور سی زندگی پر آنے والی ہر آفت سے اس کی حفاظت فرماتا ہے، اُس کے الطاف کی یہ بارش اسی طرح مہینوں تک جاری رہتی ہے، حتیٰ کہ وہ حقیر نطفہ تمام درمیانی مدارج سے گذر کر مکمل انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

(فتبارك الله احسن الخالقين)

خود ہی سوچو! انسان کے ساتھ جس خدا کی مہر و نوازش کا یہ حال ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی بخشی ہوئی روح کو بلا وجہ کسی بندہ سے چھین لینے کا کسی کو حکم دے، اور کیسے ہو سکتا ہے کہ جو خون اُس نے آدمی کی رگوں میں دوڑنے پھرنے اور اُس کی زندگی قائم رکھنے کیلئے ہی اُس کے اندر پیدا کیا ہے، اُس کا نالیوں میں اور سڑکوں پر بہنا اُسے بھلا معلوم ہو؟۔

مجھے بتاؤ کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کون سی کتاب میں اور انبیاء صادقین میں سے کس نبی کی شریعت میں اس ظلم کی اجازت ہے کہ تم کسی ایسے شخص کو جو امن و اطمینان سے اپنے راستہ پر چلا جارہا ہو، یا اپنے گھر کے کسی گوشہ میں بیٹھا ہو، قتل کر ڈالو، اُس کی بیوی کو رانڈ، اور اُس کے بچوں کو یتیم کر دو، اُس کے پورے خاندان اور اُس کی قوم کو سوگوار بنا دو۔ صرف اس جرم میں کہ وہ تمھارے دین پر نہیں ہے، اور اُس کے عقائد تمھارے عقائد سے مختلف ہیں۔

اگر اس کی اجازت ہو کہ انسان دوسرے انسانوں کو اختلافِ دین و مذہب کی وجہ سے قتل کر دیا کریں تو سارے شہر آدمیوں سے خالی ہو جائیں، آبادیاں ویرانہ بن جائیں، اور روئے زمین سے نسل آدم اسی طرح غائب ہو جائے جس طرح ہتیلی پر سے بال۔

اگر عقل و بصیرت کا کوئی حصہ تمھیں نصیب ہے تو اس حقیقت کا سمجھنا تمہارے لئے مشکل نہ ہونا چاہئے کہ دین و مذہب، فطرت و طبیعت اور خیالات و جذبات کا اختلاف، اس عالمِ تکوین کے لوازم میں سے ہے جو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آئے کہ اس دنیا میں صرف ایک ہی آدمی رہ جائے اور کوئی دوسرا اُس سے اختلاف کرنے والا نہ ہو تو یہی اکیلا انسان اپنے تخیل اور تصور سے ایک دوسرا انسان پیدا کرے گا تاکہ نزاع و اختلاف کا فطری تقاضا پورا ہو۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ[1] لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ۔

---

[1] یہ سورۂ "ہود" کے آخری رکوع کی ایک آیت ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ "اگر اللہ چاہتا تو اپنی قدرتِ قاہرہ کو استعمال کرکے سب انسانوں کو ایک امت اور ایک ملت بنا سکتا تھا لیکن اسکی حکمت کا فیصلہ یہ نہیں ہوا اس لئے اب انسان مختلف گروہوں میں بٹے رہیں گے، اور صرف وہی صراط مستقیم اور دین حق پر متفق ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ کی

یہی نہیں بلکہ یہ کوشش اس عالم کی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش ہے، اس کے نظم کو درہم برہم کرنے کی کوشش ہے، کیونکہ اس کے حیات کا فلسفہ حرارت کے فلسفہ سے ملتا جلتا ہے کہ جب تک دو الگ الگ جسم نہ ہوں اور پھر ان میں تصادم نہ ہو حرارت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اے مسلمانو! اگر تم اپنے اس مجرمانہ اور مفسدانہ رویہ کی تائید میں قرن اول کی ان جنگوں کا حوالہ دینے لگو جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہوئی تھیں تو ہرگز صحیح نہ ہوگا۔

اس جہاد اور اس فساد میں زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ وہاں مسلمانوں کا مطمح نظر مسیحیوں کے خون سے اپنے اشتعال اور انتقام کی آگ بجھانا یا اُنھیں موت کے گھاٹ اُتارنا نہ تھا، ان کی جنگ کا باعث عیسائیوں کی عداوت نہ تھی بلکہ اسلام کی حفاظت۔ وہ کسی انسان کے دشمن نہ تھے بلکہ انھیں صرف ان انسان نما روڑوں سے دشمنی تھی جو دعوت اسلامی کا راستہ روکتے تھے خواہ وہ عیسائی ہوتے یا غیر عیسائی، ان کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ اسلام کی روشنی دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک پہونچا دیں، اب اگر کوئی ان کی اس کوشش میں خلل ڈالنے لگتا تو وہ مجبور تھے کہ اس کا قصہ پاک کردیں۔

غرضکہ ان کی تلوار جذباتی پیاس بجھانے کے لئے نہیں اٹھتی تھی، بلکہ اسلام کو نقصان سے بچانے کے لئے اور اللہ کے سب بندوں تک آسمان سے آیا ہوا آبِ حیات بحفاظت پہونچانے کے لئے۔

اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اس دور میں جب کبھی اسلامی لشکر کو کسی مہم پر جانے کا حکم دیا گیا تو روانگی سے پیشتر ہمیشہ غیر مبہم الفاظ میں یہ احکام خلیفۂ وقت کی طرف سے سنائے گئے:۔

"تم دیر نشیں راہبوں کو پریشان نہ کرنا! گرجوں کے پادریوں کو نہ چھیڑنا، جنگ صرف اُن لوگوں سے کرنا جو مقابلہ میں آویں، زور بازو انھیں دکھانا

جو راستہ روکیں!!

حالانکہ اگر ان لڑائیوں میں اہلِ اسلام کا مقصد جذبۂ انتقام کی تسکین، یا مسیحیت اور پیروانِ مسیحیت کو نیست و نابود کرنا ہوتا تو چاہیئے تھا کہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کے اکابر اور پیشرووں کو سب سے پہلے قتل کرنے کا حکم دیا جاتا —— جو کسی دین یا قوم کی عمارت میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ ستون جب گرتے ہیں تو پوری عمارت کو لیکر گرتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی اچھی طرح سُن لو، کہ اگر تم نے اپنے دین کے سوا کسی اور دین کو برداشت نہ کیا اور مُلک کے سارے غیر مسلموں کو موت کے گڑھے میں ڈھکیل کر اس خطۂ زمین کو اپنے ہم مذہبوں کے لئے خالص کر لیا تو پھر خود تم میں بہت سے نئے نئے اختلافات پیدا ہو جائیں گے، تم خود ہی بے شمار ٹکڑیوں میں بٹ کر آپس میں اسی طرح دست بہ گریباں ہو جاؤ گے جیسے آج دو مختلف مذہبوں والے اور آخری انجام یہ ہو گا کہ نہ مذہب رہے گا نہ مذہب والے۔

اسلام کے نادان دوستو! اسلام کے نام پر جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ تم کر رہے ہو اسلام اس کے مٹانے کے لئے دنیا میں آیا تھا۔ اسلام غیر مسلموں کے لئے تیغ بے نیام نہیں، اس وحشت ناک بربریت کیلئے موت کا پیام ہے۔

اسلام تو اس لئے آیا تھا کہ دلوں سے بغض و عداوت کی پرانی جڑیں نکال کر رحم و انصاف کا نیا بیج بوئے جس کے شجرہ سعادت کی چھاؤں میں انسانیت آرام کی سانس لے سکے۔ میں مانتا ہوں کہ اس نے جسم انسانیت سے تھوڑا سا خون بھی خارج کیا، مگر اس کی نوعیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے کہ کبھی کبھی ڈاکٹر عملِ جراحی کر کے مریض کے جسم سے مادۂ فاسد نکالنا ضروری سمجھتا ہے اور پھر یہی اس کی زندگی اور صحت کا ذریعہ بنتا ہے۔

اگر بالفرض ایسا ہوتا کہ تمہارے مُلک میں رہنے والے ان عیسائیوں نے تم پر مظالم کئے ہوتے، یا ان کی ہمسائیگی تمہاری سوسائٹی میں برائی کے جراثیم اور بُرے نتائج

پیدا کرنے والی ہوتی یا تمہارے ساتھ رہ کر وہ ایسی حرکتیں کرتے جن سے تمہیں کوئی بڑا خطرہ ہوتا، تو کسی درجہ میں تم معذور سمجھے جاتے، لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، جو قوم تمہارے زیر سایہ رہتی ہے بلکہ کہنا چاہئے تمہارے رحم وکرم پر جیتی ہے اس میں یہ طاقت کہاں کہ وہ تم پر دست درازی کرے؟ بدیر یا سویر تمہیں کوئی نقصان پہونچا سکے۔ تو پھر یہ سراسر ظلم ہو رہا ہے جس کے لئے میری نگاہ میں تمہارے پاس کوئی عذر نہیں۔

اور شاید میں پھر بھی کسی حد تک تمہیں معافی کے قابل سمجھ لیتا اگر اُن چھوٹے چھوٹے اور بے گناہ بچوں ہی پر تم نے رحم کیا ہوتا جو جوانی سے پہلے دین و دھرم کے سوالات سے اللہ کے یہاں بھی مستثنیٰ ہیں، اُن کمزور عورتوں ہی پر ترس کھایا ہوتا جن کی زندگی اوّل سے آخر تک بے بسی کی زندگی ہے، اُن بوڑھوں ہی کو بخشا ہوتا جو خود ہی قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے تھے اور اس میں گرنے کے لئے تمہارے کسی دھکے کے محتاج نہ تھے۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم نے بھول کر بھی ایسا نہیں کیا بلکہ خطا کاروں کا بدلہ تم نے بے گناہوں سے لیا —— پھر میں کیوں نہ کہوں کہ تم غازی و مجاہد نہیں، پاپی اور مجرم ہو، بہادر جانباز نہیں، بے درد سفاک ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے سینوں میں دل نہیں پتھر کی سلیں ہیں —— یہ کیسے سخت پتھروں کے ٹکڑے تمہارے پہلوؤں میں ہیں جن پر نہ کسی بدنصیبماں کی آہیں اثر کرتی ہیں نہ کسی غم نصیب بیوہ کی چیخیں —— حالانکہ ہم نے بہت سے پتھر بھی ایسے نرم دیکھے ہیں کہ ان کی کوکھ سے نہریں پھوٹتی ہیں[1]۔

ہاں مجھے یہ بھی بتاؤ کہ تمہاری یہ آنکھیں کون سے پتھر سے تراشی گئی ہیں جو ایسے دردناک منظر کی بھی تاب لے آتی ہیں —— کہ ایک نونہال اپنی مادر کی آنکھوں کے سامنے آگ میں ڈالا جاتا ہے، شعلے اُسے کھانے لگتے ہیں۔ ماں دیکھتی ہو کہ آگ کی

---

[1] وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ۔

پسٹیں اژدہے کی طرح اس کے جگر پارہ کو نگلے جا رہی ہیں —— مگر بس دیکھتی ہی ہے —— دوڑ کر جانے اور جا کر اُٹھا لانے سے وہ مجبور ہے، اس لئے کہ اس کے دست و پا پہلے ہی نذرِ آتش ہو چکے ہیں —— آہ بے بس ماں اور بے رحم تماشبین! آہ

بے شک تم جیتے، تم نے کمزوروں پر فتح پائی، مگر افسوس ہے کہ میں تمھیں مبارکباد نہیں دے سکتا، ضعیفوں کو قتل کر ڈالنا بہادری نہیں، بزدلی اور کمزوری ہے۔ بے گناہوں اور بے قصوروں کا خون بہانا سراسر وحشی پن ہے —— جس پر تہنیت نہیں تعزیت کرنا چاہیئے۔

میرے ہم مذہبو! مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا، اگر یہ ساری تقریر بیکار رہی اور تم کسی معقول بات پر بھی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تو اب میں ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ:-

"تم جتنے عیسائیوں کو چاہو قتل کر ڈالو، تمھاری سنگدلی اور درندگی کو جتنے خون کی مانگ ہو پوری کر لو، لیکن للّٰہ اسلام اور اللہ کے نام کو بیچ میں نہ لاؤ، وہ مقدس ذات اور اس کا پاک دین تمھارے ان اعمال سے بالکل بری اور بے تعلق ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ وہ احکم الحاکمین ہے ارحم الراحمین ہے۔"

(صفحہ ۶۵ کا بقیہ) بھارتی مسلمان کو حاصل ہو یا پاکستانی ہندو کو؟ بھارت کی حکومت بھارتی مسلمان کے امن اور مستقبل کی ذمہ دار ہو، یا پاکستانی ہندو کے مستقبل اور امن کی؟ ہمیں یقین ہے کہ جس دن حکومت اور کانگریس نے اس سوال کا صحیح جواب دے دیا اور اسی کی روشنی میں قدم اُٹھایا اُسی دن اقلیتی مسئلہ حل ہو جائے گا، ورنہ یہ لعنت طاری رہے گی، اور ضرور طاری رہے گی۔ "مدینہ بجنور"

انتخاب

ہندوستان کے بہی خواہوں سے :-

جن لوگوں کے پاس دل اور دماغ ہے اور جو دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ فرقہ پرور ملک اور قوم کو کس تباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں اور آج کون کون نعمتیں خطرے میں ہیں اُن کیلئے خاموش رہنے کا موقع نہیں۔ اگر وہ آج خاموش رہے تو پھر یا تو کام کرنے کا موقع نہ ملے گا یا اگر ملے گا بھی تو اس کام کا اثر اس وقت ہوگا جب ملک قحط اور بیماریوں اور چتاؤں اور قبرستانوں کی آبادی بن چکا ہوگا اور نوبت یہ آ چکی ہوگی۔ کہ

"درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا"۔

ایک طرف بے قصوروں کے گلوں پر خنجر چل رہے ہیں اور دوسری طرف معصوموں کے کرداروں کو تباہ کیا جا رہا ہے، اور ان کو قاتل لٹیرے اور عصمت کے ڈاکو بنایا جا رہا ہے کوشش یہ ہو رہی ہے کہ سارا ملک مظلوموں اور ظالموں میں بٹ جائے، ایک طرف مقتولوں کی لاشیں ہوں اور دوسری طرف خون کے پیاسے پاگل۔ اگر ایسی کوششیں کرنے والے کامیاب ہو گئے تو ہندوستان ایسا ملک ہوگا جہاں کچھ تو ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے جرم کیا ہوگا، اور کچھ ایسے جنھوں نے ہتھیا چار ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا لیکن آنکھیں بند رکھی ہوں گی، اور اخلاق کی نظروں میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ "قومی آواز۔ لکھنؤ"

فرقہ وارانہ فسادات اور ردِّ عمل کی منطق :-

"فرقہ واریت سے متعلق یو، پی کانگریس کمیٹی کی کونسل کی قرارداد پر قومی آواز لکھنؤ"

کے تبصرہ کا اقتباس"

اس وقت کی بھیانک فرقہ وارانہ گھٹائیں دیکھئے اور صوبہ کانگریس کمیٹی کی کونسل نے فرقہ واریت کے متعلق جو قرارداد منظور کی ہے اسے دیکھئے، بس ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ اس شدید طوفان کا سامنا کرنے کیلئے ایک پھونس کی جھونپڑی کھڑی کردی گئی ہے جو نہ ہوا کو روک سکتی ہے اور نہ بارش کو، اس قرارداد میں ایک طرف تو اس بات کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ

"بھارت میں جو کچھ ہوا ہے وہ نتیجہ ہے مشرقی بنگال کے حادثوں کا، کیونکہ لاتعداد ایسے رشتے ہیں جو ان دونوں ملکوں کے باشندوں کو باہم باندھتے ہیں"

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اکثریت کو ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے کہ اقلیت محفوظ رہے۔

مشرقی بنگال کے فساد سبب تھے، اور مغربی بنگال اور اتر پردیش کے فساد اس سبب کا نتیجہ۔ جب سبب ہو گیا تو نتیجہ ضرور پیدا ہوگا۔ جب آگ لگے گی تو دھواں بھی ہوگا، جب پاکستان میں فساد ہوگا تو ہندوستان میں ضرور ہوگا، جب پاکستان کی اقلیتیں مصیبت میں رہیں گی تو ہندوستان کی اقلیتیں بھی مصیبت میں رہیں گی، یہ ہے وہ منطق جسے کونسل نے تسلیم کیا ہے۔ اس منطق کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہندوستان باوجود ایک آزاد اور خود مختار جمہوریہ ہونے کے اپنے اندرونی امن کے معاملہ میں پاکستان کا محتاج ہے، اگر پاکستان میں امن رہتا ہے تو ہندوستان میں رہ سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ ہندوستان کے امن کی کنجی پاکستان کی جیب میں رہتی ہے۔ کیا کوئی باعزت ہندوستانی اس منطق کو تسلیم کرسکتا ہے؟۔

کیا اتر پردیش میں جو کچھ کیا گیا وہ بنگالی ہندوؤں کی ہمدردی میں کیا گیا؟ کیا مسلمانوں کو تنگ کرنے والے غنڈوں کو اس بات کا یقین ہے کہ ان کی ان حرکتوں سے پاکستان میں ہندوؤں کو راحت ملے گی؟ آپ ایک ایسے غنڈے کو پکڑ لیجئے جو غصہ اور جنون میں پاگل ہو رہا ہو، اور اُس سے پوچھئے کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے، تو وہ جو جواب دے گا اس سے آپ اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ اس کو اگر یقین ہے تو صرف اس بات کا

اُنکی ایسی باتوں سے پاکستان کی بدامنی اور بڑھے گی، اور وہاں کی اقلیتوں کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہوگا۔
پھر یہ کہنا کیا معنی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ مشرقی بنگال کا ردِ عمل ہے؟۔
اجودھیا کی مسجد کا واقعہ اُسوقت ہوا ہے جب پاکستان میں امن تھا، یہ بات اور اس قسم کی باتیں صاف بتلاتی ہیں کہ ہندوستان کے فسادوں کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ یہاں فرقہ واریت کا زہر موجود ہے اور اس کا مقابلہ ٹھیک طرح سے نہیں کیا جارہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک وہی زہریلی فرقہ وارانہ مشق چل رہی ہے، جو آزادی سے پہلے چل رہی تھی۔ نواکھالی کا بدلہ بے قصور بہار، اور گڑھ مکتیشر کے مسلمانوں سے لیا جانا، پھر اس کا بدلہ راولپنڈی کے بے قصور ہندوؤں سے، پھر لاہور اور امرتسر میں انتقام در انتقام کا مقابلہ چلنا۔ یہ حقیقت ہے، کہ اس ناپاک رشتے کا کلچر، مذہب، برادری، ہم وطنی اور اس قسم کی اعلیٰ چیزوں سے کوئی دُور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ یہ زہر اور صرف زہر ہے اور زہر کے سوا کچھ نہیں۔ زہر بھی ایسا زہر جو ہندوستان کے مستقبل کو اور آنے والی نسلوں کو جلا کر کوئلہ اور کوئلے سے راکھ بنا سکتا ہے۔ یہی زہر ہے جسنے ہندوستان کی اکثریت اور اقلیت کے درمیان ایک مصنوعی دیوار کھڑی کر رکھی ہے اور جس وجہ سے ان دونوں میں وہ مقدس رشتہ نہیں قائم ہونے پاتا ہے جس کا تقاضہ آزادی اور جمہوریت کر رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ صوبہ کانگریس کمیٹی کی کونسل مُلک کو صحیح ہدایت دینے سے قاصر رہی۔

"قومی آواز۔ لکھنؤ"

حکومت اور کانگریس کی ذمہ داری :۔

اگر اقلیتی مسئلہ کا حل واقعتاً منظور ہے تو سوائے اسکے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ پاکستان کو نظر انداز کر کے بھارت کی ...... اکثریت کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کی جائے اور اسے آدابِ جمہوریت سکھائے جائیں۔ یہ فرض حکومت کا بھی ہے اور بھارت کے اُن بہی خواہوں کا بھی جو بھارت کو مستحکم ترقی یافتہ اور پر امن دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک زبردست مہم کی ضرورت ہے، جس میں سبھی کو حصہ لینا ہوگا، اور یہ مہم حکومت اور کانگریس کے باہمی تعاون سے بآسانی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس مہم میں کانگریس کو اسی تنظیم اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا ہوگا جیسا کہ جنگِ آزادی کے دوران میں کیا گیا تھا اور حکومت کو دشمنانِ جمہوریت کے خلاف اسی انداز میں قدم اُٹھانا ہوگا جس انداز میں کہ وہ قلتِ غذا کو دُور کرنے کیلئے اُٹھا رہی ہے، اگر کانگریس اور حکومت دونوں اس فرض کی ادائیگی کے لئے تیار ہیں تو پھر مہم کا آغاز اس سوال کے غیر مبہم جواب سے ہونا چاہیئے کہ بھارت میں بھارتی مسلمان اور پاکستانی ہندو کے مدارج کیا ہیں؟ ان میں اوّلیت کا شرف (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ

جلد ۱۷ نمبر (۱)　　　　　　　　رجسٹرڈ نمبر اے ۳۵۳

تبلیغی و اصلاحی ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

مدیر مسئول

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یاد رکھئے! "الفرقان" اور "کتب خانہ الفرقان" بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں
اب خط و کتابت اور فرمائشات وغیرہ کے لئے ذیل کا پتہ یاد رکھئے!

دفتر "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (یو-پی)

[illegible]　　　　　　　　[illegible] ۳ روپے آٹھ آنہ

| جلد — ۱۷ | بابت ماہ رجب ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۵۰ء | نمبر — ۷ |

شائقین حج نمبر سے!

(۱) آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ جب گذشتہ سال الفرقان کا حج نمبر پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اعلان کیا تھا کہ آپ حضرات ۸ ر کے ٹکٹ ارسال فرما دیجئے تاکہ پہونچنے نہ پہونچنے کا سوال ہی درمیان سے اٹھ جائے۔۔۔ لیکن افسوس کہ ایسے حضرات کم ہی نکلے جنھوں نے اس گزارش پر توجہ فرمائی ـــــ اور جنھوں نے توجہ فرمائی ان کو بغیر کسی زحمت کے پرچہ ملا۔ بہرحال۔ یہ سوچ لینا کہ جب ہر ماہ پرچہ مل جاتا ہے تو حج نمبر بھی مل ہی جائے گا. ایک بھول ہے۔ پوسٹ آفس کا نظام آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اس لیے آپ براہ کرم ۸ ر بذریعہ منی آرڈر (یہ اسلیے کہ گذشتہ سال کچھ لفافے گم ہو گئے تھے) روانہ فرماد یجیے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کو یہ چار آنے اس بارے جو حج نمبر گم ہو جانے سے الفرقان پر پڑے گا زیادہ عزیز نہ ہوں گے۔

(۲) **پاکستانی احباب** | حج نمبر کی رجسٹری فیس ۸ ر بذریعہ منی آرڈر حسب ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔
حاجی عبدالجبار صاحب (بی اے) اینڈ جی نفس الھما کمپنی سائوتھ نیپیر روڈ کراچی پاکستان)

(۳) مالی مشکلات کی وجہ سے حج نمبر ضرورت سے زیادہ نہیں چھپ رہا ہے، اس لیے ہم نہ پہونچنے کی کسی بھی شکایت کی تعمیل نہ کر سکیں گے۔ اگر کسی صاحب کو حج کا پیاں نہ منظور ہو تو فوراً آرڈر دیں۔

(۴) منی آرڈر فارم ان تمام خریداروں کو روانہ کیا جا رہا ہے جن کی مدت خریداری شعبان پر ختم ہو رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ تساہل سے کام نہ لیتے ہوئے جلد سے جلد اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر حج نمبر کی تیاری میں تعاون فرمائیں گے۔ ـــــ ناظم

نوٹ :- منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری اور پتہ صاف و خوشخط ضرور لکھیے۔ ورنہ اندراجات میں کوتاہی کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی ـــ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ سے شائع کیا۔

حج نمبر کی تیاری میں تاخیر

(از ناظم دفتر الفرقان)

گزشتہ اشاعت (بابت جمادی الاخریٰ) میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس سال کا "حج نمبر" انشاء اللہ آخر شعبان یا شروع رمضان میں شائع ہو جائے گا۔ [illegible] ترتیب — اس کی تیاری بھی شروع کر دی گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ چند [illegible] پیش آگئیں جن کو حل کرنے سے ہم قاصر رہے۔ ان میں سب سے بڑی مشکل اور مجبوری یہ پیش آئی کہ "حج نمبر" کی تیاری کے لیے قریباً ڈیڑھ ہزار روپے درکار تھے — ادھر رجب میں ہم کو دفتر الفرقان کی بعض رقوم کی وصول یابی کی امید تھی اور چند مخلصین نے اپنے اپنے مقام سے ایک معقول تعداد میں نئے خریدار پیدا کرنے اور اپریل میں ان کی چندہ کی مجموعی رقم دفتر الفرقان کو بھیج دینے کا بھی ذمہ لیا تھا۔ خیال تھا کہ یہ سب رقمیں امید کے مطابق آخر رجب تک وصول ہو جائیں گی اور "حج نمبر" کی تیاری میں ان سے خاص مدد مل جائے گی۔ لیکن وہ احباب غالباً اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور یہ رقمیں آج تک بھی کہ شعبان کے تین ہفتے گزر چکے ہیں، دفتر الفرقان میں نہیں پہنچی ہیں اس لیے مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ ماہ رجب کا پرچہ اس وقت شائع کر دیا جائے۔ اور "حج نمبر" کو بجائے رجب و شعبان کے اب شعبان و رمضان کی مشترک اشاعت قرار دے دیا جائے

لہٰذا اب "حج نمبر" انشاء اللہ سال گزشتہ کی طرح شوال میں ہی شائع ہو سکے گا

اگرچہ اس تاخیر سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ انشاء اللہ زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل شکل میں نکل سکے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اس مجبورانہ تاخیر پر سخت رنج و افسوس ہے ہمارا ارادہ اور پروگرام یہ تھا کہ ہم رمضان سے پہلے اس کو شائع کر دیتے لیکن مجبوری معذوری۔

گزشتہ سال کے حج نمبر کے کچھ نسخے باقی ہیں اور جن حضرات نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حج کے موضوع پر وہ کیسا عجیب و غریب اور شوق انگیز مجموعہ ہے اور عازمین حج کے لیے وہ کیسا بیش بہا تحفہ ہے۔ جو صاحب اس کو منگائیں گے وہ اپنے اوپر احسان کریں گے قیمت عہ

ناظم کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

اگر آپ چاہیں تو مندرجۂ ذیل طریقوں سے "حج نمبر" کی تیاری میں ہماری مدد کر سکتے ہیں

(۱) اگر آپ کے ذمہ دفتر الفرقان کا کوئی حساب باقی ہو تو براہ کرم اس وقت اس کو فوراً ادا فرما دیجئے، خصوصیت سے پاکستان کے ناظرین الفرقان میں سے قریباً دو سو حضرات کے ذمہ الفرقان کا چندہ باقی ہے اور بہت سے حضرات کے [illegible] اگر یہ سب احباب حج نمبر کی تیاری میں مدد و ہمارا کی نیت سے یہ رقمیں اس وقت ادا فرما دیں تو ان کی طرف سے کارکنان الفرقان کی [illegible] جیسا کہ پہلے بھی اطلاع دی جا چکی ہے پاکستان کے حضرات الفرقان اور کتب الفرقان کی تمام رقمیں مندرجۂ ذیل پتہ پر کراچی روانہ کریں اور دفتر الفرقان کو کارڈ کے ذریعہ اطلاع دیں۔ جناب حاجی عبد الجبار صاحب ایس جے۔ اینڈ جی فضل الٰہی کمپنی۔ صابو صدیق میر روڈ کراچی۔

(۲) اگر کوشش کر کے ایک دو جدید خریداروں کا چندہ آپ اس وقت (وسط رمضان تک) روانہ فرما سکیں تو دریغ نہ فرمائیں۔ احباب مخلصین کی معمولی کوششوں سے اگر صرف دو تین سو نئے خریداروں کا چندہ بھی اس وقت آ جائے تو انشاء اللہ "حج نمبر" کے مصارف کا مسئلہ بڑی حد تک اس سے حل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ گزارش صرف ان ہی مخلص احباب سے ہے جن کو اس کوشش میں گرانی اور زحمت محسوس نہ ہو یا جو اس گرانی اور زحمت کو ایک دینی کام سمجھ کر خوشی سے برداشت کر سکیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ ہر نئے خریدار کو "حج نمبر" کے مطالعہ کے بعد محسوس ہو گا کہ پانچ روپیہ میں صرف حج نمبر بھی ملتا تو سودا زیادہ گراں نہیں ہے!

(۳) کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات کی مکمل فہرست رسالہ ہذا کے صفحہ ۵ پر دی جا رہی ہے ان میں سے خاص خاص اور اہم مطبوعات کا تعارف بھی اس رسالہ کے ٹائٹل کے صفحات پر آپ کی نظر سے گزرے گا آپ ان میں سے جو کتابیں چاہیں کہ پسند کر کے اپنے لیے پسند کریں اور منگوانا چاہیں تو اسی وقت منگوا لیں۔ ان میں خصوصیت سے چار کتابیں جو ابھی تیار ہوئی ہیں ایسی ہیں کہ ہر مخلص دوست کو بلکہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ان کی خریداری کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ کلمہ طیبہ کی حقیقت۔ نماز کی حقیقت۔ ارشادات حضرت مولانا محمد الیاسؒ۔ اسلام کیا ہے؟۔ ان میں سے آخری کتاب کی زبان سادہ، آسان ہے معمولی پڑھے لکھے بلکہ بے پڑھے لوگ بھی انشاء اللہ سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی ضروری تعلیمات اس میں ایسی جامعیت سے آگئی ہیں کہ ان پر عمل کر کے ایک آدمی ولی بھی ہو سکتا ہے باقی تین کتابوں سے صرف تعلیم یافتہ حضرات ہی پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس لیے کم پڑھے لکھے لوگ ان کو نہ منگوائیں ان سب کتابوں کا پورا تعارف ٹائٹل کے آخری صفحوں پر دیکھا جائے۔

اس وقت کی خاص رعایت | چونکہ حج نمبر کی تیاری کے لیے ہم کو روپیہ کی فوری ضرورت ہے اس لیے یہ طے کیا ہے کہ رمضان تک جن حضرات کی فرمائشیں دفتر الفرقان میں پہنچ جائیں گی ان کو اپنی مطبوعات پر ہم ۲۰ فی روپیہ کمیشن دیں گے واضح رہے کہ دوسرے اداروں اور کتب خانوں کی مطبوعات پر کوئی کمیشن نہیں دیا جا سکے گا۔

خاکسار ناظم الفرقان و کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

[الفرقان کا [illegible] اپنے ناظرین کی خدمت میں ان شاء اللہ ایسے وقت پہنچے گا کہ اللہ کا رحمت والا مہینہ رمضان مبارک شروع ہونے والا ہو گا۔ یا شروع ہو چکا ہو گا۔ اس لیے جی چاہا کہ اس دفعہ "نگاہ اولیں" کے صفحات میں اس موسم رحمت ہی کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معمول تھا کہ جب یہ ماہ مبارک شروع ہوتا تو آپ اس کی رحمتوں اور برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی طرف صحابہ کرام کو خصوصیت سے توجہ دلاتے اور اس کے لیے مخصوص خطاب فرماتے اس سلسلے کے بعض نبوی خطبے ذخیرۂ حدیث میں آج تک محفوظ ہیں]

ماہ رمضان

روزہ ——— تراویح ——— اعتکاف

دوسرے تمام مہینوں کے مقابلہ میں رمضان مبارک کا بڑا امتیاز اور اس کی خاص فضیلت اور اہمیت جو قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا آخری اور مکمل ہدایت نامہ قرآنِ مجید اسی مہینہ میں نازل ہوا۔ یعنی اس کا نزول اسی مہینہ کی ایک مقدس رات میں شروع ہوا۔

شہر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن ھدی للناس وبیّنٰت من الھدیٰ والفرقان (البقرہ ع ۲۳)	رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راستہ کی اور فیصلہ کرنے والا حق و باطل میں۔

اپنے اسی امتیاز کی وجہ سے رمضان مبارک، روزوں کے لیے مخصوص کیا گیا اور ایمان والوں کو حکم دیا گیا۔

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (البقرہ ع ۲۳) — تم میں سے جو اس مہینے میں موجود ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ضرور روزہ رکھے۔

گویا رمضان کے روزے اور اس سلسلہ کے دوسرے خاص اعمال، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت تنزیلِ قرآن کا شکریہ اور اس واقعۂ عظیمہ کی یادگار ہیں۔

رمضان کے [illegible] فرض کیے گئے ہیں لیکن ان کے علاوہ اس مہینہ کی ہر رات میں ایک نفل نماز کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ اور اس کا ایک خاص نظام بھی مقرر کر دیا گیا ۔۔ یعنی تراویح! اور ایمان و احتساب کی شرط کے ساتھ ان دونوں چیزوں کے ادا کرنے پر جنت کا بھی وعدہ دیا گیا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان فرمایا۔

من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ و من قام رمضان ایماناً و احتساباً غفر لہ ما تقدم من ذنبہ (بخاری و مسلم)

جو کوئی ایمان و احتساب کی صفت کے ساتھ ماہِ رمضان کے روزے رکھے تو اس کے پہلے سب گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور اسی طرح جو کوئی ایمان و احتساب کی صفت کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد) پڑھے تو اسکے سب پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ایمان و احتساب کی صفت کے ساتھ کسی نیک کام کے کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عمل پر اللہ تعالیٰ نے جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہو اور قرآن و حدیث میں اسکے اثر یا نتیجہ کی امید دلائی گئی ہو اس پر ایمان و یقین رکھتے ہوئے اور اسی کی طلب و امید میں وہ عمل کیا جائے پس رمضان کے روزوں اور تراویح کا جو اجر و ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے اس پر یقین رکھتے ہوئے اور اسی کی طلب و امید میں جو شخص رمضان کے روزہ رکھے اور رات کو نوافل پڑھے اسکے لیے یہ بشارت ہو کہ اسکے سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

لیکن ان دونوں عملوں کے قبول ہونے کے لیے اور ان کے نتیجہ میں مغفرت اور جنت حاصل ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں اگر وہ پوری نہ ہوئیں تو پھر روزہ اور تراویح کا نتیجہ بھوک، پیاس اور شب بیداری کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

رب صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع
ورب قائم لیس لہ من قیامہ الا السہر
(ابن ماجہ)

بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے روزوں کا حاصل بھوک کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور بہت سے راتوں کے عبادت گذار ایسے ہوتے ہیں جنکو شب بیداری کی زحمت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ان شرطوں میں سب سے بڑی شرط تو وہی ایمان و احتساب کی شرط ہے جو در اصل ہر نیک عمل کی جان ہے اور اسکے بغیر ہر بڑے سے بڑا عمل بے روح ہے اور اللہ کے یہاں اسکی کوئی قیمت نہیں ہے اسکے علاوہ روزہ کی قبولیت کی شرط ایسے ہی یہ بھی ہے کہ روزہ دار کھانا پینا چھوڑنے کے ساتھ تمام بری باتوں اور برے کاموں سے بھی پرہیز کرے، حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہ
فلیس للہ حاجۃ ان یدع طعامہ و
شرابہ (بخاری)

جو شخص روزہ کی حالت میں غلط باتیں بولنے اور غلط کام کرنے سے پرہیز نہ کرے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

لیس الصیام من الاکل والشرب انما
الصیام من اللغو والرفث

روزہ صرف کھانے پینے ہی سے باز رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ روزہ یہ ہے کہ تمام بیہودہ اعمال اور گندی باتوں سے بھی بچے۔

الغرض روزہ اگر ایمان واحتساب کے ساتھ ہو اور اس کے دوسرے شرائط بھی پورے کیے گئے ہوں یعنی روزہ دار نے ہر قسم کی بری باتوں برے کاموں سے بھی اپنے جسم اور اپنی روح کو بچایا ہو تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت بڑا اور بندہ کو اللہ کے قرب و رضا کے بلند سے بلند مقام تک پہونچانے والا ایک غیر معمولی روحانی عمل ہے اور ایسے ہی روزوں کے متعلق حدیث قدسی میں ہے۔

الصوم لی وانا اجزی بہ

روزہ دار کا روزہ بس میرے لیے ہے اور میں خود اپنے ہاتھ سے اس کا صلہ دوں گا۔

سبحان اللہ جس روزہ دار کے متعلق اللہ تعالی یہ فرمائیں کہ اس کا روزہ میرے ہی لیے تھا اور یہ بندہ میرے ہی واسطے بھوکا پیاسا رہا تھا اور میں خود بلا واسطہ اسے انعام سے نوازوں گا۔ اسکی

خوش بختی اور بلند نصیبی کا کیا کہنا۔

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہو
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہو

روزہ اور تراویح کے علاوہ ماہ رمضان کا تیسرا خاص عمل اعتکاف ہے۔ اعتکاف کی روح اور حقیقت بس یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں جو پہلے دونوں عشروں سے بھی افضل ہے اور جس میں اللہ کی رحمت و مغفرت اور بخشش و کرم کا سمندر اتھاہ جوش پر ہوتا ہے، بندہ اپنے مولا کے در پر دھرنا دے کے پڑ جائے یعنی کسی مسجد میں اپنے کو مقید کر دے اور بشری حوائج کے سوا کسی اور ضرورت سے کبھی وہاں سے قدم نہ نکالے۔ اور جس طرح جسم مسجد میں مقید رہے اسی طرح روح و دل بھی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور اس کی رضا جوئی کی فکر میں ڈوبا رہے۔ اس کی عبادت ہو اس کی تسبیح و تقدیس ہو۔ اس سے دعائیں اور التجائیں ہوں، توبہ و استغفار ہو۔ الغرض اپنے ظاہر و باطن کو تمام ماسوا اللہ سے منقطع کر کے کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے کو اللہ کے در پہ اس کے حضور میں ڈال دے۔ روئے، گڑگڑائے اور مانگے جو مانگنا چاہے اور پھر رب کریم کی شان کرم کا تماشہ دیکھے۔

قدح باں بے بہرہ انداز جرعہ کاس الکرام
ایں تطاول بیں کہ با عشاق مسکیں کردہ اند

رمضان مبارک کی دو خصوصیتیں بہت زیادہ قابل قدر ہیں اور ان کی قدر نہ کرنا اور فائدہ نہ اٹھانا یقیناً بڑی محرومی ہے۔ ایک یہ کہ اس میں ہر نیک عمل کا ثواب غیر معمولی طور پر بڑھا دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ میں ہے کہ آپ نے رمضان کی خاص رحمتوں اور برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس میں ہر نفل نیکی کا ثواب فرض کے برابر کر دیا جاتا ہے اور ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے۔

دوسری قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ رمضان میں گناہوں اور سیہ کاریوں کی بخشش کا قانون بہت ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اور چند خاص قسم کے باغیوں اور سرکشوں کے سوا معافی مانگنے پر ہر بندہ کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ نیز دوسری عام دعائیں بھی دوسرے زمانوں کی بہ نسبت

اس مبارک مہینہ میں زیادہ سنی جاتی ہیں۔ پس بڑا محروم اور بے نصیب ہو وہ جو رحمت کے اس مہینہ میں بھی اعمالِ خیر سے غفلت برتے اور گناہوں کی معافی مانگ مانگ کے بخشش حاصل کرنے میں کمی کرے حدیث میں ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

بعد من ادرك رمضان فلم يغفرله

محروم ہو اور اللہ کی رحمت سے دور ہو وہ شخص جس نے رمضان پایا اور اللہ کی مغفرت [illegible] نہ لے سکا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۴

اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

خوشخبری ہو اور آخرت میں بھی یعنی یہ دونوں جہانوں میں اچھے حال میں رہیں گے (یہ اللہ کی بات ہو اور اس کا وعدہ ہو) اور اللہ کی باتیں اٹل ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ایمان و تقوی والوں کی دنیا اور آخرت میں یہ کامیابی بڑی کامیابی ہو۔

حضرات! اس آیت میں کتنے صاف صریح طریقہ سے اعلان فرمایا گیا ہو کہ ایمان اور تقویٰ والی زندگی اختیار کرنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی خوف اور غم نہیں، اللہ سے تعلق درست کر لینے کے بعد دنیا اور آخرت کے ہر خوف اور غم سے نجات حاصل ہو جانا یقینی ہو۔ اگر افراد میں یہ چیز ہو گی تو اس کا ظہور افراد ہی کے پیمانہ پر ہو گا جس کو خود وہی محسوس کریں گے اور اگر یہ چیز قوم میں پیدا ہو جائے تو پوری قوم کو یہ نعمت حاصل ہو گی ـــــ اللہ تعالیٰ ان ایمانی حقیقتوں کو سمجھنے اور ان پر یقین کرنے کے لیے ہمارے سینے کھول دے اور اس راہ پر چلنا ہمارے لیے آسان فرما دے۔

اللّٰھمّ لا سھل الا ما جعلتہ سھلاً و انت تجعل الحزن سھلاً اذا شئت لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم ہ

ہماری موجودہ مشکلات

کا

ایک یقینی حل

[ناچیز مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو ماہ رجب میں ایک ایسے مقام پر کی گئی تھی کہ وہاں کے مسلمان اپنے کو مشکلوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا محسوس کر کے کثرت سے وطن چھوڑ رہے تھے]

(خطبۂ مسنونہ کے بعد)

بزرگو - دوستو - اور عزیزو!

ہم اور آپ بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمان اس وقت جن حالات سے گزر رہے ہیں اور جن مشکلوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہیں اُن پر غور کرنے اور ان کا حل سوچنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک اُن عام انسانوں کا طریقہ ہے جو صرف ظاہری اور مادی اسباب و تدابیر ہی کو جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اُس کی قدرت کے ان خاص قوانین سے وہ آشنا نہیں ہیں جن کا علم انبیاء علیہم السلام کو ہوتا ہے یا اُن کے ان امتیوں کو جو اُن سے یہ علم حاصل کریں اور اس پر یقین لائیں۔

اور دوسرا طریقہ انبیاء علیہم السلام کا اور ان کی باتوں پر ایمان لانے والوں کا ہے جو ظاہری اسباب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اس خاص قانونِ قدرت پر بھی یقین رکھتے ہیں جس سے خدا ناشناس لوگ ناواقف ہیں۔

اس دنیا کے ظاہری اسباب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے جس خاص قانونِ قدرت کا میں حوالہ دے رہا ہوں پہلے اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے! دیکھئے! بارش کے جو ظاہری اسباب ہیں اُن کو ہم آپ سب اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے جانتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب موسم سخت گرم ہوتا ہے تو سمندر سے کچھ بخارات اٹھتے ہیں جو بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں پھر ہوائیں اُن کو جوڑ کے کسی خاص سمت کو لے جاتی ہیں پھر نہیں جا کر وہ برس جاتے ہیں۔ تو بارش کا یہ ظاہری قانون تو ہم آپ سب ہی جانتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السّلام نے بارش ہی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ایک خاص قانون اور بھی بتلایا ہے جس سے عام لوگ بالکل واقف نہیں ہیں اور وہ یہ کہ کسی علاقہ کے لوگ اگر اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں اور نیکی کا راستہ اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان پر بارشیں بھیجتا ہے اور ان کی کھیتیوں کو سیراب کرتا ہے اور ان کی پیداوار اور دولت میں اضافہ فرماتا ہے اور ان کی نسل بھی بڑھاتا ہے جس سے ان کی طاقت اور تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں کئی نبیوں کی زبانی اللہ تعالیٰ کے اس خاص قانون کا ذکر کیا گیا ہے سورہ نوح میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا۔

اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔

اے میری قوم کے لوگو، تم اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو وہ بہت بخشنے والا ہے پھر وہ تم پر خوب بارش بھیجے گا اور تمھارے مال و دولت اور تمھاری اولاد میں زیادتی دے گا اور تمھارے لئے باغات اور نہریں بنا دیگا۔

اسی طرح سورۂ ہود میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ہودؑ پیغمبر نے اپنی

قوم سے فرمایا تھا۔

يَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ۔

اے میری قوم کے لوگو تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو پھر توبہ کرکے اس کی طرف پلٹ جاؤ وہ تم پر خوب بارشیں بھیجے گا اور تمہاری قوت میں تمہاری طرف سے بہت بڑی قوت کا اضافہ کردے گا۔

تو اللہ تعالیٰ کے ان دو پیغمبروں (حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ) کے ان بیانات سے معلوم ہوا کہ بارش کے جن ظاہری اسباب کو عام دنیا والے جانتے ہیں ان کے علاوہ بارش ہونے کا ایک سبب استغفار اور توبہ بھی ہے ——— اور انہی آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ استغفار اور توبہ کی وجہ سے قوموں کی دولت اور تعداد اور طاقت میں بھی اضافہ کردیا جاتا ہے۔ حالانکہ عام دنیا والے دولت اور طاقت بڑھنے کے جن ظاہری اسباب کو اور جن تدبیروں کو جانتے وہ اور ہیں بہرحال اللہ تعالیٰ کا یہ خاص قانون کہ وہ کسی قوم کی توبہ اور استغفار سے اس کی تعداد اور دولت اور طاقت میں اضافہ کردیتا ہے صرف انبیاء علیہم السلام ہی نے بتلایا ہے۔

اب اگر آپ نے اس تفصیل سے میری یہ بات سمجھ لی ہے کہ اس مادی دنیا کے ظاہری اسباب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص قانونِ قدرت بھی ہے جس کا علم براہ راست صرف انبیاء علیہم السلام کو ہوتا ہے تو اب میں پھر اپنی یہ بات دہراتا ہوں کہ جن پریشانیوں اور مشکلوں میں ہم ہندی مسلمان اس وقت گھرے ہوئے ہیں ان کے بارہ میں غور کرنے اور سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ صرف ظاہری اسباب پر یقین رکھنے والے خدا ناشناس لوگوں کا ہے اور دوسرا طریقہ انبیاء علیہم السلام اور ان پر سچا ایمان رکھنے والوں کا ہے جن کو

ظاہری اسباب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اس خاص قانون پر یقین حاصل ہوتا ہے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے۔

اب ہمیں اپنے موجودہ مسائل اور اپنے حالات پر غور کرنے سے پہلے اپنی پوزیشن اور اپنی حیثیت متعین کر لینی چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ آپ صرف ظاہری اسباب و تدابیر ہی پر یقین رکھنے وال[illegible] ہیں اور بس اسی راہ سے اپنے موجودہ مشکلات کا [illegible] چاہتے ہیں تو میں صاف عرض کرتا ہوں کہ اس بارہ میں میں آپ کو کوئی ایسا مشورہ نہیں دے سکتا جس پر خود میرا دل پوری طرح مطمئن ہو۔ میں نہ خود دھوکے میں ہوں اور نہ آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہوں بلاشبہ راستہ سخت تاریک ہے اور مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ ہم صرف ظاہری اسباب کے سہارے ان مشکلات کو اس وقت عبور کر سکیں گے۔

اس لئے میرا روئے سخن صرف اُن حضرات کی طرف ہے جو اسباب کے علاوہ خالقِ اسباب کو بھی جانتے اور مانتے ہیں اور انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم و ہدایت کے مطابق اس کی قدرتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

اُنھیں سب سے پہلے تو اپنے دل میں اس عقیدہ کو تازہ کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس سارے عالم کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا ہے اور اس دنیا میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس کے علم اور اُس کے حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس ہم مسلمان اس وقت جن حالات میں ہیں یہ بھی بلاشبہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ تو ہمیں اس ملک میں عزت اور عافیت سے رکھنا چاہتا ہو لیکن کچھ لوگ اتنے زبر ہو گئے ہوں کہ وہ اللہ کی چلنے نہ دیتے ہوں اور وہ ہمارے لئے ذلتوں اور پریشانیوں کا باعث بنا رہے ہوں۔ بلکہ ہمیں یقین کے ساتھ جاننا چاہیئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اُس کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہو رہا ہے۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ط تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ تُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ط

پھر ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ ظالم نہیں ہے کہ بلا قصور کسی قوم اور کسی امت کو ذلتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرے۔ بلکہ قوموں پر برے حالات ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آتے ہیں قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا	اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ
وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ط	آدمی خود اپنے پر ظلم کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہمیں جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی مقدس کتاب میں جا بجا اپنے اس قانون کا ذکر فرمایا ہے کہ جب کوئی قوم اور امت اللہ سے بندگی کا عہد کرکے اور اس کے دین پر چلنے کا اقرار کرکے نافرمانی اور عہد شکنی کی زندگی اختیار کرلیتی ہے تو وہ اللہ کی نظر کرم سے گر جاتی ہے اور لعنت کی مستحق ہو جاتی ہے پھر اس پر جب برے حالات آتے ہیں تو اللہ اس کی مدد نہیں کرتا۔ قرآن شریف میں بنی اسرائیل پر غضب اور لعنت کا جہاں جہاں ذکر آتا ہے اُس سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِیْثَاقَھُمْ	ہم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے
لَعَنّٰھُمْ	اُن کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ	جو لوگ اللہ سے کیا ہوا عہد پختہ
مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ	کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اللہ

مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَ لَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ

نے جن تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ان کو قطع کرتے ہیں اور زمین میں (اپنی بدعملی اور سرکشی سے) فساد پھیلاتے ہیں اُن کے لئے لعنت ہے اور اُن کے واسطے برا ٹھکانہ ہے

اور سورہ بقرہ کے نویں دسویں رکوع میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو یہ احکام دیئے تھے ان میں سے اکثر کی نافرمانی کی اور صرف ایک حکم پر انھوں نے عمل کیا ـــــ پھر (اللہ کے احکام کے ساتھ بنی اسرائیل کا یہ طرزِ عمل بیان کرنے کے بعد) ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے اُن کی جزا اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ دنیا کی زندگی میں رسوا ہوں اور قیامت کے دن سخت عذاب میں ڈالے جائیں اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر اور غافل نہیں ہے

بہرحال ہم مسلمانوں کو اپنی موجودہ مصیبتوں اور پریشانیوں پر غور کرتے وقت اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کا اصلی اور حقیقی سبب ہماری نافرمانی اور عہد شکنی والی یہ زندگی ہے جو ہم صدیوں سے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اسلئے اِن مشکلوں اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس طرز زندگی کو چھوڑنے کا فیصلہ کریں، اب تک کی بداعمالیوں اور نافرمانیوں کی اللہ سے معافی چاہیں اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کریں۔ قرآن پاک میں صاف صاف وعدہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی قوم اس طرح استغفار اور توبہ کرکے اپنے معاملہ کو اللہ سے درست کرلے تو اللہ تعالےٰ اِس کو اس دنیا

میں بھی اچھی عزت اور اطمینان والی زندگی مرحمت فرمادیں گے۔ سورۂ ہود کے بالکل شروع میں ارشاد ہے۔

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ	اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اپنے پروردگار سے پھر توبہ کرکے رجوع ہوجاؤ اُس کی طرف۔ وہ تم کو دنیا کی اچھی زندگی دے گا

اور اچھی طرح اس کو برتنے کا موقع دے گا ایک مقررہ مدت تک۔ اور جو خاص فضل کے مستحق ہوں گے ان کو خاص فضل سے نوازے گا۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔	اور جو لوگ اللہ سے ڈریں اور تقوے کی زندگی اختیار کرلیں، اللہ اُن کے لئے مشکلوں اور مصیبتوں

سے نکلنے کی راہیں پیدا کرے گا۔ اور ان کو ایسے طریقوں سے رزق دے گا جو اُن کے گمان میں بھی نہ ہوں گے۔

غور کیجئے! اس وقت اس ملک میں ہماری پریشانیاں عموماً دو طرح کی ہیں۔ ایک جان و مال اور عزت و آبرو کے خطرے۔ اور دوسرے روز بروز معاش کے وسائل کا کم ہونا۔ پڑھا لکھا ملازم پیشہ طبقہ کہتا ہے کہ اس پر ملازمت کے دروازے بند کردیئے گئے ہیں اور جو کہیں لگے ہوئے ہیں ان کو بھی نکالنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں۔ کاریگر طبقہ کہتا ہے کہ کارخانہ دار ہندو ہمیں کام کام نہیں دیتے۔ تجارت پیشہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہماری تجارتوں کو ختم کردینے اور فیل کردینے کی ایک پوری سازش ہے اور ہم اس کے مقابلہ سے عاجز ہیں۔

میں ان میں سے کسی بات کی بھی تردید نہیں کرتا، میں مانتا ہوں کہ واقعات اسی طرح کے ہیں لیکن اسی کے ساتھ میں آپ سے یہ کہتا

ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی مشکلات سے نکلنے اور روزی ملنے کی جو تدبیر اس آیت میں بتلائی ہے (یعنی تقوے والی زندگی اختیار کرنا۔ ذرا دل کے یقین کے ساتھ اُس پر عمل کر کے تو دیکھو پھر دیکھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے کیسی نئی نئی راہیں پیدا ہوتی ہیں اور کتنے دروازے کھلتے ہیں۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ　　اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے

وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ　　تو اللہ تمھاری مدد کرے گا اور

تمھارے پاؤں جما دے گا

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی قوم اور کوئی جماعت، اللہ کے دین کی مدد میں لگ جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا اور اس کے حالات ایسے کر دے گا کہ اس کے پاؤں اکھڑنے نہ پائیں گے۔

پس اگر اللہ و رسول کی اِن باتوں پر ہم کو یقین ہے کہ استغفار و توبہ اور تقوے والی زندگی اور اللہ کے دین کی خدمت میں لگ جانے سے ہماری مشکلیں حل ہو سکتی ہیں اور ہماری مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں اور ہمارے لئے روزی کے دروازے کھل سکتے ہیں اور اللہ کی مدد ہم کو حاصل ہو سکتی ہے تو پھر ہم بڑے بدنصیب ہوں گے اگر اس کا فیصلہ نہ کریں اور پورے قوم کو اس راہ پر لگانے کی کوشش نہ کریں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

میرا مشورہ ترکِ اسباب کا نہیں ہے

اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اپنے حالات درست کرنے اور موجودہ مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لئے ظاہری اسباب و تدابیر کے راستہ سے جو کوشش اس وقت کی جا سکتی ہیں،

وہ ہم نہ کریں اور بس توبہ و استغفار کو وظیفہ بناکے اللہ پر "توکل" کر کے بیٹھ جائیں۔ توکل کے یہ معنی بالکل غلط ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے اللہ و رسول کا ہرگز یہ حکم نہیں ہے۔ اور میرا ہرگز یہ مشورہ نہیں ہے —— میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس وقت صرف ظاہری اسبابی کوششوں سے یہ حالات نہیں بدل سکتے۔ اور ہم ان مشکلوں سے نجات نہیں پا سکتے جبتک کہ ہم زندگی میں ایسی تبدیلی نہ کریں جس سے آسمان کے فیصلے بدل جائیں اور ہم اللہ کی مدد اور رحمت کے مستحق ہو جائیں۔

اور قرآن پاک نے اس کی صورت یہی بتلائی ہے کہ ہم پچھلی زندگی کی بداعمالیوں سے سچی توبہ کریں، اللہ سے معافی چاہیں، آئندہ کے لئے تقوے والی زندگی اختیار کریں اور اللہ کے دین کی خدمت اور اس کو رواج دینے کے اس کام میں لگیں جس کے لئے دراصل ہم پیدا کئے گئے ہیں —— جب ہم ایسا کریں گے تو اللہ کی رحمت اور مدد ہماری طرف متوجہ ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موجودہ پریشانیوں اور مشکلوں سے نکلنے کے لئے اور عزت و اطمینان کی زندگی حاصل کرنے کے لئے جو ظاہری کوششیں اور تدبیریں ہم کریں گے اللہ تعالےٰ کی مدد سے وہ کامیاب ہوں گی —— تدبیر کرنا اور ظاہری اسباب کے راستہ سے جد و جہد کرنا تو خود اللہ کا حکم ہے لیکن مومن کی شان یہ ہے کہ وہ یہ یقین رکھے کہ میری تدبیر اور کوشش جب ہی کامیاب ہوگی جب اللہ تعالےٰ چاہیں گے۔ اور جیسا کہ میں نے بتلایا عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم اللہ سے اپنا معاملہ درست کرلے اور اس کی رضا کے راستہ پر چلنے لگے تو اللہ تعالےٰ اس کی تدبیروں کو کامیاب کرتے ہیں اور اپنی خاص رحمت اور مدد سے اس کو مشکلوں سے نجات دیتے ہیں۔ تو میرا مشورہ ہرگز تدبیر اور ظاہری کوشش چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ میری گذارش یہ ہے کہ جب تک اللہ کی رحمت اور مدد کے قابل ہم اپنے کو نہ بنائیں گے کوئی تدبیر بھی ہم کو نجات نہیں دلا سکے گی۔

بلکہ اگر آپ غور کریں تو خود سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی میں یہ تبدیلی جس کی میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں یہ ایک طرح کی ظاہری تدبیر بھی ہے۔ ذرا سوچئے جب ہم توبہ و استغفار کر کے حقیقی ایمان اور تقوے والی زندگی اختیار کرلیں گے تو اُس کی عملی صورت یہی تو ہوگی کہ اللہ پر اور اس کی قدرت پر ہمیں پورا یقین ہوگا۔ اللہ کے سوا ہر چیز کا اور موت کا ڈر ہمارے دل سے نکل جائے گا۔ اللہ پر ہمیں پورا بھروسہ ہوگا۔ ہماری ہمتیں بلند اور ہمارے دل مضبوط ہوں گے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہم اللہ و رسول کے احکام کے مطابق چلیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری پوری زندگی ایمانداری اور خدا پرستی کی زندگی ہوگی۔ ہم ہر معاملہ میں سچائی اور انصاف سے کام لینے والے اور اللہ کے لئے غریبوں مفلسوں سے ہمدردی کرنے والے ہوں گے ہم میں سے جن کے پاس کچھ دولت ہوگی وہ ضرورتمندوں کو بلا سود قرضے دیں گے۔ بے کاروں کے لئے کاروبار مہیا کرنے میں مدد دیں گے مفلسوں اور معذوروں کی صدقات سے مدد کیا کریں گے کیوں کہ اسلام نے دولت مندوں کو یہ سب احکام دیئے ہیں۔ اسی طرح ہم میں جو تاجر ہوں گے وہ دھوکہ بازی کی تجارت نہیں کریں گے کسی کو فریب نہیں دیں گے چور بازاری نہیں کریں گے۔ غرض ان کی تجارت سچائی اور ایمانداری کی تجارت ہوگی۔ اسی طرح ہم میں سے جو ملازم ہوں گے وہ پوری محنت اور دیانت داری سے اپنا کام انجام دیں گے۔ جن کو حکومت کا کوئی عہدہ سپرد کیا جائے گا وہ رشوت نہیں لیں گے اور ہمیشہ انصاف کے ساتھ فیصلے کریں گے۔ اسی طرح ہم میں جو مزدور ہوں گے وہ صرف نوکری چھوٹنے کے ڈر سے نہیں بلکہ خدا کے مواخذہ سے ڈر کر اپنی ڈیوٹی محنت سے انجام دیں گے ہم میں جو پیشے والے ہونگے وہ بات کے پکے اور ہاتھ کے سچے ہوں گے اور یہ سب کچھ وہ اپنے ایمانی ضمیر کے تقاضے اور خدا کے خوف سے آخرت کے حساب کتاب کے ڈر سے کریں گے۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس دنیا میں آج اگر کوئی قوم ایسی زندگی رکھنے والی موجود ہو تو یقیناً سب کے مقابلہ میں

وہ ہی چمکے گی ۔ دوسرے لوگ اس کی قدر اور عزت کرنے پر مجبور ہوں گے ۔ اس کے تاجر دوسرے تاجروں کے مقابلہ میں کامیاب رہیں گے ۔ وہ اگر ملازمتیں اور عہدے نہیں بھی چاہیں گے تو جمہور عوام انھیں مجبور کریں گے ۔ اور ذمہ داریاں ان کے سپرد کی جائیں گی ۔ ہر موقع پر اور ہر ضرورت کے وقت سب سے پہلے انہی کو پوچھا جائے گا ——— لیکن یہ سب کچھ جب ہو گا کہ دس پانچ برس کے تجربہ سے دنیا یہ جان لے کہ آپ وہ نہیں رہے جو کہ تھے بلکہ اب آپ کی زندگی دنیا سے ممتاز ہو گئی ہے اور آپ نے ہر معاملہ میں ایمانداری، خدا پرستی اور سچائی کو اپنی زندگی کا اصول بنالیا ہے ——— اور صرف دس بیس[۲۰] آدمیوں کے ایسا بن جانے سے بھی یہ نتائج نہیں نکل سکتے ۔ اللہ کے فضل سے کچھ نہ کچھ تو اب بھی ہم میں ایسے موجود ہیں جن کی زندگی ایمان اور تقوے والی زندگی ہے ——— اس لئے حالات کی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ قوم کی اکثریت یا کم از کم قوم کے اُس متوسط طبقہ کی زندگی درست ہو جو قوم کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا عام دنیا سے واسطہ پڑتا ہے ۔

بہرحال اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس پوزیشن میں ہیں اور جن حالات میں وہ اپنے کو گھرا ہوا پا رہے ہیں اُن سے نجات پانے اور عزت و اطمینان والی زندگی حاصل کرنے کی یہ بالکل یقینی تدبیر ہے کہ وہ اللہ سے اپنا معاملہ درست کر کے اس کی رحمت اور مدد کے قابل بنیں اور خود غرضی اور نفس پرستی کی موجودہ غیر اسلامی زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستی اور اللہ کی فرمانبرداری والی زندگی اختیار کریں ۔

مصر کی بت پرست قوم میں یوسف علیہ السلام اکیلے مرد مومن اور خدا پرست تھے اور شروع میں ایک جھوٹا ناپاک مقدمہ ان پر قائم کر کے ان کو جیل میں بھی بھیجدیا گیا تھا ، لیکن ان کی ایمان اور تقوے والی زندگی ہی کا یہ کرشمہ تھا کہ جب قیدخانہ کے ان کے ایک ساتھی کے ذریعہ لوگوں کو اور خصوصاً بادشاہِ مصر کو انکی دوستانہ

اور متقیانہ زندگی کا علم ہوا اور ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلا تو بغیر ان کی درخواست اور کوشش کے خود بادشاہ نے ان کو جیلخانہ سے نکلوا کر حکومت کا انتظام ہی اُن کے سپرد کر دیا۔ حالانکہ یوسف علیہ السلام مذہب میں، نسل میں، زبان میں غرض ہر چیز میں مصری قوم سے مختلف تھے ـــــ قرآن مجید میں یوسف علیہ السلام کا قصہ ایک دلچسپ تاریخی قصہ کی حیثیت سے نقل نہیں کیا گیا ہے اور نہ قرآن کوئی قصہ کہانی کی یا تاریخ کی کتاب، وہ تو سراسر ہدایت ہے۔ اس میں اگلی قوموں یا اگلے پیغمبروں کے جو واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ ہماری ہدایت اور سبق آموزی کے لئے ہی بیان کئے گئے ہیں۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا بہت بڑا سبق ہمارے لئے یہی ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کا قصہ تو بہت پرانا ہے اور ایک پیغمبر کا اور مصر کا ہے، خود ہمارے اس ملک ہندوستان میں اللہ کے جن بندوں نے شروع میں آکر اسلام کی روشنی پھیلائی آپ جانتے ہیں کہ وہ چند بے نوا فقیر تھے جن کے پاس ایمان اور تقوے والی زندگی کی طاقت کے سوا کوئی ظاہری اور مادی طاقت بالکل بھی نہ تھی۔ خواجہ معین الدین چشتی کے پاس کیا تھا؟ بابا فرید الدین شکر گنج کے پاس کیا تھا؟ بس یہی تقوے والی زندگی تھی اور اُس کے نتیجے میں اللہ کی خاص رحمت اور مدد تھی ـــــ آج بھی کوئی بندہ اپنے اندر یہ روح پیدا کرلے تو سب کچھ ہو سکتا ہے ـــــ بزرگو اور دوستو! مادہ اور مادی اسباب اصل طاقت نہیں ہیں، بلکہ اللہ پر سچا ایمان اور اس کے ساتھ بندگی کا صحیح تعلق ہی اصل طاقت ہے ؎

با سلاطین مے نند مردے فقیر   از شکوہ بوریا لرزد سریر

از جنوں مے افگند ہوئے بشہر   وارہاند خلق را از جبر و قہر

قلب او را قوت از جذب و سلوک
نعرۂ او پیش سلطاں "لاملوک"

اب مجھے صرف یہ اور بتلانا ہے کہ ہم میں اور آپ میں اتنی بڑی تبدیلی اس وقت کس طرح ہو سکتی ہے اور حقیقی ایمان اور توبہ و انابت اور تقوے والی زندگی قوم میں کس طرح عام کی جاسکتی ہے؟

میرے بزرگو اور دوستو! ــــ اس بارہ میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ صرف اس طرح کی تقریریں سننے سنانے سے یہ زندگی قوم میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسکی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اسکی ضرورت کو محسوس کر کے پورے عزم اور پختہ ارادہ کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اپنے کو بدلنا اور اپنی قوم میں اس تبدیلی کیلئے کوشش کرنا ہے اور اس فیصلہ کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانے میں لگ جائیں۔

اصلاح و تبلیغ کے نام سے مسلمانوں میں اصلی ایمانی اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس کا خاص مقصد یہی ہے۔ اس کے پروگرام کے دو خاص جز ہیں ایک مقامی ہفتہ وار شبینہ اجتماعات (جن میں پوری رات وہیں گزرنی چاہئے) اور دوسرے اس مقصد کے لئے جماعتیں بنا کر باہر نکلنا اور مسلمانوں کے تمام طبقوں میں اس دعوت کو پہنچانا اور اس سفر کے زمانہ میں خود اپنے میں یہ تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا خصوصاً کلمہ طیبہ کی حقیقت، نماز کی حقیقت، علم دین، ذکر اللہ، اخلاق اور دین کی دعوت و خدمت میں رسوخ حاصل کرنا۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سمجھدار اور اچھی صلاحیتیں رکھنے والے طبقہ نے ابھی اس کام اور اس کے پروگرام کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی ــــ دوستو! ہر کام کا قاعدہ ہے کہ جیسے اس کو کرنے والے ملیں گے بس انہی کے درجہ کا کام ہوگا۔ اسوقت اس کام کا بھی یہی حال ہے کہ جس درجہ کے کرنے والے اب تک اس کو ملے ہیں بس اُس درجہ کا کام ہو رہا ہے اگر اچھی صلاحیتیں رکھنے والا ہمارا طبقہ اس کام میں لگ جائے تو پوری امید ہے کہ انشاء اللہ ۴-۵ برس کے اندر اندر پوری قوم کی زندگی بدل جائے گی اور زندہ رہے تو ہم آپ اپنی آنکھوں سے

دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مدد سے ہمارے حالات کس طرح بدلتے ہیں۔

بعض میرے ملنے والے بھی موجودہ حالات سے گھبرا گھبرا کے کبھی کبھی مجھ سے بھی پوچھتے ہیں کہ اِن حالات میں اس ملک میں ہم کس طرح رہ سکیں گے؟ بہت صفائی کے ساتھ میرا ایک ہی جواب ہے کہ اگر ہم اپنی زندگیاں بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور خدانخواستہ ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ جیسے ہم اب ہیں۔ ایسے ہی رہیں گے تو مستقبل میں کسی بہتری کی مجھے ہرگز امید نہیں بلکہ حالات بد سے بدتر ہوں گے ـــــــ لیکن اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ یہ طے کر لیں کہ ہمیں اپنی زندگی کو ایمانی زندگی بنانا ہے اور آئندہ اللہ کے وفادار بندے بن کر رہنا ہے تو پھر پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انشاء اللہ ہمارا مستقبل اس ملک میں بھی نہایت خوش گوار ہوگا اور کچھ تعجب نہیں کہ زمانہ ماضی سے بھی زیادہ خوشگوار ہو۔ ہر ملک کا مالک اللہ ہے اور اس کے صالح اور وفادار بندے اس میں رہنے بسنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝۔

اور میرا یہ پیام جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ہے اسی طرح ان دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی ہے جو بظاہر ابھی اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں ـــــ اگر وہ اپنی نافرمانی اور خدا فراموشی والی زندگی کے ساتھ مستقبل سے مطمئن ہیں تو بڑے غافل ہیں اور اس دنیا میں مہلت اور پکڑ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو خاص قانون ہے وہ اس سے ناواقف ہیں۔

سب سے آخر میں اب مجھے یہ اور عرض کرنا ہے کہ میری اس تقریر سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ دین و ایمان اور تقوے والی زندگی کی دعوت ہم بس اپنی

اور اپنی قوم کی دنیا بنانے کے لئے اور اس دنیاوی زندگی میں عزت و اطمینان حاصل کرنے کے لئے دیتے ہیں یہ تو دین ایمان کا محض ضمنی فائدہ ہے۔ اصل مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی نجات و فلاح ہے " یہ تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ کسی قوم کے ایمان اور تقوے والی زندگی اختیار کرنے پر دنیا کی نعمتوں سے بھی اُس کو نوازتا ہے ورنہ حق تو یہ ہے کہ اگر یہ فرمادیا جاتا کہ دین پر چلنے کے بدلہ میں تم کو صرف آخرت میں نجات اور ہماری رضا حاصل ہوگی اور دنیا میں دین پر چلنے والوں کی ہمیشہ کھالیں کھینچی جائیں گی تب بھی ہم کو دین ہی پر چلنا چاہیئے تھا اور ایمان اور تقوے ہی کو اصول زندگی بنانا چاہیئے تھا ——— دنیا میں کھالیں کھنچواکر اور بوٹیاں نچواکر بھی اگر آخرت کی ابدی نجات اور اللہ کی رضا حاصل ہو جائے تو یہ سودا گراں نہیں ارزاں ہی ہے۔

یاد کیجئے! فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے جن جادوگروں کو بلوایا تھا، جب اُن پر حضرت موسیٰؑ کی سچائی کھل گئی اور انھوں نے بھرے دربار میں اپنے ایمان کا اعلان کر دیا تو فرعون نے غضبناک ہو کر ان سے کہا تھا کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں کٹوا کے تم کو سولی پر لٹکواؤں گا۔ اس کے جواب میں اللہ کے ان بندوں نے کہا۔

فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا	ہمارے متعلق تو جو فیصلہ کرنا چاہے
تَقْضِي هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	کر ڈال تو بس اسی دنیا کا تو فیصلہ
إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا	کر سکتا ہے (یعنی تیرے فیصلہ
خَطٰيٰنَا ۝	سے بس دنیوی زندگی میں تو

ہمیں دکھ پہونچے گا جو بہرحال ایک دن ختم ہونے والی ہے) ہم تو ان خطرات کے باوجود (خوب سوچ سمجھ کے) اس لئے ایمان لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری خطائیں بخشدے اور ہمیں اخروی نجات مل جائے۔

بہرحال اللہ کی رضا اور آخرت کی نجات ہی دین و ایمان کا اصل مقصد ہے دین کا ہر چھوٹا بڑا کام دراصل اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہونا چاہیئے لیکن یقین اس پر بھی رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ اپنے شاہانہ وعدوں کے مطابق دین و ایمان کی راہ پر چلنے والی قوم کو دنیا میں بھی اچھی زندگی نصیب فرماتے ہیں —— آخر میں قرآن مجید کی ایک آیت پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ سبحان اللہ کیسی ایمان افروز آیت ہے۔ سورۂ یونس کا ساتواں رکوع اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔ شروع آیت میں بندوں کے ساتھ اپنا تعلق اللہ تعالےٰ نے بڑے ہی پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ فِي ذَالِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ط ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

(آیت کا حاصل مطلب یہ ہے) تم جس حال میں ہوتے ہو اور خاص کر جب تم کہیں سے قرآن پڑھتے ہو اور جو عمل بھی کرتے ہو تو اُسکے دیکھنے والے ہم وہیں تمھارے پاس موجود ہوتے ہیں (یعنی کسی حال میں بھی ہم تم سے غائب اور بے خبر نہیں ہوتے) اور زمین و آسمان میں کوئی ذرہ برابر چیز بھی تمھارے پروردگار سے چھپی نہیں ہے اور اُس سے چھوٹی اور بڑی ہر چیز بھی لوح محفوظ میں مرقوم ہے۔ یاد رکھو اللہ سے تعلق رکھنے والوں کیلئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے یہ اللہ والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقوے کی راہ چلتے ہیں ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی ہماری طرف سے

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(مولنا سید مناظر احسن گیلانی)

(۶)

"تا کہ دھمکائے ان لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا"
"نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی، نہ ان کو ہے اور نہ انکے باپ دادوں کو ہے"
"بڑی بات ہے جو ان کے منھ سے نکل رہی ہے"
"نہیں بول رہے ہیں وے مگر صرف جھوٹ"

تقریبًا یہ لفظی ترجمہ ہے قرآن کی ان آیتوں کا یعنی:-

"وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا"
"مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ"
"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ"
"إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا"

اور اب آپ کے سامنے سورۂ کہف کے ان ہی چار فقروں پر بحث کی جائے گی۔ عرض کرچکا ہوں کہ من لدنی باس شدید (خود حضوری سخت جنگ) جس دھمکی سے اس سورہ کی گویا ابتدا کی گئی ہے اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہے یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے اپنا نشانہ ٹھہرایا ہے؟ دراصل اسی سوال کا جواب مذکورۂ بالا آیات میں دیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالق عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں، بلکہ اسی "اعتقاد" پر عیسائیت یا کرسچینٹی کی بنیاد دم ہے،

عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔

اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ و امریکہ میں آباد ہے، جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رُخ اس من لدنی یاس شدید کا ان ہی ممالک اور ان کے آباد کاروں کی طرف ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً "نصاریٰ" یا اسی قسم کے الفاظ سے بھی اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا، مثلاً کہدیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو، مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورۂ بالا الفاظ سے جو کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے اس موقع پر استعمال کئے ہیں کیا صرف یہ دور خطابت ہے؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کئے بغیر صرف یہ کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں کیا یہ مناسب ہے کہ ہم بھی اسی طرح گذر جائیں، جیسے عموماً لوگ گذر رہے ہیں۔

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابلِ برداشت بھی ہو سکتا ہے مگر علام الغیوب، الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے! میں تو اس کو سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ خالقِ عالم کا کلام ہے، اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے، جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے، اٹم سے حقیر ذرات ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ان ہی ذرات میں سے کسی ذرے کو لے کر لوگوں نے جب سوچا اور سوچنے کا جو حق تھا اسے ادا کیا تو کون نہیں جانتا کہ اسی ایک ذرے سے قوت کا طوفان اُبل پڑا، کیسا طوفان؟ جس کے کام کا یہ حال ہو، انصاف شرط ہے اسی عجیب و غریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ یہ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں میں اس نے ادا کیا ہے اسی مطلب کو ایک لفظ "عیسائیوں" یا "النصاریٰ" یا اسی قسم کے لفظ دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا، اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا

اسے ادا کر دیا۔ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۔

بہر حال اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے آئیے، اور قرآن کی مندرجہ بالا ان چار آیتوں اور جن الفاظ پر یہ آیتیں مشتمل ہیں ان پر غور کیجئے۔

(۱)

لِیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا (تاکہ دھمکائے ان لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ولد بنا لیا) یہی پہلا فقرہ ہے جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام پر کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک ولد کا لفظ ہے، اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا، بچہ وغیرہ الفاظ سے ولد کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ عربی ہی میں ابن کا جو دوسرا لفظ ہے اس میں اور ولد کے اس لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے گویا دونوں ہم معنی مرادف الفاظ ہیں۔

مگر ادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ولد کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے، فارسی میں زادن اور اردو میں جننا جس کے معنی ہیں، جس کا مطلب یہی ہوا کہ ولد کسی کا جب کسی کو ہم ٹھہراتے ہیں، تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد اس شخص سے جس کا وہ ولد ٹھہرایا گیا ہے، ولادت اور زائیدگی، یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے، اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ زادن یا جننے یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حال کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہوتی ہے؟۔

فرض کیجئے کہ زید ولد ہے، اور عمرو مثلاً اس کا والد ہے، ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟۔

کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے، یعنی زید کو کتم عدم، اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر عمرو اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی، زید جو نیہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے، اور عمرو جو والد ہے صرف اسی جو نیہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں منتقل کر دیتا ہے، ولد یعنی زید کی ذات، وجود، وجود کے

سارے صفات، صفات کے ثمرات ونتائج، ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے نہیں پاتا، بلکہ بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گذرگاہ کی ہوتی ہے، جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم منویت یا نطفیت) میں ولد کو گذرنا پڑتا ہے نیست کو ہست کرنا اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو اس معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا۔ اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے، جیسے سنار سونے چاندی سے زیور گھڑتا ہے، یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بت تراش مجسمہ یا بت وغیرہ بناتا ہے، تو اس معنی کے رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا، کیونکہ ولد میں صفات وکمالات کا جو سرمایہ بھی پایا جاتا ہے، اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں، قطعاً دخل نہیں ہوتا والد بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا، وہ مرد بن کر پیدا ہو گا، یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہو گی، اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟۔

اور یہ پہلی قابل غور بات ہے جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضا ہے اسے بھی سوچئے، آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہو گی وہ گھوڑا ہی ہو گی، اور جیسے گھوڑے سے ہاتھی نہیں بلکہ گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد وولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو۔ آخر بطن سے بچھو ندر، اور چوہے سے چیل، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا ہے؟۔

یہ دونوں مقدمات جو بداہتہً بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں، کو سامنے رکھ لیجئے۔ اور اب سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم (تعالیٰ عما یقولون علواً کبیرا) کے لئے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعوی کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے، اور اپنے دین وایمان کی بنیاد انھوں نے کس چیز پر قائم کر رکھی ہے؟۔

یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو خدا کی مخلوق نہیں ہے، نہ خود خدا کی مخلوق ہے اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں، یہ تو عقیدۂ ولدیت کا سلبی پہلو ہوا یعنی ولد؛ ولد کی ذات، اس کے صفات و کمالات، اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں، یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں، یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضاء رہا۔

اور دوسرا مقدمہ یعنی وہی بات کہ گھوڑے سے گھوڑا، ہاتھی سے ہاتھی، اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے، تو قانونِ ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا ہونے کے اور کیا ہوگا؟ گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے۔

اس کا مطلب جیسے یہ ہے اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے ولد گھوڑے میں گھوڑا پنے کے ان سارے صفات و لوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہے جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں، تو خدا کے لئے ولد کے عقیدے کو منسوب کرنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اور یہ ہے وہ مہیب و مدہش شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے، اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو ولد ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا تھا، ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے، خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے، جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے تھے۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ولد یعنی زائیدہ ولاد سے محبت و شفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی فطرتاً رکھتا ہے یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو، تو ابن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج تھا، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نحن ابناء اللہ (ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں) ایسا دعویٰ

بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔

مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلے میں اسرائیل کی اولاد یعنے بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط و تعلق رکھتا ہے جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اپنے آپ کو یہودی "خدازادہ" یا ولد اللہ (العیاذ باللہ) نہیں سمجھتے تھے، بلکہ بارگاہِ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں وہ اس کے مدعی تھے، اور اسی کی تعبیر نحن ابناء اللہ سے کرتے تھے، قرآن میں صرف یہ فرماتے ہوئے کہ :-

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۔ کہدو ! کہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمہیں سزا کیوں دیتا ہے، بلکہ تم آدمی ہو، ان ہی چیزوں میں سے ایک تم ہو جنہیں اللہ نے پیدا کیا

ان کے اس دعوی پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر "ابن اللہ" کا دعویٰ اور "ولد اللہ" کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی اگر قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہو "ابناء اللہ" ہونے کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے[۱]

کچھ بھی ہو، ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اُس موقع پر کیا گیا ہے جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے، میرے نزدیک

---

[۱] بلکہ بائبل کی پہلی کتاب پیدائش کے شروع ہی میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں "جب خدا کے بیٹے انسان کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی یہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے" پیدائش باب ۶ درس ۴ اگر یہ کوئی الحاقی خارجی فقرہ نہیں ہے، یا ترجمہ میں تحریف سے کام نہیں لیا گیا ہے، تو شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہو کہ ملائکہ کو بھی یہود ابناء اللہ کہنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے، شاید یہ اسی قسم کی بات ہو کہ بخاری کی اس مشہور حدیث کی بنیاد پر جس میں ہے کہ ماں سے بھی زیادہ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہیں۔ کوئی مسلمان بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے مگر چونکہ مسلمانوں کی تربیت ابتدا ہی سے کچھ ایسے طریقے سے کی گئی ہو کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں کے شکار صر

براہِ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خالقِ عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اگرچہ عیسائی اس کو اللہ نہیں بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں، مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات یا دوسرے الفاظ میں چاہئے تو کہئے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے، شرک و بت پرستی اور ان کی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں تو بس ان ہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں۔ مگر تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے، دلوں سے کبھی نہیں نکلا، تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہے۔ اس میں صرف ایران کا ایک فرقہ مجوس نامی کے متعلق کچھ اہرمن و یزدان، یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کرکے کہنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں، بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزدان نے پیدا کیا ہے اور بعضوں کو اہرمن نے، یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے، اگرچہ مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو تحقیق نے الحاق قرار دیا ہے، لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں، تاہم ان کی بات اتنی بودی اور بھسپھسی تھی کہ ہلکی سی ذہنی چوٹ چونکانے کے لئے کافی ہو سکتی تھی۔

ان کی طرف اس عقیدے کی توجیہ میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر و شر یا بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے، پس خدا یا یزدان جو خیر مطلق ہے اس کی طرف یہ کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شرور اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے؟ کہتے ہیں کہ ان ہی شرور اور برائیوں کی پیدائش کی تصحیح کیلئے اہرمن کے وجود کا یزدان کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا؟۔ مگر ذرا سوچئے بھلائی اور برائی کے

جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کی واقعی حالت کیا ہے؟ دراصل ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ مثلاً آگ ہے، جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے، ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں، مگر اسی آگ سے جب ہمیں کبھی نقصان پہونچتا ہے، گھر جل اُٹھتے ہیں، جانور یا آدمی بھننے لگتے ہیں تو اسی آگ کو ہم بدترین چیز ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو کبھی خیر کبھی شر بنتی رہتی ہے، غریب مجوسیوں نے خیال کرلیا کہ شر و خیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں، اسی طرح واقع میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر اس عالم میں پایا جاتا ہے، مگر اس لفظی مغالطہ پر تنبہ ہو جانے کے بعد کہ ایک ہی چیز اس عالم کی شر بھی بنتی رہتی ہے اور خیر بھی، کیا ایک مخلوق کے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟۔

خیر یہ قصہ تو بہت طویل ہے، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لے دے کر خیر و شر کا یہی لفظی صرف لفظی مغالطہ کچھ سہارا دے سکتا تھا، لیکن اس سہارے کے ختم ہو جانے کے بعد آپ خود سوچئے کہ عالم کی پیدائش کے لئے ایک خالق کو مان لینے کے بعد عقل کے لئے ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ بلاوجہ کسی دوسرے خدا کو بھی تلاش کرے۔ ہاں! خدا کا وجود پیدائش عالم کی توجیہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی اگر ناکافی ہوتا تو خیر اس وقت دوسرے خدا کی جستجو کا جواز بھی ذہن انسانی کے لئے کسی حد تک درست ہو سکتا تھا، مگر خدا کا وجود توجیہ عالم کے لئے ناکافی ہے، آج تک نہ کسی نے یہ دعویٰ کیا اور نہ کر سکتا ہے، اور کوئی کر بھی گذرے تو اس دعوی کے لئے اسے قطعاً کوئی ٹوٹی پھوٹی شکستہ و بر شکستہ دلیل بھی نہیں مل سکتی۔ توحید کے مسئلہ میں قرآن کو عموماً جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ مشرکین سے کرتا ہے، مثلاً "ھاتو برھانکم یا فاتوا بسلطان مبین" تو اس کا مطلب یہی ہے کہ مشرک کے مقابلہ میں موحد کی حیثیت منکر کی ہے، مشرک خدا کے وجود کو گویا ناکافی ٹھہرا کر خدا کے ساتھ غیر خدائی قوتوں کا اضافہ کرتا ہے، اس لئے وہ مدعی ہے اور قاعدہ ہے کہ بار ثبوت منکر پر نہیں، ہمیشہ مدعی پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن نے یہی سکھایا ہے کہ مشرکوں کے مقابلہ میں تم ہمیشہ یہی کہا کرو کہ ہم تو خدا کے ساتھ دوسرے

خدا کے اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دراصل یہی وجہ ہے کہ "شرک" کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے۔ بر و بحر کے کونے کونے کو لوگوں نے چھان مارا مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی وہاں خالق عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا، اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا یا اپنی اُمیدوں کا ماویٰ ملجا اور ٹھکانہ ان کو ٹھرایا تو یہ مانتے ہوئے ٹھرایا کہ باوجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان کو دخل ہے، مگر اس مغالطہ کی بنیاد بھی صرف ایک لفظ کے نہ سمجھنے پر موقوف ہے یعنی خود "مخلوق" کا لفظ۔

ایسی ہستی جو مخلوق ہو اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کرلی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہے یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے مثلاً زید اور عمرو دو آدمی ہیں، ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمرو کی مخلوق ہے اور نہ عمرو زید کا ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید و عمرو ان دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہے کچھ یہی نوعیت یا اسی قسم کی نوعیت خالق و مخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے لیکن ان میں صنعتی تعلق بھی جو پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً پتھر کو صنعتی کاریگری سے بت تراش مجسمہ بنا لیتا ہے، یا اینٹ چونے گارے کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے، لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش و تراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی کچھ یہی ہوگی حالانکہ پہلی صورت ہو یا دوسری، خالق و مخلوق کے تعلق کے سمجھنے میں جب ان سے مدد لی جائے گی

تو حقیقت نظر کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی، اور طرح طرح کی الجھنوں میں آدمی مبتلا ہو جائے گا، جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ صانع ہو یا مصنوع، یا صانع و مصنوع کا تعلق نہ ہو، کسی حال میں بھی ایک کا وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جن چیزوں میں صانع و مصنوع کا تعلق نہیں ہے ان کا حال تو ظاہر ہی ہے باقی خود صانع مصنوع میں بھی دیکھئے پتھر یا لکڑی یا اینٹ چونا وغیرہ جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے، ان میں کوئی بھی ایسا ہے جسے صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو، یعنی نیست سے ہست یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کو موجود کیا ہو۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو صنعتی عمل سے ظاہر کر دیتا ہے۔ پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، بت تراش اسی صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے، آخر اسی صنعتی عمل سے کیا ہوا کے کسی ٹکڑے سے وہ بت بنا کر دکھا سکتا ہے۔

خالق و مخلوق کی کوئی مثال چونکہ سامنے کی چیزوں میں نہیں پائی جاتی، اسی لئے غلط مثالوں کا سہارا لے لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ ہر شخص خالق و مخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے، حالانکہ باہر نہ سہی، مثال اس کی آدمی کے باہر میں نہ سہی، اندر میں خود پائی جاتی ہے، یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا خواب جن خیالی چیزوں کو آدمی اپنے اندر پیدا کرتا رہتا ہے، کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے، تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لئے کافی ہوتا ہے، بڑی سے بڑی عمارت، پہاڑ، سمندر، آفتاب و ماہتاب کو عالم خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، گو یہ بھی ایک ہلکی سی ناقص مثال ہے، مگر ذرا سوچئے کہ ان خیالی مخلوقات

کا تعلق ان کے خالق سے کیا ہوتا ہے، اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً دلی کی جامع مسجد کا خیال کیجئے یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجئے، اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات، اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی، اور پیدا ہو جانے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقاء میں اس کی ذات بھی، اس کے صفات بھی، حالات بھی، آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے، جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود ہوگی، جوں ہی توجہ و التفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی، اسی وقت ناپید ہو کر رہ جائے گی۔

کمزور آدمی کی مخلوق کا حال جب یہی ہے تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قادر و مقتدر واقعی جو عالم کا خالق حقیقی ہے، اس کے ساتھ اس کے مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگی، اس کے مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خالق کا ہوتا ہے، ان کا وجود بھی، ان کی ذات بھی، ان کے صفات بھی، ان کے افعال بھی ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیض توجہ کے ساتھ بندھے پھندے رہتے ہیں، "مخلوقیت" کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاج مطلق ہے، جس پر "مخلوقات" کی یہ حیثیت کھل جاتی ہے، وہ ان سے اسی حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے، ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور تب کہیں بعض تو ایسی یافت کے بعد چیخ اٹھتے ہیں، کہ ؎

گر او ہست حقا کہ من نیستم[1]

---

[1] یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے۔ "مخلوقیت" کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا اجمالی تذکرہ یہاں کر دیا گیا۔ زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو مولانا گیلانی کی کتاب "الدین القیم" میں مطالعہ فرمائیے۔ ۱۲

بہرحال باوجود اجمال کے یہ ضمنی۔ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہوگئی، ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ "مخلوق" کو "مخلوق" مان کر اس کو "معبود" بنانے کی غلطی میں آدمی اسی وقت تک شاید مبتلا رہ سکتا ہے جب تک کہ اس پر "مخلوقیت" کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں واشگاف نہ ہوئی ہو، مگر "خالق و مخلوق" کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ "مخلوقیت" دراصل خالص بے چارگی اور حد سے گزری ہوئی بے بسی کا نام ہے، تو جن مثالی مغالطوں سے پھسل کر شرک کی اندھیری کھائی میں آدمی گر پڑا تھا اُس سے اچانک باہر نکل آتا ہے، آخر ایسے "معبود" کو آدمی کب تک پوجتا چلا جائے گا، جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود، اپنی ذات اپنے صفات، اپنے افعال، سب میں دوسرے کا دست نگر، اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

اسی لئے شرک اور شرکیات کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر معبود بنایا گیا ہے، ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے، کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری "شرک" کی اس عجیب و غریب قسم کی وجہ سے پیش آگئی جس کی بنیاد "ولدیت" کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے، جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ ہے کہ "مولود" مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ خدا یعنی خالق عالم کی ذات تو ہمارے ہاں بھی ایک ہی ہے، حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ "ولد اللہ" اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے، اور ولدیت کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ اللہ کا ولد بھی (العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو۔

اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا، اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ "نظریۂ ولدیت" کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا، مگر دوسرا پہلو بھی اسی "نظریۂ ولدیت" کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ امور

کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بنے بیں ہیں اب اسے ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی آدمی کے سامنے کر دیتا ہے، جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں ہم جن کے ذکر سے کیا معنے؟ خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین گھنونے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والد کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا پہلی آیت یعنی "لینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولدا" کا، اب آگے چلئے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

(۲)

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ۔ نہیں ہے ان کو اس کا کچھ بھی علم، نہ ان کے باپ دادوں کو۔

سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں، یعنی براہ راست جاننے والے کو اس کا علم حاصل ہوا ہو، یا براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہونچی ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ "نظریۂ ولدیت" یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا "مولود" ٹھہرا لینا۔ اور مولود ٹھہرا لینے کے بعد انسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلہ کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے، بجائے اس کے ایک خاص ذات کو خدا کی "مخلوقیت" کے دائرے سے خارج کر دینا، اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت ایک اور اللہ کو مان لینا، پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لئے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے، اور اس سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل و دماغ کو گذرنا پڑتا ہے، ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی؛

ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا، ہزاروں لاکھوں کتابوں کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے درودیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا، اور جہاں جہاں موقع ملتا چلا گیا، وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا۔

سوال یہی ہے کہ اس سارے اعتقادی طوفان کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ، کسی منزل میں کوئی ایسی بات بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہو کہ براہ راست اس بات کا علم اسے حاصل ہوا، یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گذرا ہے، اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدے یا تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا۔

کتنے مہیب، کتنے دہشت ناک، کتنے مکروہ اور گھنونے، ناگفتہ بہ دعووں پر "ولدیت" کا یہ عقیدہ مشتمل ہے، لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کل نہیں کسی ایک ہی جزء کے جاننے کا بلاواسطہ یا بالواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں، خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں، اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں، الملک القدوس کی طرف وہ ایسی باتوں کو منسوب کر رہے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں سکتے، مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے، آپ دیکھ رہے ہیں "کچھ نہیں" کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرأت اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب "بغیر والد کے" والدہ "(مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے، تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو خیر ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے، مگر ابھی سوال سے نہیں، بحث جواب سے ہے، جس یہ کہدینا کہ جب انسانوں میں ان کا کوئی والد نہ تھا، تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا۔ اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ اگر عمرو نہ ہو، تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے، خود سوچئے کہ ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہوگا؟۔ پھر اتنی بات کہ کوئی

آدمی حضرت مسیح (علیہ السلام) کا باپ نہ تھا، محض اس سے یہ منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جس کا باپ نہ ہو، اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے، ایک بے بنیاد جاہلانہ وسوسہ کے سوا اور بھی کچھ ہے؟۔

(۳)

اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری آیت کے صحیح وزن کا جو مذکورہ بالا دو آیتوں کے بعد ہے، یعنی نظریۂ "ولدیت" کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے، قرآن نے

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ	بہت بڑی بات ہے جو ان (عیسائیوں)
أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا	کے منہ سے نکل رہی ہے، نہیں بول رہے ہیں
كَذِبًا۔	یہ مگر صرف جھوٹ۔

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے، کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے؟ اس سے بڑی بات خود سوچئے اور کیا ہوگی کہ ایک ایسی بے ادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی، اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی، اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریۂ ولدیت کے معتقدوں کے منہ سے نکل رہی ہے، اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کو یہ حاصل نہیں کر سکتے، نہ خود اپنے حواس کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں، اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو، اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا، اسی "نظریۂ ولدیت" کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ہی میں دوسری جگہ جو یہ ارشاد ہوا ہے:۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (سورۂ مریم)

قریب ہے کہ اس سے (یعنی عقیدۂ ولدیت کی وجہ) پھٹ پڑیں آسمان اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمین، اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر۔

تو جو نہیں سوچتے، انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے بڑے چڑھے الفاظ میں جن سے زمین و آسمان بھی کانپ اٹھیں آخر قرآن نے اس عقیدے کی تنقید کیوں کی ہے؟ بظاہر اسی قسم کے مقامات میں بداندیشوں کو شاعرانہ مبالغوں، یا خطیبانہ اغراق کا دھوکہ عموماً ہوا کرتا ہے، حالانکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ خواہ الفاظ جتنے بھی بلند و بالا ہوں، مگر بال برابر بھی "قرآن" حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتا، الفاظ کی بلندی خبر دیتی ہے کہ حقیقت جسکی تعبیر الفاظ سے کی گئی ہے وہ خود اپنے اندر غیر معمولی بلندی رکھتی ہے۔

آسمان پھٹ جائیں، الارض شق ہو جائے۔

اور پہاڑ چکرا کر گر پڑیں

آخر میں پوچھتا ہوں کہ "لفظ" ولدیت "کے متعلق آپ ابھی سن چکے کہ درحقیقت خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی یہ ایک مخفی تدبیر اور تعبیری چال ہے، اور کون نہیں جانتا کہ خدا کے ساتھ خدا کے اضافہ کا مطلب جیسا کہ خود قرآن میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین کے فساد اور بگاڑ کے نتیجہ کی یہ صورت حال پیدا کر دیتی۔

پھر مندرجۂ بالا الفاظ میں بجز اس کے کہ اسی لزومی منطقی نتیجہ کو دہرایا گیا ہے اور کیا کہا گیا ہے؟ تعدد جس یعنی خدا کے ساتھ دوسرے خدا کا وجود نظام عالم کی تباہی کو مقتضی ہے، اس الہیاتی دعوے کے فنی حکیمانہ دلائل تک عوام کی رسائی ذرا دشوار ہے۔ مگر میں ایک سیدھی سادی بات کہتا ہوں، ابھی آپ کے سامنے خالق و مخلوق کے تعلق کو مثال سے سمجھاتے ہوئے عرض کیا گیا تھا کہ تخیل کی قوت سے مخلوقات کو ہم اپنے خیال میں جو پیدا کرتے ہیں منجملہ دوسری باتوں کے دیکھئے، کسی کرسی پر آپ بیٹھے ہوں، اور اسی حال میں اپنے خیالی مخلوق کو پیدا کیجئے، آپ پائیں گے کہ آپ کی خیالی مخلوق کا وجود اور آپ کا وجود ایک ہی جگہ گویا مکان میں سما گئے، مگر اسی کرسی پر

ایسی چیز جو آپ کی مخلوق نہ ہو، مثلاً زید بھی اسی حال میں بیٹھنا چاہے جب آپ اس پر بیٹھے ہیں، تو یقیناً ایک مکان میں ایسے دو مکینوں کا جمع ہونا ناممکن ہے، دونوں صورتوں میں فرق کیا ہوا؟ یہی تو کہ ثانی الذکر شکل میں دونوں میں کوئی کسی سے مخلوقیت کا تعلق نہیں رکھتا تھا۔ برخلاف اوّل الذکر صورت کے کہ آپ کی حیثیت خالق کی تھی اور خیالی مخلوق، جسے تخیل کی قوت سے آپ نے پیدا کیا تھا آپ کی مخلوق ہونے کی حیثیت رکھتی تھی، خواہ اب آپ کی یہ مخلوق جتنی بھی عریض و طویل ہو، ہمالہ کا پہاڑ ہی کیوں نہ ہو لیکن مخلوق بن کر اسی کرسی میں اس کی گنجائش نکل آئی جس پر آپ بیٹھے ہیں۔

اب اسی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے کہ خالق کے ساتھ ایسی ہستی کا تصوّر جو اس کی مخلوق نہ ہو، دونوں کے اکٹھے پائے جانے کی شکل ہی کیا ہو سکتی ہے، اپنے مخلوقات کے ساتھ اس وقت خالق کا وجود تو اس لئے جمع ہو رہا ہے کہ دونوں میں ایک کی حیثیت خالق کی ہے اور دوسری کی حیثیت مخلوق کی۔ لیکن جب ایک دوسرے کی مخلوق نہ ہو، تو جیسے کرسی میں بیٹھنے والے کی مثال سے سمجھایا گیا تھا کہ زید کے ساتھ کرسی کی اسی جگہ کو جسے زید کا وجود بھرے ہوئے ہے، عمرو کا وجود اُسے نہیں بھر سکتا، اور اگر بھرنے کی کوشش کرے گا تو کرسی پاش پاش ہو جائے گی، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی[1]

---

[1] ایک اور طریقے سے بھی سوچئے کسی انجن کو پوری رفتار میں لانے کے لئے فرض کیجئے سو گھوڑوں کی بخاری طاقت کی اگر ضرورت ہو، اور اس طاقت کو لگا کر انجن چالو کر دیا گیا ہو، اب اسی انجن کے ساتھ مزید سو گھوڑوں کی بخاری طاقت کا اضافہ اگر کر دیا جائے گا، تو نتیجہ کیا ہو گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے، انجن پھٹ پڑے گا، اس کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے جدا ہو کر بکھر جائے گا، معلول واحد پر دو تامہ علتوں کے تاثیری عمل کا یہ نتیجہ کچھ انجن ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، اب ملاحظہ کیجئے عالم کا موجودہ نظام جس قوت سے چل رہا ہے، قرآن نے اس کا نام "الرحمٰن" رکھا ہے، یہ حق تعالیٰ کی ذات کی صفاتی تعبیر ہے، کائنات کا مرکز جس کا قرآنی نام "العرش" ہے، اور عالم کے قالب کے ساتھ اس کی حیثیت "قلب" کی ہے، عالم کے اسی قلب کو مرکز بنا کر (بقیہ صـ۴۲ پر)

بس اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ بجائے مخلوقات کے خالق کے ساتھ کسی ایسے وجود کو اگر مانا جائے گا، جو اس کی مخلوقیت کے دائرے سے خارج ہو، تو اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، جو قرآن نے بیان کیا۔ یعنی عالم کا سارا نظام اُلٹ پلٹ، اور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔

اسی سورۂ مریم میں "نظریۂ ولدیت" کے اس لازمی نتیجہ کو بیان کرتے ہوئے اس عقیدے کے ماننے والوں کو خطاب کر کے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ:۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (سورۂ مریم) یعنی بڑی بھاری اچنبھے کی بات تم پیش کر رہے ہو

یہ "اِدًّ" کا عربی لفظ اگرچہ ایک ہی لفظ ہے، لیکن لغت میں جن معانی کو اس کے نیچے درج کیا گیا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عجیب و غریب بات جو کبھی سنی اور دیکھی نہ گئی ہو، اور فطرت انسانی جسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی، ان ساری باتوں کو "اد" کا یہ عربی لفظ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اور "ولدیت" کے جن لوازم و آثار و نتائج کو اب تک آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے بتایا جائے کہ اس سے بہتر تعبیر اس گھنونے عقیدے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟۔

اور اس وقت تک تو اس مسئلہ کے صرف اُن پہلوؤں کی حد تک بحث کو محدود رکھا گیا ہے، جن کا آدمی کے عقلی اور نظری احساسات سے تعلق ہے، مگر عقلی احساسات کے ساتھ جذباتی تاثرات کو بھی اگر شریک کر لیا جائے تو میں کیا عرض کروں کہ بات

(صلہ ۴۱ کا بقیہ حاشیہ) "الرحمن" دنیا کے نظام کو چلا رہا ہے۔ اب "الرحمن" کے ساتھ دوسرے "الرحمن" کا اگر اضافہ کیا جائے تو اس کے معنے یہی ہوں گے کہ سو گھوڑوں کی قوت سے پوری رفتار پر چلنے والے انجن کے ساتھ مزید سو گھوڑوں کی اسٹیم کی قوت کا اضافہ کر دیا گیا۔ "عقیدۂ ولدیت" اسی نتیجہ کو جب مستلزم ہے تو آسمان پھٹ پڑیں، پہاڑ گر جائیں، زمین ریزہ ریزہ ہو جائے۔ "نظریۂ ولدیت" کے نتیجے کو قرآن نے ان الفاظ میں اگر بیان کیا ہے تو بجز اظہار واقعہ کے یہ اور کیا ہے۔ ۱۲

کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے۔

جذبات کو متاثر کرنے والی چیزوں میں ایک بڑی موثر "چیز" وہ بھی ہے جس کی تعبیر مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ سے کی گئی ہے، اُردو یا ہندی میں ہم اس کی تعبیر "گالی" سے کرتے ہیں، فارسی والے "دشنام"۔ عربی میں "سبّ وشتم"۔ اور اسی طرح مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ مروج ہیں۔

ظاہر ہے کہ جسے گالی دی جاتی ہے، اگر واقعہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے جسم یا روح کو کوئی مادی نقصان نہیں پہونچایا جاتا، گالی دینے والے زبان کی حرکت سے ہوا کے اندر کچھ ارتعاشی تموجات پیدا کرتے ہیں، زبان اگر کچھ ہلتی ہے تو گالی دینے والوں ہی کی ہلتی ہے، لیکن سننے والے کا تو بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ جن الفاظ یا فقروں کی تعبیر ہم گالی سے کرتے ہیں ان کی صحیح عقلی نوعیت یقیناً یہی ہے، مگر کون نہیں جانتا کہ عقل کے نزدیک جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اسی گالی اور دشنام، سبّ وشتم سے جذبات میں کتنا شدید ہیجان پیدا ہوتا ہے، آدمی ان ہی جذباتی تاثرات کے طوفان سے اتنا بے کل اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ سب کچھ کر گذرتا ہے، یا کر گذرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو مادی ضرر سے متاثر ہونے کے بعد بھی شائد نہیں کرتا۔

اس جذباتی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے میں دریافت کرتا ہوں کہ زید کا واقع میں مثلاً جو شخص باپ نہیں ہے، اس کو زید کا باپ قرار دے کر دیکھئے، آپ کو زید کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے؟۔ فرض کیجئے کہ جسے زید کا باپ آپ نے قرار دیا ہے کوئی وقت کا بادشاہ یا کوئی بڑا جلیل القدر بزرگ ہی کیوں نہ ہو، مگر ان باتوں سے کیا جس ردعمل کی توقع زید کی طرف سے کی جاتی ہے اس میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے، صرف اس لئے کہ زید کی ماں کو جس شخص کے ساتھ آپ نے بلا وجہ متہم کیا ہے، وہ کوئی بڑا آدمی ہے، کسی ملک کا حکمراں ہے، یا خدا رسیدہ بزرگ ہے، کیا زید آپ کو بخش دے گا؟ اس کے ہاتھ کا چلا ہوا جوتا کیا درمیان ہی میں اس توجیہ کی وجہ سے رک جائے گا؟۔

پھر ذرا سوچنا چاہیئے ان لوگوں کو جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو قطعاً خدا زادے نہ تھے، منسوب کرنے والے جب ان کی ولدیت کو خدا کی طرف العیاذ باللہ منسوب کرتے ہیں کیا وہ نہیں سوچتے کہ وہ مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالی دے رہے ہیں، ان کی والدہ محترمہ و مکرمہ (علیہا الصلوٰۃ والسلام) کو بھی گالی دے رہے ہیں، اور وہ اگر سوچیں تو سمجھ سکتے ہیں، کہ درحقیقت حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہے ہیں جسے خدا تو خدا شائد ایک شائستہ آدمی بھی اپنی طرف اس کے انتساب کو برداشت نہیں کر سکتا۔

آخر ایسی عورت جو آپ کی بیوی نہ ہو، اس کے ساتھ آپ کو اگر متہم کیا جائے تو یہ تہمت آپ کے لئے کیا قابلِ برداشت ہو سکتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ "ولدیت" کے اس عقیدت کو ماننے والے دراصل حضرت مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالیاں دے رہے ہیں، اُن کی پاک طاہرہ و مطہرہ والدہ معصومہ عفیفہ کو بھی بے آبرو کر رہے ہیں۔

اور کاش! ان میں کچھ سمجھ ہوتی تو خیال کر سکتے تھے کہ اپنے ارحم الراحمین مالک و خالق (تعالی اللہ عما یفترون) کے ساتھ بھی سب و شتم کی گستاخیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، اور کیسی گستاخیاں؟ کیسی شوخ چشمیاں! جنھیں خود برداشت نہیں کر سکتے، توقع رکھتے ہیں کہ خدا اسے برداشت کرے گا۔ آسمان و زمین پہاڑ کے پھٹنے کا بعض لوگوں نے یہ مطلب جو بیان کیا ہے کہ یہ عربی زبان کا ایک پیرایہ بیان ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر احساس ہوتا تو ان گالیوں سے وہ درہم و برہم ہو جائیں۔

بہرحال عقلی احساسات، اور جذباتی تاثرات پر یہ سارا ازور و ظلم محض اس لئے کیا گیا کہ حضرت مسیح کا انسانوں میں جب کوئی شخص باپ نہ تھا، تو آخر کسی نہ کسی کو تو چاہیئے کہ آپ کا باپ ٹھہرایا جائے، حالانکہ خود یہی ایک غیر عقلی تقاضہ ہے، کائنات کی ساری چیزیں جنھیں خالق عالم پیدا فرما رہے ہیں، خواہ بالواسطہ پیدا ہو رہی ہیں یا بلا واسطہ، ادیان و ملل کا اس پر اتفاق ہے، کہ ان میں ہر چیز درحقیقت

حق تعالیٰ کے کلمۂ کن سے پیدا ہو رہی ہے، یعنی حق تعالیٰ کا تخلیقی ارادہ، اور حکم پیدائش صرف اسی میں ہر چیز کے پیدا ہونے کی واحد ضمانت ہے، بلا واسطہ پیدا ہونے والی چیزیں جن کا تعلق عالمِ امر سے ہے اُن کا بھی یہی حال ہے، اور چیزے چیزوں کی پیدائش کا جو سلسلہ عالم میں نظر آتا ہے، گو بہ ظاہر یہاں وسائط نظر آتے ہیں لیکن وسائط کو کسی چیز کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں ہے، تخلیق و آفرینش یہ کام براہ راست خالق تعالیٰ ہی کا ہے، اور کوئی مانے یا نہ مانے مگر عیسائی جو بہر حال ایک دینی اور مذہبی اُمت ہے، اس کا دینی عقیدہ بھی یقیناً یہی ہے، پھر ان گنت چیزیں جب کن سے پیدا ہو رہی ہیں تو اس میں کون سی دشواری تھی اگر ایک مسیح (علیہ السلام) کی پیدائش کو بھی حق تعالیٰ کے اسی تخلیقی ارادہ اور کلمۂ کن کا نتیجہ وہ مان لیتے۔[۱]

---

[۱] قرآن مجید میں اسی کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کم از کم "انسان اوّل" یعنی حضرت آدمؑ کے متعلق تو بہر حال یہی مانا جاتا ہے اور اس کے سوا اور مانا ہی کیا جا سکتا ہے کہ والدین کے توسط کے بغیر بنی نوع انسانی کا پہلا فرد پیدا ہوا، انسانی عقل جب اس ناگزیر واقعہ کو تسلیم کر چکی ہے تو والدین نہیں بلکہ صرف والد کے توسط کے بغیر کسی انسان ہی کی پیدائش کے تصور سے اپنے آپ کو درماندہ اور عاجز کیسے ٹھہرا سکتی ہے۔ خالق تعالیٰ جل مجدہ کا کُن یعنی ہو جانے کا حکم جب آدمؑ کی آفرینش کے لئے کافی ہوا، تو مسیح (علیہ السلام) کی پیدائش کے لئے کُن کے اسی کلمہ کو ناکافی قرار دے کر پہلے تو ان کے والد ہی کی لاحاصل جستجو میں مبتلا ہونے کی ضرورت عقل کو کیا پڑی ہے، اور طرفہ ماجرا اس کے بعد یہ ہے کہ اس لاحاصل جستجو کے تقاضے کو خواہ نخواہ دل میں پیدا کر کے عیسائیوں کا یہ کتنا احمقانہ اور گستاخانہ فیصلہ ہے کہ جب انسانوں میں کسی کو مسیحؑ کا باپ نہیں مانا جاتا، تو ضرور ہوا کہ (العیاذ باللہ) خدا ہی کو ان کا والد مان لیا جائے۔ ان مقدمات میں خود سوچئے کیا کسی قسم کا کوئی منطقی ربط ہے؟ اور میں تو کہتا ہوں کہ انسانوں میں مسیح (علیہ السلام) کا کوئی باپ اگر عیسائیوں کو نہیں ملا تھا، اور خواہ مخواہ والدہ کے ساتھ ان کی پیدائش کے سلسلے میں والد اور باپ کا توسط ان کے نزدیک کسی وجہ سے ناگزیر ہی تھا تو صرف توسط کے لئے انجیل کا یہ فقرہ یعنی "مریمؑ نے فرشتہ سے کہا کہ یہ کیونکر ہوگا جبکہ میں مرد کو نہیں جانتی؟

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

نہ عقل ہی پر کسی قسم کا بار پڑتا تھا اور نہ جذبات ہی کو ٹھیس لگتی تھی، مگر انھوں نے نہ عقلی احساسات ہی کی پروا کی، اور نہ جذباتی تاثرات کا خیال ان کے آڑے آیا، اور ایک ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے عجیب وغریب تماشے پیدا ہوئے، پیش ہونے کے ساتھ ہی عقل جس خیال کو قے کر دیتی ہو، جذبات میں جس سے طوفانی ہیجان پیدا ہو جائے اسی کو وہ نگلنا چاہتے ہیں نگلوانا چاہتے ہیں۔ پھر قرآن اگر یہ

(ص۴۴ کا بقیہ حاشیہ)

اور فرشتہ نے جواب میں اُس سے کہا کہ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی "لوقا ۱/۳۵ یہی فقرہ جس کا حاصل قرآن میں بھی پایا جاتا ہے، اسی کے توسط کے تلاش کی ضرورت ہی پیاس عیسائی چاہتے تو بجھا سکتے تھے، یعنی والدہ تو ان کی مریم (علیہا الصلوٰۃ والسلام) موجود ہی تھیں، اور روح القدس جس کے نزول کا ذکر انجیل میں کیا گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ جو ایک ملکوتی عمل ہے اسی میں ان کو وہ چیز مل سکتی ہو جسے چاہیں تو مولا الوہیت کی قائم مقامی عطا کر سکتے تھے، بلکہ اسلامی صوفیوں نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا وجود بشریت وملکوتیت کا ایک برزخی قالب تھا، ماں کی طرف سے وہ بشر تھے اور فرشتہ یا روح القدس یا جبرئیل (علیہ السلام) اور ان کے عمل نفخ نے حضرت مسیح (علیہ السلام) میں ملکوتی شان پیدا کر دی تھی، انھوں نے لکھا ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی فہم وادراک عقل وتمیز کی قوت جو مسیح (علیہ السلام) میں بیدار ہو گئی، اور "اِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ اٰتَانِیَ الْکِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا" کے الفاظ گہوارے ہی میں انکی زبان پر جاری ہوئے تو یہ اسی برزخیت کا نتیجہ ہے، برخلاف ان بچوں کے جو بشری والدین کے توسط سے پیدا ہوتے ہیں، اُن کی رُوح ماں باپ دونوں کی طرف کے مادی پردوں میں دبی ہوتی ہے، اسی لئے روحانی قوتوں کی بیداری کیلئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے مگر مسیح (علیہ السلام) پر صرف ماں کی طرف کا ہلکا سا مادی پردہ چڑھا ہوا تھا، اسی لئے اس مدت کی ضرورت ان روحانی قوتوں کی بیداری کیلئے پیش نہ آئی، بلکہ بشری والدین سے پیدا ہونے والے انسانوں کی موت کا جو عام قدرتی قانون ہے اس سے بھی حضرت مسیح کو جو ہم باہر دیکھتے ہیں تو اسکی توجیہ بھی یہی ہے کہ وہ پورے آدمی ہی کب تھے بلکہ جیسے بے شمار فرشتے جبرئیل، میکائیل جس طرح زندہ ہیں کچھ اسی قسم کی نوعیت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کی بھی ہے، گر تھوڑا سا بشری حصہ ماں کی طرف کا بھی ان کے اندر چونکہ شریک تھا، اس لئے بالآخر بشری موت کا قانون آخر میں اُن پر نافذ ہوگا۔ ۱۲

کہتا ہے کہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یعنی كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ یا ایسی بھاری بات جو نہ کبھی سنی گئی اور نہ دیکھی گئی، یعنی لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تو انصاف شرط ہے کہ جس چیز کو انھوں نے مانا ہے، اس کی صحیح تعبیر کے لئے اور کیا کہا جاتا، اور یہ تو خیر "نظریۂ ولدیت" کی وہ باتیں ہیں، جو "ولدیت" کے اس لفظ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ باقی اس عقیدے نے خود اس عقیدے کے ماننے والوں کی آئندہ تاریخ کو، اور ان کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو جن روح گداز، جاں فرسا، حوادث و واقعات سے گذرنا پڑا، اور گذرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل اس اشارے میں ملے گی، جو اسی کے بعد والی آیت میں کیا گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

"سرمایہ"

(حکیم مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی)

سرمایہ انسان کی معاشی زندگی کا خون ہے جس کے بغیر اس کی معاشی جد وجہد جاری نہیں رہ سکتی، خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ دنیا کے مختلف حصّوں میں تعلقات انسانی زندگی کے مستقل حصّے بن گئے ہیں، اس کی ضرورت ہوا اور پانی کی ضرورت سے آنکھیں ملانے کی جرأت کر رہی ہے۔

اس کی ضرورت کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس سوال کی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ "سرمایہ" کو کہاں رہنا چاہئے؟ اس سوال کے دو جواب اس وقت دنیا کے سامنے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی موجود ہیں۔

پہلا جواب نظام سرمایہ داری (CAPITALISSM) ہے، جو دنیا کے اکثر حصّے میں رائج ہے، اور جس کا نظریہ یہ ہے کہ سرمایہ کو ہر اُس شخص کی ملکیت ہونا چاہئے جو اسے کسی طبعی طریقے سے حاصل کرے، اور ہر فرد کو اس میں اضافہ کرنے، اس کو جمع کرنے، اور اس کو استعمال کرنے میں پوری پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ البتہ انسان کی معاشی جد وجہد کو پراگندگی و خوف سے بچانے کے لئے اور اجتماعی نظم قائم رکھنے کے لئے اس حد تک کچھ پابندیاں عائد کرنا ضروری ہے جو سرمائے کے بارے میں سرمایہ داری کی فطری آزادی میں خلل انداز نہ ہوں اور جن کا مندرجۂ بالا مقاصد کیلئے ناگزیر ہونا خود سرمایہ داروں کو بھی محسوس ہوتا ہو۔ مثلاً ڈکیتی و چوری وغیرہ کی ممانعت۔
اس انفرادی سرمایہ داری کا اثر یہ ہوا کہ دنیا کا معاشی توازن بگڑ گیا، دنیا کی آبادی دو طبقوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جس کے پاس دولت کے انبار ہیں، اس لئے

آرام اُن کا غلام اور راحت اُن کی باندی ہے، عیش و مسرت کی کثرت نے ان کے لئے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا ہے، اور تکلیف و پریشانی ان کے گھر کی طرف رُخ کرنے کی بھی ہمت نہیں کرتی ہے۔

ایسے لوگوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ شاید دنیا کی بقیہ آبادی ان سے لاکھوں گنا زائد ہوگی، اور اس اکثریت کا یہ عالم ہے کہ اس کو ضروریاتِ زندگی کا میسر ہونا بھی مشکل ہے اطمینان ان کے گھروں میں قدم رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا، البتہ پریشانی و تکلیف ان کے مستقل مونس، غمگسار ہیں، اور تنگدستی و افلاس ان کے وفادار ساتھی۔

ہندوستان میں بھی یہی نظام رائج ہے اس لئے ہم ہندوستانی اس کے کڑوے پھلوں کو خود کھا رہے ہیں۔ مٹھی بھر دولت مندوں کے مقابلے میں ہماری زندگی جس تلخی کے ساتھ بسر ہوتی ہے اس کو ہم محسوس تو کرتے ہیں لیکن زبان کو اس کے بیان کی قدرت نہیں ہے۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ دنیا کی اکثر آبادی کا یہ عالم ہے کہ افلاس کی وجہ سے زندگی ان کے لئے ایک خاردار نوالہ بن گئی ہے، جس کو نہ وہ اگل سکتے ہیں نہ نگل سکتے ہیں۔ اور یہ سب اس نظام کی وجہ سے ہے جسے نظام سرمایہ داری کہا جاتا ہے اور جس میں سرمایہ شخصی ملکیت میں رہتا ہے۔

اس مصیبت سے تنگ آ کر ایک گروہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سرمائے کو حکومت کے پاس رہنا چاہئے، حکومت جماعت کی نمائندگی اور وکالت کرتی ہے، اور ہر فرد کو اس کا نفع پہونچا سکتی ہے، اس کے سامنے اجتماعی مفاد ہوتے ہیں، اس لئے وہ سرمائے کو اس طرح کام میں لائے گی جس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے گا۔ جماعت میں امیر و غریب کے طبقے باقی نہیں رہیں گے، اور دنیا کا معاشی توازن درست ہو کر مصیبتوں کو دُور کر دے گا۔ اس طریقے کا نام اشتراکیت (SOCIALISM) ہے۔

نظام سرمایہ داری کی برائی ایسی چیز ہے جس کو ہم روزمرہ دیکھتے رہتے ہیں، اسکی حمایت تو صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو یا تو خود سرمایہ دار ہیں یا سرمایہ داروں کے نمک خوار، ورنہ اس کے اندر کوئی خوبی ایسی نہیں جس کی وجہ سے اس کی حمایت کی جائے، نہ اُس کے

جرائم ایسے ہلکے ہیں جن کو معاف کر دیا جائے اور اس کو مٹانے کی کوشش سے پہلوتہی کی جائے، وہ نظام جس کی بنیاد زرپرستی پر قائم ہو کسی مسلمان کے نزدیک رعایت کا مستحق نہیں ہو سکتا، اور ایسے بے رحمانہ نظام کو مٹانے کی جدوجہد اسلامی نقطۂ نظر سے کارِ ثواب ہے، جو نہ جانے کتنی بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کا سبب بن کر انسان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق بنا رہا ہے۔

بحیثیت مسلمان ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ وہ طبقاتی تقسیم جو موجودہ دنیا کے اکثر حصے میں پائی جاتی ہے بہت غلط اور بے رحمانہ ہے اس لئے اس کو ختم ہو جانا چاہئے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اس مخالفت میں متفق ہونے کی وجہ سے ہم اشتراکیوں کی اس رائے سے بھی متفق ہیں کہ سرمایہ حکومت کے پاس رہنا چاہئے، اور یہ کہ اس طرح یہ طبقاتی تقسیم ختم ہو جائے گی۔

آیئے اس مسئلہ کو عقل و فہم کے سامنے پیش کریں، اور دیکھیں کہ اس کا فیصلہ اس بارے میں کیا ہے؟۔

یہاں گفتگو صرف اس مسئلہ پر ہے کہ اگر سرمایہ شخصی ملکیت کے بجائے حکومت کی ملکیت میں آ جائے تو معاشی طبقات ختم ہو جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ معاشی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یا ایسا نہیں ہوتا؟۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں باتوں یعنی (سرمایہ حکومت کی ملک ہو جانے اور معاشی طبقات ختم ہو جانے) میں کونسا ایسا منطقی ربط و تعلق ہے جس کی وجہ سے دوسری چیز پہلی کیلئے لازم ہو گئی ہے۔ وہ سرمایہ حکومت کے پاس رہے!! اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ سرمایہ داری ختم ہو گئی۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس کی شکل بدل گئی، یعنے شخصی سرمایہ داری (INDIVIDUAL CAPITALISM) حکومتی سرمایہ داری (STATE CAPITALISM) میں تبدیل ہو گئی، لیکن سرمایہ داری کی روح بدستور باقی رہی۔

جمہوری ریاست (REPUBLIC STATE) میں اگرچہ حکومت

عوام کی نمائندہ ہوتی ہے، لیکن ایک مستقل کام رکھنے کی وجہ سے ایک ممتاز اور مستقل جماعت ہوتی ہے، جو کل سرمایہ پر قابض اور متصرف ہوتی ہے، یہ ناممکن بات ہے کہ وہ پبلک کے ہر فرد کی مرضی کے مطابق اس سرمایہ کو جمع اور خرچ کرے، یا ہر شخص کو اس سے یکساں فائدہ پہونچائے، یا معیار زندگی کے لحاظ سے ہر فرد کو ایک ہی سطح پر لے آئے، ایسی حالت میں سرمائے کی اس مکانی تبدیلی کا ماحصل صرف یہ رہ جاتا ہے کہ متعدد سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک بڑا سرمایہ دار بنایا جائے جس کا نام حکومت ہے پبلک کو کم از کم دو طبقوں میں منقسم کر دیا جائے یعنی اہل حکومت اور عوام، جن کے معیار زندگی میں یقیناً بہت فرق ہوگا۔

عوامی حکومت کی عمارت رائے عامہ کے ستونوں پر قائم کی جاتی ہے لیکن جو لوگ فن الکشن بازی سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مومی ستون کتنی آسانی کے ساتھ مختلف سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہ تو اس قدر کمزور چیز ہے کہ بعض اوقات معمولی سی آتش بیانی اس کے پگھلنے اور شکل بدلنے کے لئے کافی ہوتی ہے، چہ جائیکہ ان لوگوں کی چالاکیاں اور پر فریب تدبیریں جن کی آتش نفسی ایک عالم میں فتنہ کی آگ بھڑکا دینے کی خاصیت رکھتی ہو۔

گفتگو انسانی آبادی کے متعلق ہے نہ کہ فرشتوں کی آبادی کے متعلق، ایسی صورت میں اس کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ آبادی کا چالاک اور خود غرض عنصر سرمایہ پر قابض ہو کر اور اس میں اپنے من مانے تصرفات کر کے آبادی کی اکثریت کو ان کے بہت سے جائز حقوق سے محروم نہ کر دے گا! اور سرمائے کے بہت سے منافع، مختلف تدابیر اور مختلف شکلوں میں صرف اپنے طبقہ کے لئے مخصوص نہیں کر لے گا؟۔

یہ صورت تو ایک ایسی مشترکہ کمپنی کی سی ہے جس کے حصہ داروں کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود اس کے ملازمین اور مزدوروں سے بہر حالت کم ہوتی ہے، اور وہ ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر بلا شرکت غیرے قابض ہوتے ہیں البتہ اپنی خدمت اور تجارتی اغراض میں امداد حاصل کرنے کے لئے مجبوراً ان کو بقدر ضرورت اجرت دیتے ہیں، اگر

کمپنی کی جگہ حکومت اور مزدور کی جگہ رعیت کے الفاظ استعمال کیجئے تو یہی تصویر اشتراکی نظام کی شکل بتا دے گی اور اس پر خط بخط خال بخال منطبق ہو جائے گی۔

اس مکمل مشابہت کے ساتھ اشتراکی نظام میں ایک چیز اور زائد بھی ملے گی، جو مصیبت بالائے مصیبت کی مصداق ہے۔ یعنی ایک مشترکہ کمپنی کا ملازم یا مزدور تو یہ اختیار رکھتا ہے کہ جب چاہے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جائے، لیکن جب حکومت و سرمایہ ایک ساتھ جمع ہو جائیں اور سیم و زر کو فولاد کی امداد بھی حاصل ہو جائے تو غریب مزدور و ملازم کا یہ اختیار بھی سلب ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت زمانۂ قدیم کے غلام یا بے جان مشین کے ایک پرزے کی ہو جاتی ہے جس کا ارادہ اور خواہش دونوں چیزیں بے وزن، بے وقعت اور بے اثر ہیں۔

کیا یہ چیزیں ایسی ہیں جن کی انسان خواہش کرے؟۔

کیا یہ جبری زندگی انسانی فطرت کے مطابق ہے؟۔

کیا یہ مصیبت نظام سرمایہ داری کی مصیبت سے کچھ کم ہے؟۔

معاشی طبقات کی مصیبت اس شکل میں بھی بدستور موجود رہتی ہے، آبادی دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتی، اہل حکومت اور عوام۔ اور اس کا انکار سخت ہٹ دھرمی ہے کہ دونوں طبقوں کے معیارِ زندگی میں فرق ہونا لازمی ہے، پھر اس میں کیا چیز ہے جس کی وجہ سے کوئی سمجھدار انسان اس نظام کو اختیار کرنے کی طرف راغب ہو، اور اشتراکی نظام کو رائج کرنے کیلئے جد و جہد کرے۔

جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ محض منطقی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ تجربہ اور مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے، نظام اشتراکی کا عملی نمونہ آج روس میں موجود ہے، روس ہی وہ جگہ ہے جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا، اور آج بھی اس نظریہ و نظام کی دعوت کا مرکز وہی ہے۔ وہاں بھی اس وقت دو طبقے موجود ہیں۔ ایک اعلیٰ طبقہ ہے جس کا معیارِ زندگی بہت بلند ہے، یہ وہ گروہ ہے جو حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے، یا حکومت سے کوئی خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا ادنیٰ طبقہ ہے جس کا معیارِ زندگی اس سے نسبتاً

بہت پست ہے۔ اور جس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا خون پسینہ ایک کرکے ارباب حکومت کی راحت رسانی کا انتظام کرے۔ قانون کی شدید گرفت نے اس کو غلام کی حیثیت دے دی ہے، اس کی مرضی اور خواہش کوئی چیز نہیں ہے۔ اور وہ اعلیٰ طبقہ کے خوبصورت بنگلوں، لذیذ کھانوں، تیز رفتار موٹروں، خوبصورت لباسوں، رقص و سرود کی محفلوں اور دیگر عیش کوشیوں کو دیکھ کر بجز آہ حسرت کھینچنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔[1]

خدارا کوئی بتائے کہ کیا روس میں اسٹالن اور ایک روسی سپاہی کا معیارِ زندگی ایک ہی ہے؟ کیا وہاں کے حکام اور معمولی مزدور ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ کیا دونوں کا تعلق سرمائے کے ساتھ یکساں ہے؟۔ ہاں کہنے کی جرأت تو شائد کوئی بڑے سے بڑا اشتراکی بھی نہیں کرسکے گا۔

سودی لین دین نظام اشتراکی میں بھی جائز ہے، روس کی حکومت سود لیتی بھی ہے اور دیتی بھی۔ کیا سود دینے والے اور سود لینے والے کی دولت ایک ہی مقدار میں رہ سکتی ہے؟ پھر معاشی طبقات پیدا نہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور اسکی کیا صورت ہے؟ اور کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ آج اشتراکی روس کی آبادی معاشی طبقات میں تقسیم نہیں ہے؟۔

اشتراکی یوگوسلاویہ، ٹرکی اور بعض دیگر ممالک کے ساتھ روس کے برتاؤ نے یہ چیز ظاہر کردی ہے کہ دوسروں کو غلام بنانے کی خواہش اشتراکیت کے ساتھ بھی اسی طرح پرورش پاتی ہے جس طرح سرمایہ داری کے ساتھ اس کا نشو و نما ہوتا ہے۔ یوکرین کی قریبی بغاوت (جسے غالباً ۲ سال سے کم عرصہ ہوا ہے) کو جب ہم کمیونسٹوں

---

[1] یہ سب سانحات لوئی فشر کی کتاب (THE GREAT CHALLENGE) سے ماخوذ ہیں جن کی تائید اخبارات سے بھی ہوتی رہتی ہے۔ مصنف خود اشتراکی نظریہ کا حامی ہے۔ مگر اشتراکیوں کی بے عملی سے نالاں۔ اشتراکی دوست سب باتوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ سب مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ لوئی فشر کے متعلق یہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ تاہم اسے تسلیم کرنے کے بعد بھی سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ خود اشتراکیوں کے بیان کو کیوں نہ سچا

۲ سمجھا جائے۔ ۱۲

کے اس اصول کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ "جنگ ہمیشہ معاشی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے" تو وہ روس میں طبقاتی کشمکش کا پتہ دیتی ہے، اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کیمونزم معاشی بے اطمینان کو دور کرنے سے قاصر رہا ہے۔

عقل کس طرح باور کرے کہ محض سرمائے کی جگہ بدل دینا معاشی مصیبت کو ختم کردے گا؟ حالانکہ اس مصیبت کا حقیقی سبب یہ نہیں ہے کہ سرمایہ چند جیبوں میں جمع ہو گیا ہے، بلکہ اصل سبب سرمایہ دار کی قوت تصرف کی زیادتی ہے، کوئی قارون یا فورڈ مزدور کے مقابلے میں طاقت ور اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی تجوریوں میں ہزاروں من سونا چاندی جمع ہے، اگر اسے اپنے خزانے میں حسب منشا تصرفات سے روک دیا جائے تو کیا پھر بھی اس کی طاقت مزدور کے مقابلے میں زیادہ کہی جا سکتی ہے؟۔ ایسی دولت کا مالک جس میں وہ حسب منشا تصرف نہ کرسکے خزانہ کا سانپ تو بن سکتا ہے مگر مزدور کی لاٹھی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن خزانے میں ہر قسم کے تصرفات کا مقتدر خواہ وہ اس کا مالک نہ ہو وہ اژدہا ہے جس کی پھنکار ہی مزدور کو لرزہ براندام کر دینے کیلئے کافی ہے، کیمونزم سرمائے پر اسی قسم کا سانپ مسلط کر دیتا ہے۔ کیمونسٹ حکومت سرمائے پر قابض ہوتی ہے اور اس میں تصرف کرنے کے بارے میں آزاد ہوتی ہے، رعیت کو اس بارے میں کوئی حق نہیں ہوتا، اس حالت میں غریب مزدور کی مصیبت کیسے دور ہو سکتی ہے؟ سوسائٹی طبقاتی کشمکش سے کس طرح نجات پا سکتی ہے؟ کیمونزم کو سرمایہ داری سے جدا کرنے والی کیا چیز باقی رہ جاتی ہے؟

اور کیا ایک منصف مزاج کے نزدیک سرمایہ کی اس مکانی اور ملکیتی تبدیلی کو سرمایہ داری ہی کی ایک دوسری شکل نہیں کہا جا سکتا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ سرمائے کو کہاں رہنا چاہئے؟ یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے۔ کیمونزم بھی اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ پھر ہم اسے کیوں اختیار کریں؟ اور اس کا کوئی دوسرا حل کیوں نہ تلاش کریں؟۔ (باقی آئندہ)

انتخاب

ٹنڈن جی سے :—

اپنے صوبہ کے ٹنڈن جی کی آواز تو ہم کو بھی سنائی دیتی ہے، اخباروں میں آیا ہے کہ راج رشی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ہندو کلچر کو اختیار کریں ورنہ پاکستان کی راہ لیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ٹنڈن جی سے اول تو میرا یہ کہنا ہے کہ کیا وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہیں یا بادشاہ ہیں جو پوری قوم کی طرف سے اپنے خیال کا اظہار حکم کے لہجہ میں کر رہے ہیں، وہ اس صوبہ کی اسمبلی کے ایک اسپیکر اور اس صوبہ کی کانگریس کے صدر ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں، اور اسی لئے وہ اس حکمانہ لہجہ میں باتیں کرکے اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ ہندو کلچر جس کے وہ منادی ہیں کہاں پایا جاتا ہے؟ کیا انکی داڑھی ہندو کلچر ہے؟ کیا ان کا ننگا سر ہندو کلچر ہے؟ کیا بھارت کی یونیورسٹیوں میں ہندو کلچر ہے؟ کیا ہمارے بڑے بڑے عہدہ داروں، نئے تعلیم یافتوں اور طالب علموں کے طور طریق اور لباس وضع قطع اور زبان بیان و طریق زندگی میں ہندو کلچر ہے؟ آج ہر جگہ یورپ کا تمدن پھیل رہا ہے، اسی کی پیروی ترقی کا نام پا رہی ہے۔ ہمارے نوجوان برملا کہتے ہیں کہ یورپ کے اس اُبلتے سیلاب کو جو ہر میدان میں نظر آرہا ہے آج ہندو کلچر سے نہیں بلکہ اسی کے طور طریق سے روک سکتے ہیں، اور اب یہ پرانی باتیں کسی پرانے ڈھنگ کے ملک میں بھی نہیں چل سکتی ہیں، اس لئے اگر کوئی نئے زمانہ کا دل جلا نوجوان کسی دن خود راج رشی سے یہ کہہ دے کہ رشی جی آپ یوروپین کلچر اختیار کیجئے ورنہ ہندوستان چھوڑ کر نیپال کی ترائی میں چلے جائیے، اور وہیں تپسیا کیجئے، تو کیا ہوگا۔ "معارف" اعظم گڑھ

پاکستان کے ہندو اور قانون شریعت :—

"۲۲ مئی کے (قومی آواز لکھنؤ) میں ایک بنگالی پناہ گزین پروفیسر مسٹر پی سنہا کا ایک اہم مضمون (مشرقی بنگال کے ہندو) کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے دلائل اور حقائق کی روشنی میں مسٹر شیاما پرشاد مکرجی جیسے اعلیٰ ہندو لیڈروں کی زبردست تردید کی ہے جو اپنے رویہ سے مشرقی بنگال کے

ہندوؤں میں بے اطمینانی پیدا کر کے سب کو ہندوستان کھینچنا چاہتے ہیں، اس مضمون کا آخری ٹکڑا

جو اسلام کے قانون شریعت سے متعلق ہے، ملاحظہ ہو:۔ "مدیر"

بہت سے ایسے شرارت پسند عناصر ہیں جو صرف اپنے ذاتی فائدہ کیلئے مشرقی بنگال کے ہندوؤں کو خوف زدہ کر رہے ہیں کہ وہاں چند دنوں کے بعد قوانین شریعت نافذ ہو جائیں گے جسکی بنا پر ہندوؤں کو ستایا جائے گا، اور ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جائیں گے۔ وہاں کے ناسمجھ لوگ ان کو اپنا بڑا رہبر و رہنما خیال کر کے انہی کے خیالات اور انہی کی تحریر و تقریر پر عمل کر رہے ہیں، لوگ ان کو اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ناسمجھی سے یہ شرارت پسند عناصر خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں، میں نے خود اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے میں وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے غیر مذہب والوں کی حق تلفی ہو، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کیلئے تیار ہوں کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہاں قوانینِ شریعت نافذ کر دیئے جائیں، اس لئے کہ شریعت کی رو سے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان غیر مذہب والوں کا جو ان کے ملک میں رہتے ہیں، ہر قسم کا مالی، جانی، اور مذہبی تحفظ کریں، اس طرح وہاں کی حکومت صرف سیاسی اعتبار سے نہیں بلکہ مذہبی طور پر بھی ان کا تحفظ کرنے کے لئے مجبور ہوگی۔ اس لئے مشرقی بنگال کے ہندو بھائیوں سے میری التجا ہے کہ وہ اپنے وطن کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں بلکہ ان شرارت پسند عناصر کا جو ان کو غلط راستہ پر لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

"قومی آواز" لکھنؤ

سینما کا اثر:۔

گورکھپور کی ایک خبر ہے کہ وہاں ایک شخص نے دو تعلیم یافتہ لڑکیوں کو پہلے تو سینما بینی کا شوقین بنایا پھر انھیں فلمسٹار بنانے کے لالچ سے بمبئی لے گیا اور وہاں جاکر اُنکی عصمت دری کی۔ اس کیس کا فیصلہ کرتے ہوئے فاضل جج نے مندرجۂ ذیل ریمارک دیا ہے۔

عشق کے ہلاکت ناک ترانے بھری ہوئی عام ہندوستانی جلسی فلمیں، نوجوان لڑکیوں کے دل میں ایک کسک پیدا کر دیتی ہیں اور وہ ایسے ہی عشق کے خواب دیکھنے لگتی ہیں جو انہوں نے پردۂ سیمیں پر دیکھا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت کی چنگاریاں سلگتے سلگتے شعلہ بن جاتی ہیں لیکن جب سماج کے ڈھانچہ کے اندر محبت کرنے کا انھیں کوئی موقع ہاتھ نہیں آتا تو وہ باغی ہو جاتی ہیں

"الانصاف" الہ آباد

تذکرہ امام ربانی

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و خصائص اور آپ کے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی بیان، اکبر اور اس کے منافق و ملحد حواریوں کے گڑھے ہوئے "دین الٰہی" کی تفصیلات، اس زمانہ کے علماء سوء اور ملحد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندستانی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لیے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جدوجہد اور بارگاہ خداوندی میں چیخ پکار اور اصلاح و تجدید کی اس کوشش میں آپ کی محیر العقول کامیابی، اور مغلیہ سلطنت کے رویہ اور مسلک پر آپ کی مساعی تجدید کا اثر۔

ان تمام چیزوں کی پوری تفصیل آپ کو "تذکرہ امام ربانی" کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے

قیمت .... عار

تصوف و احسان

اور ہندستان میں صوفیہ صافیہ کے برکات

عرصہ ہوا اس عنوان سے مولنٰا نور الحق صاحب پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کا ایک مقالہ دو تین برس تک مسلسل الفرقان میں شائع ہوا تھا ــــ کتابی شکل میں اس کی اشاعت کے لیے بہت سے شائقین کا شدید تقاضا تھا ــــ اب خدا خدا کر کے کتابی شکل میں اس کے تھوڑے سے نسخے تیار ہو گئے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اردو ہی نہیں بلکہ کسی زبان میں بھی یہ معلومات اس طرح مرتب نہیں ملیں گے۔ علمی اور تحقیقی لحاظ سے بہت بلند پایہ کتاب ہے پوری کتاب الفرقان ہی کے سائز کے صفحات پر ہے۔

قیمت .... عمر

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

حضرت شاہ ولی اللہ رح

(از۔ مولنٰا سید مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہ کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ تحریکوں کا زور اور ان کے غارتگرانہ ہنگامے نادر شاہ کا طوفانی سیلاب اور احمد شاہ ابدالی کی تاریخی جنگ، یہ سارے واقعات شاہ صاحب رح ہی کے زمانہ میں ہوئے اور شاہ صاحب ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے اس لیے اس مقالہ میں ان تمام واقعات اور ان کے اسباب و اثرات کا ذکر بھی اچھی خاصی تفصیل سے آگیا ہے پھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحب نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی اور ان کے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔

کاغذ سفید چکنا

قیمت .... (عمر)

امام ولی اللہ دہلوی رح

اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولنٰا عبید اللہ سندھی رح)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور ان کے فلسفہ پر یہ نہایت گہرا علمی مقالہ بلاشبہ نوادر میں سے ہے اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پانچ باب ہیں پہلے باب میں شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور ہند و حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں ان کی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے۔ اور چوتھے اور پانچویں باب میں علم کلام، فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے

کاغذ سفید چکنا

قیمت .... (عمر)

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ

الفرقان
مرتبہ
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ط

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

خوش آنکہ بندم در رہ رت بر ناقہ محمل از وطن
خیزم چو گرد، افتم چو اشک آیم بسر غلطم بہ تن

الفرقان لکھنؤ
حج نمبر

سنہ ۱۳۶۹ ہجری

مُرتّبہ

محمد منظور نعمانی

قیمت فی کاپی عہ/ سالانہ چندہ ۵ صہ/ .. سالانہ نمبر رجب سے الفرقان میں

محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر

فہرست مضامین "حج نمبر الفرقان لکھنؤ" سنہ ۶۹ ۱۳ ہجری

جلد نمبر (۱۷) | بابت ماہ شعبان و رمضان و شوال سنہ ۱۳۶۹ھ | نمبر (۸-۹-۱۰)

اپنے ناظرین کرام سے

گزشتہ سال بھی حج نمبر ۱۶۰ صفحہ ہی پر شائع ہوا تھا، گویا اس کی ضخامت الفرقان کی تین عمومی اشاعتوں کے برابر تھی لیکن اسکو دو ہی مہینے (رمضان و شوال) کے قائمقام کیا گیا تھا ـــــ اس سال کا یہ حج نمبر جو آپکے ہاتھ میں ہو اتفاق سے اسکی ضخامت بھی وہی ہو اور جی چاہتا تھا کہ اس مرتبہ بھی دو ہی مہینے کے قائمقام کیا جائے لیکن اول تو الفرقان کی مالی حالت اسوقت اس بار کی متحمل نہیں، علاوہ ازیں شوال کے آخر میں یہ انشاء اللہ شائع ہو سکے گا، اسلیے ہم نے اسکو تین ماہ (شعبان، رمضان، شوال) کے قائمقام قرار دیا ہو، اب اسکے بعد انشاء اللہ ذیقعدہ ہی کا شمارہ شایع ہوگا، امید ہو کہ ہمارے خاص حالات کے پیش نظر ناظرین کرام کےلیے ہمارا یہ فیصلہ ناگوار نہ ہوگا ـــــ ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ

سخنہائے گفتنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ واقعہ ہو کہ گذشتہ سال جب حج نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا گیا اور جب وہ تیار ہو کر نکلا تو اسکا کوئی ارادہ بلکہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ آئندہ پھر اس قسم کا کوئی نمبر نکالا جائے گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے نمبر کی اشاعت سے تین چار ہفتے بعد ہی سفر حج کی توفیق اس نامہ سیاہ کو عطا فرمائی تو پہلے جہاز میں اور اسکے بعد مکہ معظمہ میں اور پھر مدینہ منورہ میں بکثرت حجاج کے ہاتھوں میں دیکھکر مسرت بھی ہوئی اور یہ خیال بھی دلمیں آیا کہ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے اور ہر سال اسی طرح الفرقان کا حج نمبر شائع ہوا کرے تو انشاء اللہ بڑے خیر اور بڑے اجر کی توقع ہو اور سیکڑوں اللہ کے بندوں کے حج میں اور ان کی دعاؤں میں شریک ہونے کا ایک اچھا ذریعہ ہو ـــ میرے دلمیں تو یہ خیال بس آرزو ہی کے درجہ میں آیا تھا لیکن ایک دن خاص مسجد حرام میں ایک بڑی بابرکت صحبت میں مخدومنا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اس ناچیز سے فرمایا کہ ہر سال الفرقان کا حج نمبر نکلنا چاہیئے! آپ صاحب کے اس ارشاد نے آرزو کو ارادہ سے بدل دیا اور وہیں اس کا فیصلہ کر لیا گیا۔

لیکن حجاز سے جب میں واپس آیا تو ہندوستان و پاکستان کے درمیان تبادلۂ زر بند ہو جانے کی وجہ سے الفرقان غریب کو میں نے اس حالت میں پایا کہ اسکے جاری رکھنے یا بند کر دینے کا سوال درپیش تھا۔ بہرحال الفرقان کو جاری رکھنے کا فیصلہ تو کر لیا گیا، لیکن خاص نمبر نکالنے کا خیال یا منصوبہ قدرتی طور پر نسیاً منسیاً ہو گیا، یہانتک کہ جب حج کا مہینہ آیا اور حج کے تذکرے اور چرچے شروع ہوئے اور انھوں نے وہاں کے مناظر وہاں کی صحبتیں اور بہاریں یاد دلائیں تو پھر دل میں امنگ اٹھی اور بنام خدا حج نمبر کا اعلان کر دیا گیا۔

گزشتہ سال حج نمبر کی تیاری شعبان میں شروع ہوئی تھی اور صرف رمضان کے ایک مہینہ میں کتابت طباعت کے سارے مرحلوں سے گزر کر عید کے دن وہ تیار ہو چکا تھا ـــ اس سال خیال تھا کہ اگر شعبان کے آخر تک نہیں تو رمضان کے شروع میں انشاء اللہ ضرور شائع کر دیا جائے گا۔ یہی پروگرام تھا اور اسی خیال سے مقالہ نگار حضرات سے اواخر رجب یا زیادہ سے زیادہ اوائل شعبان تک مضامین کی استدعا کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے اکثر حضرات نے مقررہ وقت ہی پر مقالات بھیجدیے لیکن اس وقت کارکنان الفرقان کے لیے وہ مجبوری پیش آگئی جس کا ذکر رجب کے الفرقان میں

کیا جا چکا ہے اور اس معاملہ میں وہ بالکل بے بس ہو گئے۔ پھر بھی خیال تھا کہ انشاء اللہ شروع شوال تک ہم شائع کر سکیں گے لیکن امورِ تقدیری پر کس کا بس چلتا ہے، اس عاجز کی والدہ ماجدہ جنکی طبیعت کئی مہینہ سے ناساز چلی آ رہی تھی، شعبان میں انکی علالت نے ایسی شدت اور نزاکت اختیار کر لی کہ تمام کاموں کو موخر کر کے ان کی خدمت میں پہونچنا اور حاضر رہنا میرے لیے ضروری ہو گیا چنانچہ میں لکھنؤ سے اپنے وطن (سنبھل ضلع مرادآباد) ان کی خدمت میں چلا گیا۔ تا آنکہ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۝ کے قانونِ عام کے تحت رمضان المبارک کے آخری مبارک زرین عشرہ کے پہلے دن یعنی ۲۱ رمضان کو ٹھیک نماز مغرب کے وقت انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور دوسرے عالم میں پہونچا دی گئیں[1] (اللھم اغفر لھا وارحمھا وعافھا واعف عنھا) اسکے بعد سنبھل ہی سے مجھے دہلی اور بہار پور جانا بعض وجوہ سے ضروری تھا، بہر حال اس سارے چکر سے فارغ ہو کر میں ۴ شوال کو لکھنؤ واپس پہونچ سکا۔ اگرچہ میری غیبت میں بھی حج نمبر کا کچھ کام ہوتا رہا لیکن بعض کام ایسے تھے جو مجھ سے ہی متعلق تھے وہ میرے انتظار میں رکے رہے جس کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔

چند مضامین کی گمشدگی کا سانحہ اس نمبر پر ایک حادثہ یہ بھی گزرا کہ ۲۹ شعبان کو یہ عاجز سنبھل سے لکھنؤ آ رہا تھا راستہ میں مرادآباد کے اسٹیشن پر ایک چرمی بیگ چوری ہو گیا جسمیں بعض اور ضروری اور قیمتی چیزوں کے علاوہ حج نمبر کے چار مقالے بھی تھے، ایک مقالہ جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ کا تھا، اور دو مقالے مولنا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کے تھے اور ایک مقالہ مولنا سید محمد ثانی کا تھا ان مقالات کے علاوہ نمبر ہی کی چند نظمیں بھی تھیں، ان گمشدہ مقالات میں سے صرف مولنا محمد اویس صاحب کا ایک مقالہ ان سے دوبارہ مل سکا جو اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے انشاء اللہ ناظرین اسکو دلچسپی سے پڑھیں گے اور بڑی لذت و حلاوت پائینگے، باقی مقالے دستیاب نہ ہو سکے، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے مقالہ کا ایک حصہ جو "زیارت" سے متعلق تھا اور جو بعد میں آیا تھا حسنِ اتفاق سے وہ دفتر الفرقان ہی میں تھا اسلئے وہ رہ گیا اور وہی اس نمبر کا گویا "مقطع" یا "حرفِ آخر" ہے انشاء اللہ ناظرین اسکے مطالعہ سے بہت محظوظ اور مستفید ہوں گے۔

بہر حال نمبر کی تیاری اور اشاعت میں جو مزید تاخیر ہوئی اسمیں مضامین کی گمشدگی کے اس حادثہ کو بھی خاصا دخل ہے۔

خیر خدا کا شکر ہے کہ ان تمام حوادث و سوانح سے گزر کر اب کشتی کنارے آ لگی ہے آج ۱۱ شوال ہے انشاء اللہ ۴، ۵ دن میں نمبر تیار ہو جائے گا اور خدا نے چاہا تو زوال ختم ہوتے ہوتے اکثر ناظرین کو مل جائیگا۔ اگرچہ حجاج کی ایک خاصی تعداد شروع شوال کے جہازوں میں جا چکی ہے لیکن ذیقعدہ میں بھی ابھی کئی جہاز اور جانے والے ہیں، نمبر کے جو شائقین ان جہازوں سے روانگی کا ارادہ رکھتے ہیں انشاء اللہ انکی خدمت میں یہ نمبر روانگی تک پہونچ جائے گا۔ اگر بالفرض حج کو جانے والے انکے چند بندوں تک بھی یہ پہونچ گیا اور انھوں نے اس سے کچھ فائدہ اٹھا لیا تو پھر انشاء اللہ سب محنت وصول ہے اور اس تاخیر کا پھر زیادہ غم نہیں۔ **محمد منظور نعمانی**

---

[1] ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ وہ مخدومہ مرحومہ کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا فرما کر اس عاجز پر احسان فرمائیں۔

باسمہٖ سبحانہٗ

حمداً و مصلیاً

نگاہِ اوّلیں!

(مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی)

ناظرین الفرقان اور عازمین حج کی خدمت میں "الفرقان" کا دوسرا "حج نمبر" پیش ہے، گذشتہ سال ۱۳۶۸ھ میں پہلی مرتبہ یہ تجویز ذہن میں آئی اور بڑی عجلت کے ساتھ حج نمبر مرتب و طبع ہو کر قارئین اور مسافرین حرمین کی خدمت میں پیش ہو گیا۔ عازمین حج کی بے حسی اور حج کی اصل رُوح اور عظمت سے غفلت کو دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگی تھی کہ جو سفر سراسر سفرِ عشق و جہاد اور علانیہ عملِ محبت و اخلاص ہے اور جو عام طور پر بغیر غیر معمولی اہتمام اور خصوصی ذہنی قلبی و رُوحی توجہ کے انجام نہیں دیا جا سکتا، اُس کی معنویت و رُوحانیت اور آداب و احکام سے بڑی غفلت پائی جاتی ہے۔ شیطان کا بہت بڑا حربہ یہ ہے کہ جب وہ کسی عمل میں ظاہری تحریف و تغیر و تبدل سے قاصر رہتا ہے اور اس کی ظاہری شکل اور قالب کو بدل نہیں سکتا تو وہ اس عمل یا رکن کو رُوح اور حقیقت سے خالی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں حقیقت کے بجائے رسمیت پیدا کر دیتا ہے۔ قالب اور ظاہری شکل میں محسوس تغیر و تبدل نہ ہونے کی وجہ سے اس دین کے متبعین اور بعض اوقات محافظین کو بھی کوئی انقلاب محسوس نہیں ہونے پاتا اور وہ اپنے تساہل یا غفلت سے اس کا موقع دیدیتے ہیں کہ شیطان اپنا کام کرلے۔ اس صورت حال کا مقابلہ اور اس کی اصلاح بہت ہی مشکل ہوتی ہے، اس لئے کہ ظاہری تحریف اور تغیر و تبدل کو آسانی سے محسوس کر لیا جاتا ہے اور پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے، علماء اس تبدیلی پر تحریف اور اگر بہت رعایت سے کام لیتے ہیں تو بدعت کا حکم لگاتے ہیں، اصل سے مقابلہ کیجئے تو کھلا ہوا فرق معلوم ہوتا ہے اور عامی سے عامی بھی محسوس کر لیتا ہے کہ یہ ایک دینی فتنہ اور شریعت سے انحراف ہے، لیکن کسی عمل کے حقیقت سے خالی ہونے کا احساس بہت مشکل سے ہوتا ہے اس کے لئے بڑی گہری نظر کی ضرورت ہے۔ فرائض و آداب کی ظاہری پابندی

اور ضابطہ کی خانہ پری سخت دھوکا دیتی ہے، محتسب و واعظ کی زبان یہاں بند ہوتی ہے، فقیہ و مفتی اس کو اپنے حدودِ عمل سے خارج سمجھتے ہیں، یہ کام ان نائبین انبیاء کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ دین کی گہری بصیرت اور اعلیٰ اخلاقی جرأت عطا فرماتا ہے جس طرح اہلِ قانون قانونی مخالفت کے خلاف گرفت کرنا اپنا منصبی فرض سمجھتے ہیں، اسی طرح یہ اہلِ نظر اعمال و ارکان میں حقیقت و روح پیدا کرنے کی کوشش کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے حقیقی نتائج و ثمرات حاصل نہیں ہوتے، اور لوگوں کو یہ دیکھ کر استعجاب ہوتا ہے کہ اللہ و رسول نے ان اعمال کے متعلق جو وعدے فرمائے تھے، وہ معاذ اللہ نظر نہیں آرہے ہیں حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ وعدے حقیقت سے متعلق تھے نہ کہ صورت سے، اور ہماری غفلت و لاعلمی میں ہمارے یہ اعمال اکثر حقیقت سے خالی ہو گئے ہیں۔

پچھلے مذاہب و ادیان کی تاریخ کو دیکھا جائے گا تو صاف معلوم ہوگا کہ ان مذاہب میں یہ مخفی تحریف پہلے عمل میں آئی، پھر ظاہری تحریف نے بھی راہ پائی، اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں پر ظاہری تحریف سے محفوظ رکھا ہے لیکن فطرتِ انسانی بدل نہیں سکتی، جب حقیقت سے غفلت کی جاتی ہے رسمیت فوراً غالب آجاتی ہے، عمل کا ذوق اور اس کی روح نکل جاتی ہے، ایمان و احتساب کے بجائے رسم و رواج کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، پھر جو چیزیں ذوق، قوتِ ایمانی، اور روح سے سہارا حاصل کرتی ہیں اُن کو ذوق کے فقدان، قوتِ ایمانی کے اضمحلال، اور روح کے زوال سے اپنا وجود قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ظاہری ضوابط و قوانین کی پابندی بھی مشکل ہو جاتی ہے اور اس میں سستی اور غفلت شروع ہو جاتی ہے، آج ہمارا حج روح و ضابطہ دونوں کے انحطاط کا نمونہ ہے۔

مدیر "الفرقان" اور ان کے رفقاء نے یہ سمجھ کر کہ ہم رسالہ کے ذریعہ اپنی آواز کو زیادہ آدمیوں تک پہونچا سکتے ہیں، "حج نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا اور تھوڑے وقت میں اس کو مرتب کرکے پیش کر دیا، لیکن اُن کو اس کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ ان کی یہ حقیر خدمت اس قدر موثر اور نتیجہ خیز ہوگی۔ اگر مدیر الفرقان کو اُسی سال خود جہاز اور حجاز میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس انعام کا بچشم خود مشاہدہ نہ ہوتا اور وہ حجاج کو بکثرت بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس رسالہ کو پڑھتا ہوا اور اس کے اثرات کا اظہار و اعتراف کرتا ہوا نہ پاتے تو شاید وہ غائبانہ شہادتوں پر یقین نہ کرتے اور نہ ان کو اس سال دوبارہ حج نمبر مرتب کرنے کی تحریک ہوتی، لیکن گذشتہ سال انھوں نے جو کچھ دیکھا اور دوستوں اور اللہ کے مخلص بندوں سے جو کچھ سنا اُس کے بعد

دوبارہ اس نمبر کا مرتب نہ کرنا ایک طرح کا کفرانِ نعمت معلوم ہوتا ہے۔ حج کے اس وسیع سمندر میں کوئی سکون یا اضطراب پیدا کرنا بڑی بڑی منظم حکومتوں کے بھی بس کی بات نہیں رہی، اس میں ایک کاغذی سفینہ اگر کوئی ادنیٰ خدمت بھی انجام دے سکے، اور چند سو آدمیوں تک بھی دین کی بات پہونچا سکے اور چند درجن آدمیوں کے دل میں بھی حج کی اہمیت و ذوق پیدا کر سکے، یہ محض اللہ کا فضل ہے اور مدیر "الفرقان" ان کے شرکا کار اور رسالہ اس کے شکر میں اپنے مالک کی بارگاہ میں سربسجود ہیں۔

ہر نمبر کو حوادث و آلام کی تلخ داستان سے شروع کرنا اور حالات کی ناسازگاری کا شکوہ کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اس نمبر کی تیاری جس توجہ و سکون کی طالب ہے وہ میسر نہیں آسکا۔ مدیر الفرقان اپنی والدہ مرحومہ کی شدید علالت اور تیمارداری کے سلسلہ میں لکھنؤ سے عرصہ تک غیر حاضر رہے جس کی وجہ سے نمبر کی ترتیب و طباعت کا سارا کام صاحبزادوں کو انجام دینا پڑا، مسرت اور شکر کا مقام ہے کہ دونوں مرتبہ یہ سعادت ان کے حصہ میں آئی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خدا کا شکر ہے کہ پیشِ نظر رسالہ مضامین کی افادیت اور اصحاب مقالات کی بلندی و امتیاز کے لحاظ سے کسی معذرت کا محتاج نہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کے مکتوب گرامی میں جس طرح حج کی روح آگئی ہے اسی طرح وہ اس رسالہ کی روح ہے۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا پچھلا مقالہ جو گذشتہ حج نمبر میں شائع ہوا تھا ایک محققانہ اور خالص علمی مقالہ تھا جس سے اہلِ علم نے استفادہ کیا۔ مولانا ممدوح صاحبِ علم و قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ درد و صاحبِ قلب بھی ہیں، اور جہاں کہیں ان کے قلم کی باگ ان کے دل کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ان کے کلام کی تاثیر و دل آویزی کا کچھ اور عالم ہوتا ہے، ہماری تمنا تھی کہ مولانا اس مرتبہ حقیقت حج یا فلسفۂ حج کے بجائے، اپنے سفر حج کی روداد سنائیں اور بے تکلف و بے ساختہ سنائیں۔ مولانا نے ہماری یہ درخواست منظور فرمائی، امید ہے کہ اہلِ ذوق کو اس سے حظ روحانی بھی حاصل ہوگا، اور علمی استفادہ میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ مولانا محمد اویس صاحب ندوی کا مقالہ "سفرِ حج کے چند مشاہدات و تاثرات" اس مرتبہ وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو پچھلے نمبر میں "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" والے مقالہ نے انجام دی تھی، امید ہے کہ وہ بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ میر ولی الدین صاحب کا مضمون اگرچہ ان کے اصل مقالہ کا ایک حصہ اور تتمہ ہے،

لیکن بجائے خود مکمل اور ان کے مضامین کی خصوصیات کا حامل ہے۔ خود حضرت مدیر "الفرقان" کا خط "عازم حج کے نام"، اس نمبر کا سب سے زیادہ جامع مضمون ہے جس سے حج کی روح اور قالب دونوں کے بارے میں رہنمائی اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام مضامین سے حجاج کرام کو نفع پہونچائے، اور اپنی قدرت کاملہ اور رحمت واسعہ سے ان مضامین کے لکھنے والوں اور اس رسالہ کے مرتب کرنے والوں کو بھی حج کے برکات وانوار میں شریک فرمائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

عازمین حج کی خدمت میں:-

دربارِ الٰہی اور بارگاہِ نبوی کے مسافرو! ہم فقیروں کی طرف سے محبت بھرا سلام اور اس سفر و توفیق پر دلی مبارک باد قبول ہو۔

پورے ادب و احترام اور اخلاص کے ساتھ آپ کی خدمت میں آپ کے یہ مخلص خادم اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کے تجربہ کی روشنی میں یہ عرض کرتے ہیں کہ حج و زیارت کی یہ دولت خداداد بڑی قدر کی چیز ہے، یہ سعادت ہر ایک کی قسمت میں نہیں۔ یاد کیجئے اللہ کے اُن نیک بندوں اور اُن اہلِ دل بزرگوں کو جو ساری عمر حج کی تمنا کرتے اور اس کا گیت گاتے دنیا سے چلے گئے، اور اُن لاکھوں مسلمانوں کو جو اب بھی اس کے لئے تڑپتے ہیں۔ اللہ نے اپنے فضل سے آپ کو اپنے دربار میں بُلایا اور اس سعادت کا موقع عطا فرمایا، لیکن یہ آپ کی قدردانی، بلند حوصلگی، اور عالی ہمتی کا امتحان ہے، یہ عشق کی پُل صراط ہے، بال سے زیادہ باریک تلوار سے زیادہ تیز، یہاں تیز گامی بھی ضروری ہے اور سبک روی بھی، یہ تن آسان گراں جان پست ہمت دوں فطرت، راحت طلب لوگوں کا راستہ نہیں۔ ؎

ناز پروردہ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد (حافظ شیرازیؒ)

آپ نے جب اس راستہ پر قدم رکھا ہے تو حوصلہ کو بلند کیجئے، ادنیٰ پر قناعت نہ کیجئے، دل کی پیاس بڑھایئے اور شوق کی آگ بھڑکایئے، کہ یہ "دولتِ بیدار" ہر ایک کو نہیں ملتی اور ہر روز نہیں ملتی۔ ؎

سرمدِ غم عشق بوالہوس را ندہند سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار! ایں دولتِ سرمدِ ہمہ کس را ندہند

ہر لمحہ کو غنیمت سمجھئے، اور یوں سمجھئے کہ شاید یہ آخری موقع ہو، فرائض کی پابندی، نوافل کا اہتمام،

خدمت وایثار کی کوشش، اہلِ حرم کا احترام، جیرانِ رسول کی محبت و خدمت، لایعنی سے احتراز، دل آزاری وایذا رسانی سے قطعی پرہیز، شکستہ دلوں کی دل جوئی و غمخواری، کمزوروں معذوروں اور فقراء کی خدمتگذاری ذکر و استغفار کی کثرت حج کی مقبولیت و قیمت بڑھانے والے اعمال ہیں۔

حج کی حقیقت و روح اور اس کے ثمرات و برکات حاصل کرنے کے لئے دراصل پہلے سے بڑی تیاری اور صحبت و تربیت کی ضرورت تھی، اگر برسہا برس اس کے لئے تیاری کی جائے تو کچھ بڑی بات نہیں، کچھ عجب نہیں کہ سیکڑوں اللہ کے بندوں کی طرح ہم کو بھی اس کا احساس ہو، اور ہم بھی صوفی صاحب کی زبان میں اس طرح گویا ہوں۔ ؎

یہ حسرت رہ گئی پہلے سے حج کرنا نہ سیکھا تھا
کفن بردوش جا پہونچا، مگر مرنا نہ سیکھا تھا

نہ رہبر تھا، نہ رہرو تھا، نہ منزل آشنا تھا میں　　محبت کا سمندر، دل کی کشتی، ناخدا تھا میں
ہوائیں تھیں، تلاطم تھا، سفینہ ڈگمگاتا تھا　　بڑا گہرا سمندر تھا، جدھر نظریں اٹھاتا تھا
وہ موتی تہ نشیں تھے، میں مسافر جن کا جویا تھا　　کہاں موتی، کہاں میں، خود سفینہ ہی ڈبویا تھا

حج کی تیاری کیا ہے؟ قوتِ یقین، اللہ و رسول کی اطلاعات اور وعدوں پر کامل و بے تکلف اعتماد کی عادت، ذوق و شوق و حلاوتِ ایمانی، کسی قدر سوز و گداز، دعا کی قوت و عادت، ضبط و ایثار کی مشق، یہ حج کا صحیح توشہ اور زادِ راہ ہے۔ قدم قدم پر اس کی کمی کا احساس ہوگا اور اس کی تلافی کسی مادی ذریعہ سے نہ ہو سکے گی۔ حاضری بیت اللہ، سعی و طواف، وقوف عرفات، قیام منیٰ، رمی جمرات، دعاء ملتزم، ہر موقع پر ہم کو اس کا احساس ہوگا کہ اگر پہلے سے اس کے لئے اپنے کو تیار کیا ہوتا اور ان مقامات سے مناسبت ہوتی تو آج کچھ اور ہی بات ہوتی، کاش کہ سفر کے لئے جو تیاریاں کی تھیں اس کا کوئی حصہ اس حقیقی تیاری میں بھی صرف کیا ہوتا، کیا عجب کہ اس وقت ہم زبانِ حال سے کہہ اٹھے ہوں۔ ؎

ہزاروں منزلیں آئیں گئیں میں رہ گیا سوتا
دلِ بیدار آئی لیکر نہ پہونچا تھا تو کیا ہوتا

پھر اگر ہماری آنکھیں محبتِ رسول سے لذت آشنا ہیں اور دل ذوق و شوق سے معمور، سیرت کے واقعات حافظہ میں تازہ ہیں، اور عہد مبارک کے مناظر آنکھوں کے سامنے، صحابہ کرامؓ ہماری چشمِ تصور میں

چل پھر رہے ہیں، تو ہم مدینۂ طیبہ کی پاک سرزمین پر صاف محسوس کریں گے، اور برملا کہیں گے، کہ ؎

ہزاروں بار تجھ پر لے مدینہ میں فدا ہوتا — جو بس چلتا تو مر کر بھی نہ میں تجھ سے جدا ہوتا

یہیں جاں دادگانِ عشق کی بزمِ حسیناں ہے — احد کا دامنِ زریں مگس رانِ شہیداں ہے

اگر کانِ شہادت کی طرف ہم کان دیتے ہیں — تو یہ معلوم ہوتا ہے صحابہؓ سانس لیتے ہیں

نبی کے نطق کی حامل، مدینہ کی ہوائیں ہیں — یہاں گونجی ہوئی اب تک صحابہؓ کی صدائیں ہیں

فضا خاموش ہو جاتی ہے جب تاروں کی چھاؤں میں — تو ہنگام تہجد کی سکوت افزا فضاؤں میں

نبی کا نطق دل میں نورِ سینہ بن کے آتا ہے — صحابہؓ کا تکلم ایک سکینہ بن کے آتا ہے

یہاں کا ذرہ ذرہ کھینچتا ہے دل کے دامن کو — کہ او طائر کہاں؟ اب چھوڑ کر اپنے نشیمن کو

"صوفی"

پھر اگر ہم ان تمام منازلِ محبت سے کامیاب گذرے اور اللہ نے چشمِ بینا اور دلِ بیدار کی دولت سے نوازا ہے، اور ادراک و احساس کی آنکھیں مکۂ معظمہ میں جلال و عظمت اور مدینۂ طیبہ میں جمال و محبوبیت کے مشاہدہ سے محروم نہیں ہیں، تو ہم کو خود اپنی قسمت پر ناز ہوگا اور کیا عجب ہے کہ سرخوشی کے عالم میں کہتے ہوئے سنے جائیں ؎

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

صد بار بوسہ زنم دستِ خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

لیکن اگر خدانخواستہ ہم بغیر کسی تیاری کے چل کھڑے ہوئے، ہم نے تیاری صرف یہ سمجھی کہ ہمارے پاس سفر کے مصارف اور سامان ہو۔ دل ذوق و شوق سے خالی، روح محبت کی لذت سے ناآشنا، دماغ حرمین کے ادب و عظمت سے ناواقف، آنکھیں بند، دل خوابیدہ، روح افسردہ، دماغ منتشر، تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا دل ہزاروں حسرتوں کی آماجگاہ اور ہماری زبان اس طرح مرثیہ خواں نہ ہو، کہ ؎

مری چشمِ محبت خونِ حسرت اب بھی روتی ہے
خبر اے کاش یہ ہوتی کہ حج کیا چیز ہوتی ہے
گیا حج کر کے لوٹ آیا، تو اب حسرت یہ ہے طاری
کہ پہلے سے نہ کی افسوس حج کرنے کی تیاری

"صوفی"

اس لئے اپنے دوستوں کی خدمت میں مخلصانہ عرض ہے کہ اگر یہ سطریں سفر سے پہلے نظر سے گزر جائیں تو وقت نکال کر اور حج کی ایک اہم ترین اور اولین ضرورت سمجھ کر اپنے میں ایمانی شعور و ذوق بیدار کرنے کی کوشش کریں، اور اس کا سب سے زیادہ موثر اور مختصر راستہ یہ ہے کہ چند دنوں کے لئے اپنے کو کسی ایسے ماحول میں رکھنے کی کوشش کریں جہاں یہ ذوق اور شعور پہلے سے موجود ہو اور وہاں اس کی تحریک و تربیت ہوتی ہو، ہماری نظر اور تجربہ میں اہلِ ذوق و اہلِ دل کی صحبت تبلیغی اجتماعات اور تبلیغی قافلوں اور جماعتوں کی شرکت، اور کچھ تھوڑا سا ذکر و علم سے اشتغال اس کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپ کا جو وقت اس ماحول اور اس حال میں گذرے گا وہ سفرِ حج اور اس کے ثمرات و منافع حاصل کرنے کے لئے نہایت مددگار اور بیحد بیش قیمت ثابت ہوگا۔

اگر جہاز یا حجاز سے پہلے ان معروضات کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہو تب بھی اس کا موقع ہے کہ آپ اپنے جہاز پر یا مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو دعوت و تبلیغ میں مشغول ہیں اور جن کی صحبت دین کی روح اور ذوق اور توجہ الی اللہ پیدا کرنے کے لئے بہت موثر اور مفید ہے۔ اگر طلبِ صادق ہوگی تو انشاء اللہ ہر جگہ آپ کو ایسے بندگانِ خدا مل جائیں گے جن کی صحبت و رفاقت سے اعمالِ حج روح سے معمور، اوقات ذکر، طلبِ علم، دعوتِ دین اور خدمتِ خلق سے مشغول ہو جائیں گے، لایعنی اور منافی حج اعمال و اشغال سے خود بخود حفاظت ہو جائے گی، اور اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ اس سفر سے نہ صرف ہم فریضۂ حج سے سبکدوش بلکہ ایک نئی دینی روح اور زندگی سے معمور اور دین کے داعی اور خدمت گذار بن کر واپس ہوں گے۔

سفرِ عشق

از۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ

ذیل میں مولانا مدنی مدظلہٗ کا ایک نہایت بیش قیمت مکتوب درج کیا جاتا ہے جس میں بڑے عارفانہ بلکہ عاشقانہ انداز سے حج کی رُوح اور اس کے اسرار بیان کئے گئے ہیں۔ حج کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اس تحریر کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

یہ خط مولانا نے آج سے بائیس برس پہلے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو اُنکے سفرِ حج کے موقع پر لکھا تھا، لیکن خط کا اثر اور مضامین کی تازگی آج بھی قائم ہے۔

خوش قسمتی سے ہمیں اس کی ایک نقل مخدوم محترم جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے پاس سے مل گئی، جس کو ہم پہلی مرتبہ شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ حجاج کرام اس سے اپنے ذوق و شوق کو بڑھائیں گے، اور اس "سفرِ عشق" کا اصلی زادراہ محبت و شوق حاصل کریں گے۔

"مدیر"

محترما! جناب باری عز اسمہ کی وہ صفات جو کہ مقتضی معبودیت ہیں، ان کا مرجع دو باتوں کی طرف ہوتا ہے، اوّل مالکیتِ نفع و ضرر، دوم محبوبیت، اوّل کو جلال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ثانی کو جمال سے، مگر یہ تعبیر ناقص ہے۔ جلال محض مالکیتہ ضرر پر متفرع ہوتا ہے جس طرح جمال اسباب محبوبیت میں سے صرف ایک سبب ہے۔ وجوہ محبوبیت علاوہ جمال کے کمال، قرب، احسان بھی ہیں، سبب اوّل یعنی مالکیتہ نفع و ضرر کا اقتضا معبودیت حدودِ عقل میں رہ کر ہونا ضروری ہے اس معبودیت میں عابد کی ذاتی غرض چونکہ باعث عبادت ہوتی ہے، یعنی طمع یا خوف یا دونوں، اس لئے یہ عبادت اس قدر کامل نہ ہوگی جس قدر وہ عبادت جس میں محض رضاء معبود مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ محبوب کی جو کچھ اطاعت اور فرمانبرداری کی جاتی ہے اس سے محض اس کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہوتی ہے، لہٰذا ضروری تھا کہ دونوں قسموں کی عبادتیں

دین کامل میں ملحوظ ہوں قسم اوّل پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول نماز و زکوٰۃ ہیں، اور قسم ثانی پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول روزہ اور حج ہیں، روزہ محبوبیت کی منزل اوّل اور حج منزلِ ثانی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عاشق پر اولیں فریضہ یہی ہے کہ اغیار سے قطع تعلق کیا جائے جو کہ روزہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے، دن کو اگر صیام کا حکم ہے تو رات کو قیام کا اور آخر میں اعتکاف نے آکر سب سے تعلقات کا بھی خاتمہ کر دیا، بحکم من شھد منکم الشھر فلیصمہ اور من قام رمضان ایمانا الحدیث اگر استیعاب صوم رمضان کا پتہ چلتا ہے تو بحکم احیٰ لیلہ اور من قام رمضان الحدیث وغیرہ استیعاب قیام رمضان کا پتہ چلنا ضروری ہے اور چونکہ کمال عمومی کے لئے محض مالوفات ثلثہ کا جو کہ اصل الاصول ہیں، ترک مطلوب نہیں بلکہ ان کے علاوہ معاصی اور شہوات نفسانیہ کا ترک بھی مقصود ہے من لم یدع قول الزور الحدیث اور رب صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع الحدیث اسکے شاہد عدل ہیں جب ترک اغیار کا اثبات (جو کہ منزلِ عشق کی پہلی گھاٹی ہے) ہو گیا، اس کے بعد ضروری ہے کہ دوسری منزل کی طرف قدم بڑھایا جائے یعنی کوچۂ محبوب اور اس کے دار و دیار کی جبہ سائی کا فخر حاصل کیا جائے اس لئے ایام صیام کے ختم ہوتے ہی ایام حج کی ابتدا ہوتی ہے، جن کا اختتام ایام نحر (قربانی) پر ہے۔ کوچہ محبوب کی طرف اس عاشق کا سفر کرنا جس نے تمام اغیار کو ترک کر دیا ہو اور سچے عشق کا مدعی ہو [illegible] نہ اس کو سر کی خبر ہوگی نہ پیر کی، نہ بدن کے زیب و زینت کا خیال ہوگا، نہ لوگوں سے جھگڑنے اور [illegible] کی فکر فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ کہاں عشق اور کہاں آپس کے جھگڑے اور [illegible] کہاں قلبی اضطراب اور کہاں شہوت پرستی اور آرام طلبی، نہ سرمہ کی فکر ہوگی نہ خوشبو اور تیل کا دھیان، اس کو آبادی سے نفرت جنگل اور جنگلی جانوروں سے الفت ہونی ضروری ہے وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما۔ سیر و شکار جو کہ کار بیکاراں ہے ایسے عشاق اور مضطرب نفوس کے لئے یہ نفرت کی چیز ہوگی واذا حللتم فاصطادوا۔ اس کی تو دن و رات کی سرگرمی معشوق کی یاد [illegible] کے نام کو جپنا، اپنے تن بدن کو جلا دینا، دوست احباب، عزیز و اقارب، راحت و آرام کو ترک کر دینا۔ نہ نیند آنکھوں میں بھلی معلوم ہوگی، نہ لذائذ اطعمہ اور خوشبودار اور خوش ذائقہ اشربہ و البسہ کا شوق ہوگا۔

لو ان [illegible] ہواہ لم یکد عـروۃ ویختم فی کل الامور ویختم

جوں جوں دیارِ محبوب اور ایام وصال کی قربت ہوتی جائے گی اسی قدر ولولہ اور فریفتگی اور جوشِ جنوں میں ترقی ہوتی رہے گی۔ ~

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتش شوق تیز تر گردد

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو   لوگ ہر سوے چلے آتے ہیں سمجھانے کو

خونِ دل پینے کو، اور لختِ جگر کھانے کو   یہ غذا دیتے ہیں جاناں ترے دیوانے کو

نو بہار است جنوں چاک گریباں مددے

آتش افتاد بجاں جنبشِ داماں مددے

قریب پہونچتے ہیں (میقات پر) تو اپنے رہے سہے میلے کچیلے کپڑوں کو نکال کر پھینک دیتے ہیں، اس وادیٔ عشق میں گریبان ودامن سے کیا کام۔ ~

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک

اس کو سیا سیا نہ سیا، پھر کسی کو کیا

دن رات محبوب کی رٹ پپیہا کی طرح لگی ہے (تلبیہ پڑھ رہے ہیں)۔ ~

انت پھرت پیو پیو کنارے   ہمرے پیا تو بدیس سدھارے

برہا روگ سے تلپت جیو   اب جن بول پپیہا پیو!

اگر غم ہے تو محبوب کا، اگر ذکر ہے تو معشوق کا، اگر طلب ہے تو پی کی، اگر خیال ہے تو دلبر کا۔ ~

عشق میں ترے کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو

عیش ونشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

کوچۂ محبوب میں پہونچتے ہیں تو اس کے درو دیوار کے ارد گرد دیوانہ وار پوری فریفتگی کے ساتھ چکر لگاتے ہیں کہیں چوکھٹ پر سر ہے تو کہیں دیواروں اور پتھروں پر لب ہیں۔ ~

امر علی الدیار دیار لیلیٰ   اقبل ذا الجدار وذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من نزل الدیارا

کسی نے اگر جھوٹی بھی خبر دی کہ معشوق کا جلوہ فلاں جگہ نمودار ہونے والا ہے تو بے سر وپیر ہو کر دوڑتے ہوئے وہاں پہونچے نہ کانٹوں کا خیال ہے، نہ راستے کے پتھروں کی فکر ہے، نہ گڑھوں میں گرنے کا

خطرہ ہے، نہ پہاڑوں کی سختیوں کا ڈر ہے، مجنونِ بنی عامر کا سماں بندھا ہوا ہے، بدن میں اگر جوئیں ڈھیروں پڑی ہیں تو کیا پرواہ ہے، اہلِ عقل اور اہل زمانہ اگر پھبتیاں اُڑاتے ہیں تو کیا شرم۔ ے

جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے
دکھ درد پڑے تو کیا چنتا، اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

اگر ناصح نادان معشوق اور عشق سے روکتا ہے تو جس طرح آگ پر پانی کے چھینٹے اس کو اور بھڑکا دیتے ہیں، اسی طرح آتشِ عشق اور بھڑک جاتی ہے، نادان ناصح کو پتھر مارتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کر دینے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ ۶

"ناصحا مت کر نصیحت، دل مرا گھبرائے ہے"

وبھجتی یاعاذلی الملك الذی اسخطت کل الناس فی ارضائہ
فومن احب لاعصینك فی الھوی قسماً بہ وبحسنہ وبھائہ

میرے محترم!

یہ تھوڑا سا خاکہ حج اور عمرہ کا ہے، اگر دل میں تڑپ اور سینہ میں درد نہ ہو تو زندگی ہیچ ہے، وہ انسان انسان نہیں جس کے دل، دماغ، رُوح، اعضاء رئیسہ محبوبِ حقیقی کے عشق اور ولولہ سے خالی ہیں۔ یہاں سب کے ہوش گم ہیں، جس قدر بھی بے عقلی اور شورش ہوگی، اور جس قدر بھی اضطراب و بے چینی ہوگی اُسی قدر یہاں کمال شمار کیا جائے گا۔ ے

موسیا آداب داناں دیگر اند
سوختہ جان و روانان دیگر اند
کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردت دلِ عطار را ے

عقل اور حیا کے مقید ہونے والے عشاق آرام و راحت کے طلب گار محبین اپنی سچائی کے اثبات سے عاجز ہیں۔ ے

عشق چوں خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ مغزانِ جنوں را کے حیا زنجیر پاست

اس وادی میں قدم رکھنے والے کو سر فروشی اور ہر قسم کی قربانی کے لئے پہلے سے تیار رہنا ضروری ہے۔ آرام اور راحت، عزت اور جاہ کا خیال بھی اس راہ میں سخت ترین بلکہ بدترین بدنام کرنے والا گناہ ہے۔ سے

ناز پروردہ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد
یقین میداں کہ آں شاہ نکونام
بدست سر بریدہ میدہد جام

مولانا المحترم!

اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھتے ہیں اور پھر متلی کا، سر کے چکر کا، بیماری کا، ضعف کا، تکلیف کا، عزت وجاہ کا فکر ہے۔ افسوس ہے، مردانہ وار قدم بڑھائیے، اگر تکلیف سامنے ہو تو خوش قسمتی سمجھئے، اگر ستائے جائیں تو محبوب کی عنایت جانئے۔ پسِ پردہ طوطی صفت کون کرا رہا ہے، مجنوں کو لیلیٰ سے کاسہ توڑ دینے پر رقص ہوتا ہے جس سے وہ اپنے خاص تعلق کا اثبات کرتا ہے، اور آپ یہاں جھجکتے ہیں۔ کلا واللہ، کلا واللہ۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل، قول صادق امین ہے۔ قیمۃ المرءِ ھمتہ۔ سے

بقدر الجد تکتسب المعالی ومن رام العلیٰ سہر اللیالی

سوائے رضاءِ محبوب حقیقی اور کوئی دھن نہ ہونی چاہئے۔ سے

دنیا و آخرت را بگذار حق طلب کن!
کیں ہر دو لولیاں را من خوب می شناسم!

۶

"بجوش درخروش و ہیچ مفروش"

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی دیوانگی کی بڑ میں آپ کا بہت وقت ضائع کیا، مگر کیا کروں کہ اہلِ حیثیت کا دریوزہ گر ہوں اُن کی نسبت اپنا کھیل اور رنگ دکھاتی رہی ہے۔

سفرِ حجاز کے بعض مناظر اور تاثرات

(از جناب مولنا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی)

"مولنا موصوف نے گزشتہ سے پیوستہ سال (۱۳۶۷ھ م ۱۹۴۸ء) میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں حجاز کا سفر کیا تھا، مولنا کا یہ مضمون اُسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔"
"مدیر"

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

ستمبر ۱۹۴۸ء کی پانچ اور عربی حساب سے شوال المعظم ۱۳۶۷ھ کی بیسٌ تاریخ تھی کہ شام کو ۵ بجکر بیس منٹ پر مغل لائن کے اسلامی جہاز نے اٹھارہ سو مسافروں کو لے کر جدّہ کے قصد سے بمبئی کا ساحل چھوڑا۔ ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
سر افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

وطن (نگرام) سے ۱۲ راگست ۱۹۴۸ء کی صبح کو لکھنؤ کے لئے، اور لکھنؤ سے ۲۲ راگست کی دوپہر کو بمبئی کے لئے روانگی ہوئی تھی، اور بحمد اللہ اب اس مُبارک سفر کے لئے کوئی ظاہری رکاوٹ بھی معلوم نہیں ہوتی تھی، مگر ؎

عِشق است وہزار بد گمانی

اندر ہی اندر دل ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی مانع نہ پیش آجائے! بارہ دن کے انتظار کے بعد جہاز روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ بدگمان دل اب سکون پائے گا، مگر اس دیوانہ کے مقدر میں اطمینان و آرام

کہاں؟ اب فکر یہ ہے کہ جہاز آج کے بارھویں دن جدّہ پہونچے گا۔ اور قسمت کو اپنا رنگ دکھلانے کیلئے بارہ دن اور بارہ گھنٹے کیا بارہ منٹ بھی بہت ہیں۔ بہرحال جسم کو جہاز جدّہ کی طرف لئے جا رہا ہے، مگر دل اُمید و بیم کی کشمکش میں مبتلا، کبھی شاداں و فرحاں کبھی لرزاں و ترساں ایک بے نیاز بارگاہ میں حاضر، اور اُسی کی طرف متوجہ ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

سمندر کے سفر کے ابتدائی آٹھ دن تو اس شان سے گذرے کہ اوپر نیلگوں آسمان تھا اور نیچے نیلگوں پانی؛ اور پانی کی سطح پر ہزاروں ٹن کا وزنی جہاز خس و خاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت اور سمندر کی کوہ پیکر موجوں کا کھیل بنا ہوا تھا، مگر سبحان اللہ! انسانی عقل بھی کیا عجیب عطیۂ خداوندی ہے۔ سمندر کے اندر یہی حقیر اور بے وقعت جہاز موجوں سے ٹکر لیتا ہوا، پانی کو کاٹتا ہوا آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ "سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین"۔

غالباً ساتواں دن تھا کہ جہاز کے قریب دو ایک چڑیاں نظر آئیں، سیکڑوں آدمی ان چڑیوں کو دیکھنے اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر جہاز کے بالائی حصہ پر آ گئے۔ اہلِ تجربہ نے بتلایا کہ چڑیوں کا نظر آنا اِس بات کی نشانی ہے کہ ساحل کہیں قریب ہے۔

اب تک ہم بحرِ ہند میں چل رہے تھے، لیجئے بحرِ احمر آ گیا۔ اب ہمارے داہنے ہاتھ پر جزیرۃ العرب اور بائیں ہاتھ پر صحرائے افریقہ ہے، سبحان اللہ! آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں؟ وہ عدن کی پہاڑیاں اور عدن کے بعد مکلا اور بوشہر کی پہاڑیاں۔ ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھا کروں، کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

نہیں معلوم کیا بات تھی کہ نگاہیں ان پہاڑیوں کو دیکھنے سے تھکتی نہ تھیں، بلکہ "نظارہ جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد" کی کیفیت تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ان پہاڑیوں سے لپٹ لپٹ کر رو دیجئے، اور رودادِ غمِ فراق ان کو کچھ اس طرح سنایئے کہ پہاڑیاں بھی لرز اٹھیں اور پتھر کا کلیجہ بھی دہل جائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پہاڑیاں بالکل بے آب و گیاہ، خشک اور جھلسی ہوئی ہیں، مگر اپنے

ادراک و احساس نے جو محبوبیت و رعنائی اور شانِ دل آویزی اس کوہستانی سلسلہ میں پائی اُسکی یاد آج بھی تازہ ہے۔

کامران میں ٹھہرنا نہیں ہوا، اب یلملم کا انتظار تھا۔ انھیں دنوں جہاز میں یلملم کے متعلق اہلِ علم کے درمیان ایک دلچسپ مذاکرہ جاری تھا، سوال یہ تھا کہ یلملم کو ہندوستانیوں کی میقات کس طرح قرار دیا جاتا ہے؟ یلملم سعدیہ کے پہاڑوں سے ایک پہاڑ ہے، اور یمن والوں کا میقات ہے! ہندوستان سے جانے والے یہاں صرف اس لئے احرام باندھ لیتے ہیں کہ اُن کا جہاز اُس میقات کے سامنے سے گذرتا ہے "سامنے سے گذرنے" کی حقیقت یہ ہے کہ کپتان کے بتلانے کے بموجب یہ پہاڑ جہاز سے ستر، پچھتر میل کے فاصلہ پر ہے، دُوربین سے بھی دکھلائی نہیں دیتا ہے۔ کپتان سے دریافت کیا گیا کہ پھر آپ احرام کے لئے سیٹی کس حساب سے بجواتے ہیں، تو اُس نے کہا کہ جہاز کی رفتار کے حساب سے ہم یہ اندازہ کرتے ہیں کہ اب جہاز یلملم کے سامنے سے گذر رہا ہے، اسی اندازہ کے بموجب سیٹی بجوائی جاتی ہے۔

تحقیق طلب امر یہ ہے کہ اس درجہ کی محاذاۃ قابلِ اعتبار ہے یا نہیں؟۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی بات پایۂ تحقیق کو نہ پہونچ جائے موجودہ میقات ہی سے احرام باندھا جائے گا، مگر یہ مسئلہ علمائے محققین کے لئے قابلِ توجہ ہے!۔ جیسے جیسے یلملم قریب آرہا تھا حجاج میں احرام باندھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اٹھارہ سو مسافروں میں ہمارا تین آدمیوں کا قافلہ پہلے مدینۂ طیبہ (صلے اللہ علیٰ صاحبہا) کی حاضری کا قصد کر چکا تھا، ہماری رفاقت کے خیال سے اعظم گڈھ کے نیک دل اور خوش صفات احباب، نیز مرادآباد کے دس احباب بھی عازمِ مدینہ ہو گئے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کیلئے یلملم میں احرام کا کوئی سوال نہ تھا۔

مگر قریب کے رفقاء کے لئے ہم لوگ موضوع بحث بن گئے، اور بحث نے نوعیت یہ اختیار کی کہ حج سے پہلے مدینہ جانا جائز بھی ہے یا نہیں؟۔ بحث و مباحثہ کے لئے طبیعت مطلقاً تیار نہ تھی، انتہائی عاجزی کے ساتھ ان صاحبوں کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ مجبور کرنا تو درکنار ہم میں سے کوئی آپ لوگوں کو پہلے مدینۂ منورہ چلنے کا مشورہ بھی نہیں دیتا ہے، لہٰذا آپ کا بگڑنا تو بالکل بے محل ہے، باقی رہا دینی اخوت کی بناء پر آپ کو مشورہ کا حق ضرور حاصل ہے، تو اس کے متعلق

یہ عرض ہے کہ مستند کتابوں سے ہم اپنا اطمینان کر چکے ہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں بھی آپ پریشان نہ ہوں۔
حج و زیارت سے متعلق تمام کتابوں میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اگر حاجی مدینہ کے راستے سے آرہا ہے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے زیارت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سعادت حاصل کرلے تب حج کے لئے آئے، اور اگر راستے میں مدینہ نہیں پڑتا ہے اور حج نفل کا ہے تو اختیار ہے کہ چاہے پہلے حج کرے یا پہلے مدینہ حاضری دے۔
البتہ اگر حج فرض ہے تو اس کے متعلق فقہاء لکھتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ پہلے حج کرلے تب مدینہ طیبہ حاضر ہو۔ واضح رہے کہ معاملہ جواز اور عدم جواز کا نہیں، افضل اور غیر افضل کا ہے۔ اور اس میں بھی تفصیل یہ ہے کہ اگر وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ بہ آسانی حج کے وقت تک مدینہ سے لوٹ سکتا ہے تو یہ افضلیت اور غیر افضلیت کا معاملہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ابن حجر ہیثمی کی "الجوہر المنظم"۔

پنجشنبہ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء مطابق ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ کو صبح ہی سے جہاز میں دھوم مچی تھی کہ آج ہندوستانی گھڑیوں کے حساب سے دن کے دو بجے تک جدّہ پہونچ جانے کی توقع ہے۔ وہ دیکھئے جبہ بردوش عرب ایک موٹر لانچ سے آیا اور لکڑی کے بالکل کھڑے زینہ پر جو رسّی کے ذریعہ لٹکا دیا گیا ہے کھٹ کھٹ جہاز کے اوپر آگیا، اور انگریز کپتان نے جہاز اس کے سپرد کر دیا۔ حجاج قطار در قطار جہاز کے عرشہ پر کھڑے جدّہ کی سمت نظر جمائے ہیں، جن کے پاس دوربین ہے وہ دوربین لگائے ہیں۔ جہاز کا عملہ اس وقت بہت مشغول ہے، مختلف رنگ کے جھنڈے ڈوری کے ذریعہ سب سے بلند مقام پر لگائے جارہے ہیں
حجاج کا سامان کشتیوں پر اُتارنے کے لئے مشین ٹھیک کی جارہی ہے، وہ لیجئے لوگ ہاتھ کے اشارہ سے ایک دوسرے کو کچھ دکھلا رہے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ کبوتروں کے کابک جیسی کوئی چیز معلوم ہو رہی ہے، کوئی کہتا ہے کہ جی نہیں اونٹ قطار در قطار کھڑے ہیں۔ لیجئے جہاز جدّہ کے قریب پہونچ گیا، جنھیں کبوتروں کی کابک اور اونٹوں کی قطار سمجھا گیا تھا وہ تو بڑی لق و دق عمارتیں نکلیں۔ یقین کیجئے کہ آج اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا، کہاں ہم اور کہاں عرب کی سرزمین،

ذوق وشوق کہتا تھا کہ پورے جدّہ کو اپنی نگاہوں میں رکھ لیجئے۔ جہاز لنگر انداز ہوا، اور کشتیوں نے جہاز کا محاصرہ کر لیا۔ عرب ملاحوں سے اور مسافروں سے گفتگو شروع ہو گئی، کیسا دلچسپ منظر تھا۔ لیکن ان ملاحوں کی بات کون سمجھے۔

زبان یار من ترکی ومن ترکی نمے دانم

ہم ہندوستان کے عربی پڑھے لکھے لوگوں کی عربی دانی کی قلعی کھلنا شروع ہو گئی، مگر خدا کا شکر تھا کہ ندوہ کے طرزِ تعلیم نے اپنی تو آبرو رکھ لی، ایک موٹر لانچ ہم تیرہ چودہ آدمیوں کیلئے طے پا گیا۔ بدوی ملاح نے پوچھا کہ "مضبوط" یعنی بات اب پکی ہو گئی، ادھر سے اثبات میں جواب دیا گیا تو اُس نے اپنا رومال ہمارے پاس پھینک دیا، گویا یہ قول وقرار کے پختہ ہو جانے کی نشانی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ملاح اور ان کے آدمی جہاز پر آ گئے، گو ان کی بولی زیادہ سمجھ میں نہیں آتی تھی تاہم ان کو دیکھ کر اور ان کی بات سُن سُن کر جی خوش ہوتا تھا۔

ہمارا سامان شرط کے بموجب کشتی والوں نے خود اُتارا، بالاکپتی سے ایک چیز بھی ہم نے نہیں جانے دی، گو اس وقت یہ سودا دوسروں کے مقابلہ میں ہم کو نسبتاً گراں پڑا تھا، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ نہیں ہم ہی بڑے نفع میں تھے، جن لوگوں کا سامان بالاکپتی سے گیا ان میں سے بعض کو زیادہ اور اکثر کو کچھ نہ کچھ نقصان اُٹھانا ہی پڑا۔

موٹر لانچ نے جدّہ کی آبادی کا رُخ کیا۔ اب دم بدم اور لحظہ بہ لحظہ ہم شہر سے قریب ہوتے جاتے تھے۔ یہ لیجئے کشتیوں کا پلیٹ فارم آ گیا۔ بسم اللہ کہہ کر سرزمین حجاز پر قدم رکھے، دل آج کاتبِ تقدیر کے سامنے بے حد شرمندہ ہے۔ نہیں معلوم تھا کہ قسامِ ازل نے آج کا مُبارک دن بھی رکھا تھا، ورنہ اپنی تقدیر سے بدگمانی کا جرم کبھی بھی سرزد نہ ہوتا۔

کشتی سے اُترے، منٹوں میں بندرگاہ جدّہ کے قانونی مراحل طے ہوئے، اور اب ہم شہر جدّہ کی سب سے بڑی اور سب سے عمدہ سڑک پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف امریکن طرز کی عمدہ اور عالی شان عمارتیں، وسط میں خوشنما پارک زیرِ تعمیر۔

یہیں پہلی ملاقات جناب مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ سے ہوئی،

اس کے بعد ہم لوگ اپنی جائے قیام پر روانہ ہوئے۔ جدّہ میں مدینۂ منورہ جانے والے موٹر کے انتظار میں چار دن قیام رہا، اس چار روزہ قیام میں جدّہ کو خوب دیکھا بھالا، اس سرزمین کے ہر ٹکڑے سے محبت والفت کی بو آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ کا دیکھا بھالا مقام ہے۔ اجنبیت کا احساس کہیں نام کو بھی نہیں ہوا، دیدۂ شوق نے جی کھول کر اپنی آرزو پوری کی، پھر بھی جذبۂ عقیدت کو اپنی کم ہمتی کا شکوہ ہی رہا۔

جدّہ میں مکّہ کی یاد :-

جدّہ کے چار روزہ زمانۂ قیام میں دل پر ایک چوٹ برابر لگتی رہی۔ مناسب ہے کہ اُس چوٹ کا حال آپ بھی جان لیں، شائد کچھ کام ہی آجائے۔ پہلے مدینۂ منورہ (صلی اللہ علی صاحبہا) کی حاضری کا قصد ہم لوگوں نے دو وجہوں سے کیا تھا، ایک تو یہ کہ حج کا احرام ہم ذوالحلیفہ میں مسجد شجرہ میں باندھیں گے تاکہ ارکانِ حج کی ابتدا اُسی جگہ سے ہو جس جگہ سے حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلّم) نے اپنے حج کی ابتدا فرمائی تھی۔ دوسرے یہ کہ حجاج سے سنا تھا کہ حج کے بعد عموماً لوگوں کے ذوق وشوق میں کمی آجاتی ہے، اور مدینۂ طیبہ (صلی اللہ علی صاحبہا) اس طرح حاضری دیتے ہیں کہ جسم مدینہ میں ہوتا ہے اور خیال جدّہ کی بندرگاہ میں۔

ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم حضور نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلّم) کی خدمت میں سراپا ذوق وشوق بن کر حاضر ہوں، مگر جدّہ پہونچ کر کعبہ کی روحانیت نے کچھ ایسی جذب وکشش فرمائی کہ زیارتِ کعبہ کے بغیر آگے بڑھ جانے کا خیال صریحاً سوءِ ادب معلوم ہوا۔ اللہ جزائے خیر دے فقہاءِ اُمّت کو یہ حضرات قلوبِ انسانی کے کیسے طبیب تھے، زیارتِ مدینہ کے باب میں لکھتے ہیں کہ جس حاجی کے راستے میں مدینہ پڑتا ہے اور وہ حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلّم) کی زیارت کے بغیر آگے بڑھ آئے تو یہ سوءِ ادب ہے اور سنگدلی کی نشانی ہے۔ بعینہ یہی کیفیت مکّہ چھوڑ کر مدینہ جانے والے حاجی نے محسوس کی!۔

وکیل سے کہا گیا کہ ہمارے لئے پہلے مکہ ہی جانے کا انتظام فرمادیجئے، مگر انھوں نے

معذوری ظاہر کی اور فرمایا کہ آپ پہلے مدینہ جانے کے لئے کرایہ جمع کر چکے ہیں اس لئے اب ممکن نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے پہلے مدینۂ طیبہ (صلی اللہ علیٰ صاحبہا) کی حاضری میں کوئی قباحت نہ تھی، مگر یہ ایک دل کی بیتی تھی جس کا سنانا ضروری تھا۔

اس سلسلہ میں اہلِ حدیث جماعت کے ایک عالم صاحب نے بہترین راہ اختیار فرمائی، انھوں نے کیا یہ کہ یلملم میں عمرہ کا احرام باندھ لیا، جدّہ اتر کر سیدھے مکۂ معظمہ گئے اور عمرہ سے فارغ ہو کر مدینۂ طیبہ (صلی اللہ علیٰ صاحبہا) میں حاضری دی، اور حج سے پہلے پھر مکۂ معظمہ آگئے۔ اس میں غالباً چالیس پچاس روپیہ کا خرچ ضرور بڑھ جاتا ہے[1]، لیکن میرے نزدیک یہ بہت مناسب صورت ہے۔

بہرحال اب ہم مدینۂ طیبہ کے لئے چشم براہ تھے۔ وکیل صاحب صبح و شام موٹر کا وعدہ فرماتے تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ۲۰ ستمبر (مطابق ۱۶ ذی قعدہ) کو مغرب کی نماز ہم نے جس مسجد میں پڑھی، اُسی میں شیخ محمد مظہر ندوی بھی تشریف لائے، شیخ محمد مظہر شیخ عبدالرحمٰن مظہر (جو ہندوستانی حجاج کے معلموں کے "رئیس المطوفین" ہیں) ان کے چھوٹے بھائی ہیں، اور جدّہ میں وزارت خارجہ کے دفتر میں کام کرتے ہیں، ندوہ میں میرے رفیق درس تھے، بڑی محبت سے ملے، فوراً اپنے عالیشان مکان لے گئے، اور پر خلوص انداز میں شکایت بھی کی کہ ہمارے یہاں کیوں نہ ٹھہرے، ندوہ کا حال پوچھتے رہے۔ بعد میں ہم نے کہا کہ ہم لوگ مدینہ کے انتظار میں یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، اور ابھی تک کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ یہ بے چارے ہمارے ساتھ وکیل کے یہاں آئے اور تاکید کی کہ فوراً موٹر کا انتظام کرو۔ اور مدینہ جانے والا پہلا موٹران کے قافلہ کو ملنا چاہیئے۔ شیخ مظہر کی مؤثر گفتگو کے جواب میں وکیل صاحب نے فرمایا کہ (حین) یعنی ابھی ابھی۔ مظہر صاحب ہم کو رخصت کر کے گھر گئے اور ہم نے عشا کی نماز پڑھی، عشا کی نماز کے بعد ہی لاری آگئی، اور ہم لوگ مدینۂ طیبہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

---

[1] چالیس پچاس نہیں بلکہ اس صورت میں صرف پندرہ بیس روپئے زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔ "نعمانی غفرلہ"

جدہ سے رابغ تک ریگستانی اور رابغ سے مدینۂ منورہ تک کوہستانی سلسلہ ہے منزل بمنزل رکتے ہوئے ۲۲ ستمبر ۱۹۴۸ء (مطابق ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ) کی شام کو ہم مدینۂ منورہ (صلے اللہ علیٰ صاحبہا) پہونچے۔ راستہ کے کوہ وبیابان عقیدت ومحبت کی نگاہ میں کچھ ایسے بس گئے کہ انکی تصویر آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔

بار بار خیال آتا تھا ممکن ہے کہ ان پہاڑیوں میں سے کسی خوش نصیب پہاڑی پر جناب رسول کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی نظر پڑی ہو۔ ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ اور خاندانِ نبوت کے افراد کبھی یہاں تشریف لائے ہوں۔ غازیانِ اسلام کے گھوڑوں نے ممکن ہے کہ ان گذرگاہوں کو کبھی اپنے قدموں سے روندا ہو، اسی لئے ان پر انوار دشت وجبل کو عینکوں کے رنگین شیشوں کی آڑ سے دیکھنا دیدۂ شوق کے تحمل سے باہر تھا، آخر اس حجابِ رنگیں کو الگ ہی کرنا پڑا۔

۲۲ ستمبر کو عصر کے اوّل وقت ہم ذوالحلیفہ (موجودہ نام بیر علیؓ) پہونچے، یہاں مسجد شجرہ کی تلاش شروع کی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا تھا اور یہیں احرام زیب تن فرمایا تھا، بعد کو یہاں مسجد بنادی گئی، اور مسجد شجرہ کے نام سے اس کی شہرت ہوگئی۔ یہ مسجد منزل ذوالحلیفہ سے ذرا فاصلہ پر ہے اور عام حجاج وہاں نہیں پہونچتے ہیں، یہ اب بالکل شکستہ محض پتھروں کا ڈھیر ہے۔ معلوم ہوا کہ ابھی قریبی زمانہ میں کوئی سیلاب آیا تھا جس میں مسجد کی عمارت گر گئی، اور اب تک بننے کی نوبت نہیں آئی۔

الحمد للہ کہ ہمارے پورے قافلے نے اس پر انوار جگہ کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کیا۔ یہاں سے مدینۂ منورہ بالکل قریب ہے، آن کی آن میں موٹر پہونچنے والا ہے۔ اس وقت سارا ذوق وشوق گم، اور الفت ومحبت کے سب دعوے بھولے ہوئے ہیں، صرف کسی کا جلال یا جمال ہے جس کی نگرانی میں قافلۂ دل آگے بڑھ رہا ہے۔

سبحان اللہ! وہ مدینہ کے آثار نظر آنے لگے۔ لیجئے بابِ عنبریہ آگیا، موٹر ڈرائیور باوجود ہرطرح کی خاطر ومدارات کے اپنے مقررہ ٹھکانے سے پہلے ہم کو اتارنے کے لئے تیار نہ ہوا، تھوڑی دیر میں ہمارا موٹر مدینۂ منورہ (صلی اللہ علیٰ صاحبہا) کے ایک بڑے بازار میں کھڑا تھا۔ یہاں

شیخ المزورین بہاء الدین خاشقجی کے وکیل عثمان صاحب ملے۔ عصر کا وقت ذوالحلیفہ میں آچکا تھا، مگر خیال تھا کہ مدینۂ منورہ پہونچ کر مسجد نبوی (صلے اللہ علیٰ صاحبہا) میں نمازِ عصر ادا کریں گے، اب پورا قافلہ منتظر ہے کہ موٹر یہاں سے چلے اور ہم کو حسب قاعدہ ہمارے ٹھکانے پر پہونچائے۔ مگر ڈرائیور صاحب لاپتہ ہو گئے۔ عثمان صاحب نے مشورہ دیا کہ سامنے مسجد سیدنا عمرؓ ہے اسی میں عصر پڑھئے، مگر بقول خواجہ صاحب کے۔ ؎

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا!

اب آج تو اسی مسجد میں نماز پڑھنے کا جی چاہتا ہے جس کو ذاتِ نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے شرفِ انتساب حاصل ہے، اور جس کے ایک گوشہ میں وہ ذاتِ اقدس (صلے اللہ علیہ وسلم) آج بھی جلوہ افروز ہے۔ مجبوراً پورے قافلہ اور موٹر کو چھوڑ کر راقم سطور اور ہمارے رفیق نسیم صاحب نگرامی، مسجد نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف چل پڑے۔

چل تو پڑے مگر راستہ نہیں معلوم! اور لطف پر لطف یہ کہ نہیں معلوم کیوں ہمت نہیں پڑتی ہو کہ مسجد نبوی کا نام لے کر کسی سے راستہ معلوم کریں، دو ایک صاحبوں سے مدرسۂ علوم شرعیہ (جو مسجد نبویؐ سے بالکل ملا ہوا ہے) کا پتہ ضرور دریافت کیا، اُس کے بعد تو قدم خود بخود اُٹھتے ہی گئے جیسے کوئی مقناطیسی قوت اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ لیجئے! وہ گنبدِ خضرا نظر آیا، اور وہ سامنے باب السلام۔ اللھم صل وسلم علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلِ محمد۔ بعدد کل شیئ معلوم لک۔

اُردو تو خیر عربی اور فارسی کی تمام مستند کتابیں جو زیارتِ مدینہ کے آداب کے متعلق مل سکیں ان سب کو آج ہی کے دن کے لئے پڑھ ڈالا تھا، مگر نہیں معلوم تھا کہ ہوش و حواس اس خاص موقع پر ساتھ چھوڑ دیں گے، اور دل و دماغ آج صاف جواب دے دیں گے۔

اب تو قدم بھی نہیں اُٹھ رہے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کو سہارا دے کر ٹھہر گئے، تھوڑی دیر بعد پھر آگے بڑھے، اور دبے پاؤں ڈرتے کانپتے باب السلام سے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں داخل ہوئے۔ جماعت ہو چکی تھی، نماز ادا کی، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اس نعمتِ عظمیٰ سے

سرفراز فرمایا، اب بارگاہِ نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) میں حاضری کی باری تھی۔
حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ نے مناسکِ حج، نیز اس موقع کیلئے کچھ مخصوص ہدایتیں فرمادی تھیں، الحمد للہ حضرت شیخ کی برکت و توجہ سے یہ منزل بھی طے ہو گئی۔

ہم بارہ دن مدینۂ طیبہ (صلے اللہ علیٰ صاحبہا) میں ٹھہرے۔ یقین کیجئے کہ مدینہ کے گلی کوچے، مدینہ کے بازار، مدینہ کے درودیوار، اور مدینہ کی فضا میں کچھ ایسی کیفیت محسوس ہوئی کہ سو جان سے نثار ہونے کا جی چاہا، یہاں کی خاکِ پاک کے ہر ذرہ سے ہم کو محبت کی بو آئی۔ عہدِ نبوت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے لے کر اس وقت تک کی یہاں کی اسلامی تاریخ کے سب اہم واقعے ہم کو یاد آئے۔

"نگاہِ تصور نے مسجدِ نبوی[1] میں بالخصوص روضۃ الجنۃ میں صحابۂ کرامؓ کا مجمع دیکھا، محرابُ النبیؐ[2] اور محرابُ التہجد[3] کے پاس حضور نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کو سربسجود پایا، اسطوانہ وفود[4] کے پاس باہر کے آئے ہوئے وفود کو بارگاہِ نبوتؐ میں باریاب ہوتے ہوئے دیکھا، اسطوانہ حرس[5] کے پاس جاں نثارانِ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو پہرہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اسطوانہ ابی لبابہ[6] میں سیدنا ابولبابہ کو بندھے دیکھا، اور پھر دیکھا کہ حضرت نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) اُن کو اپنے دستِ مبارک سے کھول رہے ہیں۔ اسطوانہ سیدتنا عائشہؓ[7] کے ارد گرد خواصِ اُمت کے

ہجوم کو دیکھا کہ نماز و دُعا میں مشغول ہیں۔ گوشِ تخیل کو منبر شریف سے صحابہؓ کے درمیان حضورؐ کے مواعظ اور صفۂ نبوی سے اصحابِ صفہ کو تلقین و تعلیم کی آوازیں سنائی دیں۔

اور اس مُبارک زمین کے اس مقدس حصہّ کا حال آپ سے کیا بیان کیا جائے کہ جہاں سید المرسلین، حبیب ربّ العالمین حضرت رسُولِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلّم) مع اپنے دونوں رفیقوں اور وزیروں کے آج بھی جلوہ افروز ہیں۔ اللہ ہر مسلمان کو یہاں کی حاضری سے سرفراز کرے۔ وہ گھڑی بھُولنے والی نہیں، جبکہ ایک سیہ کار و گنہگار نے مواجۂ شریف میں عرض کیا تھا کہ "یا رسُول اللہ کفار بھی اگر سائل بن کر اس دربار میں آئے تو محروم واپس نہیں گئے، ہم اپنے اعمال کے لحاظ سے جیسے بھی ہیں مگر الحمد للہ کہ عقیدۃً آپ کے دین کے ماننے والے، اور آپ کے طریق کے چاہنے والے ہیں، اس لئے یا رسُول اللہ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے ہم محروم و ناکام واپس ہوں۔

قسم ہے رؤف و رحیم خدا کی کہ اُس نے "بالمومنین رؤفٌ رحیم" جس

ذات کا وصف اپنی کتابِ مبین میں بیان فرمایا ہے اُس کی رأفت و رحمت نے

ہر طرح کی دستگیری فرمائی "

صلے اللہ علیہ وسلم

بارگاہِ نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) میں عرض و معروض کے سلسلہ میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ مدینۂ منورہ میں مسجدِ نبوی سے متصل بابِ جبرئیل کے قریب قبلہ کی سمت شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا بے نظیر کتب خانہ ہے، اس کتب خانہ کے بالکل مقابل حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا وہ مکان ہے جس میں حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) ہجرت کے موقع پر مہمان اُترے تھے۔

عارف حکمت بے تیرھویں صدی کے مشہور ترک علماء میں تھے، مدینۂ منورہ میں قاضی ہو کر آئے تھے سنہ ۱۲ھ میں انھوں نے اس کتب خانہ کی بنیاد ڈالی، اپنی جائداد اور دولت کا بڑا حصہ اس پر صرف کیا۔ مقدونیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتب خانہ کی بقا و ترقی کے لئے وقف کی۔ بلقان کی لڑائی کے بعد مقدونیہ وغیرہ کی جائداد تو ملکیت سے نکل گئی، پھر بھی ایشیائے کوچک کی آمدنی کتب خانہ پر صرف ہوتی رہی مگر عرصہ سے یہ آمدنی کتب خانہ کو نہیں مل رہی ہے۔ ترکی حکومت اور سعودی حکومت کے درمیان اس سلسلہ میں مذاکرات جاری ہیں۔

شیخ ابراہیم حمدی خربوطی جو ایک ترک عالم ہیں اور صرف ترکی و عربی سے واقف ہیں، وہ اسی کتب خانہ کے منتظم ہیں، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور جناب مولانا مسعود علی صاحب ندوی سے خوب واقف ہیں، ہندوستان آچکے ہیں، اسی تعلق سے میں شیخ حمدی سے ملا اور یہ مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔

ایک دن شیخ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم سے ایک خاص بات کہنا ہے، میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ فرمانے لگے کہ تم کو معلوم ہے کہ حضرت نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنے مہمانوں کا کس قدر اکرام

فرماتے تھے، اور مہمانوں کی دلجوئی حضرت کو کس قدر منظور تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ صحیح ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے کہ جتنے حجاج آتے ہیں وہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے مدینۂ منورہ آتے ہیں، اس لئے سب حضورؐ ہی کے مہمان ہیں۔ میں نے جب اس کا بھی اقرار کر لیا تو فرمایا کہ دیکھو اس وقت تم سب بوجہ مہمان رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہونے کے حضورؐ کے مرکز نظر ہو لہذا اب جب مواجہ شریف میں حاضر ہونا تو سعودی اور ترکی حکومت کے درمیان میرے کتب خانہ کے متعلق جو معاملات چل رہے ہیں اس کے متعلق حضورؐ سے ضرور عرض کر دینا، اُمید ہے کہ میری مشکل انشاء اللہ ضرور حل ہو جائے گی۔

شیخ حمدی نے کچھ اس طرح یہ سب کچھ کہا کہ سننے والے کو اُن کی اس محبت و عقیدت پر رشک آ گیا۔[1]

اسی مدینہ میں بقیع جیسا مدفن پاک ہے جہاں عموماً رات کے آخری حصہ میں حضرت سرورِ کونین (صلے اللہ علیہ وسلم) تشریف لاتے تھے اور یہاں کے لوگوں کی مغفرت کی دُعا فرمایا کرتے تھے۔ ایک رات کو جبریل امین نے بارگاہِ نبوت (صلے اللہ علیہ وسلم) میں تشریف لا کر یہیں کے لوگوں کے متعلق عرض فرمایا تھا کہ آپ کا پروردگار فرماتا ہے کہ جا کر ان لوگوں کیلئے استغفار کیجئے۔

چلئے اس سراپا نور حصۂ زمین کی زیارت کا شرف ہم بھی حاصل کریں، مگر دیکھئے ضبط و تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، ادب و احترام کا پورا لحاظ رکھئے، یہاں انبیاء کرام ؑ کے بعد بنی نوع انسانی کی سب سے مقدس اور محترم جماعت مدفون ہے۔ یہیں سیدنا عثمان ابن عفانؓ، حضرت عثمان ابن مظعونؓ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت عباسؓ جلوہ افروز ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ (حضرت خدیجہؓ و حضرت میمونہ کے سوا) اور دیگر ازواج مطہرات، رقیہ بنت الرسول، اور دیگر بنات طاہرات، فرزندِ رسول حضرت ابراہیمؓ، حضرت امام حسنؓ، اور

---

[1] گذشتہ سال مدینۂ طیبہ حاضری کے موقع پر اس عاجز کو بھی شیخ حمدی کے الطاف کا تجربہ ہوا بہت ہی خوبیوں کے جامع نظر آئے، اخلاق و مکارم کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مدینۂ طیبہ کے جغرافیہ سے اس زمانہ کے غالباً سب سے بڑے واقف ہیں۔ "۱۲ نعمانی"

خاندانِ نبوت کے دوسرے افراد یہیں تشریف فرما ہیں۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں، تابعین تبع تابعین، مفسرین، محدثین، فقہا، متکلمین اور اہل اللہ کی بڑی جماعت یہیں آرام فرما ہے۔

ان پر اللہ کی رحمتیں ہوں، عبد اور معبود کے رشتے کے یہ کیسے مبارک نمونے ہیں ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کے کیسے اچھے مظہر ہیں۔ بقیع والو! تمہیں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا پڑوس مبارک ہو۔ وتوفنا مع الابرار والی دعا نہیں معلوم کس مبارک گھڑی تمہاری زبان سے نکلی تھی۔

رضی اللہ عنکم ورحمکم

مدینہ کی اسی مبارک زمین پر ذرا فاصلہ پر قبا ہے، وہاں ہم قدیم راستے سے پا پیادہ گئے۔ راستہ میں مسجد جمعہ کی زیارت ہوئی، جب حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) جمعہ کے دن قبا سے مدینۂ منورہ تشریف لے جانے لگے اور قبیلۂ بنو سالم تک پہونچے تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آگیا تو آپ نے یہیں جمعہ ادا فرمایا تھا، مدینہ میں یہ پہلا جمعہ تھا۔

قبیلۂ بنو سالم کے کھنڈروں کے قریب ہی قبیلۂ بنی النجار کی ایک مسجد ہم کو دکھلائی گئی، اس مقام کو دیکھ کر بڑا اثر ہوا، یہ حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کا ننھیال تھا، جب حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) مدینہ تشریف لائے تھے تو یہیں کی لڑکیاں یہ شعر پڑھتی تھیں۔ ؎

نحن جوار من بنی النجار
یا حبذا محمد من جار

مسجد قبا کی عظمت کو آپ کے سامنے کن الفاظ سے بیان کیا جائے، مختصراً یہ سن لیجئے کہ خود حضرت سرور کائنات (صلے اللہ علیہ وسلم) سوار اور پیادہ اس مسجد کی زیارت کو تشریف لایا کرتے تھے، اور حضور ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

"اس مسجد میں نماز ادا کرنا عمرہ کے مثل ہے"

بہرحال خدا کے فضل وکرم نے ہم کو اس مسجد میں پہونچایا۔ اسی مسجد کے قریب بیرِ اریس ہے، یہ وہ مشہور کنواں ہے جس میں حضرت سید انس وجان (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنا لعاب دہن

ڈالا تھا۔

مدینۃ النبی (صلے اللہ علیہ وسلم) میں بارہ دن قیام کے بعد آخر ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ کی وہ تاریخ آگئی جبکہ اس سرزمین انوار و برکات سے ہم کو رخصت ہونا تھا۔

موٹروں کا تھوڑا بہت جو تجربہ ہوگیا تھا اس کی وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوا کہ احرام بجائے ذوالحلیفہ کے مدینہ ہی میں باندھ لیا جائے، چنانچہ ظہر و عصر کے درمیان احرام پہن کر ہم لوگ مسجد نبوی میں آئے، اور روضۃ الجنۃ میں محراب النبی کے سامنے دو دو رکعت پڑھ کر حج قران کی نیت کی، اور اسی وقت بارگاہِ نبوت (صلے اللہ علیہ وسلم) میں وداع کیلئے حاضر ہوئے۔

میں اس موقع پر بہ ادب التماس کروں گا کہ حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے مواجہ شریف سے وداع کی منظر کشی کے لئے آپ اصرار نہ فرمائیں۔ نہ قلم میں تاب رقم اور نہ زبان میں قوتِ گویائی، بس اس سراپا رحمت (صلے اللہ علیہ وسلم) پر بار بار درود پڑھئے، کہ قلب محزوں کے لئے اب اسی میں طمانیت و سکون ہے۔

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما تحب و ترضیٰ و بعدد ما تحب و ترضیٰ!

مکہ معظمہ میں حاضری!

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ کو بعد مغرب ہم مدینہ منورہ (صلی اللہ علی صاحبہا) سے روانہ ہوئے تھے، تیس کا دن گذر کر ہندوستانی گھڑیوں کے حساب سے رات کے دو بجے مکہ معظمہ (زادہا اللہ شرفاً و کرامۃ) میں حاضری کی دولت ہمارے نصیب میں آئی۔

اس وقت یہاں رات تھی مگر ہماری خوش تقدیری کا آفتاب نصف النہار پر تھا، سب محوِ خواب تھے مگر ہماری قسمت بیدار تھی، طالع کی ارجمندی اور بخت کی فیروز مندی نے آج اُس شہر میں پہونچایا جس کی قسم قرآن میں کھائی گئی یہیں حضرت آدم ؑ نے سکونت اختیار کی، یہیں حضرت ہود ؑ اور حضرت صالح ؑ نے پناہ لی، حضرت ابراہیم ؑ یہیں ہجرت کر کے آئے، حضرت اسماعیل ؑ نے اسی کو

اپنی سکونت کے لئے پسند فرمایا، حضرت رسولِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) یہیں پیدا ہوئے، یہیں کی گلیاں اور راستے جبریلِ امین کی گذرگاہ تھے، یہیں براق کے قدم پڑے تھے۔

آج ادب کی آنکھیں نیچی ہوئی جاتی ہیں، اور عقیدت کا سر جھکا جاتا ہے۔ آج ایمان کے سمندر میں تلاطم ہے، آج محبت وعظمت کی رُوح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپ رہی ہے۔

خداوندا! یہ سیہ پوش عمارت جس کو کعبہ کہتے ہیں اس میں کیا جذب وکشش ہے کہ دلوں کو اپنی طرف کھینچے لے رہی ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان، ادھیڑ، عورت اور مرد، بیمار اور تندرست سب اس کے گرد دیوانہ وار چکر لگائے ہیں۔

بیت اللہ کے جنوب ومشرق میں درِ کعبہ کے قریب دیوار کے گوشہ میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر نصب ہے، دیکھئے اس کی طرف لوگ کیسے لپک رہے ہیں۔ شہرِ مکہ کا ذرّہ ذرّہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) تک تمام انبیاء کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابۂ کرامؓ، ائمہ اعلام، اولیاءِ عظام کے لبوں، ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں۔

یہ کون ہیں؟ شیبی، کعبہ کھولنے آئے ہیں۔ اللہ اللہ آج نگاہوں نے حضرت نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کا ایک زندہ معجزہ دیکھا۔

"ہجرت سے پہلے ایک دن حضرت نبیِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کعبہ کی کنجی کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے مانگی، انھوں نے انکار کر دیا، پیغمبرانہ جلال کے ساتھ ایک آواز آئی، کہ "عثمان ایک وقت آئے گا کہ کعبہ کی کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی، اور جس کو میں دوں گا اُس کو ملے گی"۔ ـــــ بات ہوگئی، برسہا برس کے بعد مکہ فتح ہوتا ہے، عثمان بُلائے جاتے ہیں، اور کعبہ کی کنجی پیغمبرِ خدا کے حکم سے ان کے حوالہ کی جاتی ہے، پھر حضورؐ دریافت فرماتے ہیں عثمان کچھ یاد ہے؟ انھوں نے پورے واقعہ کا اقرار کیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، کہ: "یہ کنجی ہمیشہ عثمان بن ابی طلحہ کے خاندان میں رہے گی، اس کو تم سے ظالم کے سوا اور کوئی لے نہ سکے گا"۔ جب عثمان کا انتقال ہوا تو کنجی شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کے ہاتھ میں آئی، اسی لئے یہ لوگ شیبی کہلاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ

حکومتیں مٹ گئیں، قومیں فنا ہوگئیں، مگر شیبہ کا خاندان بحمد اللہ آج تک موجود ہے، اور کعبہ کی کنجی انھیں کے خاندان میں ہے۔" (زرقانی، شرح مواہب، ج۔۲۔ ص ۴۹۹)

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مکۂ معظمہ میں حرم شریف کے قریب ایک مکان میں بعد عصر ایک دن تبلیغی جماعت کے اجتماع میں وعظ فرمایا تھا جس میں ہم سب شریک تھے اس میں ایک واقعہ شیبہ کے خاندان سے متعلق تھا۔ مناسب ہے کہ اسی سلسلہ میں آپ بھی اس واقعہ کو سُن لیں۔ مولانا نے فرمایا کہ جناب مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند حج کیلئے تشریف لائے تو ایک حمائل اور ایک تلوار لیکر اپنے زمانہ کے شیبی صاحب کے پاس گئے اور فرمایا کہ:

"حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے بموجب آپ کے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد آخر تک رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ظہور مہدی کے وقت بھی آپ کے خاندان میں سے کوئی صاحب موجود ہوں۔ حضرت مہدی کے ہمراہ جہاد کرنے والوں کا ثواب بدر کے مجاہدین کے برابر بتایا گیا ہے۔ آپ میری خاطر یہ زحمت گوارا فرمایئے کہ اس حمائل اور تلوار کو اپنے پاس بطور امانت کے رکھ لیں اور نسلاً بعد نسلٍ کیلئے وصیت کرتے جایئے کہ آپ کی نسل میں سے آپ کا جو جانشین شخص امام مہدی کا زمانہ پائے اس امانت کو میری طرف سے حضرت مہدی کی خدمت میں پیش کرے کہ حمائل تو آپ کی تلاوت کے لئے ہے اور تلوار کسی مجاہد کو دے دی جائے کہ وہ اس سے جہاد کرے۔"

سبحان اللہ! حصولِ ثواب کا ذوق وشوق کیسے کیسے باریک موقعوں کی نشان دہی کر رہا ہے؟۔

در کعبہ اور حجر اسود کے درمیان بیچ کی دیوار کو ملتزم کہتے ہیں اس سے لوگ لپٹے کھڑے ہیں، دعائیں کر رہے ہیں اور بلک بلک کے رو رہے ہیں، جیسے کوئی بچہ ماں کے سینہ سے لپٹ کر روئے۔ آقائے دو جہاں حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) یہاں اسی طرح کعبہ کی دیوار سے سینۂ پاک اور رخسار مبارک لگا کر جلوہ فرما ہوا کرتے تھے۔

وہ سامنے زمزم شریف ہے، اس میں خود اپنے سوتے کے سوا حجر اسود، صفا اور مروہ

کی طرف سے تین سوتے ہیں، اس کو خوب جی بھر کر نوش فرمائیے۔

مقام ابراہیمؑ کے پاس بھی تشریف لے چلئے، قرآن مجید اسی جگہ کے متعلق فرماتا ہے:-
"فیہ اٰیات بینات مقام ابراھیم"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:- "واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی"۔

یہاں سے قریب ہی وہ دونوں پہاڑیاں ہیں جن کے متعلق فرمایا گیا ہے:- "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ"۔ صفا اور مروہ یہ دونوں وہ پہاڑیاں ہیں جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہؑ کو ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے نظر آئے، ان کی سعی کر لیجئے۔ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہؑ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، یہ صفا اور مروہ کی سعی ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔

بہرحال مالک حقیقی کا شکریہ اور ہزار بار شکریہ کہ اس نے ایسے مبارک مقام کی حاضری سے ہم کو سرفراز فرمایا۔ ہم لوگوں نے محلہ جیاد میں جبل سبع نبات پر ایک کرایہ کا مکان لے لیا تھا۔ ہمارے قافلے کے جو لوگ بمبئی میں جہاز میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے چھوٹ گئے تھے وہ بھی اُسی دن جدہ سے مکہ معظمہ پہونچے، جس دن ہم مدینہ سے آئے تھے۔ سب کے سب اہلِ وطن یا وطن کے قریب کے لوگ تھے، اس لئے ایک ہی مکان میں قیام ہوا اور بڑی سہولت ہوئی۔ ابھی حج میں ایک ہفتہ باقی تھا، ہم نے اپنا یہ وقت نیز حج کے بعد زمانۂ قیام مکہ معظمہ کا بڑا حصہ بحمد اللہ مسجد حرام کی حاضری اور بیت اللہ کے طواف میں گزارا۔

روزانہ حجاج کی آمد سے مکہ کی آبادی روز بروز بڑھ رہی تھی اور ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ کا شدت سے انتظار تھا۔ منیٰ اور عرفات وغیرہ کے لئے اونٹ، لاری، بس اور کار کے انتظامات کے لئے لوگ برابر معلموں سے مل رہے تھے۔ خاصی تعداد پیادہ پا چلنے والوں کی بھی تھی، ہمارے قافلہ کے اکثر حضرات نے پیدل ہی چلنے کی نیت کی۔ چنانچہ ۸ رذی الحجہ کو بعد نماز فجر ہم سب لوگ منیٰ کے لئے پیادہ پا چل پڑے۔ مکہ اور منیٰ کے درمیان تین میل کا فاصلہ تھا، خیال تھا کہ تین میل کی

منزل بھی کوئی منزل ہے، مگر ؎

عشق آساں نمود اوّل ولے اُفتاد مشکلہا

اوپر دھوپ کی تمازت، اور نیچے تپتی ہوئی ریگستانی زمین تھی جس میں پیر دھنس دھنس جاتے تھے، گو زبان اقرار کرنے کے لئے تیار نہ تھی مگر دل ہمّت ہار رہا تھا، لیکن بہ فضلِ خدا نو بجے کے قریب ہم لوگ منیٰ پہونچ گئے اور مسجد خیف کے قریب ہی قیام کی دولت نصیب میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد خیف میں ستّر نبیوں نے نماز پڑھی ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ اس میں ستّر نبیوں کی قبریں ہیں۔

۹ر ذی الحجہ کی صبح کو عرفات روانہ ہونا تھا عقل کہتی تھی کہ کل مکہ سے منیٰ تک کے سفر کا حال یاد کر! اور یہ بھی خیال کر کہ اب سفر دوگنا ہے، یعنی ۶ میل! مگر عشق کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو افتاں وخیزاں پیادہ پا چلنا چاہئے۔ یہی تو وہ منزل ہے جس کو انبیاء نے صرف پیادہ پا نہیں بلکہ برہنہ پا طے کیا ہے!۔ الحمد للہ کہ عقل نے شکست کھائی، اور ہم لوگ عرفات کو پیادہ پا چل پڑے۔ جذبۂ دل نے پھر پکارا اور کہا کہ کیا خبر دوبارہ پھر یہ موقع ملے یا نہ ملے؟ انبیائے کرام کی پیروی کے خیال سے پیروں سے چپلوں اور جوتوں کو بھی الگ کرنا چاہئے، حج کا لبیک تو ہو ہی رہا تھا الحمد للہ کہ عشق کے اس منادی کی آواز پر بھی لبیک کہا گیا۔

ہم لوگ اس اندازے بیس منٹ چلے ہوں گے کہ سامنے ایک لاری آئی اور فی کس عہ رکے حساب سے عرفات لے چلنے کے لئے ہم لوگوں سے کہا، عقل دور اندیش نے پھر سمجھایا کہ بحمد اللہ اس راہ میں پیادہ پا اور برہنہ پا چلنے کی سعادت بھی نصیب میں آچکی، اب رحمتِ خداوندی نے ہم لوگوں کی کمزوری پر نظر فرما کر دستگیری فرمائی ہے، لہٰذا لاری پر سفر سے احتراز نہ کرنا چاہئے۔ لیجئے منٹوں میں ہم لوگ لاری کے ذریعہ عرفات پہونچ گئے اور جبلِ رحمت کی قریبی جانب قیام ہوا۔ مسجد نمرہ کی بھی زیارت ہوئی۔

شام کے وقت ہم نے جبلِ رحمت کے اس مبارک حصہ کے قریب پہونچنے کی کوشش کی جس کے متعلق گمانِ غالب ہے کہ یہاں حضرت نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہو کر حجۃ الوداع کا یادگار خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا مشورہ ہے کہ اس پہاڑ پر جہاں سیاہ پتھر ہیں وہاں آدمی مختلف مقامات پہ کھڑا ہو تو یقین ہے کہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کا موقف مبارک اس کے نصیب میں آجائے گا۔ حکومتِ نجدیہ سعودیہ کے سپاہیوں کی وجہ سے ہم اُس مقام تک تو نہ پہونچ سکے، مگر نگاہوں نے لطفِ زیارت ضرور حاصل کیا۔

اللہ اللہ! آج وہ دن یاد آرہا ہے کہ حضرت رسولِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) حضرات صحابۂ کرامؓ کے مقدس مجمع کے ساتھ یہاں جلوہ افروز تھے، اور سائل کی طرح ہاتھ پھیلا کر اپنی امت کے لئے دُعا مانگی تھی، اس منظر کو یاد کرکے دل بھرا آرہا ہے۔

خداوندا! واسطہ اپنی ذات وصفات کا، اور وسیلہ اپنے رسولِ پاکؐ اور انکے اصحاب کبارؓ کا، اور صدقہ تیرے اولیاء صادقین کا، ہم کو اپنی رضا نصیب فرما، مسلمانوں کی مصیبتوں کو دور فرما، اور اسلام کو نئی زندگی عطا فرما، اور ہماری زندگی اور موت اپنے لئے کرلے!۔

ہر طرف "حج مبارک۔ حج مبارک" کے نعرے بلند ہو رہے تھے، مغرب کے بالکل قریب ایک لکہ ابر آیا اور حجاج کو خدا کی رحمت وبخشش سے نواز گیا۔ اب مزدلفہ کی روانگی تھی، ہمارے قابلِ صد شکریہ معلم مولانا عبدالہادی سکندر نے اپنی ذاتی موٹر پر ہم کو مزدلفہ روانہ کردیا۔

عرفات اور مزدلفہ کے اس درمیانی راستے کا سماں شاید عمر بھر بھلایا نہ جاسکے، وہ بسوں، کاروں، اور لاریوں کی مسلسل قطاریں، جن کی روشنی ایک عجیب دل کش منظر پیدا کررہی تھی دوسری طرف اونٹوں اور خچروں پر لوگ سوار آگے بڑھ رہے تھے، انھیں سے ملے جلے پیادہ پا حجاج کی جماعت چل رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہم مزدلفہ پہونچ گئے اور مسجد مشعر حرام کے پاس ٹھہرے، آیت "فاذا افضتم من عرفات فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام" بار بار یاد آرہی تھی۔ سبحان اللہ! یہی تو وہ مقام ہے جہاں حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی عرفات والی دُعا کا بقیہ حصہ بھی قبول کیا گیا تھا، جس کی قبولیت کی وجہ سے شیطان پریشان حال بھاگا تھا اور حضورؐ تبسم فرمانے لگے تھے۔ خداوندا حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اس تبسم کے صدقے میں شیطان اور اس کے کارندوں کو پھر ذلت ورسوائی نصیب فرما، اور غلامانِ رسالت مآب (صلے اللہ علیہ وسلم) کو

موقع دے کہ آپ کے اور آپ کی امت کے دشمنوں کی رسوائی دیکھ کر ان کے دل ٹھنڈے اور چہرے تبسم کناں ہوں۔

صبح کو جیسے ہی ہم نے نماز فجر ختم کی معلم صاحب نے پھر اپنے ذاتی موٹر سے ہم کو منیٰ روانہ کر دیا۔ یہاں رمی جمار قربانی اور حلق کے بعد ہم نے غسل کیا، احرام اتارا اور کپڑے پہن کر مکہ معظمہ عصر کے وقت آئے اور طواف زیارت سے فراغت پائی، مغرب کے وقت ہم لوگ پھر منیٰ واپس آ گئے، اور بارہ ذی الحجہ کی شام تک یہاں قیام کر کے پھر مکہ واپس آ گئے۔

سہ شنبہ کے دن ۲۷ ذی الحجہ ۶۹ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء) کو بعد ظہر ہم لوگ مکہ معظمہ سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے اور مغرب سے قبل جدہ پہونچ گئے۔

یہاں جہاز کے انتظار میں ۸ نومبر ۱۹۵۰ء تک قیام کرنا پڑا۔ اگر صحیح طور سے معلوم ہوتا کہ ابھی جہاز میں اتنی دیر ہے تو مکہ معظمہ سے ہر گز نہ آتے۔

بہر حال خدا کو منظور یہی تھا، البتہ اب کی جدہ میں بڑا عجیب اجتماع ہو گیا تھا، ہم لوگوں کا قیام اسی قدیم مکان میں تھا جس میں پہلی مرتبہ آکر ٹھہرے تھے ہمارے مکان سے ملے ہوئے مکان میں جناب شیخ فیض علی صاحب (رئیس رحیم آباد۔ لکھنؤ) مع اپنے قافلہ کے مقیم تھے۔ انڈین یونین کے سفارت خانہ میں مخدومی خان بہادر سید اصغر حسین کا مع اپنے قافلہ کے قیام تھا۔ جناب وکیل احمد صاحب اور علی گڈھ کے دوسرے احباب حجاج منزل میں قیام فرما تھے۔ اکثر اوقات ہم لوگ جمع ہوتے اور نہایت دلچسپی رہتی۔

۸ نومبر ۱۹۵۰ء دن کے دن کو ظلوی جہاز سے روانگی ہوئی۔ اس مرتبہ الحاج سید اصغر حسین صاحب گرامی امیر الحجاج تھے۔ الحمد للہ کہ حجاج کو آرام ملا اور وہ خوش رہے۔

۱۹ کی رات کو غالباً دو بجے جہاز بمبئی پہونچ گیا، اور ۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء کی صبح کو سب لوگ جہاز سے اترے۔

حجاز کے مختصر زمانہ قیام میں ہم کو بہ زبان کے سوا دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

اگر آپ اُمیدوں سے پُر اور توقعات سے لبریز ہیں تو غالباً اس موقع پر میری تلخ نوائی آپ کو ناگوار گذرے، مگر یہ حقیقت میں کس طرح چھپاؤں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی افکار اس وقت دنیائے اسلام کی اکثریت پر چھا رہے ہیں، آخرت کا اہتمام کمتر، نمازیں بے وقار، وضع قطع، رہن سہن، اور چہرہ مہرہ سے اسلامیت کے آثار مفقود، دینی علوم کی طرف سے بے توجہی، سیاسی اعتبار سے غیروں کے دست نگر! جدّہ سے جس وقت ہم مدینۂ منورہ جانے لگے تو خط بنوانے کی غرض سے ایک مرصع دُکان گئے، یہ حضرت ہمارے "سر" ہو گئے کہ انگریزی فیشن کے بال ترشوایئے، انھوں نے مجھ کو نصیحت کی اور فرمایا کہ ایمان دل میں ہے "ظاہر" سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس نصیحت پذیری سے تو انکار کر دیا، مگر دل پر چوٹ لگی کہ خداوندا! سرزمینِ حجاز میں یہ آواز؟ اس قسم کے تجربے اہلِ مصر کے متعلق زائد ہوئے۔ بے شبہ اس "بحرِ ظلمات" میں کچھ "نورانی موجیں" بھی اِکّا دُکّا نظر آئیں۔ مصریوں میں شیخ حسن بنا مرحوم کی جماعت کے لوگوں میں خاص دینی ولولہ اور ایمانی جوش نظر آیا، خود شیخ حسن بنا بھی اس سال حج میں آئے تھے مگر افسوس کہ ان سے میری مُلاقات نہ ہو سکی (اور اب تو وہ اپنے کسی دشمن کے ہاتھ خدا کے دارِ رحمت میں پہونچ چکے)۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تبلیغی جماعت اپنے مخصوص دینی رنگ کی بنا پر سب میں ممتاز نظر آئی، اور یہ حقیقت بار بار واضح ہوئی کہ امورِ تقدیری سے تو چارہ نہیں، ورنہ صحیح تر اور مفید تر طریق کار یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر کی توفیق دیں، خاتمہ بخیر فرمائیں، اسلام اور مسلمانوں کو فروغ نصیب ہو

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں سے

دین کی کوئی بڑی خدمت لیتا ہے

وہ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جن کو قلم یا زبان کی خاص طاقت بخشی جاتی، اور وہ تحریر و تصنیف یا تقریر و بیان سے دین کی خدمت کرتے ہیں اور دوسروں کو اسکی دعوت دیتے ہیں ——— اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ قادر و توانا اور علیم و حکیم اپنے کسی ایسے بندہ کو دین کی کسی بڑی خدمت پر کھڑا کر دیتا ہے جسکے پاس نہ رواں قلم ہوتا ہے اور نہ چلنے والی زبان، بلکہ صرف اس کام کا یقین اور عشق و جنون اُسکے اندر بھر دیا جاتا ہے اور کسی حال میں شکست نہ کھانے والی ہمت و عزیمت اور اُس کام کی حکمت اسکو عطا کر دیجاتی ہے، اور اسکے علاوہ رونے اور تڑپنے والا بس ایک دل اس کو اور دیدیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا حال بڑا عجیب ہوتا ہے ——— امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات سے جو لوگ گہری واقفیت رکھتے ہیں، یا جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا لکھا ہوا "صراط مستقیم" کا مقدمہ ہی غور سے پڑھا ہے وہ جانتے ہونگے کہ حضرت سید صاحبؒ اسی دوسری قسم کے حضرات میں سے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ جنکی دینی دعوت اور تبلیغی و اصلاحی جد و جہد سے آپ ضرور واقف ہونگے، اُنکے جاننے والوں اور قریب سے اُنکے احوال کا مطالعہ کرنے والوں کا اندازہ اُنکے متعلق بھی یہی ہے کہ وہ بھی اسی دوسری قسم کے مصلحین میں سے تھے، نہ صاحب قلم تھے اور نہ صاحب زبان یعنی نہ انشا پرداز تھے نہ خطیب و مقرر۔ البتہ مسلمانوں میں ایمانی رُوح اور دینی زندگی پیدا کرنے اور رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دین کی دعوت کو پھر سے برپا کرنے کی آگ اللہ نے اُنکے سینہ میں لگا دی تھی، اور اس کا یقین اور عشق و جنون اُنکے قلب و قالب میں بھر دیا تھا ——— پھر اس عشق و جنون اور سوز و اضطراب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دین کی ایسی معرفت اور خاص اس کام (احیاء دین و اصلاح مسلمین) کی ایسی حکمت عطا فرما دی تھی کہ عام مجلسی گفتگو میں ایسے مضامین اور ایسے حقائق و معارف زبان سے اُبلتے تھے کہ ایک ایک ملفوظ پر اہلِ قلم کتابیں لکھیں، اور اصحاب زبان و بیان تقریریں کریں ——— مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر الفرقان) نے جب حضرت ممدوح کو زیادہ قریب سے دیکھا اور انکی اس خصوصیت کو سمجھا تو خاص خاص ملفوظات قلمبند کرنے کا اہتمام کیا ——— یہ ملفوظات پہلی مرتبہ کتابی شکل میں اب شائع ہو سکے ہیں ——— دین سے وفادارانہ تعلق اور اسکی خدمت کا جذبہ اور ارادہ رکھنے والوں کو خصوصیت سے ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ضرور ان کا مطالعہ کریں۔ (ضخامت پونے دو سو صفحات) کاغذ نفیس (قیمت: مجلد مع گرد پوش عار)

دعوتِ اصلاح و تبلیغ :- یا "اسلام کی نشأۃ ثانیہ کیلئے جدوجہد"

اسوقت مسلمانانِ عالم کی اکثریت دعوائے اسلام کے باوجود اسلامی زندگی اور ایمانی روح سے خالی ہے یہ حالت ہر حیثیت سے بڑی خطرناک ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہماری اس حالت سے سخت ناراض ہے نیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ سلم) کی روحِ پاک اس سے سخت متفکر اور بےچین ہے ۔ یہ اُمت اور اس کا ایمان و اسلام حضورؐ کا لگایا ہوا وہ باغ ہے جس کو آپنے اور آپکے اصحابؓ نے بڑی بڑی محنتوں سے سینچا تھا اور انھیں کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں یہ سرسبز اور شاداب تھا اسلئے اسکے اُجاڑ اور اسکی بربادی سے رُوحِ پاک کو تکلیف ہونا بالکل قدرتی بات ہے

ـــــ اسوقت اللہ تعالیٰ کو راضی اور رُوحِ محمدی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو مسرور اور مطمئن کرنے اور مسلمانوں کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ ہر مسلمان سچا مسلمان بننے کی اور دوسروں کو بنانے کی کوشش کرے

ـــــ "دعوتِ اصلاح و تبلیغ" کا مقصد یہی ہے ۔

ہر مسلمان سے ہم استدعا کرتے ہیں کہ اس تحریک کی حقیقت، اسکی اہمیت، اسکے اصول اور طریق کار و پروگرام معلوم کرنے کیلئے وہ ذیل کے رسالوں کا مطالعہ فرمائیں :-

۱- اسلام اور موجودہ مسلمان قوم	۴ر
۲- مسلمانانِ عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب	۶ر
۳- مولٰنا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت	۸ر
۴- ایک اہم دینی دعوت	۶ر
۵- مردِ خدا کا یقین	۳ر
۶ دعوتِ اصلاح و تبلیغ	۶ر
۷ مسلمان قوم کی حالت اور حاملانِ دین کا فریضہ	۶ر
۸- ملفوظات مولٰنا محمد الیاسؒ	۱۲ر
۹- مسلمانوں کی اصلی طاقت	۶ر
۱۰- اسلام کیا ہے؟	۱۲ر

حضرت مولٰنا محمد الیاسؒ

اور اُن کی دینی دعوت

(تالیف مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی)

اس دور کے مشہور مبلغ اور عارف حضرت مولٰنا محمد الیاسؒ کے نام سے ہمارے ملک کے باخبر حضرات عام طور سے واقف ہیں، یہ کتاب دراصل مولٰنا ممدوح کی سوانح حیات ہے جسمیں اُنکے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ اُنکی مشہور دینی و اصلاحی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلا شبہ اس دور کی نہایت وسیع اور گہری دینی و اصلاحی تحریک ہے ــــ اس دعوت و تحریک کے پس منظر اسکے بنیادی اصول اور اسکی ارتقائی منزلوں کو جس تحقیق و تنقیح کے ساتھ بہترین علمی اور تصنیفی زبان میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اسکے محترم مؤلف ہی کا حصہ ہے ـــــ شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کا مبسوط مقدمہ ہے جسمیں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء (علیہم السلام) کے اصولِ دعوت کی تشریح کر کے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ مطابقت ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ ۔ کاغذ نفیس ۔ صفحات (۳۲۸)

قیمت :- ڈھائی روپیے (عہ۲ر)

دربارِ نبوّت کی حاضری

(از مولٰنا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ)

[اب سے ۲۰-۲۱ سال پہلے مولٰنا ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے حج و زیارت کی سعادت نصیب فرمائی تھی۔ اس عاجز نے مولٰنا سے درخواست کی تھی کہ اگر ہو سکے تو اس سال حج نمبر کے لیے بجائے کچھ اور لکھنے کے حافظہ پر کچھ زور ڈال کے اپنے اس سفرِ حج کی سرگزشت قلمبند فرما دیں۔ ذیل کا ۴۰ صفحہ کا مقالہ میری اسی درخواست کا جواب ہے، بلکہ ابھی اس جواب کی ایک قسط باقی ہے جس کے لیے مجھے بھی اور الفرقان کے ناظرین کو بھی الفرقان کے کسی اگلے حج نمبر کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مولانا ممدوح نے مقالہ کے ساتھ جو بھی گرامت نامہ اس ناچیز کے نام لکھا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی چند سطریں ناظرین کے ملاحظہ کے لیے یہاں درج کر دی جائیں۔ تحریر فرماتے ہیں:-

خاکسار کی زندگی کا یہ ایک جبلی پہلو ہے، چھپانے کی کوشش کرتا ہوں گزشتہ حج نمبر میں فلسفۂ حج کی نقاب میں پناہ لی تھی، لیکن آپ جب درمیان میں آ جاتے ہیں تو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، سرود آپ نے مستوں کو یاد دلا دی، اب سمجھیے جنون نے طومار تیار کر دیا، جو لکھوایا گیا لکھتا چلا گیا "دربارِ نبوت کی حاضری" کی داستان اتنی طویل ہو گئی کہ دوسرے حج نمبر کے لیے حج کے قصے کو ملتوی کر دینا پڑا۔"

اب اصل مقالہ پڑھیے ———————— مدیر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از بخت بدم اگر فرو شد خورشید　　　از نورِ رخت وہا چراغ گیرم

جون ۱۹۲۸ء میں ٹھیک ان ہی دنوں میں جب بسلسلۂ تعطیل موسم گرما فقیر اپنے وطن گیلانی (بہار)

میں تھا، ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا یا مبتلا کیا گیا، جس کے خیال سے بھی دیکھنے والے شاید اب بھی کانپ جاتے ہوں، ایک مولوی، اور لوگوں میں نیک نام مولوی، جامعۂ عثمانیہ کا پروفیسر، دکن کا واعظِ شہر، ایک پُرلطف تماشا تھا کہ بجائے خون کے اس کے جسم میں ریم اور پیپ کا طوفان اُبلنے لگا۔ باہر سے جلد پر پھنسی کا اثر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اندر ہی اندر ایسے ایسے بڑے زخم اور پھوڑے پیدا ہو گئے، جن سے آپریشن کے بعد میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن سنا کہ تین تین سیر تک پیپ نکلی، بخار چار پانچ ڈگری تک پہونچ جاتا تھا، اسی سے دماغ عموماً معطل رہتا تھا، حالانکہ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، ران، پشت، الغرض ایک ایک عضو داغدار تھا، اور ایسے داغوں سے داغدار تھا، جن کا علم دوسروں کو صرف آپریشن کے بعد ہوا، لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ان پنہانی زخموں کے انگاروں پر لوٹ رہا تھا، اس کا حال کیا ہوگا؟ مگر سبقت رحمتی علی غضبی کی شاید ایک شکل یہ بھی تھی کہ دماغی تعطل نے تکلیف کی شدت کے احساس کو ایک حد تک کند کر رکھا تھا، چالیس دن تک مختلف امراض کے شبہات و شکوک کے تحت اطبا او ڈاکٹروں کا تختۂ مشق اپنے گاؤں گیلانی ہی میں بنا رہا، مگر ایک ڈاکٹر جو بحمد اللہ ابھی زندہ ہیں، انھوں نے ابتدا ہی میں مرض کی صحیح تشخیص کرلی تھی کہ نقیح الدم یا پایمیا کی بیماری ہے، دوسرے اطبا اور ڈاکٹروں کو انھوں نے زبردستی الگ کر دیا۔ اور اپنے اختیار و تیزی سے گویا یوں سمجھیے کہ انھوں نے اپنے زیرِ علاج ہی رکھا[1] جب یہ اندرونی پھوڑے پک گئے، تب انھوں نے مشورہ دیا کہ دیہات میں اس قسم کے پھوڑوں کا آپریشن ناممکن ہے، پٹنہ کا شہر قریب ترین شہر تھا، جہاں جنرل اسپتال کی آسانی تھی، طے کیا گیا کہ مجھے پٹنہ پہونچایا جائے، مگر ایسے بیمار کو کیسے پہونچایا جائے جس کے دونوں ہاتھ بھی بے کار، دونوں پاؤں بھی بے کار، حتیٰ کہ پشت پر سونے کا مطلب جس کے لیے یہ تھا کہ زخموں پر پڑا رہے، ایسے بیمار کی منتقلی کا مسئلہ کافی دشوار تھا۔

ایک کھٹولے کو موٹر میں، موٹر سے ریل میں، لوگ جنازے یا تابوت کی طرح منتقل کر رہے تھے، کیول جنکشن پر ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں یہی کھٹولا جب قلیوں کے کندھوں پر منتقل ہو رہا

---

[1] ان کا اسمِ گرامی ڈاکٹر زاہد خاں ہے، آج کل شیخ پورہ (ضلع مونگیر) میں خانگی پریکٹس کرتے ہیں ۱۲

تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرے ہوئے کتے کو پھینکنے کے لیے لوگ لیے جا رہے ہیں، بہر حال زینہ یہی کھولا بیمار کے ساتھ پہونچا، ہسپتال میں داخل ہوا، دو ڈھائی مہینے کی مدت میں سات آپریشن مختلف اعضاء پر کیے گئے، تماشا یہ تھا کہ آپریشن کر کے مواد ایک عضو سے جب ڈاکٹر خارج کرتے تھے، تو دو تین دن کے وقفہ کے بعد کسی دوسرے عضو میں ٹیس اور درد کا زور شور شروع ہوتا، اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا تا اینکہ ساتویں آپریشن کے بعد پاؤں کے ایک حصہ میں پھر درد اور ٹیس کی کیفیت شروع ہوئی، گویا آٹھویں آپریشن کی تمہید شروع ہو چکی تھی کہ پھر کیا ہوا؟ اسے اب کیا بتاؤں؛ بخاری شریف کی روایت جس کا حاصل یہ ہے کہ۔

مرگیا ایک حبشی (راوی کہتا ہے کہ) یا حبشیہ، لوگوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے بغیر دفن کر دیا، رسول اللہ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا تو انتقال ہو گیا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کیوں اطلاع نہ دی گئی، تب لوگوں نے کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کیں، (راوی کا بیان ہے کہ اس مرنے والے مسلمان) کو ہیچ میرز قرار دیا (یعنی فقیر) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی قبر مجھے بتاؤ کہ کہاں ہے، قبر کی نشان دہی کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس (کس مپرس غریب مسلمان) کی قبر پر تشریف لائے اور قبر ہی پر اس کی آپ نے نماز پڑھی (یعنی جنازے کی نماز پڑھی)"

(بخاری ج ۱ ص ۱۷۸ مجتبائی)

شاید کچھ اسی قسم کے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے کہنے والے نے اس مشہور شعر میں ؎

دو عالم بہ کاکل گرفتار داری
بہ ہر مو ہزاراں سیہ کار داری

زسر تا بپا رحمتی یا محمدؐ
نظر جانب ہر گنہ گار داری

صبح ہوئی عجیب صبح تھی، یہ دیکھنے کے لیے کہ پاؤں کا زخم پک کر آپریشن کے قابل ہو چکا؟ ڈاکٹر آئے، آکر جہاں درد اور ٹیس کی کیفیت تھی ہاتھ رکھا گیا، جو نشتر کی نوک کو تیز کرتے ہوئے آئے تھے، متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے کہ قصہ کیا ہوا؟ پھوڑا کہاں پر تھا، وہ ڈھونڈھتے تھے اور نہیں ملتا تھا،

مریض خستۂ جسم وجان سے پوچھا جارہا تھا اور وہ خاموش تھا، آخر اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ آٹھویں آپریشن کی ضرورت باقی نہ رہی، کیوں باقی نہ رہی، یہ ایک راز تھا جس سے نہ اس وقت وہ واقف ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے، یہ کارپرنظر رحمت پڑ چکی تھی، کالے حقیر سمجھے جانے والے حبشی کی ڈھیر پر کھڑے ہو کر عالمین کی جس رحمت نے دعا کی تھی، مغفرت کی دعا کی تھی، مغفرت کی وہی دعا آج ایک سیاہ کار کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہو، قسم ہو اسی خدائے زندہ و توانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہو کہ ایک سکنڈ دو سکنڈ کے لیے ابھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لیے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جارہا تھا، کہ اب وہ اٹھ رہا ہو، اٹھتا چلا جارہا ہو جس کی موت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا، وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کر دیا گیا، ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہو، حکم کی تعمیل کی گئی، پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہو، شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا، اس زمانے میں بہار میں تھا، بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہو ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہو، اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا والتماس کے لیے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ڈھلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھ سکتے ہیں لیکن اردو زبان کے املائی حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہو، کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہیے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جاسکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا، بجنسہ ان ہی الفاظ کو نقل کر دیتا ہوں۔ وھو ہذا۔

پیارے محمدؐ جگ کے سجن　　تم پہ واردں تن من دھن
تری صورتیا من موہن　　کبھیو کرا ہو تو درشن
(کبھی کرا دیجیے ۱۲)

جیا کھنڑے، دلوا انزے
(دل ۱۲)

کرپا کے بدرا کہیا برے
(کرتا ہو ۱۲)

تری دوارِیا کیسے چھوڑدں　　تم سے توڑدں تو کس سے جوڑدں
(بادل ۱۲)　(کب ۱۲)

تمری گلی کی دھول بٹوروں　　تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

صلی اللہ علیک نبیا　　تمرے دوارے آیا دکھیا
بھیا اہکی پکڑھو راجا　　اپنے جبین و حسن کا صدقا
بازو اس کا پکڑیے اے راجہ۱۲
ڈھوا گھیر بن ناؤ کو اس کے
موج عظیم۱۲
اب کہیں ہم ہیں اپنے بس کے

سیس پہ اکے پاؤں دھرہو　　پیت کی اگیا من میں بھرہو
سر۱۲　پاؤں۱۲　محبت۱۲
بھدر ہوا پہ تینی کرپا کرہو　　سپنو میں ایسن کر گجرھو
حد سے زیادہ منحوس و بدبخت ذرا مہربانی کیجیے　خواب میں ہی ایسا کر گزریے۔
راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے

اندھرا کے تم رہیا بنا ہو　　ہردے کا اکے جوت جگا ہو
اندھے کو بنا بیے۱۲　کوئی باطنی۱۲
ڈگری پہ اپنے اکو چلا ہو　　بودھا کے تم بدھی بنا ہو
راستہ۱۲　بے وقوف کو آپ　دانش مند بنا دیجیے
کھینچو اکو پاپ نرکھ سے
دھو دیہو کا لکھ منہ کا اکے
سیاہی

تمرے پیا کی اونچی اٹریا　　ہمری نے ہی واں پہ گجریا
نلا نلا رہی نجریا　　پھیلی ہے اک تمری دوریا
بھٹک بھٹک کر رہی نظر　دیکھی ہوئی ہے۱۲
ان کھ بتو امرے سے چلی ہے
ان کا پتہ تم سے چلے گا
کھو جو بھی ان کا تمرے سے ملی ہے
سراغ ان کا آپ ہی سے ملے گا

پل کی پتیا تم ہی بے لہو　　ان کھ بتیا تم ہی سنی لہو
محبوب کا خط آپ ہی لا دیجیے　ان کی باتیں آپ ہی سے سننا ہیں
ہمنی کے نندیا سے تم جگے لہو　　مرلی ٹھلبسی تم ہی جلے لہو
ہم لوگوں کو نیند سے آپ ہی نے جگایا　مرے ہوئے تھے تم ہی نے جلایا
دھرمی بجھے لوں تمری دیا سے
روشن ہوئے۱۲　تمہاری مہربانی
مکتی بھی ہو ای ہی تمری ددا سے
نجات تمہاری ہی ... کرد ... سے

"ورشن" کی آرزو اس عجیب و غریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولنا سجاد مرحوم اگرچہ بظاہر فقیہ النفس والصورت تھے، مگر ذاتی تجربہ کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لائے تھے، اسی زمانہ میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند۔

تری دوار یا کیسے چھوڑوں ٭ تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تری گلی کی دھول بٹوروں ٭ تم رے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

"تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں"؟ اس استفہامی مصرعہ کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہو ہو کر بلبلاتے، اور ہو بھی یہ سوال کچھ اسی قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرے پر تڑپ رہی ہو، زندگی کا مطلب کیا ہو؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہو، ایک ڈیوڑھی کے سوا خود ہی سوچئے کہ دنیا میں کون سا آستانہ ایسا باقی رہا ہو جہاں واقعی اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا۔ واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کس کے پاس جائے گا؟ موسیٰؑ ہوں یا عیسیٰؑ، ابراہیمؑ ہوں یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور، اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی۔ جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہو کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی، تو اب دنیا کہاں جائے۔ اور اس کے سوا کہ

جلوۂ ات تعبیر خواب زندگی (اقبال)

کا فیصلہ کرتے ہوئے "تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں"؟ کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا تہادت والوں کو غیب تک پہونچنے اور پہونچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں رہا ہے۔

بہرحال ہسپتال سے نکلنے کے بعد ڈاکٹروں کے حسب مشورہ چھوٹا ناگپور کے شہر ہزاری باغ

ین کچھ دن گذرے کہ نسبتاً وہاں کا موسم اس زمانے میں ٹھنڈا اور سمجھا جاتا ہو کہ آب وہوا وہاں کی عموماً صحت پرور ہو۔ ہزاری باغ ہی میں پہلے اٹھنے بیٹھنے، اور آخر میں کچھ چلنے پھرنے کی قوت بتدریج واپس ملنے لگی؛ پھر اپنے دیہاتی مستقر گیلانی کی طرف واپس ہوگیا۔ تقریباً چھ مہینے اس سلسلے میں ختم ہوئے جامعہ عثمانیہ سے اتنے دنوں تک غائب رہا۔ تنخواہ بھی نصف ملتی رہی، اور ڈاکٹری علاج میں مصارف کا غیر معمولی بار عائد ہوا[۵]۔ غالباً جنوری ۱۹۲۳ء میں پھر جامعہ عثمانیہ میں رجوع ہوگیا، اور کام کرنے لگا۔ تقریباً یہ سال بھی پورا ہوا، مولانا عبدالباری ندوی استاذ جامعہ اور فقیر کچھ دن سے ایک ہی مکان میں رہنے لگے تھے۔ بیماری کے نازک دنوں میں مولانا نے زبانی ہی نہیں بلکہ عملی ہمدردی بھی فرمائی۔ واپسی کے بعد پھر ان ہی کے ساتھ قیام رہا کیوں کہ تعلقات اس عرصہ میں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ قریب ہو چکے تھے کہ اچانک مولانا نے حج کے ارادے کا اعلان کیا، مولانا نے بھی اعلان کیا اور ان کے بچپن کے رفیق قدیم مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدق کی طرف سے بھی اسی اعلان کے اعادے کی خبریں مجھ تک پہونچنے لگیں تھیں اور گو مولانا عبدالماجد صاحب کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع زندگی میں کبھی نہیں ملا، لیکن جن دنوں بیمار ہوا تھا، اس سے کچھ دن پہلے مولانا سے نیازمندی کا رشتہ قائم ہوچکا تھا، پٹنہ ہسپتال میں جب تقریباً بیہوش پڑا ہوا تھا، اور پہلا آپریشن ہوا تھا، آپریشن کے بعد کچھ خفت محسوس ہوئی، آنکھیں کھل گئیں، تو یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہو کہ اپنے سرہانے دیکھتا ہوں کہ دعا میں اٹھائے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کوئی کھڑا ہوا ہو، اتنا ہوش واپس آچکا تھا، پہچان کر آنکھوں میں آنسو بھر گئے کہ ہمارے کرمفرما مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدق ہیں۔ ع باہم نگر یستم گریستم گذشتیم۔ گویا حیات بعد الموت کے بعد پہلی نظر ان ہی پر پڑی بھی مقدر ہو چکا تھا، میری علالت کی تشویشناک خبروں سے بے چین ہو کر مولانا پٹنہ میری عیادت کے لیے تشریف لے آئے تھے۔

الغرض علالت کے اس دوران میں منجملہ دوسری نعمتوں کے ایک اس غیر مترقبہ نعمت نے

---

[۵] والد مرحوم سید حافظ ابو الخیر فرمایا کرتے تھے کہ ڈاکٹری علاج میں جسم اور روپے کی تھیلی دونوں میں بہ یک وقت آپریشن کے عمل کی ضرورت ہوتی ہو۔ ۱۲

بھی سرفرازی ہوئی، کہ مولنا عبد الماجد اور مولنا عبد الباری ان دونوں بزرگوں کے ساتھ روابط میں
میں غیر معمولی استحکام و استواری پیدا ہوگئی اور امید اسی کی ہو کہ ان بزرگوں کی ذرّہ نوازیوں سے
دنیا کے ساتھ "الآخرۃ" میں بھی استفادہ کا موقع انشا اللہ عطا کیا جائے گا کہ ان رد اسم ورد ابط کی
بنیاد "تقوی" پر قائم ہو، ساری خلّتیں جس دن عداوتوں سے بدل جائیں گی الا المتقین کو اس
عام قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو

خلاصہ یہ ہو کہ حیدرآباد کے جس مکان میں خاکسار اور مولنا عبد الباری مقیم تھے، اب اس
مکان میں صبح و شام حج، سفر حج اور اس کے مقدمات و تمہیدات کا تذکرہ تھا، اور اس طرح چھڑا کہ
جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا اس تذکرے کے سوا دوسرے تذکروں کی گنجائش کم ہوتی جاتی
تھی، سامنے یہ قصہ تھا اور اس عرصہ میں مولنا عبد الماجد صاحب کے مکاتیب میں بھی حج ہی کے
ارادے اور تیاریوں کا ذکر ہوتا، سمند ناز پر جو مسلسل تازیانے کا کام کر رہا تھا، ہوک دل میں اٹھتی تھی
علالت کے طویل سلسلے نے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہو میری مالی حالت کو زبونی کی آخری حدود تک
پہونچا دیا تھا، قرض اور دیون کے بار ہی سے پیٹھ جھکی ہوئی تھی، ایسی صورت میں دبی ہوئی آرزو
کے ابھرنے کا موقعہ کیا تھا، مولنا عبد الباری اپنے ملنے جلنے والوں سے جب مسئلہ حج پر گفتگو شروع
فرماتے تو ندامت و خجالت کی زردی چہرے پر پھیل جاتی۔ زبان بھی بند ہو جاتی۔ اور شاید شنوائی کا
رشتہ بھی قلب کے ساتھ باقی نہ رہتا۔ لوگ مختلف مشورے مولنا کو دیتے، یہ کیجیے وہ کیجیے، حج کے
پرانے تجربہ کار سفر کے نشیب و فراز اور ضرورتوں سے آگاہ کرتے۔ اور دور پلنگ پر لیٹا ہوا ایک
معذور و مجبور صرف کروٹوں پر کروٹیں بدلنے کے سوا نہ کچھ کرتا تھا نہ کچھ کر سکتا تھا۔

دن گذرتے رہے، قصے ہوتے رہے تا اینکہ شاید ہفتہ عشرہ سے زیادہ وقفہ باقی نہ رہا
تھا کہ حیدرآباد سے حج کی رخصت کی کارروائی کو مکمل کرانے کے بعد مولنا عبد الباری اپنے رفیق کو
اسی مکان میں چھوڑ کر روانہ ہو جائیں، دلولے اٹھتے تھے اور دب جاتے تھے لیکن وقت کی تنگی
اپنے آخری حدود پر پہونچ گئی تھی کہ۔

اچانک عزم کی بجلی سی تھی جو سینے میں چمک اٹھی، شاید رات کی تاریکی میں اس عزم کا

مقدس نور قلب میں پیدا کیا گیا، دوسرے دن وہی جو صاحب سے اس مسئلہ کے متعلق مولانا عبدالباری کے لیے کچھ اجنبی اجنبی سا بنا ہوا تھا، اس نے مولانا سے عرض کیا کہ "فرمائیے اپنی ہمرکابی میں اس کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے جس کی شرکت کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ سردست پیش نظر نہیں ہے" یہ مولانا کے دل کی بات تھی چوں کہ میری طرف سے کسی رجحان کو نہیں پاتے تھے وہ خاموش تھے، میرے اس عرض پر شگفتہ ہو گئے، مگر جس تالے کی کنجی گم ہو اس کے کھلنے کی صورت کیا ہوگی؟۔

اب کیا بتاؤں کہ جس تالے کی کنجی میری ناقص و جاہل عقل کے نزدیک گم شدہ تھی، وہ میرے سامنے کس رنگ میں لائی گئی؟ تفصیل سن کر کیا کیجیے گا "بیدہ الخیر" نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ نہ کسی سے قرض ہی لینا پڑا، اور نہ امداد و اعانت کی رسوائی و ذلت کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے پر مجبور ہوا، کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی، اسی ہفتہ عشرہ کے تنگ وقت میں ساری کارروائی نیچے سے اوپر تک طے پا گئی، اور ٹھیک جس دن مولانا لکھنؤ اس لیے روانہ ہوئے کہ والدین کو ساتھ لے کر سفر حج پر روانہ ہو جائیں، خاکسار بھی اپنے اعزہ واقربا سے ملنے اور رخصت ہونے کے لیے حیدرآباد سے راہی بہار ہوا، ماہ رمضان المبارک کی آخری تاریخوں میں گھر پہونچا، عید کی نماز پڑھی، اور اہل وطن سے رخصت ہو کر بمبئی کے ارادے سے روانہ ہو گیا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ گیا تک بمبئی میل پر سوار کرانے کے لیے ساتھ آئے، صرف ایک دری ایک کمبل دو چادروں کے علاوہ دو تکیے بستر میں رکھے گئے، ان تکیوں سے روئی نکال لی گئی تھی، اور یہ ہمارے برادر عزیز مکارم سلمہ کی جدت طرازی تھی کہ روئی کی جگہ ان ہی دو تکیوں میں انھوں نے آٹھ دس جوڑے کرتوں اور پائجاموں کے اور بنیائن وغیرہ رکھ دیے۔ اب یہی دونوں تکیے میرے تکیے بھی تھے، اور یہی کپڑوں کا بقچہ بھی، ٹرنک بھی یہی اور یہی سوٹ کیس بھی، یہ تو مختصر سا بستر تھا، ایک ٹفن کیریر اور چمڑے کا پورٹ منٹو جیسا ایک بیگ، بس یہی کل کائنات سامان سفر کی تھی۔

بمبئی میل رات کے تین چار بجے گیا سے روانہ ہوتا ہے، مجھے میرے عزیز بھائی نے ریل کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ اور ان کے سینے میں جو دبی ہوئی آواز تھی، گریہ اور بکا کی آواز کے ساتھ مل جل کر نکل رہی تھی، وہ کہہ رہے تھے۔

"سرکار کے دربار میں جا رہے ہیں اس غریب دور افتادہ اُمتی کا سلام عرض کر دیجئے گا، اور عرض کر دیجیے گا کہ امت جس حال میں ہو اس کی طرف توجہ فرمائی جائے، ایمان و اسلام کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بغاوت پر لوگ آمادہ نظر آ رہے ہیں، عہد وفا بھلایا جا رہا ہو۔"

کچھ یہ اور اسی قسم کی باتیں بیساختہ رخصت کرتے ہوئے وہ کہتے جا رہے تھے۔ میرا دل بھی بھر آیا، گاڑی نے سیٹی دے دی، اپنے عزیز بھائی کے اس آخری پیغام کے سوا اب دماغ اور دل میں کچھ نہ تھا، گاڑی روانہ ہو گئی، دونوں بھائی ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے جدا ہو گئے۔ کہ "اُمت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جس کی دعا سمیٹ سکتی ہو وہاں جا کر کچھ ہیروی کیجیے گا۔ گڑگڑائیے گا، رو دیجیے گا۔

رات کی تاریک فضا کو بمبئی میل کا دیو ہیکل انجن چیرتا، پھاڑتا، چیختا چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا، اور اسی طویل گاڑی کے ایک گوشہ میں خدا جانے کن کن آرزوؤں پر لوٹتے ہوئے ایک فقیر بے نوا بمبئی سے قریب ہوتا جا رہا تھا، رات کٹ گئی، دن آیا وہ بھی گزر گیا، پھر رات آئی اور دوسرے دن کی صبح آٹھ بجے وکٹوریا ٹرمینس پر گاڑی ٹھہر گئی، پلیٹ فارم پر مولانا عبدالماجد صاحب کی جھلک محسوس ہوئی، وہ پہلے تشریف لا چکے تھے نوازش فرمائی تھی کہ جو تنہا آ رہا ہو اس کو اپنے ساتھ ٹھہرا لے جائیں، مرحوم مولانا شوکت علی کے ساتھ "خلافت ہاؤس" میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، فقیر کو بھی وہیں لے جا کر اس کمرے میں ٹھہرا دیا جس میں ہمارے فاضل قدیم دوست مولانا عرفان مرحوم قیام فرما تھے، اب اس وقت یاد نہ رہا کہ بمبئی میں کتنے دن ٹھہرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جہاز کا انتظار تھا، مولانا عبدالباری صاحب بھی لکھنؤ سے تشریف لا چکے تھے، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ ٹکٹ کب لیا گیا اور پاسپورٹ کی کارروائی کب ہوئی، کیسے ہوئی، بظاہر شاید آٹھ دس دن بمبئی میں قیام رہا، کھانا دونوں وقت مولانا شوکت علی مرحوم کے ساتھ ہم لوگ کھاتے رہے، ٹونک کے ایک پرانے ملنے والے مولانا ریاض النور بمبئی کی جمیعت العلماء کے رکن خاص تھے۔ اور کسی مشہور مسجد میں جس کا نام اب یاد نہ رہا اسی میں مولانا ریاض النور کا قیام تھا، کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا، انھوں نے میرے ساتھ یہ دیکھ کر کہ پان کا عادی ہوں، چند سیر کتھ (بھوپال والا) بنوا کر یہ کہتے ہوئے حوالے

کر دیا کہ جہاز میں پان نہ ملے گا، اس وقت یہی گنگا مغتنم ثابت ہو گا، سامان سفر میں نفن گیر یر جو تھا بمبئی ہی میں اسے چھوڑ دیا گیا اور بجائے اس کے ایک کیمپ کاٹ جہاز پر لیٹنے پوٹنے کے لیے اور سمندر کے نظارے کے لیے کپڑے کی ایک آرام کرسی خریدی گئی۔ آخر وقت جہاز میں سوار ہونے کا آگیا، سمندر کا یہ پہلا سفر تھا کیمپ کاٹ اور آرام کرسی خوب کام آئی۔ دس دن جہاز میں گذرے، ملا علی قاری کی کتاب المناسک ساتھ تھی، اسی سے مسائل کا التقاط کر کر کے ان حاجیوں کو بتا دیا جاتا تھا جو پوچھتے تھے، کبھی کبھی رات کی تاریکی میں جہاز کی آخری بالائی سطح پر تنہا چلا جاتا، سامنے سمندر کا پانی اور جگمگاتے تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا سناٹے کے اس عجیب و غریب وقت میں نظارہ، جہاز بڑھتا جا رہا تھا، اس خطہ اور پاک سرزمین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، دل کی گہرائیوں سے جسکے متعلق یہ ورد کر آواز آتی تھی۔

فرخا شہرے کہ تو باشی دراں   اے خنک شہرے کہ تو باشی دراں
دائے امروزم خوشا فردائے من   مسکن یار است شہر شاہ من (اقبال مرحوم)

برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ کا یاد دلایا ہوا "پیغام" دماغ کی سطح پر پہونچ کر مچلنے لگا۔ بے ساختہ زبان سے مصرعے نکلنے لگے، ابتدا تو مادری زبان اردو ہی سے شروع ہوئی،

ہر ایک سے ٹکرا کر   ہر شغل سے گھبرا کر
ہر کام سے پچتا کر   ہر فعل سے شرما کر
آمد بدرت بنگر
اے خاتم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اس کے بعد فارسی مصرعوں کا زور بندھا، نیچے اتر آیا، روشنی میں قلم بند کرنے لگا، خاتمہ عربی کے چند مصرعوں پر ہوا "عرض احسن" کے نام سے یہی نظم موسوم ہوئی، اور پیش کرنے کے لیے "تحفۂ درویش" تیار ہو گیا، مولانا عبدالماجد سے جہاز ہی میں تذکرہ کیا گیا، سنا، کس حال میں سنا، سنانے والے اور سننے والے کے سوا شاید کوئی دوسرا موجود نہ تھا، دل کے حوصلے نکلے نکالے گئے، دوسرے دن مولانا نے نظم کی نقل مانگ لی، غالباً عدن کے ساحل سے یا جزیرہ قامران (کامران) سے جو ڈاک انھوں نے ہندوستان روانہ کی، اسی میں یہ نظم بھی تھی۔ دلی سے اس زمانہ میں "ملت" نامی

اخبار جعفری صاحب کا نکلتا تھا، پیش ہونے سے پہلے ہی شاید یہ نظم "ملت" میں شائع ہو گئی۔ بعد کو تو خدا جانے کتنی دفعہ طبع ہوئی، طبع ہونے کے ساتھ غائب ہو جاتی ہو، حتیٰ کہ اس وقت بجز اس مکتوبہ مسودہ کے مطبوعہ شکل میں اس نظم کی کوئی کاپی خود پیش کرنے والے کے پاس بھی موجود نہیں ہے، شائد "الفرقان" کے اسی حج نمبر میں کسی جگہ آپ کو "عرض احسن" کے عنوان سے یہ نظم ملے گی بھی،

اسی حال میں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، پریشانی کی آنکھوں کے لیے مسلسل ایک بسیط نظارہ وہی نیلا پانی سمندر کا، اور نیلے رنگ کا آسمان، اکتا دینے والا نظارہ تھا، لیکن جہاز جس کا نام غالباً اکبر تھا، شاید ہزار سے اوپر آبادی کو لیے ہوئے پانی پر ایک مستقل گاؤں کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا، مولانا عبد الباری اور ان کے والدین مولانا عبد الماجد اور ان کی اہلیہ محترمہ اخت العرفات کے علاوہ حضرت مولانا محمد علی بانی و ناظم ندوۃ العلما (مونگیر) کے تینوں صاحبزادے مولانا شاہ لطف اللہ مرحوم مولانا نور اللہ مولانا منت اللہ ان کی والدہ اور ہمشیرہ اس خاص[۱] تعلق کی وجہ سے جو حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاکسار رکھتا ہو، یہ مجمع وحدت کی شکل میں جہاز پر سمٹا ہوا تھا، گویا ایک مختصر سا قافلہ اکیس آدمیوں کا بن گیا۔ اس کا مادی فائدہ یہ ہوا کہ اکیس آدمیوں کے اس قافلہ میں بعضوں کے پاس فرسٹ کلاس کے بھی ٹکٹ تھے، اور زیادہ تر درجۂ سوم کے ٹکٹ والے تھے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والوں کے طفیل میں تھرڈ کلاس والوں کو عرشہ پر قیام کا بھی موقع ملا، اور درجۂ اول کے بیت الخلاء غسلخانہ کے استعمال کا بھی حق حاصل ہوا، یہ بھی ہوتا کہ فرسٹ کلاس والوں کے کیبن (کمرے) کے استعمال کی ضرورت اکیس آدمیوں کے اس قافلہ میں کسی کو اگر ہو جاتی، تو اس اجتماعی شکل کا فائدہ یہ بھی تھا کہ ضرورت پوری

---

[۱] تقریباً ایک سال تک حضرت والا کی خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں حضرت کے قدموں کے نیچے اس خاکسار کو زندگی کے بڑے مبارک دنوں کے گذارنے کا موقعہ ملا تھا، ماسوا اس کے حضرت کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے برادری کا تعلق بھی پیدا ہو چکا تھا، میری چھوٹی ہمشیرہ ان سے منسوب ہوئیں، مولانا لطف اللہ مرحوم پر حج و زیارت کا ذوق ان کے بعد اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوا کہ اس سفر کے بعد انھوں نے دو سفر حجاز کے اور بھی کیے، آخری حج میں تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ سال بھر تک حجاز میں قیام فرمایا، کچھ دن مکے میں اور کچھ مدینے میں گذارے، ہندوستان واپس نہ تو عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور شاید ان کی جوانی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کی زندگی کی مدت ختم ہو گئی۔ غفر اللہ لہ ۱۲

ہو جاتی، یعنی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والے صاحب عرشہ پر چلے آتے اور اپنی جگہ تھرڈ کلاس والے صاحب کو بھیج دیتے، عرشہ میں کیمپ کاٹ والے کھٹولے سے خوب مدد ملی۔

اس جہازی بستی کے باشندوں کے لیے ایک ہی مسجد کا انتظام تو ممکن نہ ہو سکا، مگر جماعت کی نماز متفرق جگہوں پر ہوتی رہتی تھی، ایک ٹولی کی امامت کا فرض بھی فقیر کے سر تھوپا گیا اور جہاز میں چند موتیں بھی ہوئیں، ان کے جنازے کی نماز بھی اپنے پیشہ ملائیت کی وجہ سے فقیر ہی نے پڑھائی اسی سلسلے میں بجائے مٹی کے پانی میں دفن ہونے کا تماشا بھی دکھایا گیا، مرنے والے مرحوموں کے پاؤں میں کوئی وزنی چیز (پتھر یا لوہا) ڈال دیا جاتا تھا اور ایک چکنے تختے پر کفن پہنائی ہوئی لاش رکھ دی جاتی جو آسانی کے ساتھ سرک کر پانی میں چلی جاتی، جہازی بستی کے اس آبی قبرستان کا نظارہ بڑا دردناک تھا۔ بحالت مسافرت گھر در سے دور، اجنبیوں کے درمیان دنیا کے قیام کی مدت کو پوری کر کر کے لوگ سمندر کی تاریک و عمیق گہرائیوں سے "عالم نور" کی طرف روانہ ہو رہے تھے، مرنے والوں کو ان کی آبی قبر میں سلاتے ہوئے بڑھنے والے آگے بڑھتے جاتے تھے۔

حالانکہ ہفتہ دس سے زیادہ مدت نہ گذری تھی، لیکن جانتے ہیں جی جس چیز کو دیکھنے کے لیے سب سے زیادہ بے چین تھا وہ زمین کی مٹی تھی۔ دنیا مٹی جس پر برسوں چلتے پھرتے رہے، اسی سے نکلے، اسی پر زندگی بخشی گئی، اسی پر سوتے اور اسی پر جاگتے تھے، خطرہ بھی اس کا دل پر نہیں گذرا تھا کہ جیسے پیاسا پانی کے لیے ترس جاتا ہو، ایسا وقت بھی اسی زمینی زندگی میں آئے گا کہ ہم مٹی کو دیکھنے کے لیے ترسیں گے۔ مگر ترستے اور خوب ترسے ایک ہفتہ مٹی پر نہیں بلکہ پانی پر گذرا، اسی پانی پر جس کے نیچے مٹی تھی، مگر میرے لیے تو صرف پانی ہی پانی تھا، عجب پانی؟ آنکھوں سے جب تک دیکھیے وہ پانی تھا، مگر ہاتھوں سے چھونے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ شاید گوند ہو جو پانی میں گھول دیا گیا ہو، اور زبان پر رکھنے کے ساتھ ہی نہ پوچھیے کہ ذائقہ کی قوت اس پانی کو کیا پاتی تھی، "تلخ نمک کا محلول" حیرت ہوتی تھی کہ اس کڑوے کسیلے، غلیظ گاڑھے پانی کو ہمارے گھروں تک خوش مزہ، شیریں، صاف و پاک، خنک بنا کر کیسے پہنچایا جاتا ہو۔ سمندر کے اسی تلخ و تند پانی کو ہر قسم کی آلائشوں اور ناگوار عناصر سے پاک و صاف کر کے انسانی آبادیوں پر الٹنے والا ہر سال کس

طرح الٹتا ہو کیسے الٹتا ہو قدرت کے ہاتھوں کا یہی الٹا ہوا سمندری پانی جو بمبئی میں جہاز کی ٹنکیوں میں بھرا گیا تھا، جب ختم ہو گیا، تو انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے میکانیکی آلات سے سمندر کے اس تلخ و تند پانی کو صاف کیا گیا، اور جہازی بستی کے آباد کاروں میں یہی پانی تقسیم ہونے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ "اگوار عناصر" تو شاید یہ پانی پاک ہو گیا تھا لیکن "گوارائی" کی ایجابی کیفیت سے پھر بھی محروم تھا، پیاس تو اس سے بجھ جاتی تھی لیکن جی نہیں بھرتا تھا، اس وقت بھی یہی سمجھ میں آیا کہ "قرآن کسی انسان کا مصنوعی کلام نہیں بلکہ قدرتی کلام ہے" اس دعوی کو پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ جو کیا گیا ہو کہ "اس جیسا کلام لاؤ" تو قدرتی اور مصنوعی چیزوں میں امتیاز کا اس کے سوا اور معیار ہی کیا ہو سکتا تھا۔

بہرحال مصنوعی ہی سہی لیکن پانی کی پیاس اس مصنوعی صاف کیے ہوئے پانی سے بجھی رہتی تھی، لیکن اس آبی قلمرو میں پہونچ کر مٹی یا خاک دھول کی نئی پیاس کا نیا تجربہ جو پیش آیا تھا اسکے بجھنے بجھانے کی کوئی صورت غالباً ایک ہفتہ تک سامنے نہ آئی، کہ یکایک بعض دوربین نگاہ والوں کی طرف سے ہنگامہ شروع ہوا کہ افریقہ کی سمت میں کچھ دھندلے دھندلے سے دخانی سائے دکھائی دے رہے ہیں، جہاز کی آبی آبادی میں غل مچ گیا، جو تھا اسی دھندلے دھندلے سائے کی جستجو اور تلاش میں منہمک ہو گیا، گویا ساری آبادی جہاز کے ایک ہی حصہ کی طرف پلی اور دھنسی چلی جاتی تھی۔ تب معلوم ہوا کہ مٹی اور ریت، خاک دھول کی ہوئی پیاس مجھے تڑپا رہی تھی اس پیاس کا تنہا شکار میں ہی نہ تھا، یہ کیا ہے؟ کوئی پہاڑ ہے، کوئی ٹیلا ہے، یا صرف آنکھ کا دھوکا ہے، طرح طرح کے وسوسے تھے، خیالات تھے، جو مختلف دماغوں اور دلوں میں پیدا ہوتے تھے اپنے اپنے احساس کا اظہار ہر ایک کر رہا تھا، سنائی کا شعر ؎

آب چوں کم شود بجاں جوئند چو بیابند کون ازو شوئند

اس وقت بجائے پانی کے مٹی پر منطبق ہو رہا تھا، نعمت کی قدر نعمت کے زوال کے بعد ہوتی ہے، آج مٹی اور دھول بھی اس نعمت زائلہ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھی، خدا خدا کر کے دھوکے کا بادل پھٹا اور پانی سے دور، بہت دور، دقتی ساحل کی کیچڑ کا کچھ حصہ چہرے سے نقاب لٹے ہوئے بشارت کا پیغام مٹی سے ان پیاسوں کے لیے بننے لگا۔

شور بلند ہوا کہ "کامران" کا جزیرہ آرہا ہے، یہ عرب کے علاقہ یمن سے تعلق رکھنے والا عربی جزیرہ تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ قرنطینہ کے لیے اس جزیرہ میں جہاز والوں کو اتارا جائے گا اوروں کا حال تو معلوم نہیں، لیکن جس خاک سے پیدا ہوئے تھے اسکے فراق کی مدت اپنے لیے تو ناقابل برداشت بنتی جا رہی تھی، گونہ اطمینان ہوا کہ قرنطینہ ہی کے لیے سہی مگر زمین کے دیکھنے کا موقع تو میسر آئے گا۔ اور اس سے بھی زیادہ تحت الشعور شاید ایک اور جذبہ بھی مخفی تھا، واقعہ یہ ہے کہ زمین کے کرے میں تعدد کا خیال ان ناموں کی وجہ سے جو پیدا ہو گیا ہے، جن سے زمین کے مختلف حصوں کو لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے۔ ایشیا، یورپ، امریکہ، وافریقہ، یا ہند، چین، ایران ومصر وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ صرف اصطلاحی نام ہیں اور واقعے میں خاک کا ایک تودہ ہے جس میں کہیں کہیں پہاڑ، کہیں پانی کے بڑے ذخیرے پائے جاتے ہیں، لوگوں نے اسی قسم کی چیزوں کو حد بنا کر فرض کر لیا ہے کہ فلاں نام والے ملک کی سرحد اس حد پر ختم ہو جاتی ہے یا فلاں حد سے شروع ہوتی ہے، جغرافیہ کے اٹلسوں میں ان ہی فرضی حدود کے اندر گھرے ہوئے ارضی حصوں کو مختلف رنگوں سے رنگین کر دیا جاتا ہے۔ واقعہ کی کل نوعیت اتنی ہی ہے لیکن سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے لوگوں نے ان فرضی بلکہ وہمی حدود میں اتنی اہمیت پیدا کر دی ہے کہ دنیا ان ہی وہمی اور فرضی حدود کے احترام و سالمیت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی، محبت و عداوت کے دائمی جذبات کے چند اساسی محوروں میں ایک بڑا اہم محور وہم کی یہی پیداوار ہے، اور کچھ ایسا سمجھا دیا گیا ہے کہ جیسے لفظوں میں چین کا لفظ ہند سے اور ہند کا لفظ عرب کے لفظ سے جدا ہے اسی طرح واقع میں بھی زمین کے یہ علاقے جو ان ناموں سے موسوم ہیں ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہیں، گویا جیسے مریخ کا کرہ زہرہ سے اور زہرہ کا کرہ مشتری سے تعلق رکھتا ہے، وہی تعلق کرۂ زمین کے ان علاقوں میں بھی ہے۔

بہرحال ہے تو اوطان یا ممالک واقالیم کا یہ قصہ بالکل وہم کا اختلاف، مگر کیا کیجیے کہ بچپن سے ذہن انسانی میں جو باتیں رچا اور بسا دی جاتی ہیں، عقل لاکھ زور مارے لیکن ان کا دل سے نکلنا مشکل ہے، تجرید و تفرید میں "نبوت" اور وہ بھی "نبوت کبریٰ" سے بلند منزل پر اور کون ہو سکتا ہے لیکن سیرت کی کتابوں میں اس مشہور واقعہ کا تذکرہ کیا ہی جاتا ہے کہ مکہ سے ایک صاحب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ آئے آپ نے مکہ کا حال پوچھا، آنے والے صاحب میں غالباً کچھ شعریت بھی تھی انھوں نے مکہ کی چاندنی راتوں کی بھی چند خصوصیتوں کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ ایسے الفاظ میں کیا کہ راوی کا بیان ہے "اغرو

رَقَّتْ عَلَيْنَا ٥ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے) اور فرمایا چپ ہو۔ (بیہقی بروض)

ہر مسلمان خواہ کسی ملک میں رہتا ہو اسکے کان میں عرب کا ذکر ہوش سنبھالنے سے پہلے جا گونجنے لگتا ہے، کثرت ذکر غیر معمولی تعلق اس ملک سے پیدا کر دیتی ہے، جس وقت کامران کا ساحل قریب آنے لگا، عرب کے ساتھ تعلق کا بھی غیر معمولی جذبہ تلاطم ہونے لگا، ساحل کے قریب سمندری چیلیں (سی گل) اڑ رہی تھیں، پرندوں پر بھی شاید ایک ہفتہ کے بعد نظر پڑی تھی، ساحل آگیا شاید کشتیوں میں بیٹھ کر ہم لوگ جزیرے میں اترے اور "بسم اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات" کہتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ سرزمین عرب پر پہلی دفعہ قدم رکھنے کا موقعہ پا گیا ہوں، جی چاہتا تھا کہ بجائے قدم کے سر سے اس پاک زمین کے مس کی سعادت میسر آتی مگر رفقاء سفر کا حجاب مانع ہوا، لوگ قرنطینہ کے قصوں میں مست تھے اور ایک دیوانہ ادھر سے ادھر چھلانگیں مارتا پھرتا تھا، کیا ٹھکانہ تھا ان ولولوں کا جو اس تصور کے ساتھ دل میں جوش مارتے تھے کہ.

"اب میں عرب میں ہوں عرب ہی کے ایک قطعہ پر گھوم پھر رہا ہوں!"

دن تو کچھ غسل اور بھپارے وغیرہ کی اصطلاحی مشغولیتوں میں گذرا، بڑی خنک دینے والی کیفیت تھی وہ ان جزیرے میں غروب آفتاب کے بعد ہمارے سامنے آئی، یاد پڑتا ہے کہ چاندنی بھی غالباً تھی، تنہائی جب کبھی رات کی تاریکی میں میسر آجاتی تھی پھر نہ پوچھیے کہ اس جزیرے کے بالو اور ریت کو کس کس تیز پر ڈالتا تھا "خاک بر سر کن" غم کے مبتلا کا فعل ہے لیکن آج غایت مسرت و نشاط میں اسی فعل کا اعادہ کرایا جا رہا تھا، کامران کی ٹھنڈی منور ہماری یہ رات گذر گئی صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد غالباً دوسرے دن ہم لوگ اسی جہاز پر واپس کر دیئے گئے جس سے اتارے گئے تھے، قرنطینہ کی جگہ کامران میں ساحل کے کنارے تھی کچھ سرکاری مکانات بنے ہوئے تھے، انگریزی حکومت کی طرف سے کچھ حکام یہاں مسلط تھے بظاہر آبادی دوسرے جزیرے میں تھی جسکے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا. غالباً اسی آبادی سے انڈے مرغی اور ضرورت کی دوسری چیزیں لیکر اعراب جزیرہ قافلہ میں آئے ہوئے تھے، سب سے زیادہ حیرت اس پر ہوئی کہ اناناس کے مربے کے بند ڈبے اس جزیرہ میں [illegible] یا اسی کے قریب ارزاں قیمت پر مل رہے تھے، لوگوں نے خوب لیا اور کھایا، غالباً فرانس میں یہ ڈبے پیک کیے گئے تھے اور اس جزیرے تک میں اتنے ارزاں داموں پر وہ فروخت ہو رہے تھے، خیال آتا ہے کہ انگریزی حکومت کی طرف سے طبی محکمہ کے افسروں میں ایک نوجوان عورت بھی تھی، اجنبی مردوں کے ساتھ اس لیڈی ڈاکٹر کو رہنے سہنے کی اجازت جس ماں باپ نے دے رکھی تھی، ان پر افسوس ہوا، مگر ناموس کا مسئلہ جن قوموں میں کسی حال میں بھی محل افسوس باقی نہیں رہا ہو ان پر افسوس کرنے والے ہی شاید مستحق افسوس ہوں،

جہاز میں پھر لوگ سوار ہو گئے، وہی پانی اور آسمان، کا بسیط نظارہ پھر سامنے تھا۔ دن کے وقت کبھی کبھی نظارے کی اس بساطت میں ان مچھلیوں کی وجہ سے جنبش پیدا ہو جاتی تھی، جو چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے مانند ہزاروں کی تعداد میں جہاز کے ساتھ ساتھ اڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، وہ مچھلیاں اڑتیں گی کیا؟ دراصل بل کر ایک جگہ سے پھاند کر دوسری جگہ پہونچتی تھیں،

بحر احمر جس کا نام دریائے قلزم بھی ہے، جدہ کا ساحل اسی سمندر کے کنارے ہے اس کے تنگ ترین دہانہ باب المندب سے جہاز ٹھیک صبح کے وقت پاس ہو رہا تھا۔

عدن کے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا، شاید رات کو گذر گیا۔ یا جہاز اس کے قریب نہ ہوا۔

اسی عرصے میں اچانک جہاز میں ایک نیا چرچا شروع ہوا، لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یلملم کا میقات (جہاں سے حجاج احرام باندھتے ہیں) اب آنے والا ہے۔ سمندر ہی میں جہاز یلملم کے سامنے آجائے گا۔ جہاز میں گھنٹی بجے گی۔ اور لوگ احرام باندھنے میں مشغول ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ یلملم کا پہاڑ جہاز سے نظر نہیں آتا، جہاز کا کپتان اپنے نقشہ کی بنیاد پر مطلع کرتا ہے۔ خاکسار ان باتوں کو سن رہا تھا۔ دل میں ایک خیال تھا، سے اب تک دبائے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اب وقت آگیا کہ فیصلہ کیا جائے۔ عام طور پر

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء)	اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اگر تمہارے پاس (اے پیغمبر) آئیں اور اللہ تعالیٰ سے گناہ کی مغفرت طلب کریں اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ان کے لیے مغفرت کے طلب گار ہوں تو پائینگے وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان۔

کی قرآنی آیت کی تلاوت اس وقت لوگ کر دیتے ہیں، جب مدینہ منورہ کی حاضری کا مسئلہ چھیڑا جاتا ہو۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے مسئلہ کا استنباط اس قرآنی نص سے سب سے پہلے کس نے کیا۔ لیکن اس استنباط کو غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا، گویا اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ "جاءوک" "آئیں تمہارے پاس" کا یہ مطلب کہ اس کا تعلق صرف اسی زمانہ کے ساتھ محدود نہیں ہے جب روضۂ اطہر سے باہر مدینہ منورہ میں آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما تھے، بلکہ روضۂ طیبہ میں عزلت گزیں ہو جانے کے بعد بھی خدمت مبارک میں جو حاضر ہو گا وہ استغفار کے اس قرآنی دستاویز سے مستفید

ہو سکتا ہے۔ تو اب اس مطلب کی حیثیت ایک اجماعی مسئلہ کی ہے، فقہ و حدیث اور مناسک کی ہر وہ کتاب جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے مدینہ منورہ کی حاضری کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں اسی اجماعی تفسیر کے ساتھ اس قرآنی نص کے درج کرنے کا عام رواج ہے۔

اسی "اجماعی تفسیر" نے شاید اسی زمانہ میں جب سفر حجاز کی نیت کر چکا تھا، قرآن ہی کی دوسری آیت یعنی

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ	اور جب آئیں تمہارے پاس وہ لوگ جو مانتے
بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ	ہیں ہماری آیتوں کو، تو کہو سلام ہو تم پر، لکھ دیا ہے
رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ	کیا ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر مہربانی کو، یہ
عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ	کہ جو کرے تم میں سے کوئی بری بات نادانی سے
ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ	پھر پلٹ پڑے (یعنی توبہ کرے) اس کے بعد
وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ	اور سنور جائے تو وہ بہت بڑا بخشنے والا بہت
(الانعام)	بڑا مہربان ہے۔

سے یہ احساسات قلب میں پیدا ہوئے کہ اس نص قطعی کی رو سے یہ یقینی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "السلام علیکم" کی دعا ہر اس شخص کو میسر آتی ہے جو ایمان کے ساتھ آستانہ نبوت کبری پر حاضری کی سعادت حاصل کرتا ہے، اور یہ خبر بھی براہ راست اللہ کے آخری رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اس کو پہونچائی جاتی ہے کہ توبہ و اصلاح کے بعد اپنے مالک کو وہ غفور (بہت بڑا بخشنے والا) اور رحیم پائے گا۔

سورۂ النساء کی پہلی آیت ہی کے مضمون کا اعادہ الانعام کی اس آیت میں اس اضافہ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "سلامتی" کی دعا بھی قطعی طور پر ہر وہ مومن حاصل کرتا ہے جو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتا ہے۔

امتی سلام عرض کرتا ہے، لیکن برگشتہ بخت یہ کاروں کو اس سلام کا جواب بھی دیا جاتا ہے اب تک تو حدیثوں ہی سے اس کا ظنی علم پیدا ہوتا تھا مگر سورۂ الانعام کی اس آیت نے اس ظنی علم کو قطعی اور یقینی بنا دیا۔

اس راہ کے بعض خاص افراد سے جہاز ہی میں اپنے اس اندرونی احساس کا اظہار بھی کیا، اور ان ہی سے مشورے ہونے لگے کہ حج جیسی اہم عبادت میں مشغول ہونے سے پہلے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سلامتی کی قرآنی

ضمانت مدینہ منورہ پہونچ کر حاصل کر لی جائے۔ ایک سے آگے بڑھ کر بات دو تک اور دو سے تین تک پہونچی، ہمارا قافلہ اکیس ۲۱ آدمیوں کا تھا، نفعاً کا مشاہ بھی بتا دیا گیا کہ فرض حج میں ان کا فتوی یہی ہے کہ حج کے بعد زیارت کے لیے مدینہ منورہ جانا زیادہ مناسب ہے، البتہ نفلی حج میں اختیار ہے حج و زیارت میں سے جسے چاہے پہلے ادا کرے۔ فقہ اور مناسک کی عام کتابوں میں یہی مسئلہ پایا جاتا ہے، بعض فقیہ الطبع بزرگوں پر فقیر بے نوا کا مشورہ کچھ گراں بھی گذرا، "صوفیت کی رگ پھڑک اٹھی ہے" مجھ غریب ملّا پر بہ طنز بھی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ ملّائیت پر صوفیت غالب آئی، اور اکیس آدمیوں کے اس قافلہ نے یہی طے کیا کہ بجائے اس مقام کے جہاں زنگی کپتان کی راہ نمائی میں احرام باندھا جائے گا حج کا احرام ذوالحلیفہ میں، اسی جگہ انشاء اللہ باندھا جائے گا، جہاں نسل انسانی کے سب سے بڑے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وغیرہ کا احرام باندھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ "الحج" جو ایک مستقل مطلوبہ و مفروضہ عبادت ہے، اس کے ساتھ "زیارت" کے مسئلہ کا تذکرہ محض اس لیے کتابوں میں کر دیا جاتا ہے، کہ مکہ معظمہ پہونچنے والے کے لیے مدینہ منورہ تک رسائی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ بجائے "مدینہ منورہ" کے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ طیبہ اگر مکہ سے ہزاروں میل دور کسی علاقے میں ہوتا، تو الحج کے ساتھ "الزیارت" کے ذکر کا خیال بھی کسی کو نہ ہوتا، کیونکہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایسا تعلق جو مثلاً وضو کا نماز سے، یا نماز کی مسنونہ دعاؤں کو نماز سے ہے "حج" اپنی ایک مستقل عبادتی حقیقت رکھتا ہے، اور آستانۂ نبوت کبری پر کسی مرے ٹوٹے گرے پڑے امتی کی حاضری اس کی نوعیت ہی دوسری ہے،

مگر کتابوں میں "حج و زیارت" کے تذکرہ کا اتفاقی اجتماع، فتنوں کا سبب بن گیا۔ آج شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو اس قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں بڑے بڑے لوگوں نے نقل کیا ہو کہ شیخ الاسلام کہتے تھے کہ

انہ[1] لیس من القرب بل بضد ذالک	(رسول اللہ کے روضہ) کی زیارت ثواب کے کاموں میں، نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے (یعنی زیارت کے لیے مدینہ جانا ثواب نہیں گناہ ہے)۔
ص ۳۰۰ زرقانی علی المواہب	

---

[1] اس باب میں کافی ذخیرہ مناظرانہ کتابوں کا جمع ہو گیا ہے۔ شیخ الاسلام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت علامہ تقی الدین سبکی کی ہے۔ (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

یا اس کے برعکس بعض بوڑھوں سے سننے میں آیا کہ ہمارے حج کا قبلہ نہ مکہ میں نہیں مدینہ میں ہے، اور کسی غالی گمراہ شاعر نے کہا

نجف مرا مدینہ ہے، مدینہ ہے میرا کعبہ　　میں بندہ اور گدا ہوں امت شاہ ولایت ہوں

یہ سارے تصنے محض اس سے پیدا ہوئے کہ زیارت کا ربط حج کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ رمضان کے مہینے میں عموماً زکوٰۃ دینے کے لوگ عادی ہیں، تو محض اسی بنیاد پر سوال اٹھا دیا جائے کہ روزہ رکھ کر زکوٰۃ ادا کرنا بہتر ہے۔ یا زکوٰۃ ادا کر کے روزہ رکھنے میں زیادہ خوبی ہے۔

بہرحال فقہاء نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بھی سنا دیا گیا اور ساتھ ہی دل میں جو خیال تھا کب تک دبتا، اُسے ظاہر کرنا پڑا، ہمارے رفقاء کی مہربانی تھی کہ ترکِ رفاقت پر وہ آمادہ نہ ہوئے خصوصاً ہوش و حواس رکھتے ہوئے جن بزرگوں نے ایک دیوانے کے مجنونانہ مشورہ کے ساتھ ہم نوائی کی دل ان کے اس کرم کا اب بھی ممنون ہے،

بہرحال عجب تماشا تھا۔ فرنگی کپتان نے گھنٹی بجائی، کہ نادیدہ یلملم[1] کے سامنے ہمارا جہاز آ گیا، اور لوگ احرام باندھنے

(بقیہ نوٹ: پچھلے صفحہ کا) شفاء السقام اس سلسلے میں ان کی مشہور کتاب ہے۔ "الصارم المنکی" کے نام سے شیخ الاسلام کے شاگرد ابن عبد الہادی نے جواب بھی دیا ہو اسی کتاب میں ابن عبد الہادی نے لکھا ہے کہ زیارت قبور کو ابن تیمیہ نے اپنی کسی کتاب میں نہ حرام ٹھہرایا ہے اور نہ منع کیا ہے، بلکہ "استحبہا وحض علیہا" یعنی اس کو مستحب قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا ہے) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ومصنفاتہ ومناسکہ طافحۃ بذکر استحباب زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یعنی ابن تیمیہ کی کتابیں اور مناسک پر جو ان کی کتاب ہے ہر ایک اس مسئلہ کے ذکر سے معمور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت بڑا اچھا کام اور محبوب فعل ہے، از ص ۳۰) ابن تیمیہ کے ایک رشید تلمیذ کی اس شہادت کے بعد اور کس چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ۱۲

[1] یلملم یمن والوں کی قدیم تاریخی میقات تھی، اب اس نام کی کوئی پہاڑی یمن والوں کے راستہ میں نہیں پڑتی، لیکن قدیم جغرافیہ کی مدد سے اس پہاڑ کو لوگوں نے متعین کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس حساب سے اس پہاڑی کے محاذات میں ہندوستان سے براہ جدہ مکہ جانے والوں کو دو دفعہ گذرنا پڑتا ہے ایک تو یہی سمندر کا مشہور مقام جہاں عام طور پر احرام کے باندھنے کا دستور ہے اور دوسری دفعہ یہی پہاڑیاں اس وقت محاذات میں آتی ہیں، جب جدے سے نکل کر بحرہ نامی قریہ کے پاس سے لوگ گذرتے ہیں، میقات سے پہلے احرام باندھنا چونکہ جائز ہے حتیٰ کہ گھر ہی سے احرام باندھ کر کوئی چلے تو جرم نہیں اس لیے مروجہ مقام پر احرام باندھنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے مگر اس مقام سے گذر کر اگر کوئی بحرہ کی محاذات میں پہونچ کر احرام باندھے یا جدہ اتر کر باندھے تو اس پر اعتراض کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کاش! اہل علم اس مسئلہ کی یکسوئی فرما دیتے۔ ۱۲

میں مصروف ہو گئے، صرف چند دیوانے اور ان کے ساتھ کچھ ہوش والے بھی تھے۔ جو احرام باندھنے والوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھئے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے، بیچ میں ایک اعتدالی راہ بھی پیش ہوئی کہ عمرہ کی نیت سے مکہ معظمہ حاضر ہو کر زیارت کے لیے مدینہ چلے جائیں اور حج کے موسم میں مکہ معظمہ پھر واپس ہو جائیں! مگر فقہاء نے لکھا تھا کہ "اشہر حج میں مکہ پہنچنے کے بعد حج کرنے سے پہلے مدینہ نہ جانا چاہیئے"[1]

پورا جہاز احرام کے لباس میں تھا، بجز ان چند ہوش حواس باختوں کے جو ساحل جدہ پر عام رواجی غیر احرامی لباس میں اترے تھے۔ ابھی ایک مہینہ سے زیادہ مدت موسم حج کی آمد میں باقی ہے، اس مدت کو گذارنے کے لیے (۲۱) آدمیوں کا یہ قافلہ جدہ سے براہ موٹر سیدھے مدینہ منورہ روانہ ہو گیا، ایک ہی لاری میں سب کو جگہ مل گئی۔

لاری کس حال میں چلی بس عجب حال تھا وہ منزل جو اونٹوں پر تیرہ چودہ دنوں میں پوری ہوتی تھی شاید ڈیڑھ دو دن میں پوری ہو گئی، راستہ میں شدت تمازت کی وجہ سے اور رات کی تاریکی کی وجہ سے غالباً دو تین جگہ اترنا پڑا، ایک منزل کا بیرحصانی (حسانی) نام یاد رہ گیا ہے، اس لیے یاد رہ گیا ہے کہ رات کو اس منزل کے خس پوش جھونپڑے میں قیام تھا، ایک مقامی عرب بیرے قریب آیا، عربی میں خطاب کا جواب پاکر مانوس ہوا، باتیں کرنے لگا، پوچھا گیا کہ سعودی حکومت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس نے جو کچھ کہا تھا حاصل اس کا شائد یہی تھا کہ

"سعودی حکومت کے آنے سے پہلے ہم حج کے راستے میں رہنے والے بدوؤں کا کام صرف رہزنی، چوری، مردم کشی قتل و غارت کے سوا اور کچھ نہ تھا، سعودی حکومت نے بحمد اللہ ہماری مردہ انسانیت کو زندہ کر دیا، اب ہم آدمی ہیں ہمیں مختلف جائز معاشی پیشوں میں اب مشغول کر دیا گیا ہے، اس حکومت کے ہم بہت ممنون ہیں"

مجھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس اعرابی سے شائد یہ بھی پوچھا کہ صدیوں کی پڑی ہوئی بری عادتوں کے ازالہ میں آخر سعودی حکومت کامیاب کیسے ہوئی؛ جواب میں شائد اس نے "اثخان فی الارض" کی تدبیر کا حوالہ دیا۔ جہاں جہاں ان لیٹروں کے اڈے تھے۔ بے دردی کے ساتھ وہاں خونریزی کی گئی۔ چور دھرم کی کہانی نہیں سنتے ان کے لیے تو بجائے دھرم کے دھرپ ہی کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتوں کا بھاشی طریقہ نہ پہلے کامیاب ہوا ہے، اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] ... مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے مکہ آیا جایا جاتا ہے اور پہلے مدینہ چلے جانے سے حج

یہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ ترکی شریفی عہد میں حج کرنے والے پیش روؤں سے حرامیوں (اعرابی رہزنوں) کے جو مہیب قصے ہم نے سنے تھے، ان کا کہیں نام ونشان بھی اس پورے راستہ میں نظر نہ آیا۔ تن تنہا، سر پر چھتری لگائے پیدل سفرِ حج کرنے والوں پر لاری سے نظر پڑی، وہ بڑے اطمینان سے جا رہے تھے، کسی منزل میں ہمارے ساتھیوں کی کوئی چیز غائب نہ ہوئی، دوسروں سے تو ایسے قصے بھی سننے میں آئے کہ چھوٹا ہوا یا گم شدہ مال ان تک پہونچا دیا گیا، حکومت کے کارندے اس معاملہ میں بڑی ہوشیاری اور ذمہ داری سے کام کر رہے تھے، جس منزل میں بھی اترنے اور کچھ دیر قیام کرنے کا موقعہ ملا، وہاں نشست و برخاست اٹھنے بیٹھنے لیٹنے پوٹنے کا کافی انتظام تھا، اس وادیٔ غیرِ ذی زرع کے ان خس پوش جھونپڑوں کے اندر یہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ تنوری روٹیوں کی تھاک اپنے سامنے جمائے ہوئے فول[1] کی ترکاری یا گوشت کے ساتھ کھانے والے کھا رہے ہیں، جن میں ادنیٰ درجے کے حمّال (شتربان) اور باربرداری کے کام کرنے والے مزدور بھی تھے "الرزاق ذوالقوۃ المتین" کی رزافیت کی تجلیاں ان اجاڑ سنگستانوں میں قدم قدم پر چمک رہی تھیں اور بصیرت کی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ ہند کے مرغزاروں میں بھی رزاقیت کی یہ شان اتنی نمایاں نہ تھی، جتنی عرب کی ان چٹیل وادیوں میں دیکھی جا رہی تھی، وہی طبقہ جو ہندوستان میں ستو یا بھنے ہوئے چنوں پر ستّو وغیرہ کے سوا کچھ نہیں پاتا عرب میں اسی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو روٹیاں بھی بافراط میسر آرہی تھیں، اور فول کی ترکاری میں بلا مبالغہ یہ عرض کر رہا ہوں کہ ایک انچ سے کم گھی اس پر تیرتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تھا۔

پانی بھی ہر جگہ ملتا جاتا تھا۔ مگر گوارائی کی کیفیت دور تک عرب کے پانی میں محسوس نہ ہوئی شربہ کے نام سے صراحیاں پیش ہوتی تھیں۔ دام ادا کر کے لوگ پیتے تھے وضو کرتے تھے۔ کہیں کہیں۔

"حب حب"

کے شور سے منزل گونج اٹھتی، یہ تربوز کا جدید عربی نام تھا۔

مراد لادور (ڈرائیور) یا سواگ (سواق) ایک مصری مسلمان تھا۔ عربی مکالمہ کی وجہ سے مجھے یا استاد کہتا، اور مسافروں سے کچھ کہنا سنا ہوتا، تو میری طرف رجوع کرتا۔

---

[1] سیم کے بیجوں کے مانند ایک قسم کو فول کہتے ہیں عرب میں غالباً مصر سے درآمد ہوتے ہیں، بکثرت ان بیجوں کو ترکاری کی شکل میں استعمال کرنے کا رواج وہاں ہے۔ ۱۲

باوجود بے ہوشی کے اپنے ہوش کا ایک قصہ بھی سنادوں، لاری ایک ہی تھی ۱۱،۱۲ آدمیوں کے سوا بھی کچھ دوسرے لوگ اس میں گھسائے گئے تھے، چند آدمی یمن[1] کے تھے اور ایک صاحب پنجاب کے جگہ میں قدرۃً غیر معمولی تنگی پیدا ہوئی، فقیر نے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنی اپنی نشست پر بیٹھ جایئے۔ میری پروانہ کیجئے۔ میں اپنی جگہ نکال لوں گا۔ اطراف کی نشست گاہوں پر سب بیٹھ گئے۔ بیچ میں جو خلا باقی تھا۔ اسمیں بستر وغیرہ ٹھونس دیئے گئے، دیوانے نے عرض کیا کہ بس اسی خلا میں اپنے لیے ملا پیدا کرتا ہوں۔ چند بستروں کی وجہ سے کافی گداز گدے کی کیفیت اس میں پیدا ہوگئی تھی، بندہ اسی پر بیٹھ گیا۔ جس کے لیے لاری میں کوئی مستقل جگہ نہ تھی۔ اب ایک ایسی جگہ پر قابض تھا کہ گویا بڑے موٹے گدے پر بیٹھا ہوا ہے، جی چاہتا تو اسی پر لیٹ بھی جاتا بعضوں نے چاہا کہ مستقل جگہ جس پر وہ، قابض ہو چکے تھے اس سے اس غیر مستقل جگہ کو بدلیں۔ لیکن "سبقک بھا عکاشہ" اور "منیٰ مناخ من سبق"۔ کے اصول پر انکار کر دیا گیا۔

راستہ میں ایک دو جگہ۔ خفیف سی ناگواریوں کے واقعات بھی شائد پیش آئے۔ جو یاد نہیں رہے۔ اور نہ ان کو یاد رکھنا چاہیئے۔ شائد بیرحسانی جو غالباً میدان بدر ہی کے قریب کوئی منزل ہے، دہاں تک تو سنگستان کو کبھی کبھی ریگستان سے گذرتے رہے۔

مگر یہاں سے گذرنے کے بعد اب نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر بعد اچانک گردو نواح میں تدریجی طور پر تبدیلی محسوس ہوئی پہلے ایسے میدانی علاقے مل رہے تھے جن کی چاروں طرف خشک چٹیل پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں مگر عجب پہاڑیاں ہیں۔ عقیدت کی آنکھوں کے سوا بھی ان سے معلوم ہوتا تھا کہ نور ابل رہا ہے پہاڑوں کے درمیان رہنے کا عادی زمانہ سے ہوں، خصوصاً دکن میں قیام کے بعد تو ہم بھی ایک قسم کے پہاڑی آدمی بن کر رہ گئے تھے۔ راجپوتانے میں بھی آٹھ دس سال پہاڑوں ہی میں گذرے تھے لیکن وادیٔ غیر ذی زرع کی ان چٹیل پہاڑیوں کا رنگ ہی نرالا تھا، پھر اسی کے ساتھ حدیثوں کے وہ سارے مقامات اور ان کے ارتسامات دماغ میں ابھرتے چلے جاتے تھے جن کا عرب کے اسی کوہستانی علاقہ سے عموماً تعلق ہے محسوس ہوتا کہ شائد اسی پہاڑی پر گورخر کی وہ ٹولیاں حضرت ابو قتادہ انصاری کو نظر آئی ہوں گی، جن کا پیچھا کر کے نیزے سے ایک گورخر کو شکار کیا۔ اور رسول اللہ،

---

[1] یمن کے ان مسلمانوں کی شکل و صورت بہت کچھ ان ہندی مسلمانوں سے ملتی جلتی تھی؛ جو اس علاقہ میں پارچہ سازی کا کام کرنے میں خیال گذرا کہ عربی نژاد ہونے کا دعویٰ ہندی پارچہ بافوں کی طرف سے جو کیا جاتا ہے غالباً بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے

صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک ران چھپالی تھی، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات تحت الشعور سے نکل نکل کر شعور کی سطح پر مسلسل تیرتے ابھرتے اور ڈوبتے۔

ہاں! تو اچانک رت بدل گئی، بجائے دور کے پہاڑ کچھ زیادہ قریب نظر آنے لگے، اور چٹیل میدانوں کی جگہ اب ایسی وادیاں سامنے آرہی تھیں جن میں بڑے بڑے تناور درختوں کا تو پھر بھی پتہ نہ تھا۔ لیکن باریک باریک پتیوں والے میلانی قسم کے چھوٹے چھوٹے درخت اور ادھر ادھر گھانس بھی نظر آنے لگی، جن میں بھیڑوں، اور مینڈھوں، بکریوں کے گلے چرتے دکھائی دیتے تھے۔ چرانے والی عموماً ان کی عورتیں تھیں، جن کا لباس سیاہ تھا، اور سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ہر ایک کا جسم مکمل طور پر ڈھکا ہوا تھا۔ بعض مقامات پر بعض عمر اور ادھیڑ عمر کی عورتیں انڈوں کے ساتھ بھی لاری کے سامنے بیچنے کے لیے کھڑی ہو جاتیں، ان کا لباس بھی کالا تھا، عرب کی غربت وافلاس کے عام چرچوں کے مقابلہ میں صحرائی اور بیابانی باشندوں کی غذائی اور لباسی ذہنیت کے متعلق میرے یہ مشاہدے باعث حیرت بنے ہوئے تھے، اگرچہ بعض آبادیوں اور منزلوں میں جہاں لاری کسی وجہ سے ٹھہر جاتی یہ تماشا بھی دیکھنا پڑتا، کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں لاری کو گھیر کر "یا الحاج بخشیش ہات مانی الکیس" (یعنی حاجی بخشش عطا کرو، تمہاری جیب میں جو کچھ ہے اسے حوالہ کرو) ایک خاص نغمہ کے ساتھ گانے اور لاری کا پیچھا بھی کرتے لیکن بجائے غربت کے زیادہ تر بچوں کے اس عام طریقہ کار میں مجھے عادت کی تاثیری کیفیت محسوس ہوتی تھی۔

لاری اسی حال میں بڑھی چلی جارہی تھی، پہاڑیاں قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی تھیں، اب قرب کا نتیجہ تھا یا واقعہ بھی یہی تھا کہ بلندیاں بھی ان پہاڑیوں کی ترقی پذیر تھیں، تا اینکہ اونچے اونچے بلند پہاڑوں کے دروں میں لاری داخل ہوئی، کہیں کہیں چٹانوں پر تیتر جیسے جانور بھی نظر آئے۔ خیال گذرا کہ "قطا" شاید یہی ہے جس کا ذکر کتابوں میں کیا گیا ہے، کہیں کہیں جنگلی کبوتر کے جوڑے بھی دکھائی دئے۔

بیس سال سے زیادہ مدت سفر پر گذر چکی ہے اور مولانا عبدالماجد کی "سفرنامہ حجاز" نامی کتاب بھی سامنے نہیں ہے اس لیے مقامات کے نام اور ان کی ترتیب مکانی بھی صحیح طور پر یاد نہیں ہے۔ اتنا خیال آتا ہے کہ مسیجد نامی منزل جہاں سعودی شرطہ کا مستقر (پولیس اسٹیشن) بھی تھا اس منزل تک پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو ہم لوگوں نے سبزہ زاروں کے درمیاں پایا۔ پہاڑ بھی کلیتہً چٹیل اور نباتاتی زیوروں سے خالی نہ تھے، مگر پانی کی کیفیت میں غالباً مسیجد تک کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہ ہوئی کہ اچانک، وہاں پہلی دفعہ ایسا پانی پینے کے لیے ملا کہ آج تک اس کی لذت اور خنکی کا خیال مسرت بخش ہے وہاں کچھ کھجور بھی ملے، جو کافی لذیذ تھے۔ حالانکہ بدقسمتی سے تازہ کھجوروں کا یہ موسم

نہ تھا، اس موسم کی آرزو ہی دل میں رہ گئی۔

مگر یہ سب کچھ باہر ہو رہا تھا، اندر کس حال میں تھا، الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ رابغ جس کا قدیم نام جحفہ تھا اس منزل کی وہ بات دماغ سے نہیں نکلتی، تھوڑی دیر کے لیے یہاں بھی لاری ٹھہرائی گئی تھی، لوگ اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ اس فقیر نے ان جھونپڑوں کے پیچھے اس وقت، ایک کابلی عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ کو اس حال میں پایا کہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر وجد کے عالم میں کچھ اس قسم کے احساس کا اظہار فرما رہے ہیں کہ

کہاں میں اور کہاں رابغ کی منزل کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں،

وہ استغراق کے حال میں جھوم رہے تھے دل سے باتیں کر رہے تھے میری آہٹ پا کر سمٹ گئے، ان کا یہ حال تو دکھائی دیا ورنہ سچ پوچھیے تو قافلہ کے اکثر و بیش تر رفقاء کے باطن کا حال یہی تھا، دنیا کی تمام نعمتوں میں جن دو نعمتوں کو بعض دیدہ وروں نے سب سے بڑی نعمتیں قرار دیا ہے[لہ]، آج ان ہی دو نعمتوں میں سے ایک نعمت یعنی "وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست۔"

ان کے آغوش میں آ رہی تھی، جنھوں نے نہیں مانا ہے ان جھٹلانے والوں سے تو بحث ہی نہیں، مگر جو مان چکے ہیں وہ بہر حال یہی یقین رکھتے ہیں اور یہی یقین ان میں پیدا کیا گیا ہے کہ ذائقۃ الموت کی منزل سے گذرنے کے باوجود الموت کا اثر صرف اسی قدر ہے کہ اکل و شرب جیسی جسمانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر الرفیق الاعلیٰ کی زندگی بیغمبر گذار رہے ہیں، اور بیغمبر تو غیر بیغمبر ہی ہیں، الموت کا یہ مطلب کہ احساسات سے مرنے والے محروم ہو جاتے ہیں یہ ان لوگوں کا خیال ہے جن کو موت کے چکھنے کا تجربہ نہیں ہوا ہے، تجربے کے بغیر بے جانے اپنے اندر ایک ایسا فیصلہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد قطعاً کسی علم پر نہیں بلکہ جہل اور صرف جہل پر قائم ہے، قرآن میں شاید اسی قسم کے غلط غیر استحقاقی فیصلہ کرنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اپنے احساسات کو زندہ پاتے ہوئے وہ آرزو کریں گے کہ

[لہ] شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں سید صدر الدین بخاری کا قول نقل کیا ہے "دو نعمت در عالم بالفعل موجود ست کہ فوق جمیع نعمات و لیکن مردم قدر آں نعمت نمی شناسند و بداں پے نمی برند .... یکے آں کہ وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست۔" یہ پہلی نعمت ہوئی اور دوسری نعمت یہ ہے کہ قرآن مجید کہ کلام پروردگار ست وذے سبحانہ تعالیٰ بے واسطہ بداں متکلم۔" ص ۲۱۵ اخبار الاخیار

يٰلَيْتَنِي كُنْتُ تُرٰبًا ٥ کاش! میں (جیسا کہ سوچا کرتا تھا) خاک ہوتا (یعنی احساسات سے مرنے کے بعد محروم ہوجاتا)

(النبا ۶)

بہرحال جو پیغمبر نہیں ہیں جب موت ان کو بھی تراب یا خاک بنا کر نہیں چھوڑ دیتی تو نبوت و رسالت کے عالی مقامات سے جو سرفراز ہیں، ان کے متعلق جو یہ سوچتے ہیں کہ "خاک کے ڈھیر" کے سوا ان کی قبروں میں بھی کچھ نہیں ہوتا، ان کی سمجھ پر خاک پڑ گئی ہے اس کے سوا اور کیا کہا جائے؟ عام مسلمانوں کے قبور پر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کو سلام کریں، اور ان سے اس قسم کی باتیں کریں کہ "آپ ہم سے پہلے چلے گئے، ہم بھی آپ کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں، اللہ آپ کی کمزوریوں سے درگذر فرمائے، وغیرہ وغیرہ" تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ جس پیغمبر کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ "میری آیتوں کے ماننے والے تمہارے پاس جب آئیں، تو ان کو "سلام علیکم" کہو، اور آگاہ کردو کہ نادانی کی وجہ سے برائی کا ارتکاب جس نے کیا ہے لیکن پھر اس کے بعد پلٹ گیا، اور سنور گیا، تو حق تعالیٰ غفور رحیم ہیں"۔ قرآن کے اس نص قطعی کی یافت کے بعد کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم سلام کی اس دعا کو حاصل کرنے کے لیے وہاں حاضر نہ ہوں جہاں حاضر ہونے والوں کو السلام علیکم کہنے کے لیے پیغمبر اپنے خدا کی طرف سے مامور ہوا، کچھ بھی ہو، نہ ماننے والے جو چاہیں کہیں جو کچھ جی میں آئے۔ خیالات بکائیں، مگر ہم تو یہی جانتے ہیں کہ عہد نبوت ہی میں وفات سے پہلے قرآن میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ پیغمبر کی موت کو عام لوگوں کی موت پر قیاس نہ کرنا چاہیئے حکم دے دیا گیا تھا کہ ان کے ازواج سے وفات کے بعد نکاح کا ارادہ کوئی نہ کرے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ پیغمبر کے متروکہ میں وراثت جاری نہ ہوگی اور وفات کے بعد بھی دیکھا جاتا تھا کہ مسجد نبوی کے پڑوس والے دیوار میں کھونٹی

---

[1] سورۃ النبا کے آخر میں فرمایا ہے کہ "انا انذرناکم عذابا قریبا یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ" (ہم تمہیں نزدیک والے عذاب سے ڈرا رہے ہیں جس دن دیکھے گا آدمی ان چیزوں کو جنہیں اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے روانہ کیا تھا) الغرض بجائے عذاب بعید کے عذاب قریب کی جو دھمکی دی گئی ہے اور اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اپنے کیے ہوئے اعمال کا مشاہدہ کرایا جائے گا، میرے خیال میں یہ عذاب قریب عذاب قبر ہے، الکافر (نہ ماننے والا) اس وقت کہے گا کہ کاش میں خاک ہوتا (یعنی احساسات اگر ختم ہوجاتے تو جن نظاروں سے وہ دوچار ہو رہا ہے انہیں نہ دیکھتا) عذاب قبر کے متعلق یہ نص صریح ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اور اسی قسم کی قرآنی آیتوں کے باوجود بعض لوگوں نے یہ خیال کیسے قائم کر لیا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والا مٹی ہو جاتا ہے۔

والقصۃ بطولها ۱۲

ٹھوکتے تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہلا بھیجتیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوگی، مسجد نبوی میں زور سے گفتگو کرنے والوں کو ٹوکا جاتا، اور یہ کہتے ہوئے ڈانٹا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایسا کرتے ہو۔[1]

خیر میں مدرسہ کے کن جھگڑوں میں پھنس گیا جن میں پھنس جانے کے بعد بسا اوقات بدیہی سے بدیہی مسائل بھی نظری بن جاتے ہیں۔

قافلہ بیر درویش کے بعد قریب قریب اپنے اوسان کھو چکا تھا، فاصلہ ختم ہو رہا تھا، زندگی کی آرزوا سب سے بڑی آرزو ایمان والوں کی پوری ہو رہی تھی، یا قریب تھا کہ پوری ہو، اپنے آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کھوتا چلا جا رہا ہے، چانک اسی حال میں۔ "مدینۃ النبی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سواق (ڈرائیور) کی زبان سے نکلی، کلیجے نکلا پڑے، جانیں تاب کو معلوم ہو رہا تھا کہ چھوڑ دیں گی، بیس سال پہلے کان میں یہ آواز آئی تھی، لیکن اس کی گونج آج بھی تر و تازہ ہے۔

ہم میں ہر ایک دوسرے کو شاید بھول گیا۔ "مدینۃ النبی" (نبی کا شہر) اس کے سوا نہ اندر ہی میں کچھ باقی تھا اور نہ باہر میں، لاری تیزی کے ساتھ گذرتی جا رہی تھی یہ باہر میں ہو رہا تھا اور اندر میں جذبات کا طوفان تھا، جو ابل رہا تھا۔ اوروں کا حال معلوم نہیں لیکن اپنے اس احساس کو کیسے چھپاؤں، ایسا معلوم

---

[1] انہ حی فی قبرہ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضہ پاک میں زندہ ہیں) وانہ لا یبلی جسدہ (اور آپ کا جسد مبارک تغیر سے محفوظ ہے) یہ مسلمانوں کے سلسلہ عقائد ہیں جو قرآن و حدیث اور عمل صحابہ پر مبنی ہیں، تفصیل کے لیے بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ علاوہ روایتوں کے مسلسل مشاہدات سے بھی اس کی تصدیق ہمیشہ ہوتی رہی ہے سعید بن المسیب ہی کا واقعہ کہ ایام حرہ میں جب چند دنوں کے لیے مسجد نبوی میں کوئی نماز پڑھنے والا باقی نہ رہا تھا، صرف سعید مسجد کے کسی گوشے میں چھپ گئے تھے۔ دارمی وغیرہ جیسی معتبر کتابوں میں سعید کا یہ بیان منقول ہے کہ تین دن تک وہ پانچوں وقتوں کی نماز اسی ہمہمہ (گونج کی آواز) کے سہارے سے ادا کرتے رہے جو روضہ پاک سے آتی تھی اور دوسری کتابوں مثلاً ابو نعیم وغیرہ کی روایت ہے کہ روضہ پاک سے اذان کی آواز ان کے کانوں میں آتی تھی، ابن سعد نے بھی طبقات میں اذان والی روایت نقل کی ہے، اسی سلسلے میں نور الدین زنگی فاتح کا مشہور تاریخی واقعہ بھی ہے کہ بعض عیسائی خبیث النفس حکمراں نے اپنے دو آدمیوں کو مدینہ منورہ اس ناپاک غرض کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا کہ جسد مبارک کو کسی طرح نکال کر لے آئیں، یہ لوگ [illegible] سرنگ لگائے ہوئے وہ کام کر رہے تھے کہ اسی عرصہ میں دمشق میں نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کو رویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایما ہوا وہ مدینہ آئے اور مجرموں کو گرفتار کر کے [illegible] مختلف کتابوں میں یہ واقعہ [illegible] اور اس رسالہ میں [illegible] کیا گیا ہے ۱۲

ہوتا تھا کہ وہ بلال آرہے ہیں، یہ ابوذر جا رہے ہیں، یہ فاروق اعظم ہیں، ادھر حضرت صدیق ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم،
میں جانتا ہوں کہ یہ دماغی اختلال ہی کا نتیجہ ہوگا مگر مبارک تھا وہ دماغی اختلال جس میں مبتلا ہونے والے
کے کان میں گذرتی ہوئی لاری میں آواز آئی "السلام علیکم مولوی صاحب"! حضرت بلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے مہمانوں کے میزبان ایسا معلوم ہوا کہ کہتے ہوئے گذر گئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنون کی ایسی باتوں کا کہاں تک
تذکرہ کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ باب العنبریہ کب آیا، لاری سے لوگ کس وقت اترے، کیسے اترے، گھوڑے کی گاڑی،
عرابہ میں کب سوار ہوئے۔ ہوئے تو یہ سارے واقعات، ہم چل بھی رہے تھے پھر بھی رہے تھے۔ لیکن
جسم چلتا تھا ٹانگیں پھر رہی تھیں مگر ان کا چلانے والا حاسہ غائب تھا۔

شاید سیدنا حضرت مولانا حسین احمد المدنی مدظلہ العالی کے برادر محترم حضرت مولانا سید احمد رحمۃ اللہ
علیہ مہاجر مدینہ "باب عنبریہ" (جو مدینہ منورہ کا مرحوم حجاز ریلوے کا اسٹیشن تھا) وہاں تک تشریف لائے تھے، ان
کو اطلاع دے دی گئی تھی، اور ایک قدیم مدنی دوست لطفی صاحب مرحوم بھی اپنے خوبصورت شامی چہرے
کے ساتھ دیوانوں کو لینے کے لیے اس مقام تک آئے تھے۔

"ولے برندش" کی شکل میں النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "مدینہ" میں پہونچا دیئے گئے، لکھا پڑھا سب غائب
ہو چکا تھا، جس نے جو کچھ کہا، وہی کرتے جاتے تھے، غسل کا حکم دیا گیا۔ کپڑے بدلوائے گئے۔ اور اب ایک سیاہ کار
سیاہ بخت، سیاہ عمل، ظلمت تاریکی صرف سیاہی کو گھسیٹتے ہوئے اس دربار کی طرف لوگ لیے جا رہے تھے۔
جس دربار تک رسائی کا خیال بھی اس سراسر اثم و گندگی کے لیے ناقابل برداشت تھا آج وہی گھسیٹا جا
رہا تھا، اور لایا جا رہا تھا، بیعت کے بعد عہد کا توڑنے والا مجرم اپنے آقا کے آستانے کی طرف ڈھکیلا جا
رہا تھا، بس اتنا ہوش تھا کہ ہوش باقی نہیں رہا ہے معلم یا مزدد کے نام سے کوئی صاحب تھے۔ ہاتھ پکڑے ہوئے
تھے۔ وہ کچھ کہتے جاتے تھے آنسوؤں کی موسلا دھار بارش سے بند آنکھوں نے اس کا موقع باقی نہ رکھا تھا کہ
کہاں ہوں آگے کیا ہے کی خبر ہو۔ کان میں معلم کے فقرے اور وہ بھی نہیں معلوم پورے آتے بھی تھے یا نہیں مگر
زبان ان ہی فقروں کو دہرا رہی تھی، معلم کہتے تھے کہ "سلام پڑھو" کن کو سلام کروں، آنکھوں میں اتنی قوت بھی
باقی رہی ہے جو کسی طرف اٹھے، چیخ تھی پکار تھا، گریہ تھا، بکا تھا۔ بے ہوشی تھی، بدحواسی تھی، کیا عہد کیا تھا
عہد کرنے والے نے مگر کیا کیا۔

چہ گونہ سر زخجالت برادرم. بر دوست　　　　که خدمتت بسزا بر نیامد از دستم

حجاب، شرم، ندامت، ''اے اللہ کے رسول اے عالمین کی رحمت، ڈھانک لے اس کی سیاہیوں کو جس میں سیاہی اور تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہوں سیاہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں　　　　کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

نماز کا وقت بھی شاید قریب تھا۔ سب جہاں کھڑے ہوئے وہیں ہوش باختہ بھی کھڑا تھا۔ یہ کیا ہوا میں کہاں لایا گیا، کلیجہ پھٹ جائے گا، روح نکل جائے گی، ہم کس حال میں آئے۔ کیا ساتھ لائے۔ صرف پاپ، صرف گندگی، صرف آلودگی! ——— سب باہر ہوئے۔ ان کے ساتھ باہر ہوئے۔ آتے تھے جاتے تھے۔ لیکن چوبیس گھنٹوں تک کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں آرہے ہیں۔ کہاں جارہے ہیں۔ نمازیں بھی ہوتی تھیں، کھانا بھی کھایا جاتا تھا۔ شاید ملنے والوں سے کچھ باتیں بھی ہوتی تھیں، لیکن چوبیس گھنٹوں تک ''کرنے والے کو خود اپنے ان کاموں کا صحیح احساس نہ تھا۔ سب کرتے تھے وہ بھی کرتا تھا۔

مگر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، سکینت کا نزول قلب پر شروع ہوا، خود تو کیا پیدا ہوتی، مگر ہمت پیدا کرائی گئی، اور اب آنکھ کھلی، ہم کھجور کے تنوں پر کھڑی ہوئی اس مسجد کو ڈھونڈھ رہے تھے، جس کی چھوٹی کھجور کے تنوں اور شاخوں سے کی گئی تھی، جہاں کے رسول غریبوں کے ملجا، یتیموں کے ماویٰ کا دولت خانہ وہ کہاں ہو جس کے چھپر سے کھڑے ہونے والا سر چھوا جاتا تھا، جس کی دیوار کھجور کی چھڑیوں پر مٹی پیٹ کر بنائی گئی تھی، ابو ایوب انصاری کا وہ مکان کہاں ہے جو ہجرت کے بعد پہلی فرودگاہ اس آبادی میں تھی۔ ڈھونڈھتا تھا اس کی گلیوں میں حسن کو حسین کو عباس کو سید الشہداء حمزہ کو، امہات المومنین صدیقہ عائشہ حفصہ میمونہ صفیہ اپنی ماؤں کے محل سراؤں کو، اور ام حرام بنت ملحان کو ابو ہریرہ اور ابن عمر، ابن مسعود کو ابو سعید خدری کو انس بن مالک کو، اور کیا کیا بتاؤں کہ کن کن کو رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے گھروں کو: مگر نہ وہ مسجد ہی تھی اور نہ وہ مکانات، نہ ان کے رہنے والے۔ معلوم ہوا کہ انصاری صحابیوں کا کوئی خاندان اب مدینہ میں نہیں پایا جاتا، نہ انصاریوں ہی کا کوئی خاندان تھا اور نہ مہاجرین کا۔

زمانہ تیرہ سو سال آگے نکل چکا تھا: عبد المجید خلیفہ ترک کی بنائی ہوئی ایک شاندار مسجد کا نام اب مسجد نبوی ہے۔ دیکھا کہ قدم قدم پر طلائی حروف میں بہترین کتبے مسجد کی دیوار پر ثبت ہیں۔ سنا کہ اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ شریف حجاز کی بغاوت کے زمانہ میں جواہرات کا جو ذخیرہ تھا اسے ترک ساتھ لیگئے

وہی چیزیں رہ گئی ہیں ۔ جنھیں نہیں لے جا سکتے تھے ۔ جن میں ان ہی کے عہد کا قائم کیا ہوا ایک فرسودہ ڈائنامو (برقی چرخ) بھی تھا، جس سے تھوڑی بہت روشنی مسجد نبوی کے لیے مہیا ہوتی تھی کسی صاحب دل نے یہ بھی کہا کہ ترکوں کی ان اولوالعزمیوں نے جو مدینہ قدیم کو مدینہ جدید بنانے کے لیے کر رہے تھے ان غریبوں کو یہاں سے نکلوا دیا۔ انھوں نے مسجد نبوی کے اطراف کے مکانوں کو لے کر ارادہ کیا تھا کہ ایک اپ ٹو ڈیٹ گارڈن (عصری باغ) اس کے ارد گرد بنا دیا جائے ۔ حجاز ریلوے کے کھل جانے کے بعد شام سے مدینہ ایسی چیزیں وسا در ہونے لگیں، جو یہاں سے نکلنے کے تیرہ سو سال بعد یہاں واپس ہوئی تھیں،

جدید نوعیت کا ایک رسٹوران دار المسرت نامی جس میں وہ سب کچھ ملنے لگا تھا، جو شام کے انگوروں سے تیار ہوتا تھا، باب العنبریہ کے قریب حجاز ریلوے اسٹیشن کے سامنے "مدینہ یونی ورسٹی" کی داغ بیل بھی پڑ چکی تھی، دیواریں یونی ورسٹی کی عمارت کی کچھ اوپر بھی آ چکی تھیں ۔ کہ مدینہ منورہ کے تین رجفوں (زلزال) میں سے ایک رجفہ آیا ۔ جنگ عظیم جرمنی کے ملک سے شروع ہوئی ۔ اور اثر اس کا حجاز کے اس شہر پر پڑا۔ جسے ترک ایک یورپین شہر کا قالب عطا کرنا چاہتے تھے ۔ ایک لاکھ بیس ہزار کی آبادی اس رجفہ کے بعد اس زمانہ میں پندرہ بیس ہزار تک گر کر پہونچ چکی تھی، اور یہ قصہ تو بعد کا ہے ورنہ حرم فروش شیخ حرم کے زمانہ میں تو گنتی کے چند نفوس کے سوا مدینہ منورہ میں کوئی باقی نہ رہا تھا ۔ بڑا ہی زہرہ گداز عبرت آموز منظر تھا کہ یونیورسٹی بننے والی عمارت مدینہ والوں کا "حش"[1] بنا ہوا تھا ۔ اور چھ سو میل لمبی لائن پر چلنے والی ریل گاڑی کے ڈبے اسی باب العنبریہ کے آس پاس مرے ہوئے کھلیوں کی لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے ۔ الحمد للہ کہ "سکینت" کے یہ ایام ایک مہینہ سے زیادہ میسر آگئے سے۔

کام دل حاصل و ایام بکام است امروز چشم بر روئے نگار و لب بجام است امروز

اوروں کا حال معلوم نہیں مگر جو دیوانہ تھا وہ اسی نئے مدینہ میں پرانے مدینہ کو تلاش کرتا رہتا تھا یہ نئے مدینہ کے آباد کاروں سے بھی ملتا جلتا تھا وہ بڑے اچھے لوگ تھے ۔ عموماً دعوتیں کرتے تھے، مگر اپنا دل اسی نئی آبادی میں پرانے مدینہ کے پرانے باشندوں کو ڈھونڈھتا تھا ۔ اتفاقاً مدینہ کے ایک مورخ بھی مہرباں ہو گئے، حکمت عارف بے کے کتب خانے کے مہتمم صاحب، جدید مدینہ سے زیادہ ان کی دلچسپیوں کا محور بھی قدیم مدینہ ہی تھا، ان کے طفیل

---

[1] عوام کے قضا حاجت کی جگہ ۱۲

میں سقیفہ بنی ساعدہ، بیر بضاعہ، العوالی، بنی نضیر و بنی قریظہ کی گڑھیوں کے آثار اور اسی قسم کے بیسیوں مقامات کا پتہ چلا۔

حضرت مولانا سید احمد مہاجر رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسۃ الشرعیہ اور حضرت کا دولت خانہ سب سے بڑا ماویٰ اور ملجا تھا۔ ہر ضرورت وہیں سے پوری ہوتی تھی، حضرت والا نے مدینہ منورہ کے غالباً شرقی سمت میں ایک میدانی زمین کو قابل کاشت بنا کر زراعت کا طریقہ مدتوں کے بعد اس شہر میں مروج کیا تھا۔ مدینہ والے حرث سے قطعاً نا آشنا ہو چکے تھے۔ ان کا سرمایہ معیشت قیصر کے شہر کی وہ دکانیں تھیں جو النبی کے شہر پر کئی سو سال پہلے وقف ہو چکی تھیں[1] یا ارض فرعون مصر کا پانچواں حصہ جو حرمین پر وقف تھا۔ شائد بیل اور ہل پر ان کی نظر کبھی نہیں پڑی تھی، کھجور کے باغوں کے لیے کدالوں اور پھاوڑوں کی کھدائی کافی تھی مگر مولانا نے بیل بھی نجد سے منگوائے، ایشیا کوچک کے ایک ترک کو ملازم رکھا، جو زراعت کا ماہر تھا، ایک قدیم کنواں جو اس علاقہ میں تھا اس کو صاف کرایا گیا۔ اونٹوں سے چرس کشی کا کام لیا جاتا تھا۔ اپنا پشتینی پیشہ زراعت ہی تھا اور اب بھی ہے، اس مناسبت سے عصر کے بعد عموماً حضرت والا کی اس جدید کاشت کی طرف چلا جاتا اور مدینہ کے ان میدانوں میں ان ہی چیزوں کو ڈھونڈھتا پھرتا جس کے ڈھونڈھنے کے سوا مومن کا کوئی دوسرا لذیذ شغل نہیں ہو سکتا، اسی عرصے میں قبا کی مسجد کی حاضری کی سعادت بھی کبھی تنہا کبھی رفقا کے ساتھ میسر آئی، تنہائی کی سیر کا وہ لطف، اس لطف کے مزوں سے اب بھی دل لذت گیر رہتا ہے راستہ کھجوروں کے ہرے بھرے باغوں سے آراستہ تھا۔ باغوں میں کھجوروں کے سوا انار، انگور کے درخت اور بیلیں بھی نظر آئیں۔ طرح طرح کے پرندے درختوں پر چہچہاتے، کبھی کبھی پانی کے گڑھے کے کنارے بگلے بھی اڑتے ہوئے دکھائی دیے، کہیں فاختہ پر بھی نظر پڑتی، بیر اریس پر چرس چلتا رہتا، شفاف پانی نالیوں میں بہتا رہتا، اریس کے من پر بیٹھ کر پاؤں لٹکاتا۔ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتا، ان ہی دنوں کو جو اس دنیا میں واپس نہ آئیں گے۔

ایک ہفتہ کے بعد ہی دل کی کیفیت یہ ہو گئی، کہ مدینہ کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔ ہندوستان، ہندوستان کے اعزا و اقربا، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، ہر چیز دماغ سے نکل گئی، یہ قطعی فیصلہ دل کا ہوا، زبان کا ہوا، ذائقہ کا ہوا، کہ جو پانی یہاں پینے کے لیے مل رہا ہے، نہ پہلے کبھی کسی ملک میں ملا تھا اور نہ آئندہ ملے گا، نہ اتنا نفیس سواد ماحول [illegible]

---

[1] تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان محمد فاتح جس نے کل ۲۳ سال کی عمر میں قسطنطنیہ قیصر کے شہر کو فتح کیا تھا، فتح کے ساتھ ہی شہر میں جس وقت داخل ہوا تو پہلا فقرہ اس کی زبان پر یہی جاری ہوا کہ قیصر کے شہر کو نبی کے شہر پر میں نے وقف کر دیا۔ ۱۲

یہ زیبائیاں کہیں اور میسر آئیں گی، نیند جیسی وہاں آتی ہے کہیں نہیں آتی" سرور ونشاط سے دل جیسا لبریز ہوا۔ کبھی نہیں ہوا۔ دوسروں سے پوچھا تھا تو وہ بھی یہی کہتے تھے۔ جنت میں داخل ہو جانے کے بعد اس سے باہر ہونے کی حماقت میں کون مبتلا ہوگا دل اس سوال کو اٹھاتا۔ اور اس ارادہ میں پختگی ہوتی چلی گئی، کہ جب رفقاء جانے لگیں گے، تو رفاقت سے وقت پر انکار کردوں گا، پہلے پندرہ روز تک، اس خیال کا تسلط رہا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ بہت سی ناگفتنی کو گفتنی بنانے کے ارادے کے باوجود اس کو ناگفتہ ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔

بہ مستوراں مگو اسرار مستی　　　حدیث جان مپرس از نقش دیوار

ہاں! اس عرصے میں "سعودی عرب" کے بادشاہ، جو اس وقت اس ملک کے لیے نئے بادشاہ تھے، "بارادہ حج" ریاض سے مدینہ منورہ بھی پہونچے، مولٰنا عبدالماجد جو باوجود سب کچھ ہونے کے کم از کم اس وقت تک اپنے ساتھ اخبار کے اڈیٹر ہونے کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا خیال ہوا کہ عرب کے اس جدید حکمراں سے ملاقات کرنی چاہیئے، امیر مدینہ سے مل کر بات طے ہوئی، ترجمانی کے لیے اپنے ساتھ اس فقیر کو بھی ہمرکابی کا حکم مولٰنا کی طرف سے دیا گیا، حکم کی تعمیل کی گئی،

کرسیوں اور صوفوں کی طویل قطار تھی، جس پر نجدی عقال باندھے حکومت کے حکام بیٹھے تھے، ان میں بادشاہ کون ہے اس کی تمیز سخت دشوار تھی، وہی سرخ دھاگوں والا رومال اور سیاہ بالوں والی عقال سب کے سروں پر تھا، مولٰنا عبدالماجد صاحب حسب وعدہ پہلے امیر مدینہ سے ملے اور خواہش ظاہر کی کہ بادشاہ سے وہی تعارف کرادیں۔ مگر معلوم ہوا کہ امیر صاحب پر بے بسی طاری ہے، گھبرائے گھبرائے سے ہیں، تب فقیر نے ذرا جسارت سے کام لیا، قطار پر نظر کی ایک معمر آدمی تصویروں سے جن کی صورت کچھ پہچانی سی تھی، اور اس کے صوفے پر دائیں بائیں دو تکئے پڑے ہوئے تھے، یہی شاید سب سے بڑی امتیازی علامت بادشاہ کی تھی، الغرض اسی کی طرف بڑھ کر فقیر نے سلام عرض کیا، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، بادشاہ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کیا۔ پوچھا کہ تم کہاں کے ہو۔ بتایا گیا۔ اور ساتھ ہی مولانا عبدالماجد کا ان الفاظ کے ساتھ تعارف کرادیا گیا کہ یہ ایک اخبار کے مدیر ہیں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ ضرور میں ان سے باتیں کروں گا، مگر اس کے لیے اس مجلس کا موقعہ مناسب نہ ہوگا۔ آپ لوگ کل دارالامارہ میں ۸ بجے صبح کو ملیے، بس اسی پر گفتگو ختم ہوگئی، کل کا وعدہ لے کر واپس ہوئے، دن تو خیر گذر گیا۔ مگر جوں ہی خوابگاہ میں لیٹا، خیالات کا ہجوم شروع ہوا، پوچھنے والا تو نظر نہیں آتا تھا، لیکن پوچھا جا رہا تھا کہ تم کیا یہاں سلاطین اور حکام سے ملنے آئے تھے۔

کیا بادشاہوں کی دنیا بس گئی ہے، جہاں تم رہتے ہو، وہاں کے بادشاہ سے تو تم کبھی ملے نہیں[1] لیکن یہاں آگر تم نے یہ کیا حرکت کی، پھر اب کیا کروں، وعدہ ہو چکا ہے، مولانا عبد الماجد چھوڑینگے نہیں رات آنکھوں آنکھ میں کٹ گئی کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا، صبح ہوئی نماز کے بعد مولانا کی قیام گاہ پر حاضر ہوا دیکھا کہ بخار میں مبتلا ہیں، آج کا بخار میرے لیے موجب شکر بن گیا، اسی وقت ایک مختصر سا رقعہ امیر صاحب مدینہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجدیا گیا کہ اخبار کے جن مدیر صاحب کے لیے وقت ملاقات کا جلالۃ الملک نے مقرر فرمایا تھا، اتفاقاً ان کو بخار آگیا ہے اس لیے حاضری سے معذور ہیں جواب آیا کہ اچھا اس وقت تو مکہ معظمہ جارہے ہیں۔ حج کے بعد وہیں ملاقات ہوگی، قصہ ختم ہوگیا اور بحمد اللہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا

تیس دن سے اس زائد مدت میں بیسیوں واقعات پیش آئے جن کا ذکر موجب تطویل اور غیر ضروری بھی ہے، زیادہ اثر جدید مدینہ کے جدید باشندوں کی مہمان نوازیوں کا تھا، عموماً مسلم دنبوں کے پیٹ میں پلاؤ پکایا جاتا تھا، جس میں علاوہ دوسری چیزوں کے بھنے ہوئے بادام اور تخم خیار بھی ہوتے تھے اس کھانے کا نام مشارُ کوزی تھا، بعض شامی کھانے بہت لذیذ تھے، گوشت تو سچ پوچھیے تو صرف دنبوں ہی کا ہوتا ہے، بافراط مختلف شکلوں میں پیش ہوتا تھا، دودھ کی بھی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی، تقریباً ہر اچھے گھرانے میں بکریاں پلی ہوئی تھیں، دیکھنے میں دبلی پتلی، لیکن سیر ڈیڑھ سیر سے معلوم ہوا کہ کم دودھ نہیں دیتی ہیں، برسیم ایک قسم کا ہرا چارہ ہے، جس کی کاشت کھجور کے باغوں میں بکثرت مروج ہے، علی الصباح نخلوی[2] لوگ گدھوں پر اسی برسیم کو کاٹ کاٹ کر شہر میں لاتے اور بطور راتب کے گھروں میں ایک دو دو جھٹے اس کے ڈالتے جاتے، باقی عموماً حبشن عورتوں کو دیکھا کہ قیام گاہوں پر ہو جاتی ہیں۔ کپڑوں کے دھونے کا نظم اس شہر میں دلچسپ تھا، بیویوں پر کھانے پکانے کا بار کم ڈالا جاتا، روٹیاں بازار میں پکوائی جاتی ہیں، صرف سالن لوہے کے چولھوں پر پکانیا جاتا ہے مکان کے کسی گوشہ میں کھد کھد

---

[1] یعنی حضور نظام سے ملازمت کی بیس سالہ مدت میں خصوصی ملاقات کا موقعہ کبھی نہیں پیدا کیا گیا، البتہ سالگرہ وغیرہ بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیش کشی نذر کے لیے حاضری ہو جاتی تھی۔ ۱۲

[2] کھجوروں کی کاشت اور ان کے باغوں کے نگرانی کرنے والوں کو نخلاوی کہتے ہیں، امامیہ فرقہ کے لوگوں کو مدینہ کی شہری آبادی میں جگہ نہیں ملتی تھی نخلوں میں ٹھہرنے لگے ان ہی کے اثر سے عموماً یہ شیعہ ہو گئے ہیں اپنے آپ کو جعفری کہتے ہیں۔ ۱۲

ہوتا رہتا ہے، اسی لیے مدینہ کے مکانات بڑے صاف وپاک ستھرے معلوم ہوتے ہیں عورتوں کا وقت بہت بچتا ہے، اسی میں اپنے شوہروں اور بچوں کے کپڑے وہ دھولیتی ہیں اور خوب اچھا دھوتی ہیں، ہر گھر میں معلوم ہوا کہ استری کا سامان بھی لزومی طور پر رہتا ہے یہ بیوی پر الزام ہوتا ہے اگر شوہر کے کپڑے ناصاف یا داغ دھبے والے ہوں، فرض ہے کہ باہر نکلنے سے پہلے اپنے خاوند کے لباس جوتے وغیرہ کو بیوی دیکھ لے، پالش کی ضرورت ہو۔ تو پالش کر دے گھوہ یا شاہی اچائے، کا دور تو ہر وقت چلتا رہتا ہے، لیکن اصلی کھانا اس زمانے میں دیکھا کہ عموماً عصر و مغرب کے بعد لوگ کھاتے ہیں۔ درمیان میں ہلکے پھلکے ناشتوں سے کام نکال لیا جاتا ہے۔

دعوت کرنے والے بزرگوں کے متعلق عموماً دیکھا کہ باہر سے آنے والے زائرین دعوت کے بعد ان کے ساتھ مخفی طور پر کچھ حسن سلوک بھی کرتے ہیں۔ اچھی بات معلوم ہوئی، مگر ایک دفعہ سخت ذلت بھی اٹھانی پڑی، مسجد نبوی کے باب مجیدی پر ایک مکتب خانہ تھا، ایک صاحب معلم الصبیانی کا کام انجام دیتے تھے۔ ان سے تعلق پیدا ہوا، دعوت پر مصر ہوئے، قبول کی گئی، فارغ ہونے کے بعد مصافحہ کے وقت حسب دستور کچھ پیش کیا گیا۔ اللہ اللہ اس وقت ہمارے ان مدنی بزرگ کے چہرے کی سرخی غصہ کی سرخی، فرمارہے تھے تم نے کیا مدینہ کے ہر باشندے کو گداگر سمجھ رکھا ہے، کیا دعوت اسی لیے کی جاتی ہے، شرم سے گردن جھک گئی، زمین میں گڑ گیا، معذرت خواہ ہوا جرم معاف کیا گیا، بڑی مہربانی فرماتے رہے، چلتے ہوئے آبار سبعہ[1] کا پانی ایک ٹن میں اپنے مصارف سے منگوا کر حوالہ کیا یہی پانی پہلی سوغات تھی، جو مدینہ منورہ سے اپنے ساتھ رکھی گئی کہ اپنے گاؤں کے اس کنویں میں ملا دیا جائے گا جس کا پانی عمر بھر پینا ہو۔ اسی کے ساتھ کھانے کا خیال بھی آیا، یعنی کھانے میں بھی مسلسل ایسی چیز ملتی رہے جس میں مدینہ

---

[1] یعنی مدینہ کے وہ سات کنویں جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ لعاب دہن عالمین کے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پانی میں شریک ہے، مسجد نبوی کے ان معلم صاحب کا نام محمد بن سالمین تھا، مکتب خانے میں بچوں کی سزا کا اصول دلچسپ تھا، قصوروار بچے کی طرف استاد کسی اصطلاحی اشارے سے نظر کرتا، سارے بچے مجرم کو پٹک دیتے اور دونوں ٹانگیں اس کی اوپر کر دی جاتیں تلوے پر استاد ایک دو چھڑی لگا دیتا یہ بات پسند آئی۔ تلوے کی کھال موٹی ہوتی ہے تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے۔ ۱۲

منورہ کا کوئی جز شریک ہو۔ خیال گذرا کہ ترکاریوں اور بعض غلوں کے بیج حاصل کر لیے جائیں، باآسانی مل گئے، ہندوستان تک پہونچے، ارادہ بھی تھا کہ ان ہی بیجوں سے کاشت کر کے ترکاریاں اگائی جائیں گی، لیکن جن لوگوں کے سپرد کیا گیا، انھوں نے زیادہ توجہ سے کام نہ لیا۔ تاہم کدو اور شلجم کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

ذیقعدہ کا مہینہ اب قریب ختم ہونے کو آیا، حج کا مہینہ ذوالحجہ نزدیک آنے لگا، حج کی تیاریوں میں لوگ مصروف ہوئے۔ اسی عرصے میں ایک دن دخترِ العرفات (مدظلہا) مولانا عبدالماجد کی اہلیہ محترمہ نے خاص آدمی بھیج کر اپنی قیام گاہ پر بلوایا۔ حاضر ہوا، انھوں نے اپنا ایک خواب سنایا۔ عجیب خواب ہے وہ اودھ کی رہنے والی ہیں، فقیر کی مرحومہ والدہ غفراللہ لہا جو کئی سال پہلے وفات پا چکی تھیں بہار کے ایک دیہات کی رہنے والی تھیں، انھوں نے ساری زندگی ریل گاڑی بھی دیکھی تھی، ان کا سفر اپنے میکہ (موضع استھانواں) سے گیلانی تک محدود تھا، مگر ماجد میاں کے گھر نے سنایا، میں نے رات خواب میں دیکھا کہ گھر میں میرے کوئی تقریب ہے، میں کھانا لوگوں میں تقسیم کر رہی ہوں، اتنے میں دیکھتی ہوں کہ ایک بوڑھی صاحبہ جنکی شکل و صورت ایسی تھی وہ فرما رہی ہیں کہ اس کھانے میں کیا ہمارا حصہ نہیں ہے؟ ماجد میاں کے گھر نے کہا کہ آپ ہیں کون؟ بولیں کہ تمہارے ساتھ مناظر احسن جو آیا ہے میں اس کی ماں ہوں، اپنے بچے کے ساتھ یہاں چلی آئی ہوں"

یہ عجیب خواب تھا۔ آنکھیں اشک آلود ہو گئیں، ماں کی وہ گود یاد آگئی جس میں اتارا گیا تھا کھلا کھلا یا گیا تھا، مولانا ماجد کے گھر نے شکل و صورت حلیہ جو بیان کیا تھا، وہ مرحومہ والدہ پر منطبق بھی تھا، یہی تعبیر سمجھ میں آئی کہ اپنی طرف سے حج کرانے کی آرزو انھوں نے ظاہر کی ہے وہ بڑی نیک خاتون تھیں، غربا پروری ان کی فطرت تھی، اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں۔ میری تو بہر حال وہ ماں ہی ہیں بہت کچھ ہیں۔ اتفاق مولانا سید احمد صاحب مرحوم سے واقعہ کا ذکر کیا۔ حج بدل کی کوئی صورت یہاں ہو سکتی ہے مولانا نے ایک صاحب کو تیار کیا۔ مدینہ منورہ سے میرے ساتھ چلنے کا وعدہ انھوں نے بہ نیت حج بدل فرمایا۔

اب وقت نکل سر پر آ گیا۔ ارادہ پہلے سے تھا کہ پہلی ذوالحجہ کو ہمارا قافلہ مدینہ منورہ سے نکل پڑے گا، مگر اسی دنوں کی طرف سے کچھ ایسے معاملات پیش ہونے لگے کہ دل دھڑکنے لگا، آج

نہیں، کل، کل نہیں پرسوں، بات ٹلنے لگی، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کیا ہوگا۔ کیا ہم کم نصیبوں کے مقدر میں حج نہیں ہے سب سے زیادہ متاثر فقیر تھا کہ اسی کے اشارے سے لوگ مدینہ چلے آئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاری والوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ حکومت کی زنجیر بھی کھٹکھٹائی گئی، مگر وہاں سے بھی چنداں حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ پریشانی کا عجب عالم تھا۔ اسی عرصے میں ایک اور بات ایسی پیش آئی، جو بھلائی نہیں جاتی۔ ہمارے ساتھ جہاز میں تعلقہ داران لکھنؤ میں سے ایک صاحب محمد علی نامی بھی تھے عرف عام میں ان کو لوگ "محمد علی چمرو" کہتے تھے، خدا جانے اب زندہ بھی ہیں یا نہیں خود امامیہ مذہب رکھتے تھے۔ مگر بیوی ان کی سنی خاندان کی تھیں، بیوی کو حج کا شوق ہوا، محمد علی صاحب جو ایک اپٹوڈیٹ انگریزی خواں لیڈر قسم کے آدمی تھے۔ اپنی بیوی کو بمبئی تک پہونچانے کے لیے بمبئی آئے، مگر بمبئی میں خیال ہوا کہ ذرا آگے بڑھ چلو، جہاز پر سوار ہو گئے، اور مدینہ منورہ تک وہ بھی ہماری تقلید میں ساتھ آئے۔ ان کی موٹر اٹک گئی۔ مسجد نبوی میں احرام باندھ کر روضہ طیبہ پر رخصت ہونے کے لیے حاضر ہوئے، فقیر بھی مسجد کے کسی گوشہ میں تھا رخصت ہو کر جب چمرو صاحب چلنے لگے، تو مجھ پر نظر پڑی، سامنے آئے، ہوش و حواس غائب تھے۔ صرف یہ کہتے جاتے تھے۔

> مولانا آگیا تھا، کہہ کے آیا ہوں، آج آستانہ پر حاضر ہوا ہوں، کل جب وقت روانگی کا ہو تو آپ بھی تشریف لائے گا۔

آنکھیں سرخ اشکبار تھیں۔ روتے جاتے تھے، رلاتے جاتے تھے ان کا روانہ ہو جانا، اور غضب ہوا، قافلہ والوں میں گوز بر بھی پیدا ہوئی، نزلہ کا رخ زیادہ تر اسی دیوانے کی طرف تھا، اسی نے سب کی راہ ماری، حج سے محروم کیا۔ چپ تھا، کیا خود ہی نہیں بلکہ اپنے جرم میں دوسروں کو بھی ان کے حج سے محروم کرا دیا جائے گا۔

چمرو صاحب چلدئے اور بھی جو جانے والے تھے مسلسل جا رہے تھے۔ ہماری کمپنی اب بھی صحیح وقت نہیں بتا رہی ہے۔ عربدہ بازیوں سے کام لے رہی ہے،

رات کا وقت تھا۔ رباط جس میں مولانا عبد الباری ان کے والد والدہ کے ساتھ یہ فقیر بھی مقیم تھا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ اسی فکر میں سوئے تھے کہ دیکھئے کل کیا صورت پیش آتی ہے کیونکہ غالباً ذو الحجہ کی ۴ر بھی گذر چکی تھی، ۵ر تاریخ تھی۔ تین بجے کا وقت ہو گا، ہم لوگوں سے دور مولانا کی والدہ،

آرام فرما رہی تھیں کہ اچانک ان کی طرف سے "پیارے پیارے" کی آواز بھرائی ہوئی آواز آنے لگی یہ مولانا عبدالباری کا خانگی نام بچپن کا تھا۔ ان کی والدہ اب بھی زیادہ تر اسی نام سے مولانا کو پکارتی تھیں، میری آنکھیں بھی کھل گئیں اور مولانا والدہ کے پاس دوڑے ہوئے پہونچے، کیا ہے اماں کیا ہے اماں! ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان ہی ہچکیوں میں ملی ہوئی آواز کے ساتھ فرما رہی تھیں۔

میں نے ابھی خواب دیکھا ہے، دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں دل میں القا ہوا کہ خود مدینہ والے سرکار ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم سامنے لاری کھڑی ہے۔ ہم لوگوں کا اسباب بھی پڑا ہوا ہے حکم دیا جا رہا ہے کہ ان مسافروں کو جلد سوار کرو، ان کو فوراً حج کے لیے مکہ پہونچاؤ۔"

یہ یا کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے۔ شاید یہ بھی مولانا کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ "خود ہی کچھ اسباب کو اٹھا اٹھا کر لاری میں دیکھا کہ "وہ ڈال رہے ہیں سہ

گفتی سر تو بستہ فتراک ما سزد   سہل است اگر تو زحمت این باری کشی

خاکسار بھی سن رہا تھا، ہوش جاتے رہے، چیخ نکل گئی، مولانا کے والد بھی بیدار ہو گئے، اب کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، یہ کیا ہے یا اللہ یہ کیا ہے گریہ وزاری میں رات کٹی۔

نظر جانب ہر گنہ گار داری

کے نعروں کا اعادہ مسلسل ہو رہا ہے صلوات اللہ علیہ وسلامہ کہاں ہندوستان کے چند ٹوٹے پھوٹے نام کے مسلمان حقیر ذرے اور کہاں غیب و شہادت کا آفتاب عالمتاب، مرکز کائنات ایمان کے سانحہ ناشنو ہونے والوں کو سلامتی کی دعا دے سرفرازی بخشی جائے اس قرآنی حکم کی تعمیلی شکل کا یہ کتنا اچھا شاہد ہے، حق ایمان کے ساتھ ایمان کے عملی اقتضاؤں کی تکمیل کرنے والے کن نوازشوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں ان کا کون اندازہ کر سکتا ہے خالق کائنات کے ساتھ نسبت کی تصحیح کائنات کے ذرہ ذرہ کی نسبت کو درست کر دیتی ہے اس راز کو وہ کیا پا سکتے ہیں جو مخلوق سے مستفید ہونے کے لیے مخلوق ہی کو بیچ ڈالتے ہیں وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ خالق سے دور ہو کر اسی خالق کی مخلوق سے کیسے قریب ہو سکتے ہیں۔

خیر صبح ہوئی، مسجد نبوی میں نماز ادا کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں کمپنی کا نمائندہ ملا، تیار ہو جاؤ، لاری بس اسی وقت کھلے گی۔ مسرت کی لہر دوڑ گئی، قافلہ کے لوگ تیار ہو گئے سوار ہو گئے، اور ۴؍ ذوالحجہ کو جو مدینہ منورہ میں تھے، شاید ۵؍ کی شام کو وہ مکہ معظمہ کی گلیوں میں گھوم رہے تھے ؎

بور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائے کبوترزد و ناگاہ رسید

کا نقشہ بجائے قصہ کے واقعہ بنا ہوا تھا، شاید ڈیڑھ دن میں راستہ طے ہوا، نکلنے کا خیال تو دل سے پہلے ہی نکال دیا گیا تھا[1] اس لیے مدینہ سے نکلنے پر جس کیفیت کا اندیشہ تھا الحمد للہ کہ وہ طاری نہ ہوئی، ذوالحلیفہ (بیر علی) میں گاڑی رکی، سامنے مسجد تھی، مسجد کے پاس صاف و شفاف پانی سے بھری ہوئی ایک کافی عریض و عمیق باؤڑی تھی، خوب نہائے تیرے اور مسجد میں آکر احرام باندھا، الفاظ کہاں ہیں جو شکر و امتنان کے جذبات کی ترجمانی کی گنجائش رکھتے ہوں۔ ؎

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے جو کچھ کہ ہوگا ترے کرم سے ہوگا!

مدینہ منورہ کی منزل ختم ہو گئی، رسول کے دربار سے باریاب ہو کر اب اللہ کے بندے اللہ کے دربار میں تھے۔ جس کا قصہ ان شاء اللہ دوسرے حج نمبر میں زندگی نے وفا کی تو سنایا جائے گا۔

مدینہ منورہ میں آستانہ نبوت کبریٰ کے سوا دوسرا مقام جہاں زمین پر وہ سب کچھ مل جاتا تھا۔ جو شاید آسمانوں میں بھی نہ ملے وہ جنت البقیع کی خوابگاہیں تھیں۔ جن جن کی تلاش تھی، سب وہیں مل جاتے تھے۔ صبح و شام اس کا پھیرا ہوتا تھا۔ احد کے دامن میں بھی گذر کا موقعہ دیا گیا، عقیق کی

---

[1] بحرین کے علاقے کے ایک کرسچین (عیسائی) جارود نامی تھے، آستانہ نبوت کبریٰ پر حاضر ہو کر بیعت اسلام سے سرفراز ہوئے (طبرانی وغیرہ) میں ہے کہ فرحبہ و قربہ و ادناہ (رسول اللہ ان کے اسلام سے بہت خوش ہوئے ان کو قرب بخشا گیا، اور ان کو نزدیکی عطا کی گئی) مدینہ سے رخصت ہونے کے بعد ایک قصیدہ لکھا جس کے دو شعر یہ بھی تھے۔

فابلغ رسول اللہ عنی رسالۃ ÷ بانی حنیف حیث کنت من الارض ÷ فان لم یکن داری بیثرب فیکم ÷ فانی لکم عند الاقامۃ والخفض

جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ تک اس فقیر کا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ وہ ہر جگہ باطل سے ٹوٹ کر حق کے ساتھ لپٹ ہوا ہے، خواہ زمین کے اس کرے پر کسی جگہ بھی رہے، میرا گھر اگر یثرب مدینہ میں آپ لوگوں کے درمیان نہیں ہے تو کیا ہوا، میں آپ ہی کے لیے ہر حال میں ہوں، نشست و برخاست ہر حال میں۔ (اصابہ صفحہ ۲۲۶)

ندی، جو دامن مدینہ میں گویا ایک برساتی نالہ ہے۔ اس کے پانی کے استعمال کی بھی سعادت حاصل ہوئی، حرّہ کے ایک سنگی گڑھے کے پانی سے وضو کیا، ایک دن مدینہ میں بارش کا لطف بھی حاصل ہوا، مسجد نبوی کی میزاب کے نیچے غسل کرنے والوں نے غسل کیا۔ الغرض ایک مہینہ تین دن کی یہ مدت زندگی کی ایسی مدت تھی، جس کی نظیر بچاس ساٹھ سال کی طویل مدت میں نہ ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔

بقیع کا ایک واقعہ اس سلسلے کا ایک ارتسام ذہنی ایسا ہے، جو مٹائے نہیں مٹتا، بقیع کی جنت کی سیر میں تنہا مصروف تھا، کہ اچانک ایک سرخ و سپید چہرے بدن والے نوجوان کلّہ سیاہ داڑھی سے بھرا ہوا، سامنے سے گذرتے ہوئے معلوم ہوئے، انھوں نے مجھے دیکھا، میں نے ان کو "سلام" سے راہ و رسم کی ابتدا ہوئی، دریافت سے معلوم ہوا کہ مراکش وطن ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا تو کہاں کا ہے، ہند جواب دیا گیا۔ اسی کے بعد واقعہ پیش آتا ہے، مراکشی نوجوان نے عربی میں کہا کہ ہندوستان پر تو انگریزوں کی حکومت ہے، ہاں! کہتے ہوئے فقیر نے عرض کیا کہ مراکش پر بھی تو فرانس قابض ہے۔ اس فقرے کے بعد پھر کیا ہوا؟ میں نے دیکھا کہ نوجوان مراکشی مجھ سے لپٹا ہوا ہے، سامنے قبہ خضرا، تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلبلاتے اور چیختے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔

یا رسول اللہ ان امتک فی الاسر فی اسر النصاری ۔ اے رسول اللہ آپ کی امت قید و بند میں گرفتار ہے نصاریٰ کی قید و بند میں؛ وہ بھی رو رہے تھے، اور جس کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے وہ بھی رو رہا تھا، دونوں کی التجا کا رخ ایک ہی طرف تھا، مغرب اقصےٰ اور مشرق کے دور دراز کے دو باشندوں کا جو درمیانی مقدس رابطہ تھا۔ اسی سے عرض کر رہے تھے، کچھ دیر یہ وقت بھی خوب گذرا، اور جس وقت مواجہ مبارک میں ہندی، جاوی، بخاری، شامی، مغربی، ایشائی، افریقی، گورے کالے لال پیلے، اونچے اونچے قد والے چھوٹی چھوٹی قامت رکھنے والے طرح طرح کے لوگ جمع ہوتے، سلام عرض کرتے، خدا جانے دوسرے کن نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتے تھے، یا اب بھی دیکھتے ہیں لیکن اچانک اپنے خیال کے سامنے حشر کا میدان آجاتا، وہی میدان جہاں بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح آدم کی اولاد ماری ماری پھرے گی اور العالمین کے رسول پر ایمان لانیوالی امت اپنے رسول کو ڈھونڈھے گی، ڈھونڈھے گی اور پائے گی، آج ایک ہلکا سا نقشہ اسی میدان کا سامنے تھا۔ دیر تک اس نظارے میں غرق رہتا، بجلی کی طرح دل پر واردات گذرتے، گذرتے

رہتے۔

سچی بات تو یہی ہے کہ ہر طرف یہاں تجلی ہی تجلی، برق ہی برق نور ہی نور تھا، صرف روشنی تھی، اندھیرے کا نام نہیں تھا، صرف سکون تھا، بے چینی کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت تھی، محبت ہی محبت کا چشمہ فوارے کی طرح اچھل رہا تھا ابل رہا تھا صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔

ہاں! ایک آخری بات بھی سن لیجئے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر اکیس آدمیوں کا یہ قافلہ مختلف قیام گاہوں میں تقسیم ہو گیا، مولانا عبد الباری ان کے والدین اور فقیر کا قیام ایک ہی جگہ تھا۔ قیام کے ساتھ ہم چاروں کے طعام کا نظم بھی مشترک تھا۔ روانگی سے پہلے حساب کیا گیا کہ ایک مہینہ تین دن میں طعام کے مصارف کیا ہوئے، کھانے میں کافی فراخدلی اور وسعت سے کام لیا جاتا تھا، ناشتہ میں چائے کے سوا کباب انڈے دہی اور طرح طرح کی چیزیں بھی شریک رہتی تھیں، یہ صحیح ہے کہ غیر تاریخی گرانی جس کا تجربہ جنگ عظیم کے بعد والی جنگ اعظم کے بعد دنیا کو ہوا ہے اس کا ذکر تو کیا شائد ہی نوع انسانی کو تاریخ کے کسی دور میں اس کا سان گمان بھی نہ ہوا ہو گا۔ اور موجودہ زمانہ کے لحاظ سے نسبتاً ارزانی ہی تھی، لیکن جنگ اعظم نہ سہی، یہ سفر ہم لوگوں کا جنگ کے بعد ہوا تھا۔ عرب جنگ عظیم سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا۔ مسلسل انقلابوں سے اس ملک کو گذرنا پڑا تھا۔ عربوں کو پیار کرنے والی حکومت ترکی کا اقتدار عرب سے ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے لحاظ سے وہاں غیر معمولی گرانی تھی۔ بھاؤ تو اب یاد نہیں رہا۔ مگر پھر بھی غیر معمولی گرانی ہی تھی۔ مگر مولانا عبد الباری صاحب نے جب حساب کیا تو وہ کچھ بھچکے سے ہو کر رہ گئے، میں بھی سن کر حیران تھا جب مولانا فرمانے لگے کہ ایک مہینہ تین دن کی اس پوری مدت میں فی کس آٹھ روپے کا حساب پڑتا ہے کل آٹھ روپے جن میں کھانا بھی ہے اور ناشتہ بھی اور چائے بھی، کچھ تکلفات بھی، بار بار میزان کی جانچ کی گئی، مدوں کو دیکھا گیا۔ لیکن آٹھ سے آگے یہ عدد کسی طرح نہ بڑھا، مجبوراً تسلیم کرنا پڑا، کہ مہمانی میں درحقیقت یہ سارے دن گذرے، آٹھ کا عدد بھی صرف "پردہ" تھا،

اس محسن کریم کے قربان جائیے ۔۔۔ احسان جس کا صورت احسان میں نہ تھا

اللھم صلی وسلم وبارک علیہ وعلی الہ وصحبہ واھل بیتہ اجمعین۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عرضِ احسن

بآستانہ نبوتِ کبریٰ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی وہ نظم جس کا ذکر ان کے مضمون میں آچکا ہے، ذیل کا تمہیدی نوٹ مولانا موصوف ہی کا لکھا ہوا ہے ——— مدیر]

"کسی دیوانے کو مدت ہوئی حاضری کی سعادت میسر آئی تھی، حجاز ہی سے مسلمانانِ عالم کے حالِ زار کو ایک نظم کی صورت میں قلم بند کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے اس کی توفیق بھی اس کو میسر آئی کہ جہاں عرض کرنا چاہتا تھا، عرض کرنے کا موقع عطا فرمایا گیا۔

"عرضِ احسن" کے نام سے متعدد بار یہ نظم شائع ہو چکی ہے، آج مولانا نعمانی کی فرمائش پر الفرقان کے حج نمبر کے لیے اسی نظم کو نقل کر کے ارسال کر رہا ہوں، جنون ہی کے آثار ہیں کہ نظم اردو میں شروع ہوئی، چند مصرعوں کے بعد فارسی ہو گئی، اور آخری مصرعے عربی زبان میں ادا ہوئے۔ والجنون فنون" ——— مناظر احسن گیلانی

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر
آمد بدرت بنگر

اے خاتمِ پیغمبر یا قاسمِ للکوثر اے سرورِ ہر سرور اے رہبرِ ہر راہبر
اے آنکہ توئی افسر ہر کہتر و ہر بہتر فی المبدء والمحشر اے ہستیٔ تو محور
للاکبر والاصغر اے طلعتِ تو مظہر للاول والآخر اے مرحمِ جہاں پرور
آقائے کرم گستر آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہمانے ناکارہ و نادانے آلودۂ عصیانے آغشتہ دامانے
بازیچۂ شیطانے از کردہ پشیمانے
آمد بدرت بنگر نے مونس و نے یاور
نے سازنہ سامانے نے علم نہ عرفانے نے دین نہ ایمانے نے فضل نہ احسانے

از خانۂ ویرانے وز کلبۂ احزانے وز مجلس زندانے ناشکری و کفرانے

آمد بدرت بنگر کالحائر والمضطر[51]

با چاک گریبانے با سینۂ بریانے با دیدۂ گریانے با اشک فراوانے

با نالۂ و فغانے با شورش پنہانے با دانش حیرانے با عقل پریشانے

در صورت عطشانے در گریہ درمانے خواہد ز تو فرمانے پروانۂ غفرانے

آمد بدرت بنگر البائس والمعتر

شاہا تو بمن منگر بر رحمت خود بنگر انصاف تو کن آخر غیر از تو مرا دیگر

من ناظر و الناصر والشافع و مستغفر

تو جوشش رحمانی[52] تو سایۂ یزدانی تو شاہد ربانی تو جلوۂ سبحانی

تو مرکز اعیانی تو جوہر فروانی تو مبدء اکوانی تو مقصد امکانی

تو مرجع و پایانی تو جانی و جانانی ہم روحی و روحانی تو زبدۂ انسانی

تو نیر فارانی تو دُرّہ عدنانی

تو مہبط قرآنی

تو خاتم ادیانی ہاں دینی و ایمانی

اے آنکہ تو درمانی ہر رنج و پریشانی بنگر کہ مسلمانی تورانی و ایرانی

ہم ہندی و افغانی ہم مصری و سودانی از نزغہ شیطانی وز جذبۂ حیوانی

وز دانش نفسانی وز شورش عمرانی یونانی[53] و رومانی افرنجی و برطانی

در سکرت و ہیمانی در لطمۂ نادانی

در ورطۂ ظلمانی

در فتنہ و طغیانی فی البغی و عدوانی

---

[51] مانند حیران اور سراسیمہ و پریشان کے ۱۲ [52] حقیقت محمدیہ کے نزول و ظہور کے مدارج کا اظہار ایک خاص ترتیب سے ان مصرعوں میں کیا گیا ہو ۱۲

[53] موجودہ زمانے کے تمام فتنوں کا سرچشمہ، مغرب کا شیطانی اور جاہلی حیوانی و نفسانی تمدن ہو اور اس تمدن کی بنیاد روم و یونان کے قدیم تمدن پر قائم ہو، اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو ۱۲۔

ہاں دستِ عاربکشا، ازذروۂ اوادنی[۱] وز قبہ ماادحی[۲] اے مرضی تو ترضی[۳]

وے لمتِ تو بیضا فاللیل لقد یغشیٰ[۴] والکفر قد استعلیٰ[۵] ذاامتک الضعفیٰ[۶]

فی سیطرۃ الاعداء[۷] ہاں سہمک لا یطغیٰ[۸]

ودرمیک لایخطیٰ[۹]

واللہ ھوالاعلیٰ[۱۰] والحق فلا یُعلیٰ[۱۱]

---

[۱] اوادنی سورۂ النجم کی آیت ثم دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی کی طرف تلمیح کی گئی ہے [۲] فاوحی الی عبدہ ماادحی (یعنی جب اوادنی کے مقام تک عروج ہوا تو اللہ نے اپنے بندے پر وحی کی جو کچھ بھی وحی کی) یہ بھی اسی سورۂ النجم کی آیت ہے [۳] سورۂ والضحیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد الٰہی ہوا ہے کہ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ (قریب ہے کہ تیرا رب تجھے اتنا دے کہ تو راضی ہو جائے) بلاشبہ اس آیت میں بڑی بشارتیں پنہاں ہیں، العالمین کی رحمت کی رضامندی کے حدود کو سوچئے اور سر دُھنیے۔ [۴] بس رات چھا گئی [۵] اور کفر اونچا ہو گیا [۶] یہ آپ کی کمزور ناتوان امت ہے [۷] دشمنوں کے قابو میں ہے [۸] آپ کا تیر نشانہ سے ہٹ نہیں سکتا [۹] اور آپ کے نشانہ کو غلط نہیں کہا جا سکتا ہے [۱۰] اللہ ہی سب سے بڑا ہے [۱۱] اور حق پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں

ایک دوربین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا، اسکے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اسکو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا، اس نے پوری زندگی اسمیں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنائے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہو، (مقدمہ جامع المجددین از سید سلیمان ندوی) یہ کسی گزشتہ صدی کے مجدد کی کارنامہ کا ذکر نہیں ہو، بلکہ ہماری اسی صدی کا ذکر ہو اس اجمال کی تفصیل مولنا عبدالباری صاحب ندوی سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی دکن کی تصنیف کردہ ذیل کی دو ضخیم کتابوں میں دیکھیے۔

جامع المجددین

مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں یعنی ایمان میں اعمال میں، اخلاق میں اور معاملات و معاشرات میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں انکا صحیح صحیح جائزہ لیکر حکیم الامت حضرت مولنا تھانوی نے اپنی پچاسوں کتابوں اور سیکڑوں مواعظ میں انکی اصلاح اور درستی کی جو کوشش فرمائی تھی مولنا عبدالباری صاحب نے قریبا چار سو صفحے کی اس کتاب میں بڑے موثر اور دلکش پیرائے میں اس سب کو ایک نئے انداز میں مرتب کر دیا ہو، اس دور میں ہندستان سے اس کتاب کی اشاعت گویا ایک لطیفۂ غیبی ہے۔

شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا نہایت فاضلانہ اور بصیرت افروز مقدمہ ہو۔

کتابت اچھی، کاغذ عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش

قیمت ۔۔۔۔۔۔ سے ۵ر

تصوّف وصوفیہ

اور ہندوستان میں ان کی برکات

تصوف و صوفیہ کے موضوع پر یہ ایک عدیم النظیر فاضلانہ اور محققانہ علمی مقالہ ہو، شروع میں تصوف و احسان کی حقیقت اور اس کے آغاز کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہو اور بتلایا گیا ہو کہ تصوف اسی چیز کا نام ہو جس کو کتاب و سنت میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو ——— پھر تاریخ کی مستند شہادتوں کی روشنی میں بتلایا گیا ہو کہ امت کے چاروں مشہور امام (آئمہ اربعہ) دین کے اس شعبہ کے بھی امام تھے، اور اپنے اپنے زمانہ کے آئمہ تصوف سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔

پھر پوری تفصیل سے بتلایا گیا ہو کہ خصوصیت سے ہندستان میں صوفیہ صافیہ خاص کر اہل چشت نے دین کی بنیاد قائم کرنے اور کلمۃ اللہ کو یہاں بلند کرنے میں کیا حصہ لیا، اور اسلامی ہند کی تعمیر میں انکی مساعی کو کتنا دخل ہو۔

تاریخ کے ہزاروں صفحات کا عطر اور خلاصہ ہو۔

قیمت صرف ——— ڈیڑھ روپیہ ——— عہ ر

تجدید تصوف و سلوک

حکیم الامت حضرت مولنا تھانوی نے دین کے جس شعبہ کی خدمت سب سے زیادہ کی وہ "تصوف و سلوک" ہی حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کے ہزاروں صفحے اس موضوع سے متعلق ہیں ——— مولنا عبدالباری صاحب ندوی نے حضرت کے ان تمام افادات کو قریبا پانچ سو صفحہ کی اس کتاب میں بڑے ہی دلآویز اور موثر انداز میں جمع کر دیا ہو ——— یہ واقعہ ہو کہ تصوف کے موضوع پر زمانہ حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق ایسی جامع اور محققانہ کتاب اردو ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی ہمارے علم میں نہیں ہی ——— عہد حاضرہ کے تصوف کے مخالفین اور موافقین دونوں گروہوں کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں کی اصلاح کی اس میں کامیاب کوشش کی گئی ہو اور تصوف کی اصل حقیقت کو ہر طرح کے گرد و غبار سے صاف کر کے اس میں پیش کر دیا گیا ہو ——— کاغذ اعلیٰ قسم کا ولایتی مجلد مع گرد پوش ——— قیمت ——— ۵ر

آپ حج کس طرح کریں؟ :-

عازم حج کے نام!

"یہ خط حج کو جانے والے اپنے ایک مخلص دوست کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے، چھپنے کے بعد جن عازمین حج کی نظر سے یہ گزرے وہ اپنے کو اس کا مخاطب سمجھ کر پڑھیں، انشاء اللہ یہ خط ان کی پوری رہنمائی کرے گا۔" (محمد منظور نعمانی)

باسمہ سبحانہ

بڑے خوش نصیب، میرے دینی بھائی! تم پر اللہ کا سلام، اور اسکی رحمتیں!

اللہ تعالیٰ کی اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و عظمت کو پوری طرح محسوس کیجئے اور اس کا شکر ادا کیجئے کہ اپنے مقدس گھر اور اپنے محبوب رسُول کے محترم شہر کی حاضری کا ارادہ اُس نے آپ کے دل میں ڈالا اور اس کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ ع

"کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"

اور سب سے بڑا شکر اس نعمت کا یہ ہے کہ وہاں کے فیوض و برکات اور انوار و تجلیات کیلئے تا بحدِ امکان اپنے کو تیار کرنے میں، اور حج کے اعمال اور اس کا طریقہ سیکھنے کی کوشش میں ابھی سے مشغول ہو جائیے!۔۔۔

بڑا بے نصیب، بڑا ناشکرا اور اپنے رب کی اتنی بڑی نعمت کی بڑی ناقدری کرنے والا ہے وہ بندہ جس کو اُس کا مولا ایسا موقع دے اور وہ وہاں کی حاضری کے آداب اور طریقے سیکھنے اور وہاں کے لئے اپنے کو بنانے سنوارنے کی کوئی فکر نہ کرے، اور یوں ہی غفلت اور لاپرواہی اور بدسلیقگی اور بے شعوری کے ساتھ وہاں جا اُترے۔

چند ورق کے اس خط میں جو کچھ لکھنے کا ارادہ ہے اگر اللہ تعالیٰ نے لکھوا دیا تو حج کے اعمال و آداب معلوم کرنے میں انشاء اللہ اس سے آپ کو کافی مدد ملے گی۔ واللہ ولی التوفیق۔

اچھے رفیق کی تلاش :-

اس راستہ میں سب سے زیادہ ضروری اور پہلی چیز یہ ہے کہ حج کو جانے والے اللہ کے کسی ایسے بندے کا ساتھ تلاش کیجئے جو حج کے مسائل بھی اچھی طرح جانتا ہو، اور مرد صالح ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی ایسے بندے کا ساتھ نصیب فرمادیں جو مسائل حج سے واقفیت اور صلاح و تقویٰ کے علاوہ حج کا تجربہ بھی رکھتا ہو تو نورٌ علیٰ نور، بس اُن سے اجازت لے کر اُن کے ساتھیوں میں شامل ہو جائیے، اور پھر پورے سفر میں اُن کے مشوروں پر عمل کیجئے۔ لیکن اس کی پوری احتیاط کیجئے کہ آپ ان کے لئے تکلیف کا سبب نہ بنیں، اللہ کے صالح بندے چونکہ عام لوگوں سے زیادہ حساس اور لطیف مزاج ہوتے ہیں، اس لئے خلاف مزاج باتوں سے انھیں دوسرے لوگوں سے زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔

ساتھ رکھنے کی چند کتابیں :-

سفر حج میں کچھ دینی کتابیں بھی ضرور اپنے ساتھ رکھئے، کم از کم ایک کتاب ایسی ہو جس سے بوقتِ ضرورت حج کے مسائل معلوم ہو سکیں، اور ایک دو کتابیں ایسی جن کے مطالعہ سے آپ کے دل میں عشق و محبت اور خوف و خشیت کی وہ کیفیات پیدا ہوں جو دراصل حج کی اور ہر دینی عمل کی رُوح ہیں۔ ضروری مسائل کے لئے مفتی سعید احمد صاحب (سہارنپوری) کی مختصر کتاب "حج و زیارت کا مسنون طریقہ" کافی ہے۔ (مفتی صاحب موصوف ہی کی دوسری کتاب "معلّم الحجاج" ہے، جو حج کے مسائل پر بہت جامع اور مفصل کتاب ہے، لیکن کم تعلیمیافتہ لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے)۔ اور کیفیات و جذبات پیدا کرنے کے لئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کی کتاب "فضائلِ حج" اور سالگذشتہ کے الفرقان کے "حج نمبر" کے بعض مضامین قابلِ مطالعہ ہیں، ان کے علاوہ عمومی دینی تعلیم کے لئے اس عاجز کی تالیف "اسلام کیا ہے؟" انشاءاللہ کافی ہے۔

یہ کتابیں اس سفر میں خود اپنے مطالعہ میں رکھئے، دوسروں کو پڑھوائیے، اور بے پڑھے بھائیوں کو پڑھ کر سنائیے۔ اس مشغلہ میں آپ کا جتنا وقت گذرے گا، انشاءاللہ اعلیٰ درجہ کی عبادت میں گذرے گا۔

اخلاص اور تصحیح نیت :۔

سفر شروع کرنے سے پہلے نیت کا جائزہ لیجئے اور صرف اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کے حصول، اور آخرت کے ثواب کو اپنا مقصد بنائیے۔ اس کے سوا کوئی چیز آپ کے لئے اس مقدس سفر کی محرک نہ ہو۔ اللہ کے یہاں وہی عمل قبول ہوتا ہے جو صرف اُس کے حکم کی تعمیل میں اور اُس کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔

گناہوں سے توبہ و استغفار :۔

روانگی سے پہلے سارے چھوٹے بڑے گناہوں سے سچے دل سے توبہ و استغفار کیجئے، تاکہ گناہوں کی گندگی سے صاف ستھرے ہو کر آپ اپنے مولا کے دربار میں پہنچیں۔

حقوق العباد کی تلافی یا معافی :۔

اللہ کے جن بندوں کے حقوق آپ کے ذمہ ہوں، جن کی کبھی آپ نے حق تلفی کی ہو، جنکو ستایا ہو، جن کا کبھی دل دکھایا ہو، ان سب سے معاملہ صاف کیجئے، معاف کرائیے، یا بدلہ دیجئے۔ اگر کسی کی امانت ہو تو اس کو ادا کیجئے ـــــ جن امور کے متعلق وصیت کرنی ہو اُن کے متعلق وصیت نامہ لکھ دیجئے ـــــ اور سوچ سمجھ کے اور استخارہ کر کے جانے کا دن اور وقت مقرر کر لیجئے۔

روانگی کا دن آنے سے پہلے ہی تمام انتظامات اور تیاریوں سے فارغ ہو جائیے تاکہ روانگی پورے اطمینان سے ہو سکے۔

گھر سے روانگی :۔

جب روانگی کا وقت آئے تو خوب خشوع خضوع سے دو رکعت نفل نماز گھر میں پڑھئے، اور سلام پھیرنے کے بعد سفر میں سہولت و عافیت کی اور معاصی سے حفاظت کی، اور حج مبرور[1] اور زیارت مقبولہ نصیب ہونے کی پورے الحاح سے دعا کر کے اہلِ خانہ سے رخصت ہو جائیے ـــــ یاد ہو تو

---

[1] حج مبرور وہ ہے جس میں کوئی بات اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، اور عند اللہ مقبول ہو۔ ۱۲

گھر سے نکلتے وقت یہ دُعا پڑھئے :-

"بِسْمِ اللّٰهِ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ، تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ"

یہ دعا یاد نہ ہو تو صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھ کر نکلیے۔

جب سواری پر سوار ہوں :-

پھر جب آپ سواری پر، مثلاً ریل پر سوار ہوں اور وہ روانہ ہونے لگے تو اللہ کی حمد کیجئے، اور اس کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے ہماری راحت اور سہولت کے لئے دنیا میں یہ سواریاں مہیا فرمائیں، اور اتنے بڑے بڑے سفروں کو ہمارے لئے آسان کردیا۔ اور یاد ہو تو یہ دُعا پڑھے :-

"سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ"

امیر قافلہ، اور قافلہ کا تعلیمی نظام :-

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایک جگہ سے کئی کئی حاجی ساتھ روانہ ہوتے ہیں (اور یہی بہتر بھی ہے) جب ٹرین روانہ ہو جائے اور اپنے اپنے سامان وغیرہ کی طرف سے سب ساتھی مطمئن ہو جائیں تو کسی ایک سمجھدار ساتھی کو قافلہ کا امیر بنا لیجئے، اور یہ بھی طے کر لیجئے کہ اس پورے سفر میں حج کے مسائل اور اس کا طریقہ اور اس کے علاوہ بھی دین کی اور ضروری باتیں سیکھنے سکھانے کا سلسلہ انشاء اللہ جاری رکھیں گے۔ جن لوگوں کو ساری عمر دین سیکھنے کی نوبت نہیں آتی، اُنھیں حج کے سفر میں اس کا کافی موقع مل جاتا ہے —— الغرض سوچ سمجھ کے پورے قافلہ کا ایک تعلیمی نظام بھی بنا لیجئے، یہ بڑی اہم اور بڑے کام کی بات ہے —— حج کو جانے والوں میں بکثرت ایسے ہوتے ہیں جنھیں نماز پڑھنا بھی نہیں آتا ہے، اور بیچارے بعضے تو کلمہ تک سے ناواقف ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی دینی تعلیم پر وقت صرف کرنا بلاشبہ نوافل اور ذکر اذکار سے افضل ہے۔

ریل میں نماز اور جماعت کا بھی پورا اہتمام کیجئے، اگر غفلت کی وجہ سے ایک وقت کی نماز بھی خدانخواستہ قضا ہوگئی تو بیت اللہ کی سو نفل نمازوں سے بھی اسکی تلافی نہیں ہوسکے گی۔

جہاز کے انتظار کا زمانہ :-

ریل کا سفر ختم کر کے جہاز کے انتظار میں بسا اوقات اچھی خاصی مُدت تک حاجیوں کو بمبئی یا کراچی میں قیام کرنا پڑتا ہے، آپ اس قیام کے زمانہ میں اچھی طرح اس کا خیال رکھیں کہ آپ حج وزیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے ہیں اس لئے بے فائدہ سیر وتفریح اور خواہ مخواہ بازاروں میں گھومنے پھرنے سے پرہیز کریں اور پورے اہتمام سے اپنا تعلیمی نظام اور دوسرے معمولات یہاں کے زمانۂ قیام میں بھی جاری رکھیں۔

بمبئی اور کراچی میں تبلیغی جماعتیں :-

ان دونوں بندرگاہوں پر (بمبئی میں حاجیوں کے مسافر خانوں میں اور کراچی میں حاجی کیمپ میں) آپ کو انشاء اللہ تبلیغی کام کرنے والے اللہ کے کچھ بندے ملیں گے، آپ اُن کے تبلیغی اور تعلیمی نظام میں شریک ہو جائیے، اور اگر اُن کی کوئی خاص جماعت حج کو جانے والی ہو (اور گذشتہ سال سے اکثر جہازوں میں تبلیغی جماعتیں جاتی ہیں) تو آپ کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ آپ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جائیے، انشاء اللہ اُن کی رفاقت میں آپ کو بہت کچھ دینی برکتیں حاصل ہونگی۔

پورے سفرِ حج کے لئے بمبئی یا کراچی سے کیا کیا آپ کو ساتھ لینا چاہئے، یہ سب آپ کو اُن تبلیغی دوستوں سے ہی معلوم ہو جائے گا، اور اگر آپ اُن کے رفیق بن گئے تو آپکے یہ سارے انتظامات بھی انشاء اللہ آسانی سے مکمل ہو جائیں گے۔

بمبئی اور کراچی کی مُدتِ قیام میں آپکے مشاغل :-

بمبئی اور کراچی میں اکثر حجاج کا وقت بڑے انتشار اور پریشانی میں گذرتا ہے آپ اپنی طبیعت میں جب انتشار اور پراگندگی اور پریشانی کی کیفیت محسوس کریں تو اپنے کو کسی اچھے کام میں لگا دیں، مثلاً نفل نماز پڑھنے لگیں یا اللہ کے ذکر میں یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو جائیں یا اس وقت بیٹھ کر بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کی حاضری اور روضۂ اقدس کی زیارت کے تصور سے لذت حاصل کرنے لگیں، یا کوئی شوق انگیز کتاب پڑھنے لگیں۔ ایسے وقت کے لئے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ

کی کتاب " فضائلِ حج " کے اُس حصہ کا مطالعہ انشاء اللہ خاص طور سے مفید ہو گا جس میں اللہ و رسولؐ سے سچی محبت رکھنے والے بزرگوں کے حج و زیارت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں ــــــ گزشتہ سال (۱۳۶۸ھ) کے "الفرقان" کے "حج نمبر" میں رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی کا جو مضمون زیرِ عنوان "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" شائع ہوا تھا وہ بھی اس مقصد کے لئے بہت مناسب اور دل پر بہت اثر کرنے والا اور بڑا شوق انگیز ہے ــــــ نیز ہمارے دوست زائرِ حرم حضرتِ حمید صدیقی لکھنوی کے کلام کا مجموعہ " گلبانگِ حرم " بھی اس مقصد کے لئے بہت خوب ہے۔

بہرحال بمبئی یا کراچی میں (اور اس کے بعد بھی ہر منزل و موقع پر) جب طبیعت میں انتشار اور پراگندگی کا اثر ہو تو مذکورۂ بالا شغلوں میں سے کسی شغلہ میں لگ جائیے! انشاء اللہ طبیعت میں سکون پیدا ہو جائے گا۔

جہاز پر سوار ہوتے وقت :ــــ

جب جہاز پر سوار ہونے کا وقت آئے تو سلامت و عافیت اور معاصی سے حفاظت کی دُعا کرتے ہوئے بسم اللہ کہہ کے سوار ہو جائیے اور یاد ہو تو یہ دُعا پڑھیے :ــــ

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ۝

سمندری سفر کا زمانہ :ــــ

اگر کوئی تیز رفتار جہاز آپ کو ملا تو بھی کم از کم سات آٹھ دن، ورنہ بارہ تیرہ دن آپ کے جہاز میں گذریں گے ــــ بہت سے لوگوں کو بحری سفر کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے اور جہاز کی غیر معمولی حرکت سے دوسرے ہی دن سے چکر آنے لگتے ہیں اور اس کا سلسلہ کئی کئی دن رہتا ہے، بعضوں کی طبیعت زیادہ خراب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کو ایسی کوئی تکلیف ہو تو وقت پر نماز کی ادائیگی کا اس حالت میں بھی پورا اہتمام کیجئے۔ ہوش و حواس کی حالت میں جس شخص کی ایک وقت کی نماز بھی فوت ہو جائے وہ بڑے خسارہ میں ہے۔ اور جن دنوں میں طبیعت اچھی رہے تو تبلیغ و تعلیم اور ذکر و نوافل

کے معمولات ہمت سے پورے کرتے رہیئے۔ خصوصاً مناسک حج کے سیکھنے، ضروری مسائل کے یاد کرنے، یا دوسروں کو بتلانے اور یاد کرانے میں اپنا وقت گذاریئے، نیز دوسرے حجاج بالخصوص بوڑھوں اور کمزوروں کی خدمت کی سعادت ضرور حاصل کیجئے، اور یہ سمجھ کے خدمت کیجئے کہ یہ اللہ و رسولؐ کے مہمان ہیں، اور میں اللہ کا بندہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا غلام ہوں اسلئے اس نسبت سے مجھ پر ان کی خدمت کا حق ہے۔ بعض اہلِ معرفت کا ارشاد ہے، کہ:۔

"طاعت و عبادت سے تو جنت ملتی ہے، اور بندوں کی خدمت کے صلہ میں خود مولا ملتا ہے۔"

میقات آنے سے پہلے احرام کی تیاری:۔

جدہ جب قریباً ایک دن رات کی مسافت پر رہ جاتا ہے تو وہ مقام آتا ہے جہاں سے ہندوستانی حجاج احرام باندھتے ہیں۔ جہاز میں بہت پہلے سے اس کا چرچا شروع ہو جاتا ہے: جہاز کے کپتان کی طرف سے بھی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں وقت جہاز یلملم کی پہاڑیوں کے سامنے سے گذرے گا، جب وہ وقت قریب آئے تو آپ بھی احرام کی تیاری شروع کر دیں[1]۔ اگر حجامت بنوانے کا موقع ملے تو بنوالیں، ناخن ترشوالیں، بغل وغیرہ کی بھی صفائی کر لیں اور خوب اچھی طرح غسل کریں، جس میں میل کچیل اور ہر قسم کی گندگی سے جسم کی صفائی اور پاکیزگی کی پوری کوشش کریں: اور احرام باندھنے کیلئے تیار ہو جائیں۔

حج کی تینؔ صورتیں:۔

احرام کا طریقہ معلوم کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے آپ کے لئے حج کی تینؔ صورتیں ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھیں: اور احرام کے وقت صرف حج کی نیت کریں، اس کو "اِفْرَادْ" کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھیں اور ایک ہی

---

[1] جو حضرات حج سے پہلے جدہ سے سیدھے مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ یہاں احرام نہ باندھیں، ان کو مدینہ طیبہ سے روانگی کے وقت احرام باندھنا چاہیئے۔

احرام میں دونوں کو ادا کرنے کی نیت کریں، اس کو "قِران" کہتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں احرام کی ساری پابندیاں حج سے فارغ ہونے تک قائم رہتی ہیں جن کا نباہنا اکثر لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، اور بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے کام اور ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن کی احرام کی حالت میں ممانعت ہے، اس لئے آج کل عوام کو ان دونوں صورتوں کا مشورہ نہیں دیا جاتا۔
تیسری صورت یہ ہے کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا جائے اور مکہ معظمہ پہنچ کے عمرہ کر کے احرام ختم کر دیا جائے، اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو مسجد حرام سے حج کا احرام باندھا جائے، اس کو "تمتُّع" کہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے لئے یہی تیسری صورت آسان اور بہتر ہوتی ہے اسلئے تفصیل سے پہلے اُسی کا طریقہ لکھتا ہوں۔

حج تمتع کا طریقہ:-

بہرحال اگر آپ میرے مشورہ کے مطابق تمتع کا ارادہ کریں تو جب میقات قریب آئے تو جیسے کہ اوپر ابھی بتلایا پہلے غسل کریں، اور اگر کسی وجہ سے غسل نہ کر سکیں تو صرف وضو ہی کر لیں، اور سلے کپڑے جسم سے اتار کر ایک لنگی پہن لیں، اور ایک چادر اوپر اوڑھ لیں، اور ان ہی دونوں کپڑوں میں دو رکعت نفل نماز پڑھیں، اس نماز میں سر چادر سے ڈھانک لینا چاہئے، پھر جیسے ہی سلام پھیریں سر سے چادر اتار دیں اور دل سے عمرہ کے احرام کی نیت کریں اور زبان سے بھی کہیں، کہ:-

"اے اللہ! میں صرف تیری رضا کے لئے عُمرہ کا احرام باندھتا ہوں تو اس کو میرے لئے آسان فرما، اور صحیح طریقے پر ادا کرنے کی توفیق دے، اور اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔"

تلبیہ:-

پھر اس نیت کے ساتھ ہی کسی قدر بلند آواز سے تین دفعہ یہ تلبیہ پڑھیں:-

"لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ ؕ"

(میں حاضر ہوں خداوندا تیرے حضور میں، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی

شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں، اور مُلک اور بادشاہت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں)۔

اس کو تلبیہ کہتے ہیں، یہ حج و عمرہ کا خاص ذکر اور گویا حاجی کا خاص ترانہ ہے، اور دراصل یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی پکار کا جواب ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے اللہ کے بندوں کو پکارا تھا کہ آؤ اللہ کے در پہ حاضری دو — پس جو بندے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ کے اللہ کے گھر کی حاضری کے ارادہ سے جاتے ہیں وہ یہ تلبیہ پڑھتے ہوئے گویا حضرتِ ابراہیمؑ کی اس پکار کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب تو نے اپنے مقبول بندے ابراہیمؑ سے ندا دلوا کے ہمیں بلایا تھا ہم حاضر ہیں، حاضر ہیں تیرے حضور میں حاضر ہیں"۔

بہر حال تلبیہ پڑھتے وقت اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر یقین کرتے ہوئے براہِ راست اسی سے خطاب کریں، اور شوق اور خوف کی کیفیت کے ساتھ بار بار کہیں:—

لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمة

لک والملک لا شریک لک؎

تلبیہ پڑھ کر خوب خشوع خضوع کے ساتھ اللہ سے دعا کریں — اس موقع پر یہ دعا خاص طور سے مستحب ہے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَالنَّارِ"[1]

اس کے بعد تلبیہ کی کثرت رکھیں، اب یہی آپ کے لئے گویا افضل ذکر ہے، جب کسی سے ملنا ہو، جب بلندی پر چڑھنا یا نشیب میں اترنا ہو تو ہر موقع پر اللہ کی عظمت اور خشیت و محبت کی کیفیت کے ساتھ یہی کلمہ پڑھئے:—

لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمة

لک والملک لا شریک لک؎

---

[1] ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے تیری رضا اور جنت کا طالب ہوں، اور تیرے غضب اور دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں۔

احرام کی پابندیاں :-

جب آپ نے احرام کی دو رکعتیں پڑھ کے عمرہ یا حج کی نیت کر لی اور تلبیہ کہہ لیا تو اب آپ "مُحْرِم" ہو گئے، اور آپ پر احرام کی ساری پابندیاں عائد ہو گئیں۔ اب آپ سلا کپڑا نہیں پہن سکتے، سر اور چہرہ نہیں ڈھک سکتے، ایسا جوتا بھی نہیں پہن سکتے جو پاؤں کی پشت کی ابھری ہوئی ہڈی کو ڈھانکنے والا ہو، حجامت نہیں بنوا سکتے بلکہ جسم کے کسی حصہ کا ایک بال بھی نہیں توڑ سکتے، ناخن نہیں تراش سکتے، خوشبو نہیں لگا سکتے، بیوی سے ہم بستر نہیں ہو سکتے، بلکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں کر سکتے جو اس خواہش کو ابھارنے والی ہو، اور جس سے نفس کو خاص لذت ملتی ہو۔ کسی جانور کا شکار نہیں کر سکتے، بلکہ اپنے جسم یا کپڑے کی جوں بھی نہیں مار سکتے[1]۔

حج اور عمرہ کے سلسلہ کا پہلا عمل یہی احرام ہے جو جدہ پہنچنے سے پہلے ہی جہاز ہی پر باندھ لیا جاتا ہے اب مکۂ معظمہ پہنچنے تک آپ کو کوئی خاص کام کرنا نہیں ہے، بس احرام کی پابندیوں کو نباہیئے اور شوق و محبت اور خوف و انابت کی کیفیت اپنے اندر بیدار کر کے تلبیہ کثرت سے پڑھتے رہیئے۔ اس زمانہ میں جذب و عشق اور خوف و خشیت کی جس قدر کیفیت آپ کے اندر پیدا ہو جائے بس وہی اصل ابراہیمی میراث ہے، اور وہی [illegible] کی روح ہے۔

معلّم کو پہلے سے سوچ رکھئے :-

جدہ اُترتے ہی آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کا معلّم کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ جس

---

[1] عورتوں کے احرام کے بھی یہی احکام ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ سلے کپڑے پہن سکتی ہیں، اور سر کھولنے کا حکم بھی ان کیلئے نہیں ہے البتہ چہرے پر کپڑا ڈالنے کی ان کیلئے بھی ممانعت ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ ان کا احرام بس یہی ہے کہ چہرے پر کپڑا نہ ڈالیں، حتی کہ جب کسی اجنبی آدمی اور نامحرم شخص کا سامنا ہو تب بھی کسی اور چیز سے آڑ کریں کپڑا منہ پر نہ ڈالیں، اس مقصد کیلئے ببلی وغیرہ میں [illegible] ایک بنی ہوئی چیز ملتی ہے وہ نہایت مہمل ہے، بہتر یہ ہے کہ اس کام کے لئے عورتیں اپنے ہاتھ میں پنکھا یا اس قسم کی کوئی اور چیز رکھیں [illegible] سے چہرہ نامحرموں سے چھپا سکیں۔ ۱۲

معلم کا نام بتلادیں گے اُسی کے وکیل کے سپرد آپ کو کردیا جائے گا، لہذا پہلے ہی سے سوچ سمجھ کے طے کرلیجئے کہ آپ کس کو اپنا معلم بنانا چاہتے ہیں۔

حجاج کو عموماً اپنے معلموں کی شکایت کرتے ہی دیکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معلمین بھی اپنے فرائض ادا کرنے میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اور حجاج کی رہنمائی اور راحت رسانی کا جو انتظام انھیں کرنا چاہئے اور جتنا وہ کرسکتے ہیں اکثر معلم اتنا بھی نہیں کرتے، لیکن اس عاجز کے نزدیک ان شکایتوں کی بڑی بنیاد خود حجاج کی یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ معلم سے ایسی توقعات وابستہ کرلیتے ہیں جو نہیں کرنی چاہئیں۔ بہت سی انتظامی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بیچارے معلم بھی بے بس اور دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ پھر بھی اس میں شبہ نہیں کہ بعض معلم تجربہ میں دوسروں سے اچھے ثابت ہوتے ہیں، لہذا سمجھدار اور تجربہ کار حجاج اگر کسی معلم کو اچھا بتلائیں اور مخلصانہ طور پر اس کے متعلق مشورہ دیں، تو آپ اس کو اپنا معلم بنالیں۔ بعض لوگ معلموں کی باقاعدہ ایجنٹی بھی کرتے ہیں ایسے لوگوں کی باتوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔

جدّہ :-

جدہ کے ساحل پر اتر کر آپ کو خوشی ہوگی اور ضرور خوشی ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کی اس زمین پر قدم رکھنا آپ کو نصیب فرمایا جس کی محبت ہر مومن کے دل میں تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ جدہ گویا حجاز کا سب سے بڑا بحری اسٹیشن ہے، اور مکہ معظمہ تو گویا دروازہ ہے۔ آپ کا پاسپورٹ یہاں آپ سے لے لیا جائے گا۔ اور پھر آپ کو واپس نہیں دیا جائے گا بلکہ اندراج وغیرہ کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے معلم کے پاس پہنچ جائے گا۔

جدہ میں آپ کے معلم کا وکیل مکہ معظمہ کا جانے کے لئے آپ کے واسطے سواری کا انتظام کریگا۔ اس میں کبھی کبھی ایک دو دن کی دیر بھی لگ جاتی ہے، اگر ایسا ہو اور وکیل معلم آپ کے قیام کا کوئی معقول انتظام نہ کرے تو آپ سب سے پہلے "حجاج منزل" جائیں، اگر وہاں جگہ مل جائے تو یہ آپ کیلئے سب سے بہتر ہے۔ کافی وسیع مسجد بالکل وسط میں ہے اور ہندوستانیوں کے مزاج اور مذاق کے مطابق کھانے پینے کی دکانیں ہیں جن کی وجہ سے بڑا آرام رہتا ہے۔ ابھی تو ایک وسیع میدان ہموار کرکے

لکڑی کے تختوں کے عارضی کمرے بنا دیئے گئے ہیں، اگر اللہ نے کیا اور مجوزہ نقشہ کے مطابق یہ عمارت کبھی تیار ہوگئی تو اندازہ ہے کہ بیک وقت سات ہزار حاجی اس میں انشاء اللہ آرام کے ساتھ قیام کر سکیں گے[1]

جدّہ سے مکہ معظمہ :-

آپ کی طبیعت چونکہ مکہ معظمہ پہنچنے کے لئے بیتاب ہوگی اس لئے جدہ کا یہ تھوڑا سا قیام بھی آپ پر بہت گراں گزرے گا — بہرحال دیر سویر انتظام ہو ہی جائے گا اور آپ موٹر کار سے یا لاری سے مکہ معظمہ روانہ ہو جائیں گے - جدہ سے مکہ معظمہ کا راستہ صرف دو ڈھائی گھنٹہ کا ہے، سڑک اب بہت اچھی بن گئی ہے، ڈرائیور بھی عموماً تیز چلانے ہی کے عادی ہیں -

حدِ حرم :-

مکہ معظمہ جب قریباً دس میل رہ جاتا ہے تو شمیسیہ وہ مقام آتا ہے جہاں سے حرم کی حد شروع ہو جاتی ہے - جہاں ۶ھ میں حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو عمرہ کرنے سے کفارِ مکہ نے روک دیا تھا، اور پھر صلح کرکے بغیر عمرہ کئے آپ مدینہ واپس ہوگئے تھے - یہیں حدیبیہ کا وہ میدان ہے جس کے ایک درخت کے نیچے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام سے موت پر بیعت لی تھی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے، اور جس کا قرآن شریف میں بھی ذکر ہے - بہرحال یہاں سے حرم کی حد شروع ہو جاتی ہے - یہاں سڑک کے قریب ہی بطور نشانی کے ایک مینارہ بھی بنا ہوا ہے اور ایک لکھی ہوئی تختی بھی لگی ہوئی ہے - جب یہ مقام آئے تو شوق و محبت اور خوف و ادب کی کیفیت کو پوری طرح اپنے پر طاری کیا جائے اور اللہ سے دعا کی جائے کہ :- اے اللہ! یہ تیرا اور تیرے رسول کا

---

[1] مکہ معظمہ کا سب سے بڑا اور قدیمی مدرسہ صولتیہ کیرانہ (ضلع مظفر نگر) کے جس علمی خاندان کے اہتمام و انتظام میں چل رہا ہے انھیں حضرات نے اس "حجاج منزل" کی تعمیر کا بھی بیڑا اٹھایا ہے - زمین تو نہایت مناسب موقع پر ساحل کے بالکل قریب سعودی حکومت نے دیدی ہے، تعمیر ہندوستان و پاکستان کے اہل خیر کی امداد سے انشاء اللہ تکمیل کو پہنچے گی - کل تعمیر کا تخمینہ چالیس پچاس لاکھ روپے کے قریب ہے۔

اہل خیر کے لئے انشاء اللہ اچھا مصرف ہے - (محمد منظور نعمانی)

حرم ہے، اس میں جانوروں کو بھی امن ہے، تو اس کی برکت اور حرمت سے میرے گوشت پوست اور سارے جسم پر دوزخ کی آگ حرام کر دے اور قیامت کے عذاب سے مجھے امن نصیب فرما۔"

اور اگر معنی مطلب کے ساتھ آپ کو یاد ہو تو اچھا ہے کہ پھر یہ دُعا ان عربی الفاظ میں کریں:—

اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰذَا حَرَمُكَ وَحَرَمُ رَسُوْلِكَ فَحَرِّمْ لَحْمِیْ وَدَمِیْ وَعَظْمِیْ وَبَشَرِیْ عَلَی النَّارِ اَللّٰھُمَّ آمِنِّیْ عَذَابَكَ یَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ ؕ—

مکہ معظمہ میں داخلہ:—

تھوڑی دیر کے بعد آپ کو مکہ معظمہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں گی، اُس وقت پھر اپنے اندر خشیت اور ادب کی کیفیت پوری طرح پیدا کر کے اللہ سے دُعا کیجئے:—

"اے اللہ! مجھے اپنے اس پاک اور مُبارک شہر میں سکون و اطمینان سے رہنا نصیب فرما اور یہاں کے حقوق اور آداب ادا کرنے کی توفیق دے، اور حلال رزق عطا فرما۔"

پھر جب آپ کی موٹر اللہ کے مقدس شہر میں داخل ہونے لگے تو پھر دل حاضر کر کے دُعا کیجئے:—

"اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرا فرض ادا کرنے اور تیری رضا اور رحمت کا طالب بن کر آیا ہوں۔ تو میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے، اور قیامت کے دن کی معافی اور بخشش میرے لئے مقدر فرما دے، اور میرا حج صحیح طور سے ادا کرا دے۔"

مسجد حرام کی حاضری اور طواف:—

موٹر آپ کو معلم کے مکان پر پہنچا دے گی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سامان اُتار کے، اور اگر وضو نہ ہو تو وضو کر کے اُسی وقت مسجد حرام جائیں۔ مسجد حرام کے بہت سے دروازے ہیں "بابُ السّلام" سے داخل ہونا بہتر ہے۔ داخلہ کے وقت "بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علٰے رسول اللہ" کہہ کے داہنا پاؤں اندر رکھئے، اور یہ دُعا پڑھئے:—

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"—

پھر جب بیت اللہ شریف پر نظر پڑے تو "اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" کہہ کے اور ہاتھ

اُٹھاکے خوب دل سے یہ دُعا مانگئے :۔

"اَللّٰھُمَّ زِدْ بَیْتَکَ ھٰذَا تَشْرِیْفاً وَّتَعْظِیْماً وَّتَکْرِیْماً وَّمَھَابَۃً وَّزِدْ مَنْ شَرَّفَہٗ وَکَرَّمَہٗ مِمَّنْ حَجَّہٗ اَوِ اعْتَمَرَہٗ تَشْرِیْفاً وَّتَکْرِیْماً وَّبِرّاً اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ

اَعُوْذُ بِرَبِّ الْبَیْتِ مِنَ الدَّیْنِ وَالْفَقْرِ وَمِنْ ضِیْقِ الصَّدْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔

(ترجمہ) اے اللہ اپنے اس مقدس گھر کی عزت وعظمت، شرافت وہیبت میں ترقی فرما اور حج وعمرہ کرنے والوں میں جو اس کی تعظیم و تکریم کریں ان کو بھی شرافت وعظمت اور نیکی عطا فرما۔ اے اللہ تیرا ہی نام سلام ہے، اور سلامتی تیری ہی طرف سے ہے، تو ہم پر سلامتی بھیج۔ میں اس مقدس گھر کے رب سے پناہ مانگتا ہوں قرضہ سے اور محتاجی سے، اور سینہ کی تنگی سے، اور قبر کے عذاب سے

اس کے بعد سیدھے حجر اسود کی طرف آئیے[1]، اور چونکہ آپ کو اس طواف کے بعد عمرہ کی سعی بھی کرنی ہوگی اس لئے اضطباع کر لیجئے، یعنی احرام کی اوڑھنے والی چادر داہنے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھے کے اوپر ڈال لیجئے، اور پھر حجر اسود کے مقابل اس طرح کھڑے ہو کے طواف کی نیت کیجئے کہ آپ کا داہنا مونڈھا حجر اسود کے بائیں کنارے کی سیدھ میں ہو اور پورا حجر اسود آپ کے داہنی طرف ہو۔ پھر نیت کرنے کے بعد ذرا داہنی جانب ہٹکر حجر اسود کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر نماز کی طرح دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر کہئے :۔

"بسم اللہ اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ وللہ الحمد"

پھر اگر موقع ہو تو آگے بڑھ کے ادب سے حجر اسود کو بوسہ دیجئے اور اگر اژدحام ایسا ہو کہ اس کو بوسہ دینا، یا صرف اپنا ہاتھ بھی اس تک پہنچانا آسان نہ ہو تو پھر اپنی ہی جگہ پر کھڑے کھڑے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں حجر اسود کی طرف کر دیجئے اور یہ خیال کیجئے کہ گویا آپنے اپنی ہتھیلیاں حجر اسود پر رکھ دیں، اور اُس وقت یہ دُعا پڑھئے :۔

"بسم اللہ اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ وللہ الحمد"

---

[1] مسجد حرام میں داخل ہو کے پہلے تحیۃ المسجد نہ پڑھنی چاہئے، بلکہ طواف کرنا چاہئے، یہاں کا تحیۃ طواف ہی ہے۔ ۱۲

پھر اپنے ہاتھوں کو چوم لیجئے، اور طواف شروع کر دیجئے۔

ایک طواف میں خانہ کعبہ کے سات چکر لگائے جاتے ہیں، یعنی سات چکروں کا ایک طواف ہوتا ہے پہلے تین چکروں میں رمل[1] کیجئے، یعنی ذرا مونڈھے ہلا کے اور اکڑ کے قریب قریب قدم ڈالیے اور پہلوانوں کی طرح کسی قدر تیز چلئے، باقی چار چکروں میں اپنی معمولی رفتار سے چلئے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ تلبیہ جو احرام کے وقت سے شروع ہوا تھا وہ عمرہ کا طواف شروع کرنے پر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے اس طواف میں اور اس کے بعد آپ تلبیہ نہیں پڑھیں گے۔

طواف کی دُعائیں :-

معلم لوگ طواف میں حاجیوں سے بعض خاص دُعائیں پڑھواتے ہیں جو عام طور سے بیچارے حاجیوں کو یاد نہیں ہوتیں، اور نہ وہ بیچارے اُن کے کسی لفظ کا مطلب سمجھتے ہیں۔ یہ نہایت مہمل اور غلط طریقہ ہے۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ طواف کے لئے کوئی خاص دُعا ہرگز ضروری نہیں ہے، اگر کوئی بھی دُعا یاد نہ ہو تو صرف

"سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا الٰہ الا اللّٰہ، اللّٰہ اکبر"

پڑھتا رہے[2]۔ تاہم عوام کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی کم از کم دو تین چھوٹی دُعائیں معنی مطلب کے ساتھ یاد کر لیں اور وہی طواف میں پڑھتے رہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بہت جامع اور مختصر مندرجہ ذیل تین دُعائیں طواف میں پڑھنی ثابت ہیں۔ ان میں سے پہلی دُعا قرآن مجید کی ہے یہ دُعائیں بڑی آسانی سے ہر شخص کو منٹوں میں یاد ہو سکتی ہیں، اگر پہلے سے آپ کو یاد نہ ہوں تو کم از کم ان کو ضرور یاد کر لیں۔

(۱)

"رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

(ترجمہ) اے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا۔

---

[1] رمل اور اضطباع صرف اس طواف میں کیا جاتا ہے جس کے بعد سعی کرنی ہو۔

[2] بلکہ اگر طواف میں سارا وقت یہی کہتا رہے تب بھی طواف ہو جاتا ہے۔ ۱۲

(۲)

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ"

(ترجمہ) اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں گناہوں کی معافی اور دنیا اور آخرت میں عافیت کا

(۳)

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْکُفْرِ وَالْفَاقَۃِ وَمَوَاقِفِ الْخِزْیِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ"

(ترجمہ) اے اللہ میں کفر سے اور فقر و فاقہ سے اور دنیا و آخرت کی رسوائیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں

عام حاجی اگر صرف یہی دعائیں یاد کرلیں اور پورے طواف میں بس یہی پڑھتے رہیں تو بالکل کافی ہے اور معلموں کی اُن لمبی لمبی دُعاؤں سے جن کو اکثر حاجی بالکل نہیں سمجھتے، بلکہ صحیح طور سے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ ان چھوٹی چھوٹی تین دُعاؤں کا سمجھ کر اور صحیح طور سے پڑھنا ہزار درجہ بہتر ہے۔

ان کے علاوہ بھی جو اچھی دُعائیں یاد ہوں طواف میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ دُعا کا عام اصول یہ ہے کہ جس دعا میں زیادہ جی لگے اور دل میں حضور اور خشوع کی کیفیت پیدا ہو وہی دُعا سب سے بہتر ہے یہاں قرآن و حدیث کی بہت مختصر مختصر دس دعائیں اور لکھتا ہوں، یہ سب بھی بڑی آسانی سے یاد ہو سکتی ہیں، پھر ان میں سے جو زیادہ دل کو لگے اُسی کو زیادہ پڑھے۔

(۱)

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ"

(ترجمہ) اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، میں ظالموں خطاکاروں میں ہوں۔

(۲)

"سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ"

(ترجمہ) اے اللہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری حمد کرتا ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

(۳)

"رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ"

(ترجمہ) پروردگار! بخشدے اور رحم فرما تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔

(۴)

"رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ"

(ترجمہ) اے مالک! مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو بخشدیجئے جسدن کہ حساب کتاب ہو۔

(۵)

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الرَّاحَةَ عِنْدَ الْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَ الْحِسَابِ"

(ترجمہ) اے اللہ میں تجھ سے موت کے وقت راحت کا، اور حساب کے وقت معافی کا سوال کرتا ہوں۔

(۶)

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَضَبِكَ وَالنَّارِ"

(ترجمہ) اے میرے اللہ! میں تجھ سے تیری رضا اور جنت مانگتا ہوں، اور تیری ناراضی سے، اور دوزخ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

(۷)

"اَللّٰهُمَّ غَشِّنِيْ بِرَحْمَتِكَ وَجَنِّبْنِيْ عَذَابَكَ"

(ترجمہ) اے اللہ! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے، اور اپنے عذاب سے بچا دے۔

(۸)

"يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ"

(ترجمہ) اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اور سب کے تھامنے والے بس تیری رحمت ہی سے فریاد ہے۔

(۹)

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعِفَافَ وَالْغِنٰی ــــ"

(ترجمہ) اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ہدایت کا اور تقوے کا، اور شرم و عار کی باتوں سے بچے رہنے کا، اور محتاج نہ ہونے کا۔

(۱۰)

"اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَسَھِّلْ لَنَا اَبْوَابَ رِزْقِكَ۔"

(ترجمہ) اے اللہ! ہمارے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے، اور رزق کی راہیں ہمارے لئے آسان کر دے۔

یہ سب چھوٹی چھوٹی دعائیں بڑی آسانی سے یاد کی جاسکتی ہیں اور طواف میں پڑھی جاسکتی ہیں[۱]۔ مناسک کی کتابوں میں طواف کے لئے جو خاص خاص دعائیں لکھی گئی ہیں اگر آپ ان ہی کو پڑھنا چاہیں، اور اُن ہی میں آپ کا زیادہ جی لگے تو پھر آپ اُن ہی کو پڑھیں۔ اس لئے ذیل میں ترتیب وار وہ بھی یہاں لکھے دیتا ہوں۔

حجر اسود کا استلام کر کے (یعنی حجر اسود کو بوسہ دے کے یا بجائے اس کے اپنا ہاتھ اُس تک پہنچا کے اور اس کو چوم کے یا اپنی ہتھیلیاں دُور ہی سے اُس کی طرف کر کے اور ان کو چوم کے) جب آپ طواف شروع کریں، اور بیت اللہ کے دروازہ کی طرف چلیں تو سب سے پہلے یہ دُعا پڑھیں:۔

اَللّٰھُمَّ اِیْمَانًا بِكَ وَتَصْدِیْقًا بِكِتَابِكَ	اے اللہ! میں تیرے گھر کا طواف کرتا ہوں
وَوَفَاءً بِعَھْدِكَ وَاِتِّبَاعًا لِسُنَّةِ	تجھ پر ایمان لاتے ہوئے اور تیری کتاب کی
نَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ (صلے اللہ علیہ وسلم)	تصدیق کرتے ہوئے اور تیرے عہد کو پورا

کرتے ہوئے اور تیرے نبی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی سنّت کی پیروی کرتے ہوئے۔

---

[۱] اس عاجز نے قرآن و حدیث سے منتخب کر کے ایسی ہی چالیس مختصر اور جامع دعائیں اپنی کتاب "اسلام کیا ہے؟" کے آخر میں لکھ دی ہیں، جن حضرات کو اور دعائیں یاد کرنے کا شوق ہو وہ وہاں دیکھ کر یاد کرلیں۔ اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ طواف کرتے ہوئے کتاب میں دیکھ دیکھ کر دعائیں پڑھی جائیں۔ ۱۲۔

یہ دعا ملتزم کے سامنے چند قدم میں ختم ہو جائے گی، اور اتنی ہی دیر میں آپ بیت اللہ کے دروازہ کے سامنے پہنچ جائیں گے۔ اُس وقت آپ عرض کریں۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّ هٰذَا الْبَيْتَ بَيْتُكَ وَالْحَرَمُ حَرَمُكَ وَالْاَمْنُ اَمْنُكَ وَهٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ فَاَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ ۔	اے اللہ! یہ گھر تیرا گھر ہے، اور یہ حرم تیرا حرم ہے، اور امن تیرا ہی دیا ہوا امن ہے، اور دوزخ کی آگ سے تیری پناہ پکڑنے والوں کی یہ جگہ ہے، پس تو اپنے کرم سے مجھے بھی دوزخ کے عذاب سے بچا دے۔

اتنے میں آپ "رکن شامی" (بیت اللہ کے شمالی مشرقی گوشہ) کے قریب پہونچ جائیں گے، اُس وقت آپ عرض کریں:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّكِّ وَالشِّرْكِ وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ ۔	اے اللہ! شک اور شرک سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں، اور اختلاف و نفاق اور برے اخلاق سے بھی تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، اور اس بات سے بھی تیری پناہ پکڑتا ہوں کہ اپنے اہل و عیال اور اولاد و اموال میں میری واپسی کسی بُری حالت میں ہو

اب آپ "میزاب رحمت" کے سامنے آجائیں گے، وہاں پہونچ کر آپ عرض کریں:۔

اَللّٰهُمَّ اَظِلَّنِيْ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِكَ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّكَ وَلَا بَاقِيَ اِلَّا وَجْهُكَ وَاسْقِنِيْ مِنْ حَوْضِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرْبَةً لَا اَظْمَأُ بَعْدَهَا اَبَدًا ۔	اے اللہ! قیامت کے جس دن میں تیرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اور تیری ذات پاک کے سوا جب کوئی باقی نہ ہوگا، تو اُس دن مجھے اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیے اور اپنے نبی حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حوض کوثر سے مجھے ایسا پلائیے کہ اُس کے بعد کبھی مجھے پیاس نہ ہو

پھر "رکن یمانی" (بیت اللہ کے جنوبی مغربی گوشہ) پر جب آپ پہونچیں تو اس پر اپنے دونوں ہاتھ پھیریں اور اگر دونوں ہاتھ لگانا مشکل ہو تو صرف داہنا ہاتھ ہی پھیریں، اور خوب دل سے اُس وقت دُعا کریں:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ	اے اللہ! میں دنیا اور آخرت میں تجھ سے معافی اور عافیت مانگتا ہوں۔

پھر رکن یمانی سے "حجر اسود" کی طرف چلتے ہوئے عرض کریں:۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ	اے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی، اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا!۔

پھر جب آپ حجر اسود کے سامنے پہونچیں تو مذکورۂ بالا طریقہ کے مطابق پھر اس کا استلام کریں، یعنی اگر کسی کو تکلیف دیئے بغیر اور خود زیادہ تکلیف اُٹھائے بغیر اُس کو چوم سکیں تو بڑھ کر ادب اور محبت سے چومیں، اور اگر اپنے ہاتھ ہی اُس تک پہونچا سکیں تو دونوں ہاتھ یا صرف داہنا ہاتھ اس کو لگا کر چوم لیں، اور اگر یہ بھی مشکل ہو تو جیسے پہلے بتلایا جا چکا ہے دُور ہی سے حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کے اور اپنی ہتھیلیاں اُس کی طرف کر کے (اس طرح کہ اُس وقت اپنے ہاتھوں کی پشت اپنے چہرہ کے سامنے ہو) بس اپنے ہاتھ ہی چوم لیں۔

یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ طواف میں کانوں تک ہاتھ صرف شروع میں اُٹھائے جاتے ہیں اس لئے اب نہ اُٹھائیں۔ بعض لوگ ناواقفی کی وجہ سے ہر دفعہ اسی طرح ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔

طواف میں حجر اسود سے چل کر جب آپ حجر اسود تک پہونچے تو یہ طواف کا ایک چکر ہوا (جس کو شوط کہتے ہیں)۔ جب آپ ایسے سات شوط (چکر) کرلیں گے تو آپ کا ایک طواف پورا ہوگا۔ ساتویں چکر کے ختم پر بھی آپ کو حجر اسود کا استلام مذکورۂ بالا طریقہ پر کرنا ہوگا۔ اس حساب سے ایک طواف میں حجر اسود کا استلام آٹھ دفعہ ہوگا۔

رکعتینِ طواف:۔

طواف سے فارغ ہو کر آپ مقام ابراہیمؑ کی طرف آیئے اور اس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت ہو "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى" ـــــ اگر سہولت سے مقام ابراہیمؑ کے پیچھے جگہ مل جائے تو وہاں ورنہ آس پاس میں جہاں جگہ مل جائے وہیں طواف کی دو رکعتیں پڑھئے۔ ہر طواف کے ختم پر دو رکعت نماز

پڑھنا واجب ہے، اور اس کے لئے افضل جگہ مقام ابراہیم ہے۔ لیکن وہاں بڑی کشمکش رہتی ہے اور لوگ بڑی نادانی کرتے ہیں، اس لئے اگر وہاں اطمینان سے پڑھنے کا موقع نہ ہو تو اس کے قریب کہیں پڑھ لیں، ورنہ حطیم میں جاکر یا مطاف میں کہیں پڑھ لیں۔

ان دو رکعتوں کے ختم پر خوب خشوع خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ اس موقع کیلئے بھی کوئی دُعا مقرر نہیں ہے۔ مناسک کی اکثر کتابوں میں اس وقت کے لئے ایک دُعا لکھی ہے جو حضرت آدم (علیہ السلام) کی طرف منسوب ہے۔ اس عاجز کے نزدیک یہ دُعا اپنے مضمون کے لحاظ سے یاد کرنے، اور یاد رکھنے کے لائق ہے۔ آپ کو اگر اس کے الفاظ یاد کرنے مشکل ہوں تو مضمون ہی محفوظ کرلیں، اور پھر اپنی ہی زبان میں اللہ سے مانگیں۔ دُعا یہ ہے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ	اے اللہ تو میری سب چھپی کھلی باتیں جانتا ہے
فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِیْ وَتَعْلَمُ حَاجَتِیْ	اور میرے ظاہر باطن سے تو پوری طرح واقف ہے
فَاَعْطِنِیْ سُؤْلِیْ وَتَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ	لہٰذا میری معذرت کو قبول فرمالے، اور میری سب
فَاغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ	حاجتوں اور ضرورتوں کا تجھے علم ہے، لہٰذا
اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ	جو میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ مجھے عطا فرمادے
وَیَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ	اور میرا سوال پورا کردے۔ اور تجھے میرے
لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَ	دل کی باتوں اور نفس کے چھپے ارادوں کی
رِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِیْ یَا اَرْحَمَ	بھی خبر ہے لہٰذا تو میرے گناہ معاف فرمادے۔
الرَّاحِمِیْنَ ؕ	اے اللہ! اے ارحم الراحمین میں تجھ سے ایسا

ایمان چاہتا ہوں جو میرے دل میں اُتر جائے اور بس جائے، اور ایسا سچا یقین تجھ سے مانگتا ہوں جس کے بعد یہ حقیقت مجھ پر پوری طرح کھل جائے کہ صرف وہی حالت مجھ پہ آ سکتی ہے۔ جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے اور میرا دل اس پر بالکل راضی اور مطمئن ہو جائے جو تو نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے۔

ملتزم پر دُعا:۔

طواف کے بعد کے اس دوگانہ اور دُعا سے فارغ ہو کر ملتزم پر آئیے۔ حجر اسود اور باب کعبہ کے

درمیان دو ڈھائی گز کے قریب بیت اللہ شریف کی دیوار کا جو حصہ ہے وہ ملتزم کہلاتا ہے، یہ دعا کی قبولیت کا خاص مقام ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس سے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس طرح لپٹ جاتے تھے، جس طرح بچہ ماں کے سینہ سے لپٹ جاتا ہے۔ اگر موقع ملے (اور انشاءاللہ آپ کو موقع ملے گا) تو اس سے لپٹ جایئے، اپنا سینہ اس سے لگا دیجئے، اور کبھی داہنا اور کبھی بایاں رخسار اس پر رکھیئے اور خوب رو رو کر دعائیں کیجئے، اور کچھ اٹھا کر نہ رکھیئے، جو بھی دل میں آئے مانگیئے، جس زبان میں جی چاہے مانگیئے، اور یہ سمجھ کر مانگیئے کہ ربِ کریم کے آستانہ پر پہونچ گیا ہوں اور اس کی چوکھٹ سے لگا کھڑا ہوں، اور وہ میرے حال کو دیکھ رہا ہے، اور میری آہ وزاری سُن رہا ہے۔

اس موقع پر جہنم سے نجات اور جنّت میں بے حساب داخلہ کی دعا ضرور کیجئے، اور اس دعا کیلئے یہ مختصر الفاظ اگر یاد ہو جائیں تو یاد کر لیجئے:۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ اَعْتِقْ رِقَابَنَا مِنَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ بِغَیْرِ حِسَابٍ ؕ	اے اس قدیمی گھر کے مالک ہماری گردنوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کر دے، اور جنت میں بلا حساب کے محض اپنے کرم اور اپنی بخشش سے ہمیں داخل کر دے

اور اگر آپ یاد کر سکیں تو اس موقع کے لئے یہ چند دعائیہ جملے اس عاجز کو بہت محبوب ہیں :۔

اِلٰھِیْ عَبْدُکَ بِبَابِکَ فَقِیْرُکَ بِبَابِکَ سَائِلُکَ بِبَابِکَ مِسْکِیْنُکَ بِبَابِکَ ذَلِیْلُکَ بِبَابِکَ ضَعِیْفُکَ بِبَابِکَ ضَیْفُکَ بِبَابِکَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ ؕ	خداوندا! تیرا بندہ تیرے در پہ حاضر ہے، تیرا فقیر تیرے در پہ ہے، تیرا منگتا تیرے در پر ہے، تیرا مسکین تیرے دروازہ پر ہے، تیرا ذلیل بندہ تیرے دروازہ پر ہے، تیرا کمزور بندہ تیرے دروازہ پر ہے، تیرا مہمان تیرے دروازہ پر ہے، اے سب جہانوں کے پروردگار۔
اِرْحَمْنِیْ یَا مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْغَفَّارُ وَاَنَا الْمُسِیْئُ وَھَلْ یَرْحَمُ الْمُسِیْئَ اِلَّا الْغَفَّارُ ــــ مَوْلَایَ	رحم کر مجھ پر میرے مولا میرے آقا، تو بہت بخشنے والا ہے اور میں مجرم ہوں، اور بخشنے والا ہی مجرم پر رحم کرتا ہے ــــ میرے مولا

مَوْلَايَ أَنْتَ الْمَالِكُ وَأَنَا الْمَمْلُوكُ
وَهَلْ يَرْحَمُ الْمَمْلُوكَ إِلَّا الْمَالِكُ
—— مَوْلَايَ مَوْلَايَ أَنْتَ الرَّبُّ
وَأَنَا الْعَبْدُ وَهَلْ يَرْحَمُ الْعَبْدَ
إِلَّا الرَّبُّ —— مَوْلَايَ مَوْلَايَ
أَنْتَ الرَّازِقُ وَأَنَا الْمَرْزُوقُ
وَهَلْ يَرْحَمُ الْمَرْزُوقَ إِلَّا
الرَّازِقُ —— مَوْلَايَ مَوْلَايَ
أَنْتَ الْكَرِيمُ وَأَنَا اللَّئِيمُ وَهَلْ
يَرْحَمُ اللَّئِيمَ إِلَّا الْكَرِيمُ
—— مَوْلَايَ مَوْلَايَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
وَأَنَا الذَّلِيلُ وَهَلْ يَرْحَمُ الذَّلِيلَ
إِلَّا الْعَزِيزُ —— مَوْلَايَ مَوْلَايَ
أَنْتَ الْقَوِيُّ وَأَنَا الضَّعِيفُ وَ
هَلْ يَرْحَمُ الضَّعِيفَ إِلَّا الْقَوِيُّ
—— مَوْلَايَ مَوْلَايَ أَنْتَ الْغَفُورُ
وَأَنَا الْمُذْنِبُ وَهَلْ يَرْحَمُ الْمُذْنِبَ
إِلَّا الْغَفُورُ ۔

اَللّٰهُمَّ إِنْ تَرْحَمْنِي فَأَنْتَ أَهْلٌ
وَإِنْ تُعَذِّبْنِي فَأَنَا أَهْلٌ فَارْحَمْنِي
يَا أَهْلَ التَّقْوٰى وَيَا أَهْلَ الْمَغْفِرَةِ
وَيَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ وَيَا
خَيْرَ الْغَافِرِينَ ۔

میرے آقا، تو مالک ہے اور میں تیرا مملوک ہوں
اور مملوک پر اس کا مالک ہی رحم کرتا ہے
—— میرے مولا میرے آقا، تو میرا رب ہے
اور میں تیرا بندہ ہوں، اور بندہ پر اُس کا رب ہی
رحم کرتا ہے —— میرے مولا میرے آقا!
تو رازق ہے اور میں مرزوق ہوں، اور مرزوق
پر رازق ہی رحم کرتا ہے —— میرے مولا،
میرے آقا! تو کریم ہے اور میں لئیم ہوں، اور
لئیم پر کریم ہی رحم کرتا ہے ——
میرے مولا میرے آقا: تو عزت و غلبہ والا ہے
اور میں ذلیل اور پست ہوں، اور ذلیل پر
عزت والا ہی رحم کرتا ہے ——
میرے مولا، میرے آقا! تو قوت والا ہے
اور میں کمزور ہوں، اور قوت والا ہی
کمزور پر رحم کرتا ہے ——
میرے مولا میرے آقا! تو بخشنے والا ہے اور
میں گنہگار ہوں، اور بخشنے والا ہی
گنہگار پر رحم کرتا ہے ۔
خداوندا! اگر تو مجھ پر رحمت فرمائے تو یہ تیری شان کریمی
کے لائق ہے، اور اگر تو مجھے عذاب دے تو بلاشبہ میں اسی
قابل ہوں۔ تو اے مولا میرے ساتھ تو اپنی شان کے
مطابق معاملہ فرما، اور مجھ پر رحم کر، اے تقوی کے قابل
اے مغفرت والے، اے ارحم الراحمین، اے خیر الغافرین۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ قُلْتَ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ وَاِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ؛

اے اللہ! تو نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: مجھ سے دُعا کرو میں قبول کروں گا، اور تو وعدہ خلافی کرنے والا نہیں۔

وَصَلِّ اَللّٰهُمَّ وَسَلِّمْ عَلٰی عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّیَّاتِهٖ وَاَهْلِ بَیْتِهٖ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی لَهٗ وَكَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی ؛

اور اے اللہ! صلوٰۃ و سلام نازل فرما اپنے بندہ اور رسول حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر، اور اُن کے آل و اصحابؓ اور ازواج و ذریات پر، اور اُنکے سب گھر والوں پر۔

یہ بات پھر سُن لیجئے اور یاد رکھئے کہ یہ دُعا، یا کوئی اور خاص دُعا مقرر نہیں ہے، اصل بات وہی ہے کہ دل سے مانگئے، چاہے کسی زبان میں مانگئے، اور دنیا اور آخرت کی ہر ضرورت مانگئے! اپنے لئے مانگئے، اپنے والدین اور دوسرے اعزّہ اور دوستوں اور محسنوں کے لئے مانگئے، اور رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پوری اُمت کے لئے مانگئے۔

زمزم شریف پر :—

ملتزم پر دُعا کر کے زمزم شریف پر آئیے اور قبلہ رو ہو کر بسم اللہ پڑھ کر تین سانس میں خوب ڈٹ کر آبِ زمزم پیجئے، اور الحمد للہ کہہ کر یہ دُعا مانگئے! :—

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً لِّكُلِّ دَاءٍ۔

اے اللہ! مجھے علم نافع نصیب فرما اور وسعت اور فراخی کیساتھ روزی عطا فرما، اور ہر بیماری سے شفا دے۔

یہ نہ بھولئے کہ آپ نے تمتع کا ارادہ کیا ہے اور اس لئے میقات پر آپ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا ہے، اور یہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں عمرہ ہی کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

عمرہ میں احرام کے بعد تین ہی کام کرنے ہوتے ہیں، ایک[1] طواف، دوسرے[2] صفا مروہ کے درمیان سعی،

اور اس کے ختم پر سر منڈانا یا کتروانا ــــــ طواف آپ کر چکے اب آپ کو سعی کرنا ہے جو مسجد حرام سے باہر صفا مروہ کے درمیان ہوتی ہے۔

صفا مروہ کے درمیان سعی :ـ

اب آپ پھر حجر اسود پر آیئے اور اوپر تبلائے ہوئے طریقہ کے مطابق پھر اس کا استلام کیجئے اور صرف یہ استلام کرکے سعی کے لئے مسجد حرام کے دروازہ "باب الصفا" سے باہر نکلئے، نکلتے وقت بایاں قدم پہلے باہر رکھئے اور دعا کیجئے :ـ

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي وَافْتَحْ لِي اَبْوَابَ فَضْلِكَ"

صفا پہاڑی کی سیڑھیاں (جہاں سے سعی شروع کی جاتی ہے) باب الصفا سے بالکل قریب ہیں دو چار منٹ کا راستہ بھی نہیں ہے۔ جب آپ صفا کے قریب پہونچیں تو بہتر ہے کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اتباع میں آپ زبان سے کہیں :ـ

"اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ"

پھر صفا کی سیڑھیوں پر چڑھ جایئے، زیادہ اوپر جانے کی ضرورت نہیں بس پہلی یا دوسری سیڑھی پر بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو جایئے، اس وقت بیت اللہ شریف آپ کی نظر کے سامنے ہوگا۔ اب آپ دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اس طرح اٹھائے جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیجئے، اور اس کی توحید بیان کیجئے ــــــ تیسرا کلمہ :ـ

ــــــ "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ"

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بڑا جامع کلمہ ہے، اس لئے اسی کو تین دفعہ کہہ لیجئے ــــــ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس مبارک اور مقدس مقام تک پہنچایا پھر خوب اطمینان سے دعا کیجئے، اور یہاں بھی جو جی چاہے مانگیے، پھر نیچے اتر کر مروہ کی طرف چلئے اگر آپ بالکل خاموش چلیں گے جب بھی سعی ادا ہو جائے گی، لیکن مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اس وقت کا ایک لمحہ بھی غفلت میں نہ گذاریئے، اور دل و زبان کو برابر ذکر اللہ اور دعا میں مصروف رکھئے، اس وقت کے لئے بھی کوئی دعا حتمی طور پر مقرر نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے یہ مختصر دعا منقول ہے

آپ بھی اس کو یاد کر لیجئے، اور سعی کے دوران میں اسی کو زیادہ ورد زبان رکھئے:-

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ ۔

اے پروردگار! بخشدے اور رحم فرما اور ہماری جو خطائیں تیرے علم میں ہیں اُن سے درگذر فرما تو بہت غالب اور بڑا طاقت ور ہی اور بڑا کریم ہے

صفا سے کچھ دور چل کر دائیں بائیں دو ہرے ستون نظر آئیں گے وہاں سے دوڑ کر چلئے، اس کے بعد پھر ایسے ہی دوہرے ستون اور نظر آئیں گے وہاں پہونچ کر دوڑنا ختم کر دیجئے اور پھر مروہ تک اپنی چال سے چلئے۔ مروہ پر پہونچکر ایک دو سیڑھی چڑھ جایئے اور قبلہ رو ہو کر یہاں بھی اسی طرح دُعا کیجئے جس طرح صفا پر کی تھی ـــــ یہ سعی کا ایک پھیرا ہو گیا، پھر اسی طرح مروہ سے صفا تک سعی کیجئے، یہ دوسرا پھیرا ہو گیا۔ اسی طریقہ پر سات پھیرے پورے کیجئے، ساتواں پھیرا مروہ پر ختم ہوگا۔ ہر پھیرے میں جب صفا یا مروہ پر پہنچا ہو تو وہاں قبلہ رو کھڑے ہو کر اور ہاتھ اُٹھا کر دُعا کیجئے۔ اور صفا مروہ ہی نہیں بلکہ ہر مقام پر اس یقین کے ساتھ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سُننے والے قبول کرنے والے ہیں، اُن کے خزانے میں سب کچھ ہے، وہ سب کریموں سے بڑے کریم ہیں، وہ مجھے اپنے کرم سے محروم نہیں رکھیں گے۔ اور میری دُعا اپنے کرم سے ضرور قبول فرمائیں گے۔

سعی کے بعد سر کے بال منڈوائیے یا کتروائیے :-

سعی کے سات پھیرے کر کے آپ کی سعی بھی پوری ہو گئی، اب آپ اپنے سر کے بال منڈوا دیجئے یا کتروا دیجئے۔

لیجئے عمرہ پورا ہو گیا اور آپ کا احرام ختم ہو گیا، اب احرام کی کوئی پابندی نہیں رہی۔ نہایئے دھویئے، سِلے کپڑے پہنئے، خوشبو لگایئے، اب آپ کے لئے وہ سب چیزیں جائز ہو گئیں جو احرام کی وجہ سے ناجائز ہو گئی تھیں۔

حج سے پہلے مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام کے مشاغل :-

اب انشاء اللہ حج کا احرام آپ آٹھویں ذی الحجہ کو باندھیں گے، اُس وقت تک آپ مکہ معظمہ میں

بغیر احرام کے رہیں گے، اس مدت کے ہر منٹ اور سکنڈ کو غنیمت سمجھئے، فضول اور لایعنی مشاغل میں اپنے وقت کا کوئی حصہ نہ گذاریئے۔

مکۂ معظمہ کے اس زمانۂ قیام میں جہاں تک ہو سکے مسجد حرام ہی میں وقت زیادہ گذاریئے، نہ معلوم پھر کبھی عمر میں یہ سعادت میسر آئے نہ آئے۔ کثرت سے طواف کیجئے، خوب نفل نمازیں پڑھیئے، ذکر و تلاوت کے لئے بھی اس سے بہتر کون جگہ ہو سکتی ہے، اور اگر کسی وقت وہاں بیٹھنا بھی ہو تو محبت اور عظمت کیساتھ بیت اللہ شریف کو بار بار دیکھئے، رب العالمین کی یہ وہ تجلی گاہ ہے جس کی طرف نظر کرنا بھی عبادت ہے اس کی عظمت و رفعت کا اندازہ بس اسی سے کیجئے کہ خاتم الانبیاء والمرسلین سید الاولین والآخرین حضرت محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) بھی اس کا طواف کرتے تھے، اور اسی کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنے کا آپ کو حکم تھا، اور اب قیامت تک کے لئے وہی اور صرف وہی خدا پرستوں کیلئے واحد قبلہ ہے۔

نیز اس زمانہ میں بھی تبلیغ و تعلیم کے کام میں برابر حصہ لیتے رہیئے۔ دین کی تبلیغ و تعلیم کا سلسلہ اسی مسجد حرام سے اور اسی مقدس شہر سے شروع ہوا تھا۔ اگر آپ کی کوشش اور تعاون سے یہاں پھر وہی تبلیغی اور تعلیمی فضا قائم ہو جاتی ہے تو یقیناً آپ کا یہ عمل اللہ کے نزدیک بہت محبوب اور بڑا وزنی ہوگا۔

آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام اور منیٰ روانگی :-

حج کا احرام آپ اگرچہ آٹھویں ذی الحجہ سے پہلے بھی باندھ سکتے ہیں، لیکن سہولت آپ کیلئے اسی میں ہے کہ آٹھویں ہی کی صبح کو باندھیں۔ جہاز میں احرام باندھنے سے پہلے آپ نے جس طرح غسل کیا تھا اسی طرح اب بھی پہلے غسل کیجئے، اور کسی وجہ سے غسل نہ ہو سکے تو صرف وضو ہی کر کے ایک لنگی باندھ اور ایک چادر اوڑھ لیجئے، اس کے بعد مسجد حرام ہی میں پہلے دوگانۂ احرام پڑھیئے (اور جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے، یہ دوگانہ سر ڈھک کر پڑھنا چاہئے) پھر سلام پھیرتے ہی سر کھول کے حج کی نیت کرتے ہوئے تین دفعہ تلبیہ پڑھیئے :-

"لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک"

تلبیہ پڑھتے وقت یہ خیال کیجئے کہ میرے مالک اور پروردگار نے اب سے ہزاروں برس پہلے حضرت ابراہیم کے ذریعہ اپنے بندوں کو حج کا جو بُلاوا دلوایا تھا، اور اپنے گھر کی حاضری کے لئے بلوایا تھا، میں یہ اُس کا جواب عرض کر رہا ہوں، اور اپنے مالک ہی سے عرض کر رہا ہوں، اور وہ سُن رہا ہے، اور میرے اس حال کو دیکھ رہا ہے۔

تلبیہ کے بعد جو جی چاہے دُعا کیجئے، لیکن اس موقع پر خصوصیت سے آپ کو یہ دُعا کرنی چاہئے، کہ:۔

"اے اللہ! میں تیرے حکم کی تعمیل میں اور تیری رضا کے لئے اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کے تیرے در پہ حاضر ہوا ہوں، اور میں نے حج کا احرام باندھا ہے تو اپنی خاص مدد و توفیق سے صحیح طریقہ پر میرا حج ادا کرا دے اور اپنے خاص کرم سے اس کو قبول فرما، اور حج کی خاص برکتوں سے مجھے سرفراز فرما۔ میں تجھ سے بس تیری رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں، اور دوزخ سے اور تیری ناراضی سے تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ مجھے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور عافیت نصیب فرما، اور میری ساری خطائیں معاف فرما۔"

بس نیت کر کے اور تلبیہ پڑھ کے آپ محرم ہو گئے اور احرام کی وہ ساری پابندیاں آپ پر پھر عائد ہو گئیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب آپ دسویں تاریخ کو قربانی کر کے جب سر منڈوا دیں گے یا بال ترشوائیں گے تو آپ کا احرام ختم ہو گا۔ اب آپ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے، ذوق و شوق اور اللہ کی عظمت و محبت کے استحضار کے ساتھ تلبیہ کثرت سے پڑھتے رہیئے۔ عمرہ کے احرام کے بعد طواف شروع کرنے پر تلبیہ کا سلسلہ ختم ہوا تھا، اور اب حج کے اس احرام کے بعد دسویں تاریخ کو جب آپ جمرۃ العقبیٰ کی رمی کریں گے تو اُس وقت تلبیہ کا سلسلہ ختم ہو گا۔

اچھا آج آٹھویں تاریخ کو آپ نے حج کا احرام باندھ لیا، اب آج ہی آپ کو منیٰ جانا ہے۔ منیٰ مکۂ معظمہ سے قریباً تین ساڑھے تین میل ہے، پیدل جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے، اگر ہمت کر سکیں تو بہتر یہی ہے کہ پیدل ہی جائیں، اور چونکہ اب مکۂ معظمہ آپ کی مستقل واپسی بارھویں یا تیرھویں ذی الحجہ کو ہو گی اس لئے ۴، ۵ دن گذارنے کا ضروری سامان بھی اپنے ساتھ لے لیں۔ منیٰ میں اچھا خاصا بازار ہوتا ہے، کھانے پینے کی وہ سب چیزیں وہاں مل جاتی ہیں جو مکۂ معظمہ کے بازاروں میں ملتی ہیں، اس لئے ایسی چیزیں باندھ کے لے جانے کی ضرورت نہیں۔

ایک کارآمد نکتہ :-

منیٰ جاتے وقت، اور اسی طرح منیٰ سے عرفات، وہاں سے مزدلفہ اور پھر وہاں سے منیٰ روانہ ہوتے وقت آپ یہ خیال کریں کہ میرا مولا اب مجھے وہاں بلا رہا ہے، اور بس یہ خیال کر کے وہاں روانہ ہوا کریں۔ اگر یہ بات آپ کو نصیب ہو گئی تو انشاء اللہ اس حالت پھرت اور دوڑ بھاگ میں آپ بڑی لذت پائیں گے۔

منیٰ کے لئے سویرے ہی چل دیجئے تاکہ دھوپ میں تیزی آنے سے پہلے آپ وہاں پہنچ جائیں اور اگر چاہیں تو مسجد خیف میں اچھی جگہ پا سکیں ——— ہاں غفلت نہ ہو راستہ میں شوق و ذوق سے تلبیہ پکارتے چلئے!-

۸ ذی الحجہ کو منیٰ میں آپ کے مشاغل :-

آج منیٰ میں کوئی خاص کام آپ کو نہیں کرنا ہے بلکہ آج کا دن اور آج کی رات (یعنی آٹھویں تاریخ کا دن اور آٹھویں اور نویں ذی الحجہ کی درمیانی رات) یہاں گذارنا ہی بس ایک عمل ہے۔ نمازوں کے وقت پر نمازیں پڑھئے، ذکر و تلاوت کیجئے، دعائیں کیجئے، اور دوسروں کو ان اعمال خیر کی ترغیب دیجئے۔ تبلیغ اور دعوت کا کام کرنے والے اللہ کے بندوں کے ساتھ مل کر اس سعادت عظمیٰ میں بھی ضرور حصہ لیجئے، اور اُس وقت کو یاد کیجئے جب منیٰ کے اسی میدان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کا پیام اور کلمہ لے کر یہاں جمع ہونے والے لوگوں میں پھرا کرتے تھے، اور اللہ کی طرف اور اس کے دین کی طرف ان کو بلایا کرتے تھے۔

نویں کی صبح کو عرفات روانگی :-

نویں ذی الحجہ کی صبح کو سورج نکلنے کے بعد یہاں سے عرفات چلنا ہوگا، عرفات منیٰ سے قریباً چھ میل ہے۔ اللہ کے بہت سے بندے یہ راستہ بھی پیدل طے کرتے ہیں، بلکہ اس کا حق تو یہ ہے کہ سر کے بل طے کیا جائے۔ لیکن اگر آپ کو اپنے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ آپ پیدل گئے تو اتنے تھک جائیں گے کہ

ذکر و دُعا میں جو نشاط اور خوشدلی ہونی چاہیئے خدا نخواستہ وہ حاصل نہ ہو سکے گی، تو پھر آپ کیلئے بہتر یہ ہے کہ آپ سواری سے چلے جائیں۔ موٹروں والے صرف روپیہ دو روپیہ کرایہ لیں گے، اور آپ چند منٹ میں عرفات پہنچ جائیں گے۔

دیکھیئے اس وقت بھی تلبیہ سے غفلت نہ ہو، راستہ میں پکارتے چلئے:۔

لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك لك لبیك، ان الحمد

والنعمة لك والملك لا شریك لك

عرفات کا پروگرام:۔

عرفات پہونچکر اگر آپ اپنے لئے ضروری سمجھیں تو کچھ حرج نہیں ہے کہ زوال سے پہلے کچھ دیر آرام بھی کرلیں، پھر جب زوال کا وقت قریب آئے اور آپ کو غسل کے لئے پانی مل سکے (اور اب بآسانی مل جاتا ہے) تو بہتر یہ ہے کہ غسل کرلیں، لیکن اس غسل میں جسم سے میل اُتارنے کی کوشش نہ کریں، بس سارے جسم پر پانی بہالیں۔ زوال ہوتے ہی مسجد نمرہ میں ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ جماعت سے ہوگی۔ اگر وہاں پہنچ سکیں تو پھر امام کے ساتھ آپ بھی دونوں نمازیں ساتھ پڑھیں، لیکن اگر کسی وجہ سے اس نماز میں شرکت نہ ہو سکے تو پھر ظہر کی نماز ظہر کے وقت پر اور عصر کی عصر کے وقت میں پڑھیں۔

عرفات کے یہ چند گھنٹے سارے حج کا نچوڑ ہیں، خدا کے لئے ان کا ایک لمحہ غفلت میں ضائع نہ کیجئے، یہاں کا خاص الخاص وظیفہ دُعا و استغفار ہے، لیکن ہم جیسے عوام کے لئے دیر تک دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ صرف دُعا میں مشغول رہنا اور اس میں توجہ الی اللہ کا قائم رہنا مشکل ہے، اس لئے اپنے ذوق کے مطابق ذکر و تسبیح تکبیر و تہلیل اور تلاوت کا بھی شغل رکھئے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے تلبیہ بھی کہتے رہیئے، اور جب دُعا کرنی ہو تو اپنی بے بسی و حاجت مندی اور اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرت اور شان کُن فیکون کا استحضار کر کے اور زیادہ سے زیادہ الحاح اور انابت کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر کے اور عرفات میں حاضر ہونے والوں کے لئے مغفرت اور دُعاؤں کی قبولیت کے جو الٰہی وعدے رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اُن کو دل میں حاضر کر کے اور ان کی سچائی کا کامل یقین اپنے دل میں پیدا کر کے پہلے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی اور ہر طرح کے اور ہر منزل کے مواخذہ اور

عذاب سے نجات مانگئے، اور ہمت پڑ سکے تو مغفرت بلا حساب کا سوال کیجئے، اپنی سیاہ کاریوں اور تباہ کاریوں کو یاد کر کر کے روئیے، خوب پھوٹ پھوٹ کے روئیے، اور آج رونے اور مانگنے میں کوئی کمی نہ کیجئے، دنیا اور آخرت کی اپنی سب ضرورتیں مانگئے، اللہ و رسولؐ کے بعد اس دنیا میں آپ کے ماں باپ آپکے سب سے بڑے محسن ہیں اُن کے لئے بھی خوب دُعائیں کیجئے، ان کے علاوہ اپنے اور محسنوں محبوں مخلصوں اور اعزہ و متعلقین کیلئے مانگئے، سب ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے مانگئے ——— اور اس سب کے علاوہ دین کی پھر سے سرسبزی اور سربلندی اور اُس کے ساتھ اپنی اور اپنی نسلوں کی اور سب مسلمانوں کی گہری اور دائمی وابستگی خوب الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگئے ۔ اس موقع پر رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی عمر بھر کی اُن محنتوں کو نہ بھول جائیے جو دین کے پھیلانے اور بندوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنے کی راہ میں آپنے فرمائیں ہمارا ایمان، ہماری نماز، ہمارا حج، اور ہمارا ہر دینی عمل اُس محنت و کاوش ہی کا پھل ہے۔ اس لئے خوب دل سے آپؐ کے لئے اور آپؐ کے آل و اصحابؓ اور ہر زمانہ کے دین کے خادموں کیلئے بھی اللہ تعالیٰ سے رحمت اور رفع درجات کی دعا کیجئے، بہتر ہے کہ یہی آپ کی دُعا کا خاتمہ ہو۔

عرفات میں اپنا ایک مشاہدہ :-

گزشتہ سال جب یہ سیاہ کار وہاں حاضر ہوا تو عرفات کے اسی میدان میں ایک شخص کو دیکھا کہ ظہر کے بعد سے وہ ایک جھاڑی کی آڑ لے کر اور اپنے رفیقوں سے بھی الگ ہو کر ریت کے ایک ٹیلے پر پڑ گیا، ماثورہ دُعاؤں کی کوئی کتاب بھی اُس کے ساتھ تھی (ملّا علی قاری کی "الحزب الاعظم" ہوگی، یا مولانا تھانوی کی "مناجات مقبول") کبھی بلبلا بلبلا کر اس کتاب سے دُعائیں پڑھتا تھا، کبھی کتاب ہاتھ سے رکھ کے اپنی زبان میں اپنی دنیوی اور اُخروی حاجتیں اپنے ربِ کریم سے مانگنے لگتا تھا، کبھی سجدہ میں گر کے آہ و زاری کرتا تھا، ظہر و عصر کے درمیان غالباً کئی گھنٹے اُس کا یہی حال اور یہی شغل رہا۔ اُس کا تڑپنا بلبلانا اور بے تحاشا آنسوؤں کے بہنے سے اُس کی داڑھی اور احرام کی چادر تک کا تر بہ تر ہو جانا، اور الحاح و ابتہال کی ایک عجیب شان کے ساتھ اپنے کریم رب سے اُس کا مانگنا دیکھ کر یقین سا ہوتا تھا کہ جس رب کی صفت رحمان اور رحیم ہے، اور جو اپنی ذات سے جواد، وہاب، اور کریم ہے، وہ اپنے در کے اس منگتا کو محروم واپس کریگا۔

بہرحال عرفات کے میدان میں آج کے دن جس کو الحاح اور ابتہال کی کیفیت میسر آجائے یا اس قسم کی کسی کیفیت کے پیدا نہ ہونے پر جس کا دل ہی ٹوٹ جائے! انشاءاللہ اُس کی کامیابی اور فائز المرامی یقینی ہے ——— یہاں بے اختیار یہ کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ ان کیفیات کے حاصل ہونے کا نام ذریعہ اس دنیا میں ان کیفیات والوں کی محبت اور صحبت ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ حج کو جانے سے پہلے کسی صاحب دل کی خدمت و صحبت میں کچھ وقت گذار کے آپ جائیں۔ ؎

شو ہمدم پروانہ تا سوختن آموزی
با سوختگاں بنشیں شاید کہ تو ہم سوزی

اور الحمد للہ کہ ابھی اللہ کی یہ دنیا اللہ کے ایسے بندوں سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔

جبلِ رحمت کے قریب دُعا :-

جب دھوپ ہلکی پڑجائے تو لبیک لبیک پکارتے ہوئے "جبلِ رحمت" کی طرف جایئے، (جبلِ رحمت عرفات ہی میں وہ جگہ ہے جہاں حجۃ الوداع میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے قیام فرمایا تھا، اور خطبہ ارشاد فرمایا تھا) یہاں بھی خوب دل کھول کے اپنے رب سے دُعائیں مانگیے۔

اپنی مغفرت کا یقین :-

عرفات میں جمع ہونے والوں، دُعائیں مانگنے والوں، اور مغفرت چاہنے والوں کیلئے اللہ پاک کے بڑے بڑے کریمانہ وعدے ہیں، دل میں ان کا استحضار کر کے اور اُن کو یاد کر کے اُن پر یقین کیجئے، اور اپنے نفس کی گندگی اور شرارت اور عمر بھر کے گناہوں کی کثرت کے ذاتی علم کے باوجود اللہ کی غفاری اور کریمی کے بھروسہ پر یقین کر لیجئے کہ اُس نے آج آپ کے گناہوں کو معاف فرمادیا، اور آپ کیلئے مغفرت اور جنت کا فیصلہ کردیا ——— یہ یقین اپنے دل میں پیدا کر کے اُس ربِّ کریم کا شکر ادا کیجئے، اور رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر اور آپ کے اہلبیت اور رفقاء پر درود و سلام پڑھئے کہ انہیں کی رہنمائی اور سعی و کوشش نے آپ کو اللہ سے آشنا کیا، اور ملتِ ابراہیمی سے آپکا رشتہ جوڑا۔

لیجئے "وقوفِ عرفات" جو حج کا رکنِ اعظم ہے (اور اگر خدانخواستہ وہ فوت ہوجائے تو حج ہی فوت ہوجاتا ہے) الحمدللہ آپ کو نصیب ہوگیا۔

حج مبارک! آپ کے اخلاص و محبت سے اُمید کرنے کا اس عاجز کو حق ہے کہ اپنی دُعاؤں میں اس نامۂ سیاہ کو تو آپ یاد رکھیں گے، تاہم مکرر گذارش ہے۔ ع

"وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے"

عام ناظرین سے اس عاجز کی التجا:—

حج کو جانے والے اللہ کے جن بندوں کی نظر سے یہ اوراق گذریں اُن سب سے بھی اس عاجز کی عاجزانہ التجا ہے کہ اس سیاہ کار کے لئے بھی موت کے وقت تک دین و ایمان پر ثابت و قائم رہنے اور دین کی جدوجہد سے وابستہ رہنے کی اور مرنے کے بعد مغفرت و جنت کی دُعا فرمائیں، بڑا احسان ہوگا——
یہ حقیر فقیر آپ سب کی دُعاؤں کا بڑا محتاج ہے، اللہ صدقہ خیرات سمجھ کر ہی اس کو بھی اپنی دُعا و التجا کا کوئی حصہ عطا فرمادیں، کیا عجب کہ آپ ہی کی دُعا سے اس سیاہ کار کا بیڑا پار لگ جائے۔

عرفات سے مزدلفہ:—

جب آفتاب غروب ہوجائے تو مغرب کی نماز پڑھے بغیر یہ تصور کرتے ہوئے کہ اب میرا مولا مجھے مزدلفہ میں بلا رہا ہے اور آج کی رات وہیں اس کی تجلیات کا نزول ہے، تلبیہ پکارتے ہوئے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے عرفات سے مزدلفہ روانہ ہوجائیے۔ یہاں سے مزدلفہ تین میل کے قریب ہے۔——مغرب بعد کے ٹھنڈے وقت میں یہ تھوڑی سی مسافت پیدل بھی آسانی سے طے ہوسکتی ہے، لیکن اگر اس وقت آپ اپنے میں سستی اور تھکن محسوس کریں تو بہتر یہ ہے کہ لاری یا موٹر سے چلے جائیں تاکہ وہاں پہنچ کر نشاط اور جمعیت خاطر کے ساتھ ذکر و عبادت اور دُعا و استغفار میں مشغول رہ سکیں۔
——آج کے دن مغرب کی نماز عشاء کے ساتھ ملاکر یہیں مزدلفہ پہنچکر پڑھی جاتی ہے۔

شبِ مزدلفہ کی فضیلت :-

مزدلفہ کی اسی رات کے متعلق قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے :-

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ	جب تم عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ آؤ تو یہاں مشعر حرام کے پاس اللہ کے ذکر میں مشغول رہو

بتلایا گیا ہے کہ مزدلفہ میں رات کو رہنے والے حجاج کے حق میں یہ رات شبِ قدر سے افضل اور زیادہ قابلِ قدر ہے۔

صحیح روایات میں یہ بھی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے عرفات میں اُمت کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بہت کچھ مانگا تھا، اور سوا ایک چیز کے اور تمام چیزوں کے متعلق قبولیت کی خوشخبری سنا کر آپؐ کو مطمئن کر دیا گیا تھا، لیکن مزدلفہ کی رات میں آپؐ نے اپنے رب سے پورے الحاح اور ابتہال کے ساتھ اُس چیز کا پھر سوال کیا، تو یہاں اُس کی بھی قبولیت کی خوشخبری آپؐ کو سنا دی گئی، اور آپؐ نہایت مسرور اور امت کے انجام سے مطمئن ہوئے، اور شیطان کو آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کی اس دُعا کی قبولیت پر سخت واویلا کر رہا ہے اور اپنے سر پر خاک ڈال رہا ہے۔

بہر حال اس رات کی عظمت اور قدر و قیمت کو یاد رکھئے۔ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ عرفات کے دن بھر کے تھکے ہارے یہاں پہنچ کر نیند سے مغلوب ہو کر پڑ جاتے ہیں اور یہ رات سوتے ہی میں کٹ جاتی ہے، اس لئے آپ اس کا پورا اہتمام کیجئے کہ رحمت اور برکت والی یہ رات کہیں صرف نیند کی نذر ہو کے نہ رہ جائے ——— اگر جسم پر تھکن کا اثر زیادہ ہو اور طبیعت سونے کے لئے مضطر ہو تو پھر یہ بہتر ہو گا کہ یہاں پہنچ کر پہلے مغرب و عشا کی نماز پڑھ کے اور تھوڑی سی دیر اللہ کی تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل اور حمد و شکر کر کے اور اُس کے حضور میں دُعا اور توبہ و استغفار میں مشغول رہ کے کچھ وقت کے لئے شروع رات میں آپ سو جائیں اور پھر اُٹھ کر تہجد پڑھیں اور پھر فجر تک ذکر و فکر میں مشغول رہیں اور پورے الحاح و ابتہال کے ساتھ یہاں بھی عرفات ہی کی طرح دُعا و استغفار کریں اور ربِ کریم سے خوب مانگیں، سر ہو کے، اور رو رو کے مانگیں۔ ان مقامات پر جو بندہ جتنا سر ہو کے اور جتنا لپلپٹ بن کے مانگے، اُس پر اتنا ہی ربِ کریم کا

پیار ہوگا ـــــــ قربان جائیے اس کرم کے کہ ان کو مانگنا اور سر ہو کے مانگنا پسند ہے اور جو اُن سے جتنا مانگے اُتنا ہی ان کو اُس پر پیار آتا ہے۔ انہ برٌّ جوادٌ کریم۔

اور جیسا کہ دوسرے مقامات کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا ہے، عرفات اور مزدلفہ کے لئے بھی کوئی مخصوص دُعا تعلیم نہیں فرمائی گئی ہے اس لئے دنیا اور آخرت کی اپنی ہر ضرورت مانگیے، اور ابھی ابھی عرفات کی دُعا کے سلسلہ میں جن چند چیزوں کی دُعا کا مشورہ عرض کیا گیا ہے اُس کو اِس جگہ بھی پیشِ نظر رکھیے۔

رسُول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ایک خاص دُعا:ـــ

جی چاہتا ہے کہ یہاں رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ایک خاص دُعا بھی لکھ دوں، یہ دُعا اس لائق ہے کہ دل دماغ میں اس کو اچھی طرح محفوظ کر لیا جائے اور ہر خاص مقام اور موقع پر اللہ سے یہ دُعا مانگی جائے ـــــ اللہ اکبر! کیسی درد بھری دُعا ہے اور اللہ کے حضور میں قلب کی شکستگی اور اور عبدیت کا کیسا مرقع ہے:ـــ

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ وَلَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْئٌ مِّنْ اَمْرِيْ وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ اَسْئَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَاَبْتَهِلُ اِلَيْكَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ وَدُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَكَ

اے میرے اللہ! تو میری بات سنتا ہے، اور جس جگہ اور جس حال میں میں ہوں وہ تیری نظر میں ہے، اور میرا ظاہر و باطن سب تیرے علم میں ہے، اور میری کوئی چیز بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے، اور میں سختیوں اور دُکھوں کا مارا ہوا ہوں، تیرے در کا فقیر ہوں، تیرے ہی پاس فریاد لے کے آیا ہوں اور تجھ ہی سے پناہ کا طالب ہوں، تیرا خوف اور ڈر مجھ پر چھایا ہوا ہے، میں اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، میں تجھ سے بے کس اور بے وسیلہ مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں، اور ایک

اَنْفُهٗ - اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَاءِكَ شَقِیًّا وَّ كُنْ لِیْ رَءُوْفًا رَّحِیْمًا - یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ وَ یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ ۝

ذلیل گناہگار بندہ کی طرح تیرے حضور میں گڑگڑاتا ہوں، اور خوف زدہ اور دُکھ درد میں مبتلا کسی بندہ کی طرح تجھ سے دُعا کرتا ہوں، اُس بندہ کی سی دُعا جس کی گردن تیرے سامنے خم ہو، اور جس کے آنسو تیرے حضور میں بہہ رہے ہوں، اور جس کا جسم جھکا ہو، اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو، اور زمین پر سر رکھے پڑا ہو۔ اے میرے اللہ! میری دُعا کو رد کر کے مجھے شقی نہ بنا، اور مجھ پر مہربانی اور رحم فرما، اے سب سے اچھے سب سے بڑے داتا، اے خیر المسئولین۔

مختصر دُعاؤں میں یہ دو دُعائیں خاص طور سے اس لائق ہیں کہ یاد کرلی جائیں، اور ایسے موقعوں پر دل و زبان پر ان کو جاری رکھا جائے ——— ایک :-

"یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ"

یہ مع ترجمہ کے پہلے بھی لکھی جاچکی ہے ——— اور دوسری :-

اَللّٰهُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَ رَحْمَتُكَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ ۝

اے میرے اللہ! تیری مغفرت میں میرے گناہوں سے بہت زیادہ وسعت ہے اور مجھے اپنے اعمال سے بہت زیادہ تیری رحمت سے آسرا ہے

الغرض مزدلفہ کی اس رات میں بھی عرفات کے دن ہی کی طرح دُعا و استغفار کا اہتمام کیجئے، آج کل بکثر لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں اور بظاہر بڑے خسارہ میں رہتے ہیں۔

مزدلفہ سے منیٰ کو روانگی :-

فجر کی نماز مزدلفہ میں اوّل وقت پڑھ لیجئے اور اس کے بعد سورج نکلنے کے قریب تک پھر اللہ کی تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل اور حمد و ثنا میں، اور دُعا و استغفار میں مشغول رہیئے، اور جب سورج نکلنے کا وقت بالکل قریب آجائے تو وہاں سے منیٰ کو روانہ ہوجایئے۔ منیٰ یہاں سے تین میل ہے،

صبح کے ٹھنڈے وقت میں یہ راستہ آسانی سے پیدل طے ہو سکتا ہے۔ روانگی کے وقت یہ تصور کیجئے کہ اب میرا مولا مجھے منیٰ بلا رہا ہے اور اس کا حکم ہے کہ میں وہاں پہنچ کر رمی اور قربانی کروں۔ بہر حال یہ تصور کرکے اور شوق و محبت اور ہیبت و عظمت کی کیفیت اپنے پر طاری کرکے تلبیہ پڑھتے ہوئے اب یہاں سے منیٰ کو روانہ ہو جائیے؛ اور اچھا یہ ہے کہ رمی کیلئے کنکریاں بھی یہاں سے ہی چن لیجئے۔

راستہ میں "وادیٔ محسّر" ایک نشیبی جگہ آئے گی، یہ وہ مقام ہے جہاں ابرہہ کا لشکر اللہ کے حکم سے ہلاک ہوا تھا، یہاں سر جھکائے اور خوف و دہشت کی حالت اپنے اوپر طاری کئے دوڑ کے نکل جائیے۔

منیٰ میں جمرات کی رمی :-

روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کے ارادہ سے لے کر چلے اور منیٰ کی حدود میں پہنچے تو ایک جگہ شیطان سامنے آیا اور اُس نے اس ارادہ سے آپ کو باز رکھنے کی کوشش کی، حضرت ابراہیمؑ نے اُس مردود کے سات کنکریاں ماریں جس سے وہ زمین میں دھنس گیا، اور آپ آگے روانہ ہو گئے۔ کچھ دُور چلے تھے کہ اللہ کا اور اللہ والوں کا وہ دشمن پھر سامنے آیا، اور اُس نے "ناصحِ مشفق" بن کر آپ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے روکنا چاہا، آپ نے پھر اس کو سات کنکریاں ماریں جس سے وہ دفع ہو گیا، آپ آگے چل دیئے۔ کچھ دُور کے بعد تیسری دفعہ وہ پھر نمودار ہوا اور پھر اُس نے ورغلایا، آپ نے پھر اس کو کنکریاں ماریں جس سے وہ پھر زمین میں دھنس گیا ــــــ اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیمؑ کی یہ عاشقانہ ادا ایسی پسند آئی کہ قیامت تک کے لئے اس کی نقل بھی حج کا جز بنا دی گئی ہے ــــــ جن تین جگہوں میں شیطان پر حضرت ابراہیمؑ نے سنگباری کی تھی اُن جگہوں پر بطور نشان کے تین ستون بنے ہوئے ہیں، اور حجاج اب ان نشانوں پر کنکریاں مارتے ہیں، اُن ہی نشانوں کو جمرات کہتے ہیں۔ منیٰ سے مکہ جاتے ہوئے سب سے آخر میں جو جمرہ آتا ہے وہ "جمرۃ العقبیٰ" کہلاتا ہے، اس سے پہلے والا "جمرۃ الوسطیٰ" کہلاتا ہے، اور جو اس سے بھی پہلے مسجد خیف کے قریب واقع ہے اُس کو "جمرۃ الاولیٰ" کہا جاتا ہے۔

پہلے دن یعنی دسویں ذی الحجہ کو صرف "جمرۃ العقبیٰ" کی رمی کی جاتی ہے، اس کے بعد گیارہویں

اور بارھویں اور تیرھویں کو تینوں جمروں کی رمی ہوتی ہے۔

رمی جمرات کے متعلق اس مجمل یادداشت کو ذہن میں رکھ لیجئے، اور اب مزدلفہ سے منیٰ پہنچکر آپ کو جو کچھ اور جس ترتیب سے کرنا ہوگا اُس کو سُنئے:۔

دسویں ذی الحجہ کو صرف جمرۂ عقبیٰ کی رمی:۔

اگر آپ پیدل بھی گئے تو قریباً سوا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں آپ منیٰ پہنچ جائیں گے وہاں پہنچ کر آپ سب سے پہلے جمرۂ عقبیٰ کی رمی کیجئے، سات کنکریاں ہاتھ میں لیکر جائیے اور اس ستون سے ڈھائی تین گز کے فاصلہ پر اس طرح کھڑے ہو کے کہ منیٰ آپ کے داہنی جانب ہو اور مکہ بائیں جانب، انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑ کے سات دفعہ میں سات کنکریاں اس پر ماریئے اور ہر کنکری مارتے وقت کہئے:۔

"بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ رَغْمًا لِلشَّیْطَانِ وَ رِضًی لِلرَّحْمٰنِ۔"

(میں اللہ کا نام لے کر مارتا ہوں، اللہ بہت بڑا ہے، سب سے بڑا ہے۔ میں یہ کنکری مارتا ہوں شیطان کو ذلیل کرنے اور جلانے کیلئے، اور نہایت رحمت والے اپنے پروردگار کو راضی کرنے کے لئے)۔

اگر یہ پورے کلمات یاد نہ ہوں تو صرف "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر ہی کنکریاں ماریئے[1]

تلبیہ ختم:۔

تلبیہ جو آپ اب تک برابر پڑھ رہے تھے اس رمی پر اُس کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اب دوسرے اذکار (تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل وغیرہ) سے اپنی زبان تر رکھئے! لبیك لبیك پکارنے کا اب آپ کو حُکم نہیں رہا۔

آج کے دن بس اسی ایک جمرہ (جمرۃ العقبیٰ) کی رمی کا حکم ہے، اور زوال کے وقت سے پہلے اس کا کر لینا افضل ہے۔

قربانی:۔

رمی سے فارغ ہو کر سیدھے منحر یعنی قربان گاہ جائیے۔ آپ نے حج تمتع کیا ہے، اس کے شکر میں

---

[1] کنکری مارنے کی صحیح جگہ ستونوں کے نیچے کا حصہ ہے، اوپر جو حصہ ہے وہ تو دراصل نشان کیلئے اونچا کر دیا گیا ہے۔ ۱۲

ایک قربانی آپ پر واجب ہے۔ (اسی طرح حجِ قران کرنے والوں پر بھی یہ قربانی واجب ہے، البتہ حجِ افراد کرنے والے پر واجب نہیں ہے، اس کے حق میں صرف مستحب ہے)۔

منیٰ میں لاکھوں (بلا مبالغہ لاکھوں) دنبے، مینڈھے، بھیڑیں، بکریاں، گائیں، اونٹ، اونٹنیاں آپ دیکھیں گے۔ اپنی پسند اور وسعت کے مطابق دیکھ کے خرید لیجئے اور قربانی کیجئے۔

حلق یا قصر:۔

قربانی کے بعد سر منڈوا لیجئے یا بال ترشوائیے (لیکن منڈوانا افضل ہے[1])۔

لیجئے اب آپ کا احرام گویا ختم ہو گیا، اب آپ کو سلے کپڑے پہننے، نہانے دھونے اور خوشبو لگانے وغیرہ کی آزادی ہے۔ البتہ بیوی سے ہمبستر نہ ہونے کی پابندی ابھی آپ کے لئے باقی ہے اور جب آپ طواف زیارت کریں گے تو یہ پابندی بھی ختم ہو جائے گی۔

طواف زیارت اور صفا مروہ کی سعی:۔

حج کے دو ہی اہم رکن ہیں ایک "وقوف عرفہ" ——— دوسرے "طواف زیارت" ——— یہ طواف اگرچہ بارھویں تاریخ کی شام تک بھی کیا جا سکتا ہے لیکن افضل یہی ہے کہ آج ہی کر لیجئے!۔

جب آپ نے قربانی سے فارغ ہونے کے بعد بال منڈوا یا ترشوا لئے تو اب خواہ نہا دھو کے اور سلے کپڑے پہن کے اور خواہ احرام ہی باندھے ہوئے (یہ خیال کرکے کہ اب میرا مولا مجھے اپنے گھر کے طواف کیلئے بلا رہا ہے اور میرے لئے اس کا حکم اس وقت یہ ہے کہ جا کے میں اس کے گھر کا طواف کروں) پورے ذوق شوق کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہو جایئے اور مسجد حرام میں داخلہ کا اور طواف کا جو طریقہ پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اسی کے مطابق اور ان ہی آداب و کیفیات کے ساتھ مسجد حرام میں پہنچ کر طواف کیجئے، اور چونکہ آپ کو اس طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی بھی کرنی ہوگی اسلئے عمرہ والے

---

[1] عورتوں کے لئے بال منڈوانا یا ترشوانا جائز نہیں ان کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ چوٹی کا سرا پکڑ کے صرف ایک انگل بال ترشوا دیں، یا خود تراش دیں۔ ۱۲

پہلے طواف کی طرح اس طواف میں بھی اضطباع اور پہلے تین چکروں میں رمل بھی کیجئے!۔

طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیمؑ کے پیچھے یا اس کے قریب میں حسب سابق دوگانۂ طواف پڑھئے، ملتزم سے چمٹ کر دعا کیجئے، زمزم شریف پر پہنچکر پانی پیجئے اور دعا مانگئے۔ پھر حجر اسود کا استلام کر کے باب الصفا سے نکل کر صفا پر جائیے اور پہلے لکھے ہوئے طریقہ کے مطابق صفا مروہ کے سات پھیرے کیجئے، اور ہر پھیرے میں جب صفا یا مروہ پر پہنچنا ہو تو قبلہ رو ہو کر اطمینان سے دعا مانگئے۔ خصوصاً سعی شروع کرتے وقت پہلی دفعہ صفا پر اور آخری پھیرے میں مروہ پر پورے خشوع خضوع کے ساتھ اور دیر تک اللہ کی حمد و ثنا کیجئے اور خوب الحاح اور ابتہال کے ساتھ اس سے دعائیں مانگئے! ــــ اور جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے سعی کے دوران میں بھی برابر ذکر و دعا میں مشغول رہیئے:۔

"رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ"

لیجئے اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اب آپ طواف زیارت اور اس کے بعد والی سعی سے بھی فارغ ہو گئے، اب احرام کی کوئی بھی پابندی آپ کے لئے باقی نہیں رہی۔

پھر منیٰ کو روانگی :ــ

اس طواف و سعی سے فارغ ہو کر آپ اب پھر سیدھے منیٰ چلے جائیے، کل اور پرسوں یعنی گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو وہاں تینوں جمروں کی آپ کو رمی کرنی ہوگی، بلکہ افضل یہ ہے کہ تیرھویں کو بھی آپ وہاں رہیں، اور اس روز بھی بعد زوال تینوں جمروں کی رمی کر کے مکۂ معظمہ واپس ہوں۔

۱۱-۱۲-۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام اور رمی جمار :ــ

کم از کم دو دن (گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو) منیٰ میں ٹھہر کے تینوں جمروں کی رمی کرنا تو آپ کیلئے ضروری ہے، اور افضل یہ ہے کہ تیرہ کو بھی ٹھہریں اور اس روز بھی رمی کر کے مکۂ معظمہ واپس آئیں۔ ان تینوں دن تینوں جمروں کی رمی زوال کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے سنت ہے۔ تینوں دن رمی کی ترتیب یہ رہے گی کہ منیٰ سے مکۂ معظمہ جاتے ہوئے جو پہلا جمرہ پڑتا ہے (جس کو جمرۃ الاولیٰ کہتے ہیں)، پہلے اس کی رمی کی جائے گی، اس کے بعد اس سے بعد والے جمرہ (جمرۃ الوسطیٰ) کی، اور اس کے بعد

آخری جمرہ (جمرۃ العقبیٰ) کی۔ رمی کا طریقہ بالکل وہی ہوگا جو پہلے دسویں تاریخ کی رمی کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے، البتہ ایک ذرا سا فرق یہ ہوگا کہ دسویں تاریخ کو صرف "جمرۃ العقبیٰ" کی جو رمی آپ کریں گے اس کے بعد دُعا نہیں کریں گے، اور ان تین دنوں میں پہلے اور دوسرے جمرہ کی رمی کے بعد دُعا کرنی چاہئے، لیکن آخری جمرہ کی رمی کے بعد ان تین دنوں میں بھی دُعا نہیں کی جائے گی۔

رمی جمار کے بعد دُعا کی اہمیت :۔

اپنی ناواقفی اور معلمین کے نہ بتلانے کی وجہ سے جن چند چیزوں میں اکثر بیشتر حجاج کوتاہی کرتے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رمی کے بعد دُعا بالکل نہیں کرتے، حالانکہ پہلے اور دوسرے جمرہ کی رمی کے بعد چند قدم آگے بڑھ کے قبلہ رو کھڑے ہو کر اطمینان سے اور دیر تک دُعا کرنی چاہئے، یہ موقع بھی اُن مواقع میں سے ہے جہاں دُعا کی قبولیت کی خاص اُمید ہے۔

منیٰ کے ان دنوں میں آپ کے مشاغل :۔

ان دنوں میں متعین کام تو صرف دو ہی ہیں، ایک[1] منیٰ میں رہنا، خاصکر رات وہیں گذارنا ——— اور دوسرے[2] مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق رمی کرنا ——— باقی اوقات بھی آپ کے غفلت میں اور فضولیات میں ہرگز صرف نہ ہونے چاہئیں ——— یوں تو مومن کی ساری زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور قیامت میں ہم کو اپنی عمر کے ایک ایک منٹ کا حساب دینا ہے، لیکن خاصکر یہ سفر اور اُس کے بھی یہ خاص ایام! اللہ تعالیٰ اگر ایمانی فہم و فراست نصیب فرمائے اور بندہ ان دنوں کی قدر کرے تو بلا مبالغہ ان دو چار دنوں میں لاکھوں برس کی کمائی ہو سکتی ہے ——— نمازیں اہتمام سے پڑھئے! ذکر و دُعا اور توبہ و استغفار سے اپنے اوقات کو معمور رکھئے! ——— اور حقیقی ایمان اور عبدیت والی زندگی کی وہ متاع جو تمام دنیا کو اس ارضِ پاک ہی سے ملی تھی اور جس کو خود مسلمان اب گم کر چکے ہیں اس کا پیام اور اس کی دعوت لے کر حجاج کے خیموں میں پھریئے۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اگر آپ اُن تک یہ پیام نہ پہنچا سکیں تو بھی ہندوستان و پاکستان ہی کے جو بیسوں ہزار مسلمان ان دنوں منیٰ ہی کے اس تنگ میدان میں مقیم ہوں گے اُن تک تو انشاء اللہ آپ یہ دعوت پہنچا ہی سکیں گے

اگر آپ کی اس سعی و کوشش سے دو چار سینوں میں بھی یہ چراغ روشن ہوگیا تو یقین کیجئے کہ آپ نے بہت بڑی کمائی کرلی، اور اگر بالفرض کسی ایک کو بھی آپ متأثر نہ کرسکے تو بھی اپنی سعی و کوشش کے آپ پورے اجر کے مستحق ہوگئے۔

منیٰ میں دینی دعوت کی سنت کا احیاء:۔

منیٰ میں دین کی دعوت کی یہ سنت معلوم نہیں کب سے مردہ تھی، اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائے اور اپنی بے انتہا نعمتوں سے نوازے تبلیغی کام کرنے والے اپنے ان بندوں کو جنھوں نے گذشتہ دو تین سال سے اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ملک کے مسلمانوں میں اس کام کی عظمت و اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا کرے، اور جلدی وہ دن آئے کہ ہر ملک کے مسلمان تبلیغی وفود اور جماعتوں کی شکل میں منیٰ میں خیمہ خیمہ پھرا کریں، اور راتوں کو اس مقصد کے لئے اللہ کے سامنے رویا کریں ـــــ یہ کام جس طرح ہونا چاہئے اگر اُس طرح ہونے لگے تو صرف منیٰ کے ان تین دنوں کی محنت سے سارے عالمِ اسلامی میں ایک نئی زندگی اور نئی رُوح انشاء اللہ پیدا ہوسکتی ہے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

بہرحال اس عاجز کا جناب کو یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس کام کو نفلی اذکار و عبادات سے افضل یقین کرکے ضرور اس میں پورا حصہ لیں۔ اس کام کے ساتھ اور اس کے ضمن میں اللہ کا جو ذکر ہوگا انشاء اللہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس ذکر سے بہت زیادہ ہوگا جو اس کام سے بے تعلق رہ کر ہو۔

بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ گذشتہ سال جب اس عاجز کو حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی، تو اپنی ایک مخصوص حالت کی وجہ سے میں اس کام میں بہت کم حصہ لے سکا تھا، لیکن اب مجھے اس پر افسوس ہے، اور اس تجربہ کے بعد اور اس کی تلافی ہی کی نیت سے میں اس قوت کے ساتھ آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں۔

حج قِران اور اِفراد:۔

ایک ضروری بات عرض کرنے سے رہ گئی، خیر اُس کو اب عرض کرتا ہوں۔ میں نے اِس خط کے ابتدائی صفحات میں لکھا تھا کہ حج کی تین۳ صورتیں ہیں۔ تمتّع۱ ـــ قِران۲ ـــ اِفراد۳۔

میں نے جو صورت گزشتہ صفحات میں لکھی ہے یہ حج تمتع کی صورت ہے۔ چونکہ آپ کے لئے میں نے اسی کو مناسب سمجھا، اور (اکثر لوگوں کے لئے وہی آسان اور بہتر ہے) اس لئے تفصیل سے میں نے اُس کو لکھ دیا ہے۔ اس میں، اور باقی دونوں صورتوں (قرآن اور افراد) میں معمولی سا فرق ہے۔

قران اور تمتع میں تو یہ فرق ہے کہ تمتع میں میقات پر صرف عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے اور مکہ معظمہ پہنچ کے عمرہ کرکے احرام کھول دیا جاتا ہے، اور حج کے لئے پھر وہیں سے دوسرا احرام باندھ لیا جاتا ہے ——— اور قرآن میں میقات پر عمرہ اور حج دونوں کا احرام ساتھ باندھا جاتا ہے، وہ اسی ایک احرام سے دونوں کو ادا کرنے کی نیت ہوتی ہے۔ چنانچہ قارن مکہ معظمہ پہنچ کے عمرہ کرتا ہے لیکن عمرہ کا طواف اور سعی کر لینے کے بعد وہ بال نہیں منڈواتا بلکہ اسی طرح احرام کی حالت میں رہتا ہے، یہاں تک کہ آٹھویں ذی الحجہ کو مکہ معظمہ سے منیٰ جاتا ہے اور آگے اس کا سارا پروگرام بھی وہی ہوتا ہے جو تمتع کرنیوالے حاجی کا ہوتا ہے۔

اور افراد کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میقات پر صرف حج کا احرام باندھا جاتا ہے اور اُس احرام سے بس حج ہی کیا جاتا ہے۔ حج سے پہلے عمرہ نہیں کیا جاتا۔ افراد کرنے والا حاجی بھی جو احرام میقات پر باندھتا ہے وہ حج سے پہلے نہیں کھلتا، اور دسویں تاریخ کو جمرۂ عقبیٰ کی رمی کرنے تک احرام کی ساری پابندیاں اس پر عائد رہتی ہیں[1] ——— ان تینوں صورتوں کے حج کے اعمال اور پروگرام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ——— اگر ضرورت پڑے تو اس سے زیادہ تفصیل مناسک کی کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

منیٰ سے مکہ معظمہ واپسی اور چند روزہ قیام :—

جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں ۱۲ ذی الحجہ کو زوال کے بعد رمی کرکے اگر آپ چاہیں تو مکہ مکرمہ واپس ہو سکتے ہیں لیکن افضل یہ ہے کہ ۱۳ کو بھی رمی کریں، اور اس کے بعد مکہ معظمہ واپس آئیں ——— لیجئے اللہ کا شکر ادا کیجئے، اُس نے آپ کا حج پورا کرا دیا، اب حج کے سلسلہ کا کوئی خاص کام آپکے ذمہ باقی نہیں رہا ہے، اور بس اتنا کہ جب آپ مکہ معظمہ سے رخصت ہونے لگیں تو ایک رخصتی طواف کرکے جائیں، اس کے سوا اب آپ سے شریعت کا کوئی خاص مطالبہ نہیں ہے اس لئے آپ چاہیں تو آج ہی مکہ معظمہ سے روانہ ہو سکتے ہیں لیکن نہ آپ اتنی عجلت کریں گے، اور نہ اتنی جلدی آپ کی روانگی کا کوئی انتظام ہی ہو سکے گا، اس لئے لامحالہ

---

[1] [illegible] اجازت لے لی جائے۔ ۱۲

آپ کو ابھی مکۂ مکرمہ میں ٹھہرنا ہوگا ـــــ ٹھہریئے اور پوری خوشدلی سے ایک ایک دن کو غنیمت اور اللہ کی نعمت سمجھ کے ٹھہریئے ـــــ (بعض لوگوں کو دیکھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد جانے کے لئے اتنے بیتاب اور بیقرار ہوتے ہیں کہ انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے جتنے دنوں مجبوراً ان کو ٹھہرنا پڑتا ہے اُس زمانہ کے ایک ایک دن کو وہ مصیبت سمجھتے ہیں اور سخت بددلی اور شکووں شکایتوں کے ساتھ وہ یہ ایام گذارتے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، یہ بڑی بُری علامت ہے) ـــــ اگر بالفرض روانگی کا انتظام ہو جائے تو جلدی جانے میں کوئی حرج نہیں، اور اپنے احوال و مصالح کے مطابق جلد روانگی کی کوشش میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اللہ کے مقدس اور محترم شہر سے دل کا اُچاٹ ہونا اور معاذ اللہ بددلی کی کیفیت کا پیدا ہو جانا بہت بُری حالت کی نشانی ہے ـــــ مومن کا حال تو یہ ہونا چاہئے کہ برسوں رہ کے جی نہ بھرے اور دل سے یہی آواز آتی رہے ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جانِ مضطر
کہ مبادا بارِ دیگر نہ رسی بدیں تمنا

مکۂ معظمہ میں اب آپ کے مشاغل:-

بہرحال اب جتنے دنوں آپ کو مکۂ معظمہ ٹھہرنا ہو پوری خوشدلی سے رہیئے، اور اللہ تعالیٰ کا بیحد شکر ادا کیجئے کہ اُس نے آپ کو یہ موقع نصیب فرما رکھا ہے۔

دن میں اور رات میں جتنے ہو سکیں روز نفلی طواف کیجئے، تنعیم یا جعرانہ جا جا کر اور وہاں سے احرام باندھ کے نفلی عمرے کیجئے، اپنی طرف سے، اپنے والدین کیطرف سے اپنے خاص محسنوں اور محبوبوں کی طرف سے، غرض جس کی طرف سے دل چاہے کیجئے۔

مسجد حرام میں نفل نمازیں پڑھیئے! عمر بھر ہزاروں میل کے فاصلہ سے جس کعبہ کی طرف منہ کر کے غائبانہ نمازیں ابتک پڑھتے رہے ہیں، اور آئندہ بھی اگر زندگی رہی تو یونہی انشاء اللہ پڑھتے رہیں گے، اب اللہ نے موقع دیا ہے کہ اُس کے بالکل سامنے اور اس کی دیوار کے نیچے کھڑے ہو کے نمازیں پڑھیں، اس لئے عمر بھر کی حسرت نکال لیجئے۔ جس کعبہ کے گرد حضرت ابراہیمؑ سے لیکر خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تک نہ معلوم کتنے سَو یا کتنے ہزار انبیاء (علیہم السلام) نے، اور اُن کے بعد سے ابتک نہ معلوم کتنے لاکھ اور کتنے کرور اولیاء اللہ نے طواف کئے، اور ان طوافوں میں جنت سے اُتارے ہوئے جس پتھر (حجرِ اسود) کو بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ بوسے دیئے، اور جہاں جہاں انھوں نے نمازیں پڑھیں (اور یقیناً کعبۃ اللہ کے اردگرد کی بالشت بھر زمین بھی ایسی نہیں جس پر انبیاء علیہم السلام

اُن کے اصحاب کرام یا اولیاءِ عظام میں سے کسی کی پیشانی نہ ٹکی ہو۔ اب اللہ نے آپ کو موقع دیا ہے کہ چاہیں تو دن رات اللہ کے اُس مقدس بیت کا طواف کریں، حجرِ اسود جو اس دنیا میں "یمین اللہ" (اللہ کے مقدس ہاتھ) کے گویا قائمقام ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس کو رو رو کر چوما کرتے تھے۔ اللہ نے آپ کو موقع نصیب فرمایا ہے کہ آپ بھی اُس کو چومیں، اور اس پر آنسو بہائیں۔ اور جس ملتزم سے (یعنی کعبہ کے جس حصہ سے) چمٹ کر، اور اپنے رخسارِ مبارک اس پر رکھ رکھ کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعائیں کیا کرتے تھے، اب آپ کے لئے بھی موقع ہے کہ چاہیں تو دن میں کئی کئی دفعہ اُس سے چمٹ چمٹ کر روئیں اور دعائیں کریں ــــ اسی طرح حطیم میں (جو دراصل کعبۃ اللہ ہی کا ایک حصہ ہے) اور مطاف میں جہاں کھڑے ہو کر چاہیں نمازیں پڑھیں، یا مسجد حرام میں بیٹھے بیٹھے کسی وقت اللہ کے گھر کو عظمت اور محبت کی نظر دل سے دیکھا ہی کریں ــــ غرض یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو مکہ معظمہ سے چلے جانے کے بعد آپ کو کبھی نصیب نہ ہوسکیں گی، اس لئے موقع کو غنیمت جانئے اور اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کو جس قدر لوٹ سکیں لوٹئے۔ ؎

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اسی زمانۂ قیام میں دینی دعوت و تبلیغ کے کام میں بھی حصہ لیتے رہیئے، اور اس کام کے کرنے والوں سے ساتھ پورا تعلق اور تعاون رکھئے! آپ کی ذاتی عبادات سے دعوت کے کام میں طاقت و برکت اور نورانیت پیدا ہوگی، اور دعوت اور دین کی جدوجہد چونکہ انبیاء علیہم السلام کی خاص میراث ہے، اور اللہ کے یہاں بہت ہی محبوب اور مقبول عمل ہے، اس لئے اُمید ہے کہ دعوت کے کام میں آپ کی شرکت کی برکت سے آپ کی یہ ذاتی عبادات انشاء اللہ زیادہ محبوب اور زیادہ مقبول ہو جائیں گی۔

بیت اللہ کا داخلہ:۔

ایام حج میں کسی کسی دن گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے بیت اللہ شریف کا دروازہ بھی مشتاقان زیارت کیلئے کھولا جاتا ہے، اور اگرچہ یہ داخلہ زیادہ سے زیادہ مستحب درجہ کا عمل ہے، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اسکی وجہ سے کسی کو اذیت اور تکلیف کا ارتکاب نہ ہو، لیکن عام حجاج اپنی ناواقفی اور شوق کی زیادتی کی وجہ سے اس کے انتہائی درجہ میں شائق ہوتے ہیں اور خدا کی پناہ کہ شریعت کے احکام اور اللہ کی رضامندی اور ناراضی

گویا بالکل بے پرواہ ہو کر اپنا یہ شوق پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ پر بھی اس شوق کا غلبہ ہو، اسلئے عرض کئے دیتا ہوں کہ لے دے کے داخل ہونا درست نہیں ہے، علیٰ ہذا عام طور سے لوگ جیسی کشمکش اور دھینگا مشتی سے داخل ہوتے ہیں وہ بھی سخت بے ادبی ہے، اس لئے ان برائیوں کے ساتھ داخل ہونے کی تو ہرگز کوشش نہ کیجئے گا ——— البتہ اگر اللہ تعالیٰ ایسی کوئی صورت پیدا فرما دیں کہ ان برائیوں سے محفوظ رہتے ہوئے آپ اندر جا سکیں تو نعمت اور سعادت سمجھ کر جائیں، اور ان چند باتوں کا خیال رکھیں ——— بہت خشوع خضوع کے ساتھ اور اللہ کی عظمت و ہیبت دل میں لئے ہوئے داخل ہوں، "بسم اللہ" کہہ کے پہلے داہنا پاؤں اندر رکھیں اور عرض کریں "اللھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتك"۔ نظر نیچی رکھیں، اوپر کی جانب اور ادھر اُدھر نہ دیکھیں کہ یہ ادب کے خلاف ہے ——— دروازہ سے داخل ہو کر سیدھے آگے کی طرف چلیں اور سامنے والی دیوار جب قریباً دو ڈیڑھ گز رہ جائے تو وہاں کھڑے ہو کے دو رکعت یا چار رکعت نفل نماز پڑھیں اور دُعا مانگیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اسی جگہ نماز ادا فرمائی تھی۔ اور اگر معصیات و منکرات سے بچ کر داخلہ کی صورت نہ ہو تو پھر داخل نہ ہونے میں اللہ کی رضا سمجھیں، اور دل کی چاہت کے باوجود اندر نہ جائیں۔ عبدیت اور محبت کا یہی تقاضا ہے۔ ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کارِ خود گرفتم تا بر آید کارِ او

صحیح روایات کی بنا پر حطیم کعبہ ہی کا جز ہے، اس میں نماز پڑھنا اور دُعا کرنا گویا کعبہ ہی میں نماز پڑھنا اور دعا کرنا ہے، لہٰذا اسی پر قناعت کریں۔

خاص مقامات میں دُعا کے متعلق ایک آخری مشورہ :—

حج کے سلسلہ میں جو کچھ آپ کے لئے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اُس سے بہت زیادہ لکھا گیا، جی چاہتا ہے کہ خاص مقامات میں دُعا کے متعلق ایک آخری مشورہ اور عرض کر دوں اور حج کا بیان اسی پر ختم کر دوں۔ اس عریضہ سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں مطاف، مقامِ ابراہیم، ملتزم، رکن یمانی، حطیم، زمزم شریف، خود بیت اللہ شریف، صفا، مروہ، اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کی مسافت

جس میں سعی کی جاتی ہے یعنی مسعیٰ - اور پھر عرفات، مزدلفہ اور منیٰ ہیں جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ وسطیٰ کے قریب کی جگہ، یہ سب دعاؤں کی مقبولیت کے خاص مقامات ہیں جہاں سیدنا حضرت ابراہیمؑ اور خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) اور اُن کے علاوہ بس اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے سو یا کتنے ہزار پیغمبروں نے اور کتنے لاکھ یا کتنے کرور اُس کے دلیوں نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق کیسے کیسے الحاح اور ابتہال کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگی ہیں اور کیسے تڑپتے ہوئے دل سے اُس کو یاد کیا ہے۔

آپ بھی انشاء اللہ ان مقامات پر پہنچیں گے اور اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کریں گے، تو ان مقامات کی دُعاؤں کے متعلق میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ ان جگہوں پر آپ جو اور دُعائیں کریں، اُن کے ساتھ ایک دُعا یہ بھی کریں:-

"اے اللہ! تیرے برگزیدہ اور مقبول بندوں نے اس مقام پر تجھ سے جو جو دُعائیں کبھی کی ہیں اور جن جن چیزوں کا تجھ سے سوال کیا ہے اے میرے نہایت رحیم و کریم پروردگار! میں اپنی نااہلیت اور نالائقی اور سیاہ کاری کے اقرار کے ساتھ صرف تیری شانِ کرم کے بھروسہ پر اُن سب چیزوں کا اِسی جگہ تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور جن جن چیزوں سے انھوں نے اس مقام پر تجھ سے پناہ مانگی ہیں اسی جگہ اُن سب چیزوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں —— اے اللہ اس خاص مقام کے جو خاص انوار و برکات ہیں مجھے اُن سے محروم نہ رکھ، اور یہاں حاضر ہونے والے اپنے اچھے بندوں کو تو نے جو کچھ کبھی عطا فرمایا ہو یا جو کچھ تو ان کو عطا فرمانے والا ہو مجھے بھی اس میں شریک فرمائے، اور اس کا کوئی ذرہ مجھے بھی نصیب فرمائے، تیرے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔"

اور اگر یاد رہے تو اس سیاہ کار کو بھی اس دُعا میں شریک فرمالیں۔ (اور بھی جن جن حضرات کی نظر سے یہ سطریں گذریں اُن سے بھی بڑی عاجزی کے ساتھ اس عاجز و عاصی کی یہی استدعا ہے)۔ ع "وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے"

مکہ معظمہ سے روانگی اور طواف رخصت:-

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ایک رخصتی طواف کیا جاتا ہے۔ آفاقی یعنی بیرونی حجاج کے لئے یہ طواف واجب ہے لیکن اگر طواف زیارت کے بعد کسی نے کوئی نفل طواف کرلیا اور

رخصتی طواف کئے بغیر ہی وہ مکۂ معظمہ سے روانہ ہوگیا تو یہ نفلی طواف ہی طوافِ رخصت کے قائمقام ہو جاتا ہے، لیکن اصل یہی ہے کہ روانگی کے دن بلکہ اچھا ہے کہ خاص روانگی کے وقت وداع اور رخصت کی نیت سے یہ آخری طواف کیا جائے۔ اس کا طریقہ بھی وہی ہے جو پہلے لکھا جا چکا ہے — البتہ اس کی خصوصیت کا تقاضا ہے کہ بیت اللہ شریف جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خاص الخاص تجلّی گاہ ہے، اور عمر بھر کی تمناؤں کے بعد جس تک پہنچنا نصیب ہوا تھا، اُس کے فراق اور جدائی کا خیال کرکے اور یہ سوچ کے کہ نہ معلوم یہ سعادت اور دولت پھر کبھی میسر آئے گی یا نہیں، اس طواف کے وقت زیادہ سے زیادہ حزن وملال کی کیفیت اپنے دل میں پیدا کی جائے، اور اللہ نصیب فرمادے تو روتے ہوئے دل اور بہتی ہوئی آنکھوں کیساتھ طواف کیا جائے۔ طواف ختم کرکے حسبِ معمول مقامِ ابراہیمؑ پر دوگانۂ طواف پڑھا جائے، دُعا کی جائے اور دُعا کے وقت بھی دل میں یہ فکر ہو کہ معلوم نہیں اس کے بعد بھی اس مقدس اور محترم مقام میں سجدہ کرنے اور اللہ کے حضور میں ہاتھ پھیلانے کی سعادت کبھی میسر آئے گی یا نہیں — پھر زمزم شریف پہ جاکر "بسم اللہ والحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ" پڑھ کر تین سانس میں خوب سیر ہوکر پانی پیجئے اور دُعا کیجئے: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَشِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ" اس کے بعد اور جو جی چاہے دُعائیں کیجئے — پھر ملتزم پر آئیے اور آج وداع و رخصت ہی کی نیت سے اُس سے لپٹ لپٹ کے خوب روئیے اور پورے الحاح وابتہال سے دُعا کیجئے۔ حج کی مقبولیت مانگئے، مغفرت مانگئے، دنیا اور آخرت کی عافیت مانگئے، عذاب سے نجات اور جنت مانگئے، اللہ کی رضا مانگئے، اور اپنے علاوہ اُن سب کے لئے بھی مانگئے جن کے لئے آپ کو مانگنا چاہئے۔ اور ہاں اس موقع پر خوب رو رو کے اور بلک بلک کے یہ دُعا بھی مانگئے کہ:۔ "خداوندا! میری یہ حاضری آخری حاضری نہ ہو، اس کے بعد بھی بار بار مجھے اس در کی حاضری کی توفیق بخشی جائے۔"

ملتزم سے ہٹ کر اب حجرِ اسود پر آئیے اور آخری دفعہ وداع کی نیت سے اس کو بوسہ دیجئے، اگر اس موقع پر آپ کی آنکھیں چند قطرے گرا دیں تو بڑی مبارک ہیں۔ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے حجرِ اسود کا بوسہ لیتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:۔

هُنَا تُسْكَبُ الْعَبَرَاتُ — یہ آنسوؤں کے بہنے کی جگہ اور موقع

بس حجرِ اسود کو یہ آخری بوسہ دے کے حسرت سے بیت اللہ کو دیکھتے ہوئے آنکھوں سے روتے ہوئے، اور

دل وزبان سے ربِ کعبہ کو یاد کرتے اور اس سے دُعا کرتے ہوئے، اور مسجد حرام اور بیت اللہ کے آداب اور حقوق کے بارے میں جو کوتاہیاں اس عرصہ میں ہوئیں اُن کی معافی مانگتے ہوئے مسجد حرام سے نکلئے۔ حسبِ قاعدہ بایاں پاؤں پہلے نکالئے اور دُعا کیجئے :-

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي ذُنُوبِي وَافْتَحْ لِي اَبْوَابَ فَضْلِكَ"

اب آپ کو بیت اللہ کی جدائی پر دلی رنج ہونا چاہئے، اور آپ کے قلبِ محزون کا یہ احساس ہونا چاہئے کہ ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

لیکن کعبۃ اللہ کی صحیح تصویر آنکھ کے راستہ سے آپ کے دل ودماغ میں اُتر چکی ہے بس اُسی کو اب سب سے قیمتی تحفہ اور اپنے سفر کی عزیز ترین یادگار تصور کیجئے، اور جب جی چاہے اُسی کے توسط سے تصوّر کے عالم میں کعبہ میں پہنچ جایا کیجئے۔ ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ

ایک ضروری بات :-

اس خط میں حج کا طریقہ اگرچہ بحمداللہ مکمل طور پر آگیا ہے، تاہم ممکن ہے کہ آپ سے اعمالِ حج کی ادائگی میں کوئی غلطی اور کوتاہی ہو جائے، اور آپ کو اسکی تصحیح اور تلافی کی ضرورت ہو تو اس مقصد کیلئے آپ کسی مستند عالم سے رجوع کریں، یا مناسک کی کسی معتبر کتاب میں مسئلہ دیکھ لیں ــــ مناسک یعنی حج کے مسائل پر اُردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں مولٰنا سعید احمد صاحب (مفتی مظاہر علوم سہارنپور) کی تصنیف "معلم الحجاج"[1] بہت جامع اور مستند کتاب ہے ــــ اور اب خود مفتی صاحب ممدوح نے کم تعلیمیافتہ حضرات کیلئے اسکا خلاصہ بھی کردیا ہے، اکثر پیش آنے والے مسائل اسمیں بھی آگئے ہیں ــ "حج کا مسنون طریقہ"[2] اس کا نام ہے۔

---

[1][2] "معلم الحجاج" کی قیمت [illegible] اور "حج کا مسنون طریقہ" کی قیمت (۱/) ــ دونوں کتابیں کتب خانہ الفرقان سے مل سکتی ہیں۔

زیارتِ مدینہ

مدینہ مدینہ، مدینہ مدینہ　　مدینہ مدینہ، مدینہ مدینہ

دلا خاک رہِ کوئے محمدؐ شو محمدؐ شو

زہر سوئے بیا سوئے محمدؐ شو محمدؐ شو

مدینۂ طیبہ کو روانگی :-

مکۂ معظمہ کی جدائی اور فراق کے رنجدہ اور غم انگیز خیال کو اب آپ مدینۂ طیبہ اور مسجد نبویؐ کی حاضری اور روضۂ مطہر کی زیارت اور بارگاہِ نبوت کی حضوری کے مسرت بخش اور نہایت لذیذ تصور سے بدل دیجئے، اور مست ہو ہو کر آپؐ پر درود و سلام پڑھئے :-

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

عَدَدَ مَا تُحِبُّ تَرْضٰی

مدینۂ طیبہ کے راستہ میں محبتِ نبویؐ کو بیدار اور مشتعل کرنے کیلئے اگر آپ کو ذوق ہو تو نعتیہ اشعار پڑھیئے (اس کام کیلئے زائرِ حرم حمید صدیقی صاحب کا مجموعۂ کلام "گلبانگِ حرم" خاص چیز ہے) - نیز گذشتہ سال کے حج نمبر میں، اور اس نمبر میں بھی حُبِّ نبویؐ کو برانگیختہ کرنے کا نثر اور نظم دونوں میں بحمداللہ کافی سامان جمع ہو گیا ہے۔

مدینۂ طیبہ میں داخلہ اور مسجد نبویؐ میں حاضری :-

مدینۂ طیبہ کے راستہ کی آخری منزل ذوالحلیفہ (بیر علی) ہے، جہاں سے مدینۂ طیبہ غالباً صرف ۵، ۶ میل رہ جاتا ہے زائرین کو لے جانے والی اکثر لاریاں یہاں ٹھہرتی ہیں، اگر آپ کو بھی ٹھہرنے کا موقع ملے تو بہتر ہے کہ آپ یہیں غسل کرلیں، اور اگر غسل نہ کرسکیں تو وضو ہی کرلیں، اور جو اچھا لباس آپ کو میسر ہو وہ پہن لیں، خوشبو لگالیں، اور ذوق و شوق کی بیتابی کے ساتھ درود و سلام پڑھتے ہوئے آگے بڑھیں۔

گنبدِ خضرا پر پہلی نظر:- ۵

تورا گنبد گول کلس من بھاون دُور سے پیارے دیکھ جو لوں
وہیں سیس نوا دوں، جان گنوا دوں، من بیچ یہی سمایت ہے

ذوالحلیفہ سے موٹر روانہ ہونے کے بعد چند ہی منٹ میں مدینۂ طیبہ کی آبادی نظر آنے لگے گی، اور ہر مومن کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور "گنبدِ خضرا" سبز نگینہ کی طرح آبادی کے بالکل وسط میں آپ کی خوش نصیب آنکھوں کے سامنے ہوگا اُسوقت پوری محبت اور رقت کے ساتھ درود و سلام پڑھیے، اور اللہ سے دُعا کیجئے، کہ:-

"اے اللہ! یہ تیرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا محبوب شہر ہے، اور تیرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیرے حکم سے اِس کو حرم قرار دیا ہے، اسمیں میرے داخلہ اور میری حاضری کو تو ہر قسم کے عذاب سے امان کا ذریعہ بنا!"

"میں جاؤں سر کے بل یثرب نگر یا آرزو دارم":-

ذرا بھی اگر راضی ہو جائے اور وادیٔ عقیق میں (بیر عروہ کے پاس) اُتارنے پر تیار ہو جائے تو یہاں سے پیدل چلئے، اور اللہ کے محبوب کے محبوب شہر میں عشق و نیاز کی مرکب کیفیات کیساتھ داخل ہو جیئے!-

مدینۂ طیبہ کے جس دروازہ سے آپ کا داخلہ ہوگا اُس کا نام "بابُ العنبریہ" ہے۔ اُس میں داخل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر پورے خشوع خضوع کے ساتھ عرض کیجئے:-

"بِسْمِ اللّٰهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ، لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"

پھر چلتے ہی چلتے دُعا کیجئے:-

"اے اللہ! اپنے جس کرم سے تونے مجھے یہ مبارک دن دکھایا ہے کہ میں تیرے حبیب کے محبوب شہر میں داخل ہو رہا ہوں، اسی کرم سے تو مجھے یہاں کی خاص برکتیں عطا فرما، اور اُن تمام باتوں سے میری حفاظت فرما، جو یہاں کی برکات سے محرومی کا باعث ہوتی ہیں"

شہر میں داخل ہونے کے بعد اسباب کی حفاظت کا کوئی بند و بست کر کے (اور اگر داخلہ سے پہلے غسل یا وضو کر کے کپڑے بدلنے کا موقع نہ ملا ہو تو اب غسل یا وضو ہی کر کے اور کپڑے بدل کے) سب سے پہلے مسجد نبوی کی طرف آئیے،

اور "بِسْمِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" کہہ کے ظاہر و باطن کے پورے ادب کے ساتھ داہنا پاؤں پہلے اندر رکھئے، اور عرض کیجئے :-

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"

سب سے پہلے مسجد شریف کے اُس حصہ میں جائیے جو روضۂ مطہرہ اور منبر شریف کے درمیان ہے، اور جس کے متعلق خود حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے "روضۃٌ من ریاض الجنۃ" ارشاد فرمایا ہے، (یعنی یہ جنّت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے) یہاں پہنچکر سب سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیے[1]۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی اس عظیم و جلیل نعمت کے شکریہ میں کہ اُس نے اس دربار عالی کی حاضری کی سعادت بخشی، مستقل سجدۂ شکر کیجئے، اور دُعا کیجئے کہ : "اے اللہ جس طرح تو نے محض اپنے کرم سے یہاں تک پہنچا دیا، اُسی طرح اپنے کرم سے میرے لئے اپنی رحمت و رضا کے دروازے کھول دیجئے اور اپنے محبوب رسُول (صلے اللہ علیہ وسلم) کو شفقت و عنایت کے ساتھ میری طرف متوجہ فرما دیجئے، اُن کا قلب مبارک بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

مواجہ شریف میں حاضری اور پہلا سلام :-

اس کے بعد پورے ادب اور ہوش کے ساتھ (اگر ہوش باقی رہے) مواجہ شریف میں آئیے یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روبرو حاضر ہو جائیے، اور یہ تصوّر کرتے ہوئے کہ میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوں اور حضورؐ میری گذارش بنفس نفیس سُن رہے ہیں، پورے ادب کے ساتھ ہلکی آواز سے سلام عرض کیجئے۔

سلام کے بارے میں ذوق مختلف ہیں، بعض لوگ مختصر سلام پسند کرتے ہیں، اُن کیلئے یہی اچھا ہے کہ بس مختصر سلام عرض کریں، سلف کا عام مذاق بھی یہی تھا۔

اور بیچارے عوام جو عربی بالکل نہیں جانتے، اور سلام کی لمبی چوڑی عبارتیں نہ اُن کو یاد ہوتی ہیں نہ وہ اُن کے معنی مطلب سمجھتے ہیں، اُن سب کے لئے تو گویا یہ ضروری ہے کہ وہ مختصر ہی سلام عرض کریں ——— مثلاً صرف اتنا عرض کریں :-

---

[1] حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بعض صحابہ کو حکم دیا تھا کہ مسجد شریف میں داخل ہو کر پہلے تحیۃ المسجد پڑھا کریں، اُس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ اب بھی یہی حکم ہے۔ ۱۲

السَّلَامُ علیك یا رسولَ الله	اے اللہ کے رسول آپ پر سلام
السَّلَامُ علیك یا حبیبَ الله	اے اللہ کے محبوب آپ پر سلام
السَّلَامُ علیك یا خیرَ خلقِ الله	اے بہترین خلق اللہ آپ پر سلام
السَّلَامُ علیك اَیُّهَا النَّبِیُّ	اے اللہ کے نبی آپ پر سلام اور اللہ
ورحمة الله وبرکاته	کی رحمت اور اُسکی برکتیں۔

اور جو عربی داں حضرات طویل سلام عرض کرنے میں زیادہ لذت اور کیفیت محسوس کریں[1]، وہ اگر چاہیں تو سالِ گذشتہ کے حج نمبر میں رفیقِ محترم مولانا سید ابوالحسن علی کے مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" میں دیکھ لیں۔ اِس عاجز کو بھی وہ ہی سلام بہت زیادہ محبوب ہی۔

یہاں ایک سلام اور لکھتا ہوں، اپنی درمیانی حیثیت کی وجہ سے شاید آپ کے لئے اور آپ جیسوں کیلئے وہ زیادہ مرغوب ہوگا، یہ سلام بھی اس عاجز کو بہت پسند ہی :۔

السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَ	اے اللہ کے پیغمبر آپ پر سلام، اور اللہ کی رحمتیں اور
رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ	برکتیں! یا رسول اللہ میں آپکے سامنے گواہی دیتا ہوں
اِنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہی (کوئی عبادت اور بندگی
وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّكَ	کے لائق نہیں ہی) اور اس کا کوئی شریک ساجھی بھی نہیں ہے
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ	اور بلاشبہ آپ اُسکے بندے اور رسول ہیں ــــ اللہ میں
قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّیْتَ	اسکی بھی شہادت دیتا ہوں (اور انشاء اللہ قیامت میں
الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَ	اللہ کے سامنے بھی یہ شہادت دوں گا) کہ آپ نے اس کا پیغام
كَشَفْتَ الْغُمَّةَ وَجَاهَدْتَ	پہنچا دیا اور امانت کا حق ادا کر دیا، اور اُمت کی خیرخواہی
فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ فَجَزَاكَ اللّٰهُ	میں کوئی کسر نہ رکھی، اور گمراہی اور تاریکی کو بالکل دور

[1] اذ ادکی انفرادی دعاؤں میں اور اسی طرح صلوٰۃ وسلام میں اختصار پسندی اور طوالت پسندی یہ بالکل ذوقی چیزیں ہیں، شارع نے کسی نص کے ذریعہ اس قسم کے امور میں نہ ہمیں خاص الفاظ کا پابند کیا ہے نہ خاص مقدار کا، اسلئے ان چیزوں میں کسی ایک ہی پہلو کو صحیح سمجھنا اور دوسرے پہلو کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ اصل قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ حقیقت جو بے روح رسم نہ ہو۔

عَنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ خَيْرَ مَا — کردیا، اور اللہ کی راہ میں جد و جہد کا حق پوری طرح ادا

جَزٰى نَبِيًّا عَنْ اُمَّتِهٖ وَرَسُوْلًا — کردیا۔ پس آپ کو آپ کا مولا اس پوری اُمت کی طرف سے

عَنْ خَلْقِهٖ۔ — وہ بہترین جزائے جو کسی نبی کو اُسکی اُمت کی طرف سے اور

کسی رسول کو اپنی مخلوق کی طرف سے اللہ نے دی ہو یا دینے والا ہو

اس کے بعد حضورؐ سے شفاعت کی درخواست کیجئے، اور عرض کیجئے کہ: "حضور والا! گناہوں کے بوجھ نے میری کمر توڑدی ہے، میں آج آپ کے سامنے اپنے سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، اور اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔ حضورؐ بھی میرے لئے استغفار فرمائیں، اور قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں، اگر حضورؐ نے عنایت نہ فرمائی تو میں ہلاک ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا۔"

اس کے بعد اپنے اُن بزرگوں دوستوں عزیزوں کا سلام حضورؐ کو پہنچایئے جنھوں نے آپ سے فرمائش کی ہو اور آپ نے اُن سے وعدہ کرلیا ہو۔ اگر سب کا نام لینا مشکل ہو تو اتنا ہی عرض کر دیجئے کہ: "حضورؐ! آپ پر ایمان رکھنے والے اور آپ کا نام لینے والے میرے چند اور بزرگوں اور عزیزوں دوستوں نے بھی سلام عرض کیا ہے۔ حضورؐ اُن کا سلام قبول فرمائیں، اور اُن کے لئے بھی اپنے رب سے مغفرت مانگیں۔ وہ بھی حضورؐ کی شفاعت کے طلبگار اور اُمیدوار ہیں۔"

اِس سیاہ کار کی التجا:۔

یہاں میں آپ سے بڑی ہی عاجزی سے اور ایمانی اخوت کا واسطہ دے کے عرض کروں گا کہ خواہ اسی پہلی حاضری میں اور خواہ اس کے بعد کسی حاضری میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اِس سیاہ کار اُمتی کی طرف سے بھی عرض کریں، کہ:۔ "اے ربُّ العالمین کے حبیب! اے رحمتِ عالم! آپ کے ایک سیاہ کار و نابکار اُمتی محمد منظور نے بھی سلام عرض کیا ہے وہ اپنے لئے، اپنے والدین کیلئے اور حضورؐ پر ایمان لانے والے اپنے سب محسنوں اور محبّوں کیلئے حضورؐ سے مغفرت کی دُعا اور شفاعت کا طلبگار اور اُمیدوار ہے۔ اُسے یقین ہے کہ آپ کی شفاعت و عنایت سے اس کا بیڑا پار ہو جائے گا۔ حضورؐ اُسکی یہ بھی استدعا ہے کہ اُس نے جو عہد آستانۂ مقدسہ پر کیا تھا حضور والا اپنے رب سے دُعا فرمائیں کہ مرتے دم تک اُس پر قائم رہنے کی اس کو توفیق ملے۔"

حضورِ اقدس (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں سلام اور اپنی معروضات عرض کرنے کے بعد آپ کے یار غار اور سب سے بڑے جاں نثار حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔

مدینۂ طیبہ میں آپ کا قیام اور اس عرصہ کے مشاغل :-

خدا نے چاہا تو آپ کو مدینۂ طیبہ میں قیام کا کافی موقع ملے گا، اُن دنوں کے ایک ایک لمحہ کو غنیمت سمجھئے، جہانتک ہو سکے زیادہ وقت مسجد نبوی میں گذاریئے، لاکھوں کروڑوں میل کی اللہ کی زمین میں یہی وہ خوش نصیب قطعہ ہے جہاں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اللہ کے حضور میں سب سے زیادہ سجدے کئے، نمازیں پڑھیں، خطبے دیئے، دُعائیں کیں، اعتکاف کئے۔ اگرچہ اب مسجد نبوی عہد نبوت کی وہ پُرانی مسجد نہیں ہے، لیکن اس میں کیا شک کہ زمین وہی ہے، اور فضا وہی ہے، اور انوار و برکات وہی ہیں، اور رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اُسکے ایک حصہ میں آج بھی آرام فرما ہیں ——— یقیناً۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

بہرحال اپنا زیادہ وقت مسجد شریف ہی میں گذاریئے، نفل نمازیں پڑھیئے، قرآن مجید کی تلاوت کیجئے، اور سب سے زیادہ شغل درود شریف کا رکھیئے ——— اور جب موقع مناسب ملے سلام عرض کرنے کیلئے مواجہ شریف میں حاضر ہو جایئے۔

مواجہ شریف میں اطمینانی حاضری کے اوقات :-

اس عاجز کے تجربہ میں چار وقت ایسے ہیں جبکہ مواجہ شریف میں اطمینان سے حاضری اور عرض معروض کا موقع اکثر مل جاتا ہے۔ ایک تہجد کے وقت جبکہ مسجد شریف کے دروازے کُھلتے ہیں، اُس وقت داخل ہونیوالے اکثر لوگوں کو دیکھا کہ وہ روضۃ الجنۃ میں جگہ قبضہ کرنے کیلئے، یا "محراب النبی" پر نفل پڑھنے کی کوشش میں اُس طرف سبقت کرتے ہیں، آپ اگر اُسوقت باب جبریل سے داخل ہوکے اور تحیۃ المسجد مختصر پڑھ کے سیدھے مواجہ شریف پر پہنچیں، تو وہاں کوئی اژدہام انشاء اللہ اُسوقت نہ پائیں گے ——— دوسرے ہندوستانی گھڑیوں کے حساب سے دن کو ۱۰، ۱۱ بجے کے درمیان۔ ——— تیسرے غروب آفتاب سے قریباً پون گھنٹہ آدھا گھنٹہ پہلے ——— اور چوتھے رات کو جب مسجد شریف کے دروازے بند کئے جاتے ہیں۔ اگر آپ اس اُمید میں بالکل آخری وقت تک وہاں رہیں تو انشاء اللہ کبھی کبھی چند منٹ کیلئے ایسا موقع بھی اُسوقت میں آپ کو نصیب ہو جائے گا جبکہ آپ کے سوا وہاں کوئی نہ ہوگا۔

چونکہ اصحاب ذوق و محبت کیلئے ایسے وقت کی بڑی تمنا ہوتی ہے جبکہ ؎

"ہم ہی ہم ہوں تری محفل میں کوئی اور نہ ہو"

اس لئے اپنا یہ تجربہ بے تکلف آپ کیلئے عرض کر دیا، خدا کرے کام آئے۔

ایک اور تجربہ اور مشورہ :-

انکسار کے طور پر نہیں، بلکہ پوری دیانتداری اور صفائی سے حقیقت حال عرض کرتا ہوں کہ خاص اصطلاح کے مطابق میں "اہلِ ادراک" میں سے نہیں ہوں، بلکہ ان امور میں ایک عامی آدمی ہوں ۔ تاہم گزشتہ سال جب اللہ تعالیٰ نے وہاں کی حاضری کی نعمت سے نوازا، تو جب کبھی کسی قدر اطمینان کے ساتھ مواجہ شریف میں حاضری نصیب ہوئی تو قریب قریب ہر دفعہ بڑی قوت کے ساتھ دل پر اس احساس کا غلبہ ہوتا تھا کہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو سب سے زیادہ خیال اور فکر امت کی دین سے لاپرواہی اور دوری کی، اور مسلمانوں کی بگڑی ہوئی زندگی سے آپ سخت متفکر اور محزون ہیں، اور گویا ایسے منتظر ہیں کہ آپ سے تعلق اور نسبت رکھنے والے آپ کی اُمت میں ایمانی روح اور اسلامی زندگی عام کرنے کیلئے کمربستہ ہوں، —— ممکن ہے یہ میرے خاص خیالات کا ہی عکس ہو، لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی دل میں اس کا یقین پوری قوت سے بھر رہا ہے —— آپ سے بے تکلف عرض کئے دیتا ہوں کہ آخر ایک وقت اس بیاد کار نے ضروری سمجھ کر عرض کیا کہ حضورؐ توفیق اور استقامت کی دُعا فرمائیں، انشاء اللہ یہ غلام بھی جہاں تک بن پڑیگا یہ کام کرے گا ۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ گویا حضورؐ کو اس وعدہ اور ارادہ سے ایک خاص مسرت اور فرحت ہوئی ۔ والعلم عند اللہ ۔

میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ اس کا بڑا امکان ہے، بلکہ اپنی حالت دیکھتے ہوئے اغلب یہی ہے کہ یہ سب اپنے ہی اندر کے خیالات ہوں گے، لیکن بہرحال اس احساس یا ادراک نے مجھے تو فائدہ ہی پہنچایا کہ ایک قطعی منصوص دینی کام کی اہمیت کا احساس پہلے سے کچھ زیادہ ہو گیا ۔

آپ کو بھی اس عاجز کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مواجہ شریف میں جہاں حضورؐ سے آپ اور اپنی باتیں عرض کریں وہاں کبھی دین کی خدمت و نصرت کا عہد بھی آپ کیجئے! انشاء اللہ اسکی برکتیں آپ خود دیکھ لیں گے ۔

جنت البقیع :-

مدینہ طیبہ میں مسجد شریف اور روضۂ مقدسہ کے بعد سب سے اہم مقام وہاں کا قدیمی قبرستان "جنت البقیع" ہے، جو حرم نبویؐ سے بہت تھوڑے سے فاصلہ پر ہے، زیادہ سے زیادہ ۸، ۱۰ منٹ کی مسافت ہے ۔ کیسا خوش نصیب زمین کا یہ قطعہ ہے، خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے کتنے مرنے والوں کو اپنے ہاتھ سے اس میں دفن فرمایا ۔ آپؐ کی اکثر ازواج مطہرات، بنات طاہرات، اور اہل بیت نبوت کے بہت سے ممتاز افراد اور کتنے جلیل القدر صحابۂ کرامؓ اور

پھر شمار میں نہ آسکنے والے ان کے تابعین اور تبع تابعین اور قرونِ مابعد میں پیدا ہونے والے ائمہ عظام اور اولیاء کرام اس میں آسودۂ خواب ہیں — سچ کہا کہنے والے نے۔

"دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز"

مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ میں یہاں بھی ضرور حاضری دیتے رہئے، یہاں کے سونے والوں کو پہلے مسنون طریقہ پر سلام عرض کیجئے۔ اور اُن کے لئے اُن کے رب سے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی دُعا کیجئے اسی کے ساتھ اپنے لئے بھی دعا کیجئے کہ اے اللہ! یہاں تیرے جو یہ وفادار اور صالح بندے سو رہے ہیں اُن کی جن باتوں سے تو راضی ہوا اُن کا کوئی ذرہ مجھے بھی نصیب فرما، اے اللہ! اگرچہ میرے اعمال ان جیسے نہیں ہیں لیکن تیرے ان سب صالح بندوں سے مجھے محبت ہے، بس اس محبت ہی کی برکت سے تو مجھے ان کے ساتھ شامل فرما دے۔ (والحقنی بالصٰلحین)۔

بقیع کا دروازہ دن بھر کھلا رہتا ہے، آپ ہر وقت حاضر ہو سکتے ہیں لیکن اپنا تجربہ یہ ہے کہ سب سے اچھا وقت یہاں کے لئے صبح اشراق کے بعد کا ہے۔

مسجد قبا:۔

مسجد قبا جس کے متعلق "لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی" [1] فرما کر خود قرآن پاک نے اس کو خاص عزت و عظمت بخشی ہے، اور جس کی "اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ" [2] کے الفاظ سے جس میں نماز پڑھنے کی خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ترغیب دی گئی ہے، اور جس میں دو رکعت نماز کا ثواب حضورؐ نے رمضان کے عمرہ کے برابر بتلایا ہے، کم از کم ایک دو دفعہ وہاں بھی جائیے اور اس میں نماز ادا کیجئے، اور وہاں کے خاص انوار و برکات کے حصول کی اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے۔

جبلِ اُحد:۔

احد وہ پہاڑ ہے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا "يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ" (ہم کو اس سے محبت ہے اور اُسکو ہم سے محبت ہے)

---

[1] وہ مسجد جس کی بنیاد اخلاص و تقویٰ پر رکھی گئی۔

[2] وہ مسجد جس میں جانا اور نماز پڑھنا آپ کے لئے بہتر ہے۔

اس پہاڑ ہی کے دامن میں گویا جنگ احد ہوئی تھی جس میں خود آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) بھی سخت زخمی ہوئے، اور قریباً ستر جاں نثار صحابہ کرام شہید ہوئے تھے جن میں آپ کے محبوب اور شفیق چچا اسد اللہ واسد رسولہ حضرت حمزہؓ بھی تھے، یہ سب شہداء کرام وہیں مدفون ہیں ـــــــ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) خاص اہتمام سے اس گنج شہیداں پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں ان کو سلام و دعاء نوازتے تھے۔ کم از کم ایک دفعہ یہاں بھی آپ ضرور حاضری دیجئے اور مسنون طریقہ پر شہداء کرام کو پہلے سلام عرض کیجئے اُن کے واسطے اور اُن کے ساتھ اپنے بھی واسطے اللہ تعالیٰ سے مغفرت و رحمت کی اور فلاح و رضا کی دعا کیجئے، اور اللہ و رسول کے ساتھ سچی وفاداری اور دین پر استقامت اللہ تعالیٰ سے یہاں خاص طور سے مانگئے۔

مدینۂ طیبہ کے فقراء و مساکین :-

غربت و افلاس مدینہ شریف میں حد سے زیادہ ہے، جن بیچاروں نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے وہ تو غالباً لوگوں سے کچھ امداد و اعانت حاصل کر ہی لیتے ہوں گے، لیکن باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ مدینہ کی آبادی میں کافی تعداد ایسے شریف گھرانوں کی ہے جو فاقوں پر فاقے ہونے کے باوجود سوال اور اظہار حاجت کی ذلت سے اپنے کو بچاتے ہیں۔

بلاشبہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ایسے پڑوسیوں کی خدمت بڑی سعادت ہے، اور انشاء اللہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی شفقت و عنایت حاصل ہونے کا خاص ذریعہ ہے۔

لیکن ہم آپ جیسے لوگ اپنے چند روزہ قیام میں اُن کا پتہ بھی نہیں چلا سکتے۔ البتہ ایسے معتمد ذریعے مل سکتے ہیں جن کی وساطت سے اپنے ہدایا ایسے گھرانوں تک پہنچائے جا سکیں ـــــــ کتب خانہ شیخ الاسلام کے مہتمم احمد ی صاحب امین عاجز کے علم میں اس کے لئے بہترین ذریعہ ہیں، اُن کا مکان اور کتب خانہ مسجد نبویؐ کی قبلہ والی دیوار سے بالکل قریب گویا ملا ہوا ہے، مدینۂ طیبہ کے مشہور ترین حضرات میں سے ہیں۔

مدینۂ طیبہ سے واپسی :-

مدینۂ طیبہ میں جتنا قیام اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقدر فرمایا ہے اُس کو ختم کر کے آپ آخر کار واپس ہوں گے۔

اور مدینۂ طیبہ سے جدا، اور رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے رخصت ہونا قدرتی طور پر آپ کیلئے بڑا سانحہ ہوگا —— بہرحال جب وہ دن آئے تو اُس روز خصوصیت سے اور خاص اہتمام سے آپ رخصتی ہی کیلئے مسجد شریف میں حاضر ہوں، پہلے دو رکعت نماز (اگر ہو سکے تو محراب نبوی میں، ورنہ اس کے آس پاس "روضۃ الجنۃ" میں کہیں) پڑھیں - اور اپنی اور دعاؤں کے ساتھ خاص طور سے یہ دُعا بھی کریں، کہ:-

"اے اللہ! تیرے محبوب رسُول اور اُن کی اس مسجد اور اُن کے اس شہر اور شہر والوں کے حقوق و آداب کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں مجھ سے ہوئیں اُن کو اپنے خاص کرم سے معاف فرما، اور میرے حج و زیارت کو قبول فرما، اور مجھے یہاں سے محروم واپس نہ فرما، اور میری یہ حاضری آخری حاضری نہ ہو، بلکہ اے میرے کریم مولا! اس کے بعد بھی مجھے تو یہاں حاضری کی توفیق عطا فرما، اور قیامت میں اپنے رسُول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی شفاعت اور آپؐ کا قرب مجھے نصیب فرما"

اس کے بعد آپ مواجہ شریف میں آئیں اور سلام عرض کریں، اور استغفار اور شفاعت کی پھر درخواست کریں، اور یہاں کے ادب اور مقام کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے اور بھی جو کچھ عرض کرنا ہو عرض کریں، اور خوب عرض کریں، اور استدعا کریں کہ حضور والا میرے حج و زیارت کی قبولیت کیلئے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائیں، اور یہ بھی دعا فرمائیں کہ میری یہ حاضری آخری حاضری نہ ہو بلکہ اس کے بعد بھی مجھے بلایا جائے۔

اسوقت جس قدر آپ کا دل غمگین اور شکستہ ہوگا، اور آنکھیں جتنی اشکبار ہوں گی، انشاءاللہ اُسی قدر رحمۃ للعلمین (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رحمت و شفقت آپ کی طرف متوجہ ہوگی۔

اس کے بعد یہ تصور کرتے ہوئے کہ جس مُلک میں میں رہتا ہوں گویا اُسی میں شہادتِ حق اور دین کی خدمت و نصرت پر میں مامور ہوں وطن روانہ ہو جائیے، اور دل غمگین کو تسکین دیجئے کہ اگرچہ جسم میرا مدینہ طیبہ سے دُور رہے گا لیکن میری رُوح انشاءاللہ کبھی دُور نہ ہوگی، اور ہزاروں میل دُور سے بھی میرا درود و سلام اور میرا پیام اللہ کے فرشتوں کے ذریعہ انشاءاللہ حضور کو پہنچا کرے گا۔

(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ)

آخری التجا:- جن بندگانِ خدا کی نظر سے یہ خطاب یا مضمون گذرے ان سے اس عاجز کی آخر میں پھر التجا ہے کہ وہ صدقہ خیرات ہی کے طور پر اس عاجز کیلئے اور اس کے مرحوم والدین اور تمام محبّوں کیلئے مغفرت و رحمت کی دعا ضرور فرمائیں۔

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

عاجز و عاصی — محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

"بردار نقاب از رُخ اے شاہدِ بطحائی"

ہمارے مخلص دوست اور دینی رفیق مسعود علی صاحب آزاد فتحپوری کے والد ماجد مولوی حکیم سید محمود علی صاحب فتحپوری (مرحوم) کی خاص فرمائش پر حضرت محوی نے مندرجۂ ذیل نعت کہی تھی۔ بھائی آزاد صاحب نے اپنے والد مرحوم کی بیاض سے نقل کرکے یہ نظم "حج نمبر" کیلئے مرحمت فرمائی ہے۔ اگرچہ محوی صاحب کے دیوان میں بھی یہ چھپ چکی ہے، لیکن اس کا حق ہے کہ حج نمبر میں بھی شائع کی جائے۔ مطبوعہ دیوان کے اور بیاض کے بعض مصرعوں میں بھی فرق ہے، یہاں جو شائع کی جا رہی ہے یہ بیاض کے مطابق ہے۔

"مدیر"

بردار نقاب از رُخ اے شاہدِ بطحائی — عالم نشود روشن تا چہرہ نہ بکشائی
از اوجِ کمالِ تو برگشت نظر قاصر — بگذشت عُروجِ تو از سرحدِ بینائی
بر حکمتِ تو شیدا، صد حکمتِ یونانی — وز عسرتِ تو پیدا صد شوکتِ دارائی
از سعیٔ بلیغِ تو در چشم زدن بہ نشست — ہم شور و شرِ گبری، ہم فتنۂ ترسائی
شُد زندہ ز نطقِ تو آئینِ براہیمی — زیبد ز لبِ نوشیں، دعوائے مسیحائی
دلہائے عزیزاں شد پُرخوں ز فراقِ تو — وقت است ز خواب خوش برخیزی و باز آئی
فرقت ز تو کے شاید با ایں ہمہ دلداری — غفلت ز تو کے زیبد با ایں ہمہ زیبائی
آں عقدہ کہ افتاد است در رشتۂ کارِ ما — دانم کمرِ ہمت، بر بندی و بکشائی
از فرطِ کرم وقتے خیر الامم خواندی — اکنوں بحقِ اُمت اے خواجہ چہ فرمائی
از مدحِ تو شیریں است کام و دہنِ مادح — مدحِ تو مگر دارد، تاثیرِ شکرخائی

از خوانِ عطائے تو اے خواجہ چہ کم گردد
گر درد دلِ محوی یک ذرہ بہ افزائی

"محوی فتحپوری"

"اسرارِ حج!"

(از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی دکن)

ناچیز مدیر الفرقان نے غالباً ماہ رجب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب سے "حج نمبر" کے لئے مقالہ کی استدعا کی تھی، موصوف نے از راہِ عنایت اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود چند ہی روز بعد ایک مقالہ بعنوان "اسرارِ حج" مرتب فرما کر روانہ فرما دیا جس میں حج سے متعلق ہر ہر عمل ـ احرام، طواف، سعی بین الصفا والمروہ، وقوفِ عرفہ، مبیت مزدلفہ (شب گذاری)، پھر قیامِ منیٰ، قربانی، رمی جمار، حلق، غرض تمام اعمالِ حج کی رُوح اپنے خاص عارفانہ اور وجد انگیز انداز میں بیان فرمائی تھی ـــــــ موصوف کا یہ مقالہ دفتر "الفرقان" میں وسط شعبان میں پہونچا، میں اُن دنوں والدہ ماجدہ کی علالت کی وجہ سے اپنے وطن (سنبھل ضلع مرادآباد) مقیم تھا۔ دفتر کے کارکنوں نے وہیں میرے پاس یہ مقالہ روانہ کر دیا، میں نے اُس کو پڑھا، اور اب کیا بتاؤں کیسے مزے لے لے کے اور کتنی دفعہ پڑھا۔ اگرچہ یہ مقالہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا مختصر ہی تھا، مگر اس کی سطر سطر میں لذت و حلاوت بلکہ طرب و مستی کا سامان بھرا ہوا تھا، معلوم نہیں اللہ کے بندہ نے کس حال میں لکھا تھا۔

لیکن اُس وقت اُس میں صرف اعمالِ حج ہی کا بیان تھا، وقت کی تنگی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے زیارتِ نبوی کا حصہ بالکل رہ گیا تھا ـــــــ جب اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے "حج نمبر" کی اشاعت میں ہم کو ایک ڈیڑھ مہینے کے التوا کا فیصلہ کرنا پڑا، اور بجائے شعبان کے شوال میں شائع ہونا طے کیا گیا تو اس عاجز نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا کہ اب وقت میں کافی گنجائش پیدا ہو گئی ہے لہذا اب آپ زیارتِ نبوی کے متعلق بھی کچھ لکھ کر مقالہ کی تکمیل فرما دیں ـــــــ موصوف نے یہ استدعا بھی قبول فرمائی اور زیارت کے متعلق بھی چند صفحے لکھ کر روانہ فرما دیئے، جو ناظرین کرام عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے ـــــــ لیکن پہلے یہ سُن کر کچھ دیر کے لئے ہمارے غم میں شرکت کر لیجئے کہ یہ عاجز جب ۲۹ر شعبان کو سنبھل سے لکھنؤ آ رہا تھا تو راستہ میں مرادآباد کے اسٹیشن پر میرا ایک چرمی بیگ چوری گیا جس میں چند ضروری اور بعض اچھی خاصی قیمتی چیزوں

کے علاوہ "حج نمبر" کے تین اہم مضمون بھی تھے' اور انہیں میں ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ "اسرارِ حج" بھی تھا۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؕ

یہ مقالہ چونکہ ایسا صاف لکھا ہوا تھا کہ غالباً ایک جگہ بھی کٹا پِٹا نہ تھا' اس لئے گمانِ غالب تھا کہ اسکی نقل یا ابتدائی مسودہ ڈاکٹر صاحب کے پاس محفوظ ہوگا چنانچہ سانحہ کی اطلاع کے ساتھ نقل یا ابتدائی مسودہ بھیجنے کی استدعا کی گئی ۔ موصوف نے اُس کے جواب میں جو سطریں لکھیں ان کو آپ بھی پڑھ لیجئے ——— تحریر فرمایا:۔

"آپ کا کرمنامہ ملا ۔ واقعہ کی اطلاع سخت رنجدہ ہے' سخت افسوس ہے کہ میرے یہاں "اسرارِ حج" کے نہ پہلی قسط کی کوئی نقل ہے اور نہ دوسری قسط کی' جس طرح مقالہ لکھا گیا اسی صورت میں روانہ کر دیا گیا' مبیضہ اور مسودہ دونوں وہی تھے ۔ وقت چونکہ نہ تھا اور میں وعدہ کر چکا تھا کہ وقت پر بھیجدوں گا' اس لئے اس کی نقل یا ٹائپ کاپی نہ کرا سکا۔

یہ بھی ممکن نہیں کہ میں پہلے حصّہ کو از سرِ نو لکھ کر روانہ کروں' کیونکہ مجھے اسوقت سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہے ۔ رمضان کا مقدس مہینہ عجیب طریقے سے گزر رہا ہے' حق تعالیٰ کی مشیت ہو کر رہتی ہے' آپ زیادہ غم نہ کیجئے ۔ الی اللّٰہ المشتکی ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العظیم حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

بیشک اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مشیتِ الٰہی کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں' اور مقالہ کا زیارت سے متعلق باقی ماندہ حصّہ ہی ناظرین کی خدمت میں پیش کردیں ۔

اگرچہ اس کا احساس ہے اور کئی دفعہ کا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ ایک دفعہ لکھنے کے بعد جو چیز اس طرح تلف ہو جائے اُس کا دوبارہ لکھنا پہلی دفعہ سے بدرجہا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے' مگر جو شخص ان کے گمشدہ مقالہ "اسرارِ حج" کو پڑھ چکا ہے' وہ اپنے کو تکلیف دہی کا مجرم سمجھنے کے باوجود یہ عرض کرنے پر مجبور ہے کہ کسی فرصت میں ڈاکٹر صاحب اپنے دل و دماغ کو پھر تکلیف دیں' اور پھر اس کو لکھنے کی کوشش فرمائیں ۔ بڑا مبارک ہے وہ دل اور وہ دماغ جو اس طرح کے کسی کام کے لئے بار بار تکلیف اٹھائے' اور تھکایا جائے۔

بہرحال "اسرار حج" کے لئے تو ناظرین فی الحال صبر ہی کریں، اور زیارت سے متعلق اس کا جو حصہ

محض حُسنِ اتفاق سے بچ گیا ہے، بس اُسی سے اب روحانی لذت حاصل کریں۔ ؎

خراباتیاں مے پرستی کنند

محمد بگوئید دستی کنند

"مدیر"

"زیارت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم، اوکد مستحبات و افضل قربات سے ہے، اور صاحب قدرت کے لئے قریب واجب کے ہے!"[۱] ؎

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن!

خیزم چو گرد، افتم چو اشک آیم بسر غلطم بہ تن (اوحدی)

مدینۂ رسول کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا"

مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا (مسلم)

اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہئے، حبِ نبوی کا تقاضا یہی ہے۔ ؎

مَن مذھبی حب النبی وصحبہ ۔۔۔ وللناس فیما یعشقون مذاھب

جب[۲] مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لئے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دار الہجرۃ بنایا ہے۔ یہ وہ مقام مقدس ہے جہاں آپ نے حق تعالیٰ کے فرائض و سنن شروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا۔ اسی پاک زمین میں آپ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوارِ رحمت

---

۱ مولانا سید [illegible] حسن [illegible] اتحاف [illegible] صفحہ ۱۱۵

میں بلا لیا، اور آپؐ کی قبر مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپؐ کے دو وزیر جو آپؐ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپؐ ہی کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھتا ہی۔ ؎

من دیثرب کہ بہ از نور بود خاک انجا!	باشد از مہر مبیں سایۂ افلاک انجا!
شرف خاک رہش را ست کہ تا بود نِ آب	از تیمم شود اعضائے وضو پاک انجا!
بحرِ رحمت شود آں قطرہ کہ از نے ریزد	چوں کند تاب سفر جبہۂ عرقناک انجا!
صاحبش راست جنابے کہ زبس تعظیمش	بالِ جبرئیل برو بد خس و خاشاک انجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب[۳] عاشقِ رسولؐ مدینۂ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے، تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہی۔ ؎

اندر دو جہاں کعبۂ ما کوئے محمدؐ	محرابِ دل و جاں خمِ ابروئے محمدؐ

وہ دیوانہ وار حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ ؎

اللہ! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں
رگ رگ کو جس نے درد بھرا دل بنا دیا

ہر قدم پر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آقائے نامدارؐ کے قدم پڑے ہوں گے، قدم اُٹھاتا ہے، پھر ٹھہر جاتا ہے، بڑھتا ہے، پھر تھم جاتا ہے۔ ؎

ترے کوچے میں ہم کل اس طرح سے جا بجا ٹھہرے
چلے، چل کر تھمے، تھم کر بڑھے، بڑھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ذرّہ کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔ ؎

ہم اس کوچے کے ہر ذرّے کو اپنا دل سمجھتے ہیں

تجلیاتِ جب اس کو آگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں۔ ؎

پا لیم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست (نظیری)

اسی محبت کی تجلّی میں وہ دیکھتا ہے، کہ ؎

کوچۂ جاناں کا ہر ذرّہ چراغِ طور ہی!

اپنے محبوبؐ کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی! آپ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا، رفعنا لك ذکرك کی نوید سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپ کی آواز پر اپنی آواز ہی کے بلند کرنے سے وہ ترکِ تعظیم کیوں نہ ہو! حبطِ اعمال اس کی سزا تھی! پھر نظامیؒ کے الفاظ میں وہ اس طرح ثنا خواں ہوتا ہے۔ ؎

شمسہ نہ مسندِ ہفت اختراں	ختم رسل خاتم پیغمبراںؐ
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست	ہر دو جہاں بستہ فتراکِ اوست
امیٔ گویا بزبانِ فصیح	از الف آدم و میم مسیح
اے تن تو پاک تراز جانِ پاک	رُوح تو پروردۂ روحی فداک
اے مدنی برقع و مکی نقاب	سایہ نشیں چند بود آفتاب
اے گوہر تاج فرستادگاں	تاج دہ گوہر آزادگاں

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنھوں نے آپ کی صحبت پائی اور مشاہدۂ جمال، استماع اقوال و ملاحظۂ احوال سے سعادت حاصل کی، اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی اور نہ آپ کے اصحابِ کرامؓ کی صحبت ملی! دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپ ہمیں قبول نہ فرمائیں، کیونکہ آپ کا ارشادِ مبارک ہے، کہ :-

"قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے (جن میں اپنی اُمت کی بعض نشانیاں دیکھ کر) میں حق تعالیٰ سے عرض کروں گا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں! حکم ہو گا کہ نہیں، تمھیں نہیں معلوم کہ تمھارے بعد انھوں نے کیا کام کئے ہیں!! تب میں کہوں گا کہ مجھ سے دُور ہو! مجھ سے دُور ہو!" (رواہ الشیخان)

یہ حال اُن لوگوں کا ہو گا جنھوں نے شریعتِ مطہرہ کی توقیر نہیں کی، سنتِ رسولؐ کی قدر نہ سمجھی، اور بدعت کو ترجیح دی! اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے، اس وعید سے کانپ اُٹھتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، چیختا ہے۔ ؎

ہر چند گناہ بے شمار ست — صد مرتبہ بے شمار توبہ!
در بارگہت کنم خدایا — با دیدۂ اشکبار توبہ!
گر رفت بہ ترہات عمرم — کردم نہ بیک دو بار توبہ!
شد ہر سر مو کنوں زبانے — آرم بتو بار بار توبہ! (ملا اعلم)

پھر عرقِ خجالت میں غرق ہو کر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے:۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر! (اقبال)

پھر اُمید و رجا کی موج اس کے سینہ میں اٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوبؐ کی زیارت کے لئے وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہونچایا، حظِ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کو مقصود نہ تھا، فقط آپؐ کی بے پایاں محبت اور آپؐ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطن مالوف سے نکالا، زندگی میں جب آپؐ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی قناعت کی کہ آپؐ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپؐ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔ ؎

غربتے گر روی بشہر و دیار — روی در مسجدِ مصفا کن
دوست را گر نمی توانی دید — خانۂ دوست را تماشا کن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان مہیا کر دیئے تو اب اُس کی رحمت سے یہی توقع ہی کہ وہ اس کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، اور اس کے گناہوں کو معاف فرمائیں گے۔ ؎

اندر علم آنچہ ترا شاید نیست
اندر کرمت آنچہ مرا باید ہست

جب مسجد نبویؐ میں قدم رکھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے نبیِ مکرمؐ اور مسلمانوں میں سے اوّل اور افضل لوگوں کے لئے تجویز فرمایا، جو بقول عارف رومیؒ۔ ؎

برترند از عرش و کرسی و خلا
ساکنانِ مقعدِ صدقِ خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں "محبوب و مطلوب و پسند" رہے ہیں۔
جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوئے، اور کامل عبودیت کیساتھ ادا ہوئے! یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر لوگ حالتِ حیات و حالتِ ممات میں جمع ہیں! اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس پر بھی رحم فرمائیں گے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے۔

بضاعت بنا وردم الا اُمید
خدایا ز عفوم مکن نا اُمید (سعدی)

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہے، زبان پر یہ دُعا ہوتی ہے:۔

اللّٰهم هذا حرم رسولك فاجعله لي وقاية من النار وامانا من العذاب وسوء الحساب
اللهم افتح لي ابواب رحمتك وارزقني في زيارة نبيك ما رزقت اوليائك واهل
طاعتك واغفر لي وارحمني يا خير مسئول۔

پھر نیت اعتکاف الی الخروج کر کے روضۂ جنت کی طرف بڑھتا ہے اور محرابِ نبویؐ کے پاس، ممکن ہو تو مصلیٰ نبوی کے پاس سے متصل یا منبر کے پاس، ورنہ ہو سکے تو کسی ایک مقام پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتا ہے، پھر اس نعمتِ عظمیٰ کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، اور رضا، توفیقِ خیر، قبولِ اعمال و بلوغِ مقاصد کی دُعا کرتا ہے! دُعا کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:۔

اللّٰهم ان هذه روضة من رياض الجنة شرفتها وكرمتها ومجدتها وعظمتها ونورتها
بنور نبيك وحبيبك محمد صلى الله عليه وسلم! اللّٰهم كما بلغتنا في الدنيا زيارته و
مأثره التريفه فلا تحرمنا يا الله في الاخرة من فضل شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم
وحشرنا في زمرته وتحت لوائه وامتنا على محبته وملته واسقنا من حوضه المورود
بيده الشريفه شربة هنية لا نظماء بعدها ابدا انك على كل شيء قدير!۔

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضۂ پاک کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپؐ کی خدمتِ مبارک میں پہونچتا ہے[۱]۔ آپؐ نے فرمایا کہ: "من صلّی علیّ واحدۃً

[۱] چنانچہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ: "جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کریں گے میں ان کا سلام خود سنوں گا، اور دُور سے سلام
کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائے گا" (مشکوٰۃ)

صلی اللہ علیہ عشرا" (مسلم)

یہ جزا تو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لئے تمام بدن سے حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا!۔

اب وہ اپنے آقائے نامدار کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:۔

الصلوٰۃ والسلام علیك ایھا النبی السید الکریم والرسول العظیم والحبیب الرؤف الرحیم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الصلوٰۃ والسلام علیك یا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ابن ہاشم یاطٰہٰ یایٰسین یابشیر یاسراج یامبین یامقدم جیش الانبیاء والمرسلین۔

یا خیر من دفنت فی التراب اعظمہ　　فطاب من طیبھن القاع والاکم
نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ　　فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم
انت الحبیب الذی ترجی شفاعتك　　عند الصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے!۔

پھر حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ گویا آپؐ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مہاجرین وانصار آپؐ کے گرد حلقہ کئے ہوئے ہیں اور آپؐ ان کو خطبہ میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب وہمت دلارہے ہیں اور نافرمانی سے روک رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں۔

محمد شہنشاہِ خیلِ رُسل　　کہ خردند پیشش چہ جز و چہ کُل
درخشاں دُرِ دُرجِ عبدِ مناف　　بانگشتِ اعجاز مہ را شگاف
ز ابروش محرابِ عین الیقیں　　زگیسوش اسبابِ حبل المتیں
فلک ہا ز در باش در شبنمے!　　فصیحاں زغوغاش در ابکمے!
چناں عقدہ از کارِ اُمت کشاد　　کہ دنداں دریں کار بر باد داد!

(ظہوری)

دل میں توحید پر جینے مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی محبت کو قلب میں اور زیادہ راسخ کرتا ہے اور آپؐ کی سنت مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے، اس عقیدہ کو پختہ کرتا ہے کہ حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگراں ہیں (اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللہَ یَرٰی)، اس کے دل کے وسوسوں اور خفیہ

خطرات وخیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے، جیسے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب! اس یقین کو بھی دل میں مضبوط کرتا ہے کہ "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ"! یعنے طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے، اور گناہوں کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو ہلاکت سے!۔ عزم کرتا ہے کہ اپنے تمام حرکات وسکنات، خطرات ولحظات، لفظات وفلتات، عذرات وخجرات، پر ہمیشہ نظر رکھے گا اور تقوی کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ سے کام لے گا۔ بحول اللہ وقوتہ۔

آخر میں اس تسکین بخش عقیدہ کو بھی پختہ کرتا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ کہہ کر کہ:-

"ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"

یہ رزق معضمون ضرور ملے گا۔ جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہونچ کر رہے گا۔ طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہئے اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہئے۔

(لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم!)

منبر شریف کے پاس پہونچ کر تصور کرتا ہے کہ گویا ان ہی تیقنات پر حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نذر دے رہے ہیں اور وہ انھیں اپنے قلب میں اتار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں انھیں پختہ کر رہا ہے۔

حج وزیارت کے اعمال میں یہ سب دل کا وظیفہ ہے جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ ہو کر حاجی فرط مسرت سے یہ گنگناتا ہے۔ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است	افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را	کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

پیامِ محبّت نواز

(زائرِ حرم حضرتِ حمیدؔ صدیقی لکھنوی)

وہ دیدارِ خاکِ حجاز اوّل اوّل　　وہ جوشِ جنونِ نیاز اوّل اوّل
وہ نظارۂ بے نظر پہلے پہلے　　وہ اک منظرِ جاں نواز اوّل اوّل
وہ ارضِ مقدس کی سادہ فضائیں　　حرم میں وہ کیفِ نماز اوّل اوّل
وہ کیفیتِ اضطرابِ حضوری　　وہ ذوقِ جبینِ نیاز اوّل اوّل
ہمیں یاد ہو اپنے دل کا وہ عالم　　ہوئے تھے جو ہم سرفراز اوّل اوّل
وہی بن گیا دردِ دل آخر آخر　　بظاہر جو تھا سوز و ساز اوّل اوّل
غم و کیف کا امتزاج اللہ اللہ　　دل و درد کا ساز باز اوّل اوّل
کلامِ حق آموز بے لفظ و معنی　　پیامِ محبت نواز اوّل اوّل
جمالِ مجرّد، برنگِ تماشا　　حقیقت بشکلِ مجاز اوّل اوّل
ابھی تشنۂ دید تھیں میری نظریں　　کہ دل پر گری برقِ ناز اوّل اوّل
وہ اک جلوۂ بے جہت آخر آخر　　وہ اک پردۂ نیم باز اوّل اوّل
ڈھلک گئے ہوئے دل کے خونبار آنسو　　وہ آنکھوں سے افشائے راز اوّل اوّل
حضورِ شہنشاہِ کونین ادب سے　　وہ عرضِ سلامِ نیاز اوّل اوّل
ادھر التفاتِ کرم کی بشارت　　ادھر گریۂ جاں گداز اوّل اوّل

حمیدؔ آہ وہ رقصِ روحِ محبّت
وہ ہر سانس نغمہ طراز اوّل اوّل

عرض شوق نگاہ

(از حضرت نازش پرتاب گڑھی)

روم بسوئے دیارِ نبیؐ (صلوٰۃ اللہ) — ہزار ہا مہ و انجم نثار بر جادۂ راہ
حضورِ مائلِ پردہ سرائے جلوہ پناہ — منم کہ منتظرِ یک تجلیٔ ناگاہ
جمالِ پاکِ حرم باعثِ سکونِ نگاہ — مکینِ خانۂ دل الفتِ رسولؐ اللہ
برائے مدحتِ پاکِ نبیؐ (صلی اللہ) — بجز نازشِ آوارہ و خراب و تباہ
کجا نگاہِ پریشانِ زائرانِ حرم — کجا دیارِ نبیؐ رشکِ مہر و غیرتِ ماہ
مپرس ہمدمِ دیرینہ می روم کجا — بہ لب ترانۂ نعتِ نبیؐ حرم بہ نگاہ
فدائے جنتِ رضواں بہ بیں ز دیدۂ دل — فروغِ حسنِ مدینہ بہ جلوۂ شبِ ماہ
خموش باش کہ ایں بارگاہِ سلطان است — بہوش باش کہ ایں جاست عرضِ شوق گناہ
مریز بر منِ بیچارہ عشرتِ کونین — بدہ ترانۂ نعت و لبِ خلوص آگاہ
خوشا نشاطِ فراواں بہ تصورِ دوست — فسردہ گشت فروغِ ہجومِ انجم و ماہ
بہ فیضِ احمدِ مرسل ز قلبِ سنگ آمد — صدائے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
گناہ گارم و برگشتۂ کائنات از من — سوائے دامنِ پاک تو نیست جائے پناہ
نثارِ گنبدِ خضرا، فدائے شامِ عرب — فروغِ صبح و بہار و تجلیٔ شبِ ماہ
مکن ملال ز دردِ فراق اے نازش — بکن بہ احمدِ مختار عرضِ شوقِ نگاہ

فدائے جرأتِ رندانۂ خودم نازش
سوالِ جلوہ بہ ایں بے کسی و عجزِ نگاہ

لیلائے کعبہ

(حضرت شفیق صدیقی، جونپوری)

ہنس پڑے دیکھ کے تم شکل جو بیماروں کی
زندگی جھومتی پھرتی ہو وفاداروں کی

تیرے ہی در پہ ہو شنوائی دل افگاروں کی
خانہ آباد کہ بن آئی ہو بے چاروں کی

تیری ہی درگہ عالی وہ جگہ ہو کہ جہاں
پرسشِ حال ہو ہم سے وطن آواروں کی

کس کے گیسو کی تجلی ہو غلافِ کعبہ
جس سے وابستہ ہیں امیدیں سیہ کاروں کی

رشکِ سینا ہیں صفا و عرفات و مروہ
اے جنوں سیر کریں چل انھیں کہساروں کی

آبِ زمزم سے کھجوروں کی فراوانی سے
دعوتیں کرتے ہیں وہ اپنے نمک خواروں کی

ہو درِ کعبہ نزولِ کرمِ خاص کی جا
خوب گذرے گی وہاں ہم سے گنہگاروں کی

حرمِ پاک کے پردوں پہ لٹانے کے لیے
جھلملی روز بناتا ہو فلک تاروں کی

اٹھتے جاتے ہیں حجاباتِ حریمِ عرفات
آج پوچھو نہ خوشی ان کے طلب گاروں کی

مجھ جگر سوختہ پر بھی ہو نوازش کی نگاہ
خیریت پوچھنے والے جگر افگاروں کی

اللہ اللہ عجب انداز سے آئی ہی بہار
عید ہو میکدۂ عشق کے میخواروں کی

ان کی بخشش کی ہو وہ دھوم کہ شیخ و زاہد
سب چلے آتے ہیں صورت میں خطاواروں کی

بخشی جاتی ہیں خطائیں درِ مولیٰ پہ شفیق
جا ضرورت ہو یہاں آج سے گنہگاروں کی

نعت سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم

(از مولنا نسیم احمد فریدی فاروقی امروہی)

سراپا چمن ہے دیارِ مدینہ
دوام آشنا ہے بہارِ مدینہ

مدینے کے پھولوں کو کیا پوچھتے ہو
رگِ گل ہو ہر نوکِ خارِ مدینہ

دلوں پر ہو جس کی حکومت کا سکہ
زہے شوکتِ تاجدارِ مدینہ

کسی چیز کی اس کو حسرت نہیں ہو
میسر ہے جس کو غبارِ مدینہ

یہ منبر، یہ مسجد، یہ روضہ، یہ گنبد
ہے فردوس ہر یادگارِ مدینہ

وہاں کی زمیں عرش سے بھی ہو اعلیٰ
جہاں دفن ہیں تاجدارِ مدینہ

تہجد، تلاوت، تضرع، دعائیں
خوشا سعئ شب زندہ دارِ مدینہ

حنین و تبوک اور بدر و احد میں
صف آرا ہوئے شہسوارِ مدینہ

کبارِ مدینہ تو یوں بھی بڑے ہیں
بڑوں سے بڑے ہیں صغارِ مدینہ

تمنا ہے عمرِ رواں اپنی گزرے
بہ ہمراہِ لیل و نہارِ مدینہ

فریدی چلو چل کے روضہ پہ کہنا
سلام آپ پر تاجدارِ مدینہ

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں

خدا کا ایک وفادار بندہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ

(از مولانا مناظر احسن گیلانی)

شاہ ولی اللہ کا دور اسلامی ہند کا سخت طوفانی دور تھا، مغلیہ سلطنت کا زوال و انحطاط، ہندستان میں انگریزی اقتدار کا آغاز، سکھ اور مرہٹہ، جاٹ اور روہیلہ کا زور اور ان کی غارتگرانہ ہنگامے، نادر شاہ [illegible] احمد شاہ ابدالی کی [illegible] جنگ، یہ سارے واقعات شاہ صاحب ہی کے زمانہ میں ہوئے اور خود شاہ صاحب ان سے غیر متعلق بھی نہ تھے اس لیے اس مقالہ میں [illegible] اور ان کے اسباب و اثرات کا ذکر بھی بہت تفصیل سے آگیا ہے، بھر بتلایا گیا ہے کہ شاہ صاحب نے فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلام کی خدمت کیا اور کس طرح کی، اور ان کے طرز عمل سے موجودہ حالات میں ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ ... ... کاغذ سفید چکنا

قیمت ... ... (عہ)

تذکرۂ امامِ ربّانی

مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا کتابی اڈیشن

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و خصائص اور آپ کے اہم تجدیدی کارناموں کا تفصیلی بیان، اکبر اور اس کے منافق و ملحد حواریوں کے گڑھے ہوئے "دین الٰہی" کی تفصیلات، اس زمانہ کے علماء سوء اور ملحد صوفیوں کی تحریفات و تلبیسات اور ان سب گمراہیوں کے اثرات سے اسلام کو اور ہندی مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لیے حضرت امام ربانی کی مجددانہ جدوجہد اور بارگاہ خداوندی میں پہنچ پکار، اور اصلاح و تجدید کے اس مشن میں آپ کی محیر العقول کامیابی، اور مغلیہ سلطنت کے رویہ پر آپ کی مساعی و تجدید کا اثر۔

ان تمام چیزوں کی تفصیل آپ کو

تذکرۂ امام ربّانی

کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

قیمت ـــــ دو روپے آٹھ آنے ـــــ عہ

امام ولی اللہ دہلویؒ

اور ان کا فلسفہ

(از حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف اور ان کے فلسفہ پر نہایت گہرا علمی مقالہ بلا شبہ نوادر میں سے ہے اور ان کی علمی خصوصیات اور ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس میں پانچ باب ہیں، پہلے باب میں شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور ہند و حرمین کے اساتذہ و مشائخ سے استفادہ و تحصیل کا بیان ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں علوم قرآن و حدیث میں ان کی تجدیدات اور خاص نظریات کی تشریح کی گئی ہے، اور چوتھے اور پانچویں باب میں علی الترتیب فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کے خاص مجتہدانہ نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن صرف اہل علم اور عربی داں حضرات کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کاغذ سفید چکنا قیمت (عہ/)

"کلمہ طیبہ" کی حقیقت

(ازافادات مولٰنا محمد منظور نعمانی)

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ دلنشیں اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نور یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں توحید و رسالت کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور عارفانہ رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ یکساں طور پر متاثر ہوں۔ پہلا اڈیشن چھپنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد نایاب ہوگیا تھا۔ اب نظر ثانی کے بعد چھوٹے خوبصورت سائز پر یہ دوسرا اڈیشن تیار ہوا ہے۔

قیمت:- (۸/)

اِسلام کیا ہے؟

(تالیف مولٰنا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان لکھنؤ)

مصنف نے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ضرورت، اور خاص وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر توجہ اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسلامی تعلیمات پر ایسی جامع اور مفید کتاب اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کیلئے بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ اسلام کی ضروری تعلیمات کو بیس سبقوں کی شکل میں مرتب کرکے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر سبق اپنے موضوع پر ایک مستقل مضمون اور مؤثر خطبہ ہے۔ زبان کو آسان بنانے کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ بے پڑھے لوگ اور کم عمر بچے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ خود پڑھ کر ایمان تازہ کیجئے، بیوی بچوں کو پڑھا کر انھیں پکا اور کامل مسلمان بنائیے، مسجدوں اور مجمعوں میں سنا کر تبلیغ کا حق ادا کیجئے، اور مسلمانوں میں ایمانی رُوح اور دینی زندگی پیدا کرنے کا بے انتہا ثواب حاصل کیجئے! اور اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست اسلام کو جاننا اور سمجھنا چاہے تو اُس کے ہاتھ میں بھی بے تکلف یہی کتاب دے دیجئے

کاغذ و طباعت اعلٰی

قیمت مجلد ۸

"نماز" کی حقیقت

(ازافادات مولٰنا محمد منظور نعمانی)

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اُسکی رُوح و حقیقت سے واقف ہونے کیلئے اور اپنی نماز میں رُوحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ نماز کے متعلق کتاب و سنت کے لطیف اشارات اور ائمۂ دین و معرفت خصوصاً امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عارفانہ افادات کا عطر کھینچ کر اس رسالہ کی صورت میں پیش کردیا گیا ہے۔ "کلمہ طیبہ" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ تازہ اڈیشن، کاغذ اور طباعت اعلٰی۔

قیمت:- (۱۲/)

ملنے کا پتہ کتب خانہ "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد ۱۷ | بابتہ ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء | نمبر ۱۱

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۳ گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

باسمہٖ سبحانہٗ حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں!

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ملک کی آزادی اور قومی حکومت کے قیام کے بعد سے کانگریس کے ذمہ داروں کے درمیان اس بارہ میں ایک اصولی اور نظریاتی اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا کانگریس اب بھی اپنے پرانے مسلک اور اصول پر جوں کی توں قائم رہے اور ہندوستان کے تمام فرقوں کے حقوق اور ان کی زبان و تہذیب وغیرہ کی حفاظت کے متعلق اُس کی طرف سے جو وعدے اور اعلانات آزادی حاصل ہونے سے پہلے ہوتے رہے ہیں آیا اب بھی وہ اُن کی اُسی طرح پابند رہے، یا اس کو اکثریتی فرقہ کے اسوقت کے عام فرقہ وارانہ رجحان کے مطابق اب ہندو مہاسبھا کے اصول اور خواہشات سے قریب تر ہو جانا چاہئے! —
پنڈت جواہر لال نہرو، راجگوپال آچاریہ، اور اُنکے کچھ اور ساتھی پہلے نظریہ کے حامی ہیں، اور کانگریس کے نئے منتخب صدر راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن اور اُن کے بہت سے ساتھی دوسرے نظریہ کے علمبردار ہیں۔
گذشتہ مہینہ کانگریس کی صدارت کیلئے ٹنڈن جی، آچاریہ کرپلانی، اور شنکر راؤ دیو کے درمیان جو سخت مقابلہ ہوا وہ دراصل ان شخصیتوں کا مقابلہ نہ تھا بلکہ ان نظریوں کا مقابلہ تھا۔ ان تینوں اُمیدواروں میں پنڈت نہرو کے نظریہ کے پورے حامی شنکر راؤ دیو تھے، ان کے حامیوں اور ہمدردوں کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ انکی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے انھوں نے ٹنڈن جی کی بہ نسبت کرپلانی جی کو غنیمت سمجھ کر اُنکی حمایت کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ وہ اگرچہ نہرو پالیسی کے پورے حامی نہیں ہیں لیکن اتنے دور بھی نہیں ہیں جتنے ٹنڈن جی دور ہو چکے ہیں۔ اس الکشن پر ہر فریق نے اپنی پوری طاقت لگا دی اور جہانتک ہمیں علم ہے محنت اور کوشش کا کوئی دقیقہ کسی نے اٹھا نہیں رکھا، پھر اس کا جو نتیجہ نکلا اُس نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ کانگریس کی غالب اکثریت اب ٹنڈن جی کی ہمنوا ہو چکی ہے، اور وہ وہی چاہتی ہے جو ٹنڈن جی چاہتے ہیں —— اس سلسلہ میں یہ چیز بھی خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ جہانتک ہماری معلومات ہیں ہندوستان کے سات صوبوں میں سے پانچ صوبوں کے وزراء نے قریباً

متفقہ طور سے ٹنڈن جی کے حق میں ووٹ دیئے، اور اپنی سی کوششیں بھی کیں۔

انتخاب کے اس نتیجہ پر لوگوں کے احساسات مختلف ہیں بعض حضرات کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کچھ فکرمند اور شکستہ دل ہیں۔ اور ٹنڈن جی کی پچھلے دنوں کی بعض خاص تقریروں کو، خصوصاً ابھی کچھ دنوں پہلے کی سنرناتھی کانفرنس والی اُنکی تقریر کو یاد کر کے وہ طرح طرح کے خطرات محسوس کر رہے ہیں ـــــ لیکن ہمارے نزدیک تو اس میں ایک بڑے خیر کا پہلو ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگوں نے پنڈت نہرو کی طاقتور شخصیت اور حکومتِ ہند میں اُن کے غیر معمولی اثر و رسوخ کو اپنا سہارا سمجھ لیا تھا، اور وہ اس سہارے پر ایسے مطمئن ہو گئے تھے کہ اس مُلک میں مسلمان رہتے ہوئے عزت اور عافیت کے ساتھ رہنے اور اپنے دینی شعائر اور ملّی خصوصیات کو زندہ اور محفوظ رکھنے کیلئے جو کچھ انھیں کرنا چاہئے تھے وہ اس سے بہت کچھ غافل ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انتخاب کے اس نتیجہ کے ذریعہ حقیقت حال کو ظاہر اور مستقبل کے امکانات کو زیادہ واضح کر کے اُن کو چونکانے اور غلط فہمی سے نکالنے کا ایک سامان کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی جو نہ چونکیں اور اپنے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کیلئے اللہ کی دی ہوئی عقل و دانش، فہم و فکر اور سعی و عمل کی قوتوں سے کام نہ لیں وہ خود ہی اپنی ہلاکت اور بربادی کے ذمہ دار ہوں گے۔

اس مُلک کے موجودہ حالات، ماضی کے تجربات اور مستقبل کے امکانات کو سامنے رکھ کر جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ہمارا فیصلہ اس عالمِ اسباب میں بھی کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ صورت یہ ہے کہ اگر ہم خود اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو سمجھ کر یہ طے کر لیں اور پورے عزم کے ساتھ طے کر لیں کہ ہمیں اس ملک میں رہنا ہے اور ایک مردِ مومن کی طرح اپنے دین و ایمان اور خصائص ملّی کے ساتھ رہنا ہے، اور یہ مقصد جس محنت و قربانی کا ہم سے مطالبہ کرے اور اپنے رویہ میں جس دانشمندانہ تبدیلی کیلئے یہ طالب ہو اس سے بھی ہمیں گریز نہیں کرنا ہے تو اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں کہ انشاء اللہ ہم رہیں گے اور اپنی ان تمام محبوب چیزوں کے ساتھ رہیں گے۔ گویا ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر کو ہمارے طرزِ عمل اور ہماری جدوجہد سے ہی متعلق اور وابستہ کر دیا ہے ـــــ لیکن اگر ہم خود یکسو ہو کر یہ فیصلہ نہ کریں اور یہ مقصد موجودہ حالات میں جس حکمتِ عملی کا ہم سے طالب ہے اور جس وسیع اور غیر معمولی کوشش اور محنت کے لئے اس کا مطالبہ ہے اگر ہم اپنے کو اس پر آمادہ نہ کر سکیں تو پھر جواہر لال جیسے کسی حوصلہ مند اور وسیع القلب فرد کی وزارت یا آنجہانی جیسے انصاف

اور سچائی کے کسی پرستار برہمچاری کی قربانی ہم کو اور ہماری چیزوں کو زیادہ دنوں تک اس مُلک میں نہیں تھامے رکھ سکتی۔

بیشک اندھے تعصب کے اس دور میں ایسے لوگوں کی انصاف پسندی اور ہمدردی قابل شکر گذاری ہے۔

(من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

لیکن مسلمان کیلئے ایسی چیزوں پر سہارا ایک طرح کا شرک ہے، اور شرک کے ساتھ اللہ کی مدد کا استحقاق نہیں۔

ہمارے ناظرین کرام کو یہ معلوم کر کے انشاء اللہ ضرور خوشی ہوگی کہ رفیق محترم مولٰنا سید ابوالحسن علی امسال بھی بقصد حج وزیارت حجاز تشریف لے گئے ہیں، ۴ ستمبر کو اسلامی جہاز سے آپ بمبئی سے روانہ ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ آپ کے اس سفر کی بعض نہایت اہم خصوصیتیں ہیں، جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ سفر کے احوال وکوائف کے متعلق آپ کے جو خطوط آتے رہیں گے، انشاء اللہ ہدیۂ ناظرین کرام کئے جاتے رہیں گے۔

حج نمبر ختم:-

اس سال "حج نمبر" چونکہ زیادہ تاخیر سے شائع ہوا تھا اس لئے مستقل خریداروں کی تعداد سے صرف ڈھائی تین سو کے بقدر زیادہ تیار کرایا گیا تھا، لیکن الحمد للہ وہ اسقدر مقبول ہوا کہ اشاعت سے صرف دو ہفتے بعد دفتر میں اسکی کاپیاں بالکل ختم ہوگئیں اور فرمائشوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ افسوس ہے کہ دفتر الفرقان کے کارکن اب ان فرمائشوں کی تعمیل سے قاصر اور مجبور ہیں اسی اطلاع کیلئے یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔

البتہ سال گذشتہ کے "حج نمبر" اور اس سال کے "حج نمبر" کے مقالات ومضامین کا ایک مجموعہ تیار کرنے کی تجویز زیرِ غور ہے اگر حالات مساعد ہوئے تو ممکن ہے دو تین مہینے ہی میں یہ مجموعہ کارکنان الفرقان شائقین کی خدمت میں پیش کرسکیں۔

"حج نمبر" میں "سخنہائے گفتنی" کے تحت والدہ ماجدہ مرحومہ کے انتقال کا ذکر بھی ایک جگہ ضمناً آگیا تھا، جن بزرگوں یا مخلص دوستوں نے تعزیت کے خطوط لکھ کر اس عاجز کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا اور جنھوں نے مخدومہ مرحومہ کیلئے دعائیں کیں، رسماً نہیں، میں تہ دل سے اُن کا شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ اُن کو اس اخلاص واحسان کا پورا پورا اجر عطا فرمائے، اور اپنی خاص رحمتوں سے نوازے۔

تصوف اور اُسکے اعمال و اشغال؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسی گذشتہ رمضان میں اس عاجز کے مرتب کردہ "حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات" کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ راقم سطور ہی کے قلم سے شروع میں چند صفحہ کا مقدمہ بھی ہے، جس کا عنوان ہے "ملفوظات کا مرتب صاحبِ ملفوظات کی خدمت میں" — مقدمہ کے ان چند صفحوں میں اس عاجز نے حضرت مولانا مرحومؒ سے اور اُن کی دینی دعوت سے پہلے اپنی بیگانگی اور ناواقفیت، پھر کچھ سطحی اور ادھوری واقفیت، پھر کچھ اچھی واقفیت، اور پھر چند مرتبہ خدمت میں حاضری اور شرفِ صحبت کے مختلف دوروں کا ذکر کیا ہے — اسی سلسلۂ بیان میں اپنی سرگذشت کا ایک ایسا واقعہ بھی قلم سے نکل گیا اور چھپ گیا جس کا علم غالباً میرے واقفوں اور دوستوں کو بھی کم تھا — میں نے اُس میں اپنا گذرا ہوا یہ حال لکھ دیا، کہ:-

"حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے مشائخ اور ائمہ سلوک و تصوف سے اگرچہ مجھے بڑی گہری عقیدت تھی، اور اسلامی ہند کی یہ چند شخصیتیں میرے دل اور دماغ پر چھائی ہوئی تھیں لیکن نفسِ تصوف کی طرف سے مجھے اطمینان نہ تھا بلکہ طبیعت کو اُس سے ایک درجہ کا توحش تھا، اور ذہن میں اس پر کچھ علمی اشکالات بھی تھے — ۱۹۶۱ء کے اواخر یا ۱۹۶۲ء کے اوائل میں قضا و قدر کے ایک فیصلہ نے میرے لئے ایک ایسی صورت پیدا کر دی کہ ایک صاحب ارشاد بزرگ (جنکو میں اہلِ یقین و اخلاص میں سے سمجھتا ہوں) کی خدمت میں قریباً ایک ہفتہ مجھے قیام کرنا پڑا — موقع کو غنیمت جان کے ایک دن میں نے تصوف اور اُس کے خاص اعمال و اشغال کے متعلق اپنے خیالات عرض کئے — اپنی تسلی یا تشفی کے لئے نہیں، بلکہ بزعم خود گویا اُن بزرگ کے حال اور خیال کی اصلاح کیلئے — لیکن اللہ کے اُس بندہ نے عجیب طریق علاج اختیار کیا، تفصیل تو بہت لمبی ہے الا اُس کے

ذکر کا یہ موقع بھی نہیں، بس اجمالاً صرف نتیجہ سُن لیجئے کہ دو تین دن میں وہ سب اشکالات ختم ہو گئے اور معلوم ہوا کہ یہ سارے وساوس اور اعتراضات خود اپنی ہی کج فہمیوں کا نتیجہ تھے "۔

ملفوظات کے مقدمہ میں یہ واقعہ مجھے اس لئے لکھنا پڑا کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں میری حاضری اور اُن سے تعلق و عقیدت میں اس واقعہ کو خاص دخل تھا جیسا کہ بہ تفصیل مقدمہ میں لکھ چکا ہوں۔

ملفوظات کے مقدمہ میں یہ سطریں پڑھ کر بعض مخلص اور بے تکلف دوست مصر ہیں کہ الفرقان میں اس واقعہ کی پوری تفصیل بھی لکھوں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل میں بعض وجوہ سے متامل تھا، اب اپنے ایک ایسے بزرگ کا ایما پانے کے بعد جن سے اس قسم کے معاملات میں یہ عاجز اکثر رہنمائی حاصل کیا کرتا ہے، واقعہ کی وہ تفصیل حوالۂ قلم کرتا ہوں جو اب تک یاد رہ گئی ہے۔

جن بزرگ کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا اُن کی خدمت میں حاضری کا اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اتفاق ہوا تھا اور اُن کی محبت و شفقت اور تواضع و بے نفسی سے میں کافی متاثر ہو چکا تھا۔

سنہ ۶۱ھ کے اواخر یا سنہ ۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی جہاں دل اور دماغ افکار و مکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔۔۔۔ اس مقصد کے لئے میری نظرِ انتخاب ان بزرگ کی خانقاہ پر ہی پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے اور منظر بھی سر سبز و شاداب ہے، بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے از راہِ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا، یاد آتا ہے کوئی تیسرا اُس وقت وہاں نہیں تھا، قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر "نفی اثبات" کا اور بعض اُن میں سے "اسم ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے، اور مشائخ سلوک کے تجویز کئے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب بھی لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لئے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابلِ برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔

" حضرت! ساری عمر دین کے بارہ میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے

اور جس کی تعلیم آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کو دی، اور پھر صحابۂ کرامؓ سے جو بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل در نقل کے ذریعہ جو اُن سے ہم تک پہنچا ——— اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربیں [illegible] کے ہزارہ)، جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرامؓ کو [illegible] خود ہی سالکین ہوتا لیکن صحابۂ کرامؓ نے تابعینؒ سے اس طریقہ پر ذکر کرایا، اور نہ تابعینؒ نے اپنے بعد والوں کو [illegible] یہ چند خیال اس لئے ذکر کے اس طریقہ کے بارہ میں مجھے خلجان ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ [illegible] غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے۔"

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا: —

"مولوی صاحب! یہ بیچارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے، بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں ان کو یہ ہی بتلا دیتا ہوں۔ آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریر و تقریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے، آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا، لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا، اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا، اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اُٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشا کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا، لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا، اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس رویہ سے الحمد للہ میں اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں اس لئے یہ اس سے پہلوتہی کر رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے، بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے[1]۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت

---

[1] صوفیوں کو ان کے ایک بڑے اُستاد (حافظ شیرازی) کا مشورہ بھی یہی ہے کہ ؎
با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذارید تا بمیرد در رنج خود پرستی

کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نماز عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر [illegible] میں جا کر لیٹ گیا، اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطور خود بھی غور کرنے لگا۔ [illegible] تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ [illegible] مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک [illegible] رہا ہوں تو پھر اس بارہ میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط یا باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و اوضاع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا، کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارہ میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انھوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے۔ بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُنکی کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلدی ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم التفقہ فی الدین

اور عنداللہ مقبولیت کا میں پہلے سے پوری طرح قائل تھا، اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے ——— بیشک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا حامی اور مروّج بھی نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اور اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پا لینے کی کوشش کرنا چاہئے۔
رات کافی گذر چکی تھی، اس نتیجہ پر پہنچکر میں نے اس غور و فکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں، اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث مباحثہ اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا، کہ:-

"میرے دل دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوّف کے ان اعمال و اشغال کے بارہ میں جو اب تک میں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں۔ چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کُھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔"

موصوف میری یہ بات سُن کر مسکرائے اور فرمایا:-

"مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا:-

"بدعت کی تعریف تو علماء نے کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کیلئے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔"

فرمایا:-

"ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے

اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقہ سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو جس طریقہ سے رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقہ کے استعمال کو بھی آپ "دین میں اضافہ" اور "بدعت" کہیں گے؟ —— (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا) —— مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے اور دین میں اس کا نہایت تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں اس کے لئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہوگئے کہ صحبت اس مقصد کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے، اور اس کے بعد سے دین کے تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے —— تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقہ میں اس تبدیلی کو بھی "دین میں اضافہ" اور بدعت کہا جائے گا؟"

میں نے عرض کیا :-

"نہیں! "دین میں اضافہ" جب ہوتا ہے جبکہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے، لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقہ کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا"

فرمایا :-

"بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لئے کیا کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے —— مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اولٰہ ہر وقت اُس کا اور اس کی رضا کا دھیان فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں، اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا —— لیکن رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں دین کی

لہ قرآن پاک میں ہے "والذین آمنوا اشدّ حبّاً للہ" (اور ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں) بقیہ صلا پر

تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں، اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت سے صحابۂ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی، لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لئے صحبت کے ساتھ "ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا، اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی ـــــ اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے ـــــ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے۔ تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے، اور اسی لئے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردوبدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے اُن کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال اور اشغال تجویز کر دیتا ہے، اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا کرایا جاتا ہے۔

(صنا کا بقیہ حاشیہ) اور حدیث شریف میں ہے "ثلٰث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان" (الحدیث) (تین باتیں جس میں ہوں وہ ایمان کی شیرینی اور اس کا ذائقہ پائے گا، ان میں پہلی یہ ہے کہ اللہ و رسول کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو الخ) ـ اور مشہور حدیث میں ہے "الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ" (احسان کا مقام یہ ہے کہ اللہ کی بندگی تم اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو)۔ اور بعض ادعیہ ماثورہ میں ہے:- "اللھم اجعلنی اخشاک کانی اراک ابدا" (اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں ہر وقت تجھ سے اس طرح ڈروں کہ گویا ہر وقت تجھے دیکھتا ہوں) ۲

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربہ سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل کیا جائے۔ لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربہ کے لئے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں اس لئے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا، کہ:-

"اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے ان کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا:-

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ وہ ادھر دیدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے، باوا صاحبؒ نے، اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ، اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں، اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سک رہی ہیں) اُس میں اُن کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی — لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:-

"خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اُس کے بغیر نہیں ہو سکتا تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو

اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے وہ اسی راستہ سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے۔ ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سیکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے۔ جن میں سیکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحبِ الہام بھی تھے۔"

میں نے عرض کیا، کہ :-

"جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو کیا وہ کسی مدت تک اُس کام کو چھوڑ کے پہلے اس کی تحصیل کرے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کو بھی کرتا رہے اور اُس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے؟"

فرمایا :-

"ہاں ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں کچھ مدت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

میں نے عرض کیا :-

"کیا اس کے لئے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟"

فرمایا :-

"نہیں، بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت اور صحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار کے لئے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔"

میں نے عرض کیا، کہ :-

"پھر مجھ کو بھی کچھ فرمادیں۔"

فرمایا :-

"مولوی صاحب! حدیث میں ہے "المستشار مؤتمن" (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو پوری دیانت داری سے مشورہ دینا چاہئے) میں آپ کے لئے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لئے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی طرف رجوع کریں۔ ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا

خاص فضل ہے، اور آپ جیسے علم والوں کے لئے میں اُن ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا:-

"ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی، لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب یہیں پیدا ہوئی ہے اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔"

موصوف نے اپنی محبت و شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمالیا، اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمادیا، اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً ۴، ۵ دن وہاں اور مقیم رہا، جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا، کہ "حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں آپ ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کیا کریں۔" ——— اس موقع پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورہ کی تعمیل پر آمادہ کیا، اور جیسا کہ ملفوظات کے مقدمہ میں میں لکھ چکا ہوں اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا، اور کچھ عرصہ کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولاناؒ کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہلِ خانقاہ سے مجھے جو بُعد تھا، اُس میں اچھا خاصا دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح و تعدیل کے لئے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی۔ گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحبِ اخلاص بندہ کے دین کے درد اور اس راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا، اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ ؎

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز　　کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

۸، ۹ برس پہلے کا یہ واقعہ ہے، حافظہ نے ابتک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے۔ اپنی اور اُن بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے اس سب کو روایت بالمعنی ہی سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی بعض باتیں رہ گئی ہوں، اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں اُن بزرگ سے سنی گئی ہوں۔ بہرحال جو توضیحات وتشریحات اُن بزرگ کی طرف منسوب کرکے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب انہی کی ہیں۔

تصوف کے اعمال واشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا، افسوس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لاابالی پن کی وجہ سے اور کچھ اپنے دیگر مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کماحقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جاسکا، تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلہ سے اور اُس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اور اس کی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا اور اُن کے احوال اور ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں، اور بعض خود اہلِ تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں ——— خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب "تصوف" اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں ——— اس اجمال کی تفصیل اگر توفیق ملی تو کسی دوسری صحبت میں انشاء اللہ جلدی ہی عرض کی جائے گی۔

دجّالی فِتنہ اور سُورۂ کہفؕ

(مولنا سیّد مناظر احسن گیلانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"تو کیا ایسا ہوگا کہ تم اپنی جان کے کھونے والے بن جاؤگے، ان کے (یعنی
عقیدۂ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر، اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات
(قرآن) پر، مارے غم واندوہ کے"

سورۂ کہف اٹھا لیجئے، آگے آپ کو یہ آیت ملے گی، یعنی

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا"

پیشانی کی عبارت اس قرآنی آیت کا حاصل اور ترجمہ ہے، یوں تو سورۂ کہف اوّل سے آخر تک عجیب وغریب اشارات پر مشتمل ہے، لیکن کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورہ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی "اٰثارھم" کا جز غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔ آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے، جو اُردو میں بھی مستعمل ہے، جس سے شائد وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے، جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے، لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے "منتہی الارب" میں ہے۔

"اثر بقیہ چیزے ونشاں"

آگے بیان کیا ہے کہ نقشِ قدم کو بھی اسی لئے اثر کہتے ہیں، پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں "اثر ابعد عین" درحق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ وآثار ونشان او طلب نماید" یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو، اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد چیز اپنے جن نتائج اور نشانوں کو چھوڑتی ہے، ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں

آشار کے لفظ سے کرتے ہیں، یہ لغوی تشریح تو آشار کے لفظ کی ہوئی۔

دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے جس کا مادہ بخع ہے۔ عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا کر دیا جاتا ہے، مگر عربی زبان کے ایسے محاورے اور زباں زد فقرے مثلاً "بخع الارض بالزراعۃ" جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اسی طرح "بخع الرکیۃ" اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہونچ جائے جہاں سے پانی اُبلنے لگے۔ بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہونچا دینا، بخع کے عربی لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم واندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے، لیکن یہی کیفیت جب آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بےچینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر نہ پائی جاتی ہو، عربی میں اس کو ارض اَسِفَۃ کہتے ہیں۔

ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجۂ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی، تو خود عیسائیوں پر نہیں بلکہ عقیدۂ ولدیت رکھنے والی اور اس پر اصرار کرنے والی یہ امت اپنے پیچھے جن نتائج وعواقب یا آثار کو پیدا کر کے دنیا میں چھوڑتی چلی جائے گی ان پر یا ان کے تصور سے صاحبِ وحی مہبطِ قرآن محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اندر غم والم کرب وقلق کی ایسی غیر معمولی کیفیت کا طوفان برپا تھا کہ اس راہ میں اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی اور جان تک کو قربان کرنے پر آپؐ آمادہ تھے۔

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح جچے تُلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اسی سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

پس آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی یہ نفسیاتی کیفیت اگر واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ "عقیدۂ ولدیت" کے وہ مہیب روح فرسا، جاں گداز آثار ونتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس حد تک متاثر تھے، یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لئے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ وتامل کا مستحق

"آنتارھم" کا جزو ہے، اور اب میں اسی "آنتارھم" کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ آنتار، اور ھم ان دو لفظوں میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک خاص طبقہ کی ایک طویل تاریخ کو بند کر دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ "عقیدۂ ولدیت" یا کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا ٹھیرانا، خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لئے جس حد تک ناقابلِ برداشت ہو، دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہو، اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو، "کلمۃ تخرج من افواھھم" (بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے) اس میں "افواہ" یعنی منہ کی طرف جو اس کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس عقیدہ کا تعلق نہ دل سے ہے اور نہ دماغ سے، بلکہ عقیدہ رکھنے والوں کے منہ سے ایک بات نکلتی ہے، ابتدا بھی اس کی منہ سے ہے، اور انتہا بھی منہ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

مگر کیا کیجئے آدمی جب طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہر حال مان ہی کر رہیں گے تو کوئی نہ کوئی راہ اس کی نکال ہی لیتا ہے، مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے کہ حواس و عقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہیں سے راہ نمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے، فطرتِ انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی دسترس سے باہر ہیں، ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اس کے اسی فرض کی بجا آوری میں پوشیدہ ہے، اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اس قسم کی باتیں جو کہہ دیتے ہیں کہ "مذہب یا دین ورا طور عقل ہے" یعنی عقل سے بالاتر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلّت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب کرتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی، دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ جبلّت کی جس پیاس کا پانی، یا جس بھوک کی غذا مذہب مہیا کرتا ہے، یہ ایسا پانی یا ایسی غذا ہوتی ہے جس کے تصور ہی سے عقل اور جذبات میں غثیان اور ابکائی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔

بہر حال زندگی کے جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان سوالوں کے جوابوں کے علم یا جاننے کا ذریعہ نہ ہم اپنے حواس کو بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی عقل کو، لیکن یا ان یعنی ان جوابوں کے ماننے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہئے، ورنہ جن باتوں کے ماننے کی بھی صلاحیت

ہم میں نہ ہوگی تو ان ہی پر ایمان لانے یا ان کے ماننے کا مطالبہ مذہب کی طرف سے کیسے پیش ہو سکتا ہے، کیا آنکھ کو سننے کا اور کان کو دیکھنے کا مکلف بنایا جا سکتا ہے؟۔

ہمارے ہاں کی قدیم کلامی کتابوں میں ... ... مذہبی حقائق کے متعلق عموماً ان کے امکان پر جو زور دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ مذہب اپنے پیش کردہ جوابوں کے متعلق براہِ راست جاننے کا نہیں بلکہ صرف ماننے کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس مطالبہ کی تصحیح کے لئے ضروری ہے کہ فطرتِ انسانی میں ان امور کے ماننے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایسا مذہب جس کی تعلیمات کے ماننے کی بھی گنجائش آدمی کی فطرت میں نہ ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ جنوں یا فرشتوں کا تو وہ مذہب شاید ہو سکتا ہے، مگر آدمی کا مذہب وہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔

بہر حال یہ بڑا طویل افسانہ ہے۔ خاکسار کی کتاب "الدین القیم" کا مطالعہ ان لوگوں کو کرنا چاہئے جن کیلئے میرا یہ مختصر بیان تشفی بخش ثابت نہ ہوا ہو۔

اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب اور مذہبی حقائق و امور کے متعلق مذکورۂ بالا اصول ایک ایسی جانی پہچانی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ و موازنہ میں عموماً دنیا اسی اصول سے کام لیتی رہی ہے پچھلے دنوں یورپ کے اربابِ فکر و نظر نے اسی سلسلے میں "غلو" سے کام لیتے ہوئے مذہبی حلقوں میں کچھ ایسی باتیں پھیلا دیں کہ "جاننے" اور "ماننے" کا فرق خام کاروں کے سامنے سے کچھ ہٹ سا گیا، اور مذہب جس کی طرف سے ہمیشہ "آمنوا" یعنی ماننے کا مطالبہ پیش ہوتا رہا۔ یعنی دنیا سے کہا جاتا تھا کہ مانو! لیکن سننے والے کہنے لگے کہ ہم تو ان چیزوں کو نہیں جانتے، گویا گلاب کے پھول کو پیش کر کے کہا جاتا کہ اس کو سونگھو! مگر جواب میں کہا جاتا تھا کہ گلاب کی خوشبو کو ہم سُن نہیں رہے ہیں۔

پچھلے دنوں مغربی خیالات سے متاثر ذہنیتوں میں الملائکۃ، الجنۃ، النار، البرزخ یہ اور اسی قسم کے مذہبی حقائق کے متعلق تذبذب اور شک کی کیفیت جو پیدا ہو گئی تھی، اس کی بنیاد "جاننے" اور "ماننے" کے اس خلط مبحث ہی پر قائم تھی، مذہب تو کہتا تھا کہ فرشتوں کو مانو! لیکن خواہ مخواہ کی عقلیت کے مدعیوں کی طرف سے کچھ ایسی باتیں پیش ہونے لگیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم فرشتوں کو دیکھ نہیں رہے ہیں۔ حالانکہ ان سے دیکھنے کا مطالبہ کب کیا گیا تھا، گویا باور کرایا گیا تھا کہ عقل و حواس کی راہ سے جانی ہوئی باتوں کو اگر مذہب پیش کرتا ہے تب تو خیر ان کو مان لیا جا سکتا ہے، لیکن عقل و حواس کے معلومات میں مذہب اضافہ بھی کر سکتا ہے اس حق سے اس کو محروم کر دیا گیا تھا۔ متعقلوں[۱] کا ایک بڑا طبقہ اسی مغالطہ کے جال میں اب تک

۱؎ زبردستی بہ تکلف عقل کے مدعی۔

پھڑ پھڑا رہا ہے۔

خیر یہ قصہ تو پچھلے زمانہ کا ہے، لیکن اسی یورپ میں اسی مسئلہ کا سہارا لے کر کہ مذہب میں عقل کو دخل ہے یا نہیں، ایک مدت تک نفی کے پہلو کو متعین کر کے یعنی مذہب "ورا طور عقل ہے" جس کا واقعی مطلب جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تھا کہ آدمی مذہب کے غیبی حقائق کو عقل و حواس کی راہ سے جان نہیں سکتا۔ یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ مذہب کی سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اس کے تعلیمات کے ماننے کی صلاحیت بھی آدمی کی عقل و فطرت میں نہ ہو۔

کہا جاتا تھا کہ اس معیار پر سب سے بڑی صداقت "عقیدۂ ولدیت" ہے، اسی کی عام تعبیر یہ تھی کہ "تین ایک ہے، اور ایک تین ہے"، یہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے، اس لئے سب سے بڑی سچائی ہے کہ عقل ہو یا فطرت اس کے ہضم کرنے سے قطعاً معذور ہے۔ یوں سب سے بڑے جھوٹ کو سب سے بڑی سچائی کا قالب عطا کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کا خطرہ اور اندیشہ بھی کفر تھا کہ عقل یا انسان کے فطری تقاضوں کی ہوا بھی اس عقیدے کو پہونچے۔

بہر حال اسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کیلئے بھی ٹھیس اور دل کے لئے بھی صرف ٹھوکر ہو، وہ ماننے والوں کے افواہ یا ذہنی دائرے ہی میں گھومتا رہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ گو بذاتِ خود یہ افواہی مسئلہ زبان اور تالوے نہ خود آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ اس کے ماننے والے اس کو آگے بڑھانا چاہتے تھے، لیکن جیسا کہ جاحظ نے بھی لکھا ہے کہ جس قسم کی گرویدگی عیسائیوں میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق پائی گئی ہے، مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اس کی نظیر مشکل سے ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

اس غیر معمولی گرویدگی، اور وارفتگی کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، خدا کو "صورتِ انسانی" میں لانے کا نتیجہ ہو، یا "نظریۂ ولدیت" کے پیش کرنے والوں نے کفارے[1] کے غلاف میں لپیٹ کر جو اس کو پیش کیا تھا، اس چیز نے مذاہب کے بازار کا سب سے چلتا ہوا سودا اس کو بنا دیا ہو، یا اس کے سوا دوسرے اسباب و وجوہ ہوں،

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مذاہب و ادیان میں کچھ چیزیں تو منوائی جاتی ہیں، اور جن باتوں کے منوانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے ان کی بنیاد پر عملی مطالبات کی بھی ایک فہرست ماننے والوں کے سامنے رکھی جاتی ہے، اسی لئے ایمان و عمل پر ہر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ (بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

مگر ہوا یہی کہ خود یہ مسئلہ تو "افواہ" کے چکروں میں گھومتا رہا لیکن اس سے پھوٹ پھوٹ کر جڑوں، جڑوں کے باریک باریک ریشوں اور رگوں کا ایک طویل سلسلہ اندر ہی اندر ماننے والوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور جوں ہی کہ کچھ سازگار حالات میسر آئے ان ہی جڑوں سے شاخیں نکلیں، برگ و بار آئے، آخر میں

"کلیسا"

کے نام سے مذہبی دنیا میں ایک ایسے تناور بلند و بالا گھنے درخت کی شکل اس نے اختیار کر لی، جسکی نظیر مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہ پہلے ملتی ہے اور شاید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعد کو بھی اسکی مثال مشکل ہی سے

(صلا کا بقیہ حاشیہ) بنیادی تعلیم میں تو تقریباً ہر مذہب میں ایمان و عمل دونوں پر زور دیا جاتا ہے لیکن آگے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ ان دونوں (یعنی ایمان و عمل) میں سے کسی ایک چیز کی پابندی میں قصور کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی سوال کے جواب میں اپنے طبعی رجحانوں کی بنیاد پر بعضوں نے ایمان پر اور بعضوں نے عمل پر زور دے دیا۔ ہندو مذہب میں گیان کانڈ، کرم کانڈ، کے قصوں کی بنیاد نقطۂ نظر کے اسی اختلاف پر قائم ہے، مسلمانوں میں بھی مرجیہ اور معتزلہ خوارج وغیرہ اسی سلسلہ کی شاخیں ہیں۔ مرجیہ کے نزدیک ایمان ہی سب کچھ ہے، ایمان ہو مگر عمل نہ ہو تو نجات سے مومن محروم نہ رہے گا۔ ان کے مقابلہ میں معتزلہ و خوارج کے نزدیک اُس ایمان کی کوئی قیمت نہیں جس سے صحیح عمل پیدا نہ ہو۔

مذہب یہود کا عمومی رجحان بھی عملیت کی طرف تھا جس کی تعبیر وہ شریعت سے کرتے تھے، سینٹ پال نے ولدیت کا نظریہ جب عیسائیوں میں پیش کیا تو اسی کے ساتھ وہ اس کی منادی بھی کرتا جاتا تھا کہ:۔

"اب شریعت کے بغیر خدا کی راستبازی ظاہر ہوئی ہے"

یہ شریعت کے بغیر خدا کی راستبازی کیا تھی؟

"یعنی وہ راستبازی جو مسیح پر ایمان لانے سے سب ایمان والوں کو حاصل ہوئی ہو"

راستبازی کے حاصل کرنے کے اس طریقہ کا نام "مفت کی راست بازی" رکھا گیا۔ سینٹ پال کے اس خط میں ہے:۔

"اس مخلصی کے وسیلہ سے جو یسوع مسیح میں ہے "مفت راستباز" ٹھہرائے جاتے ہیں"

توجیہ یہ کی جاتی تھی کہ:۔

"اسے (یعنی یسوع مسیح) کو خدا نے اس کے (یسوع مسیح) کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا ہو جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا ہے" (رومیوں کے نام سینٹ پال کا خط۔ باب ۳)

(بقیہ صلا پر)

ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

بہ ظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے سمٹی ہوئی سمجھی جاتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی، جو اندر ہی اندر پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں، لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

"کلیسا" کا نظام کیسے قائم ہوا، ابتداء اس کی کس شکل میں ہوئی، یہودیوں یا اولادِ اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہونچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گفتہ و ناگفتہ بہ تدبیروں سے کام لیا۔ شاؤل جس کا نام بعد کو پولس اور آجکل سینٹ پال ہے، یہ شخص کون تھا، ایشیا کوچک کے صوبہ کلیکیہ کے شہر طرسوس اپنے مولد سے یہ فلسطین کیسے پہونچا، اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کر کے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اس نے توڑے، اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لئے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی روح اس پر متجلی ہوئی، اور غیبی آواز آئی۔

"اے شاؤل اے شاؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے"

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ اسے یہ جواب ملا کہ:—

"میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے مگر اٹھ شہر میں جا، اور تجھے جو کرنا چاہیئے، وہ تجھ سے کہا جائے گا" (اعمال ۹: ۴-۵)

پھر بجائے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنا والا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا، اور آخر میں بہ عہد شاہ نیرو رومیوں کے دار السلطنت روم الکبریٰ میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہونچا، وہیں وہ مارا گیا، دفن ہوا، پھر

(ص ۲۱ کا بقیہ حاشیہ) کہا یہ جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں، اپنے ماننے والوں کے گناہ کی سزا میں مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا جھیل چکا تو ماننے والوں کو ان کے ان ہی گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے، یہی کفارہ کا مسئلہ ہے۔ مسیحی دنیا میں یہ سوال و جواب یعنی "میں کیا کروں کہ نجات پاؤں؟" "مسیح یسوع پر ایمان لا تو بچ جائے گا" ایک عام زبان زد فقرے کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ۱۲

اس کے مدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرسؓ کی جعلی قبر کا دعوی کر کے رومہ میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا، جس نے آخر میں "کلیسائے رومہ" کا نام پایا۔ اور اسی رومی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخصی مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آگیا۔ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا، رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق، اور اس کے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہونچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی، یورپ کے عیسائیوں کی جان و مال عزت و آبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول و عرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے، سب کماتے تھے، اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لئے ہزارہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے تفصیل کیلئے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، لیکن بطور نمونہ کی چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کے لئے مناسب ہوگا جنھوں نے "دین صلیبی" اور یورپ جس صورت حال سے اس دین کے داخل ہونے کے بعد دوچار ہوا، اس کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلایا ہوا "صلیبی دین" اور نظریۂ ولدیت کیساتھ کفارہ کا مسئلہ، اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا، مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تااینکہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود اس دین کو وہ قبول کرلے، گویا یوں رومی حکومت، بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔

---

[1] کلیسائے رومہ کی عظمت کا زیادہ تر دار و مدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا، لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے، اب سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مرگیا، سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطۂ نظر یہ تھا کہ پال کے نزدیک صرف مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا، مخض یہی نجات کیلئے کافی ہے، لیکن پطرس موسوی شریعت کے احکام کو تعمیل ضروری قرار دیتا تھا۔ جرمنی کے ارباب تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت، حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی، اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آرہا تھا۔

(دیکھو تاریخ بائبل بلیکی ترجمہ طالب الدین ص۱۵۸)

حکومت کی اسی پشت پناہی کے زیر اثر روما کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں اپنی کتاب میں انھوں نے چند وثائق کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے روما کا دعویٰ تھا کہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے جن میں ایک مشہور قدیم وثیقہ وہی ہے جس کا نام "عطیۂ قسطنطین" تھا، گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یہ درج کیا ہے:-

"شاہنشاہ کانس ٹن ٹائن (قسطنطین) وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش، بادشاہ اقوام المانی و سریانی، و جرمانی، و برطانی، و ہونی، پارسا، و خوش نصیب فاتح، و غازی، و ذی شان، مرض جذام میں مبتلا تھا، اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اُسے صحت نہیں ہو سکتی، مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اُسے صحت حاصل ہوئی، اور صحت یابی کے شکریہ میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا روما کا "قسیس اعلیٰ" تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا، اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات روما، اور خود شہر روما اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہے گا"

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، اسی عطیۂ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے:-

"ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے"

(دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ صـ۲۰۲ - ترجمہ اُردو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ روما جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے براہِ راست صحابی یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا، اُن کی درگاہ ہے، اور اسی کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا گویا دونوں درگاہوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی، صحت کے بعد یہ صلۂ شاہی دربار سے ملا ـــــ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، کہ:-

"پندرھویں صدی عیسوی تک جب تک یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ نہ ہوا کسی میں ہمت نہ تھی، کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے، یا اس کی صحت میں شک و شبہ کرے"

(صـ۲۵۱ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے، اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس کی درگاہ ہی کو اس زمانے میں فرضی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۶۰ء جس میں مذکورۂ بالا وثیقہ کا اعلان

کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا، اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک اس کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنے تھا۔

اور ایک یہی کیا، اسی قسم کے بیسیوں ذرائع مسلسل اختیار کئے گئے تا اینکہ بقول گرانٹ صاحب گیارھویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری گوری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امراء عام باشندوں کو خطاب کرکے یہ اعلان شائع کر دیا گیا، کہ :۔

"پاپائے رومہ کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسا رومہ کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا"۔

اسی میں یہ بھی تھا، کہ :۔

"پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے، انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی"۔

آخر میں تھا، کہ :۔

"پوپ شاہنشاہوں کا آقا ہے"

(کتاب مذکور صفحہ ۲۶۸)

اور یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا جنھوں نے یورپ کے قرون متوسطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا، اس قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے، عموماً پوپوں کی طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لئے شائع ہوتی رہتی تھیں، کہ :۔

"خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں۔ اور اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں"۔

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا، کہ :۔

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے، اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو،

تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے "

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران، رُوحانی حکمران یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ بلاچون وچرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں، اسکے سوا ان کے لئے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

عام رعایا برایاان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی، اس لئے نتیجۃً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔

ماسوا اس کے "اعتراف گناہ" کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا، پوپ کے نمائندے ملک کے طول وعرض میں میل دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے "چرچ" بنائے بیٹھے رہتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں سماعت کریں اور جو معاوضہ طے ہوجاتا تھا اس کو لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جو مقامی گرجوں سے توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جا-تا تھا، جو یہ ہوتا تھا، کہ :-

"ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے، اور جن مقدس تکلیفوں کو اُٹھا کر حقوق مسیح کو جو حاصل ہوئے ہیں، ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں"

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا، کہ :-

"پس معلوم ہو کہ مسیح کے رسُولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس خاص علاقے میں جو یہ اقتدار مجھے بخشا ہے کہ تمھارے ان گناہوں کو میں معاف کردوں، جو تم سے صادر ہوچکے ہیں یا کلیسا کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں، خواہ وہ جیسے کچھ ہوں، اور جو کچھ بھی ہوں، نیز ایسے سارے گناہ جن کے بخشنے اور جنکی بندش سے کھولنے کا اختیار پوپ صاحب کو ہے، وہ سب تیرے بخشے گئے۔

اسی طرح "کلیسائے رومہ" کی کنجی جتنی دراز ہے، اسی کی نسبت سے

تیرے ایسے گناہ بھی معاف کئے گئے جو آئندہ تجھ سے سرزد ہوں۔
اب میں تجھے کلیسا کے رموز اور اسرار میں شریک کرتا ہوں، اور
جس وحدت کو کلیسا نے پیدا کیا ہے، وحدت کے اسی دائرے میں
تجھے داخل کرتا ہوں۔

آخر میں لکھا ہوتا تھا، کہ :۔

اب جو تو مرے گا تو عذاب کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پائے گا،
اور فردوسِ بریں کے دروازوں کو اپنے اوپر کھلا پائے گا۔ بہرحال
جس زمانہ میں بھی تو مرے گا تو اس "مغفرت نامہ" کی تاثیری قوت
سے تو ہمیشہ باپ بیٹے، اور روح القدس کے نام سے تو مستفید
ہوتا رہے گا" (آمین)

(منقول از اظہار الحق عربی ص ۳۷ ج ۲)

مغفرت ناموں پر باضابطہ فیس کی ابتدا اگرچہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ ہوئی، لیکن جب رواج پڑ گیا، تو اس کی تجارت نے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سلاطین کے عزل و نصب کے مسئلہ کو قابو میں لانے کے ساتھ "اعترافِ جرم" کے پردے میں لوگوں کی شخصی زندگی کی کمزوریوں کا علم کلیسا کے پاس ایک ایسا شکنجہ تھا کہ پادری سب کچھ کر رہے تھے، عوام دیکھتے تھے مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے، عوام کا مال، ان کی جان، اور آخر میں عزت و ناموس سب پر اطلاقی تصرفات کا اقتدار پادریوں کو حاصل تھا۔

کلیسائی رہبانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں

وکثیر منھم فاسقون   ان راہبوں کی اکثریت فاسق بن گئی

کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس قرآنی آیت کی تفسیر سے یورپ کی تاریخیں معمور ہیں۔ موشم نے تاریخ کلیسا میں لکھا ہے، کہ :۔

"متاہل اور شادی شدہ لوگوں پر مانا جاتا تھا کہ شیطان کا اثر ہے،
اس لئے جو لوگ کلیسا میں عہدہ حاصل کرتے تھے، وہ شیطانی اثر سے

محفوظ رہنے کے لئے شادی نہ کرتے تھے، اسی طرح عورتیں بھی تجرد کی
زندگی اختیار کرتی تھیں۔"

مگر اس ابتدا، کی انتہا کیا ہوئی، تو شم ہی کا بیان ہے :۔

"لیکن یہ ساری باتیں صرف دکھاوے کی تھیں، مجرد مردوں کے بستر
رات کو مجرد عورتوں سے آباد نظر آتے تھے، یہ عورتیں مردوں کی ناجائز
خواہشوں کو پورا کرتی تھیں۔"

اسی نے لکھا ہے، کہ :۔

"ایک عورت معمولاً ایک مرد کے تصرف میں نہیں رہتی تھی، آج ایک
عورت آئی تو کل دوسری، اسی طرح درپردہ یہ سلسلہ قائم رہتا، مگر بظاہر
یہی کہا جاتا تھا کہ مجرد مرد اور مجرد عورتیں اپنی پارسائی اور عفت کو
قائم رکھتی ہیں۔"

"مقدس کلیسا" کی ان اندرونی غلاظتوں اور گندگیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کبھی کبھی بعض نیک دل پادریوں کو بھی بے چین کر دیتا تھا۔ برنردوس نامی اسقف کی ایک نظم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشہور ہے، جس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے :۔

"نکاح کے معزز اور پاک آہنی طریقہ کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا جس سے
پاک خوابگاہ آدمی کو میسر آتی تھی، اور بجائے اس کے کلیسا کی خوابگاہوں
کو عیاشی کا چکلہ بنا دیا گیا ہے، جن چکلوں میں مرد اور عورتیں جو ماں اور
بہنیں ہیں، ہر قسم کے گندہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں۔"

ایک پرتگالی پادری الفاردوس بلاجیوس نامی نے مغربی ممالک کے عام کلیساؤں کی ان ہی اخلاقی زبوں حالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، خصوصاً اسپین کے متعلق لکھا ہے، کہ :۔

"کاش! ایسا ہوتا کہ کنوارے رہنے کا جو عہد کلیسا میں شریک ہونے والوں سے
لیا جاتا ہے، یہ عہد نہ لیا جاتا۔ آج اسی عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے
عام باشندوں کے بچوں میں زیادہ اکثریت کلیسا کے مذہبی خدام کی ہے۔"
(اظہار الحق ج۲-ص۲ عربی)

الغرض کلیسا کی "رہبانیت" باہر سے جیسی کچھ بھی نظر آتی ہو، لیکن بہ تدریج اندر ہی اندر یہی "رہبانیت" فسق کی "اکثریت" کے قالب میں ڈھل گئی۔ قرآن کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جسکی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔

ان اندرونی گندگیوں اور غلاظتوں کے ساتھ اسی کلیسا کی قوت کے بدولت باہر میں "پوپ" کا لاہوتی اقتدار بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہونچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنسیس زابادلا جو پوپ کی مجلس خاص (ڈیکن) کا کرڈینال[1] تھا، اسی نے یہ اعلان عام کر دیا تھا، کہ:۔

"پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے، تاآنکہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، پوپ چاہے تو اُن کو حلال قرار دے سکتا ہے۔"

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس "اعلان عام" کے یہ تھے، کہ:۔

"پوپ (کا اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے[2]"

اور آئے دن پوپ اپنے اس فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا۔ پروفیسر میکائیل (میخائل) کی عربی کتاب، جو بیروت میں ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے، اُس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی، جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے ردو بدل کیا تھا، میخائل نے لکھا ہے، کہ:۔

"روپیہ لے کر حرام کو حلال، حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا۔"

مغفرت نامہ کی تجارت، یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ، اور عام نذر و نذور[3] اوقاف وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ خدا کی رحمت تیر اور پادری کے حساب سے کلیسا او

---

[1] کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے، اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے، یہ سب سے بڑا عہدہ تھا، انگریزی میں اسی کو آرچ بشپ کہتے ہیں۔ اسقفوں کے بعد قسیس، قسیس کے بعد بشپ اور پریسٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل اعلیٰ کا نام ڈیکن تھا، جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی، اس کونسل اعلیٰ کے ہر رکن کو "کارڈینال" کہتے تھے۔"

[2] اظہار الحق عربی ج ۲ صـ۳۷۔"

[3] ہر چرچ کے ساتھ کسی سینٹ (ولی) یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا، اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر تازہ مردہ بہ نسبت پرانے مرنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکزیت میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بھگوڑوں نے (صفحہ ۳۰ پر)

کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے عموماً بکتی تھی۔ عام قاعدہ تھا کہ سکرات موت کے وقت علاقہ کے پادری کا مرنے والے کے سرہانے رہنا ضروری تھا۔ کوئی جاگیردار مر رہا ہے، پادری صاحب بُلائے گئے ہیں، مراقبہ میں ان کو محسوس ہوا کہ مرنے والے کی رُوح کو لینے کے لئے سیاہ سیاہ آتشیں آنکھوں والی خبیث رُوحیں اُتر رہی ہیں پادری اس حال سے لوگوں کو مطلع کرتا ہے، پھر کیا کیا جائے، کلیسا کے نام سے جائداد وقف کی جائے، اور منت مانی جائے، یہ کیا جائے وہ کیا جائے، جب سارے مراحل طے ہو جاتے تب پھر پادری سر بگریباں ہو جاتا، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بشارت سناتا کہ خبیث روحیں واپس ہو گئیں، اور مجھے دکھایا گیا کہ نورانی ہستیاں پاک رُوحیں اب اُتر رہی ہیں۔

الغرض گوناگوں نت نئے طریقے کلیسا کی طرف سے اس لئے تراشے جاتے تھے کہ ملک کے باشندوں کی کمائی ہوئی آمدنی کسی نہ کسی طرح کلیسا کے حکام اور خدام کے پیٹ میں اُترتی چلی جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی مذہبی زود اعتقادیوں سے ناجائز نفع اُٹھانے والے دنیا کے اکثر مذاہب و ادیان میں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک ابلہ فریبیوں کا یہ سلسلہ دنیا میں جاری ہے، لیکن دین صلیبی میں کلیسا اور پوپ کے نام سے جو نظام قائم ہوا تھا اس کی نوعیت "ابلہ فریبیوں" کے اس عام قصے سے قطعاً الگ تھلگ تھی، اسی لئے باوجود اہتمام اختصار کے مجھے کچھ تفصیل سے کام لینا پڑا جس سے کلیسا اور پوپ کے غیر معمولی اقتدار کا کچھ اندازہ پڑھنے والوں کو ہو سکتا ہے۔

دوسرے مذاہب وادیان میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وقت کے حکمرانوں پر کسی "مذہبی شخصیت"، کا اثر قائم ہوا، اور اس "اثر" سے اچھا یا بُرا کام اپنے اپنے وقت پر لینے والے لیتے رہے، لیکن یورپ کے "دین صلیبی" کا

(ص ۲۹ کا بقیہ حاشیہ) "خیرے بزحو گھر کو آئے"، اس کی خوشی میں انگلستان کی قربان گاہوں یا درگاہوں اور چلّوں میں جو نذریں چڑھائیں، تو طامس بکٹ اسقف جو تازہ مردہ تھا، تو اس کی قبر پر تو اسی ہزار تین سو چھبیس ۸۰۳۲۶ روپے چڑھانے کی آمدنی ہوئی، لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت مریمؑ کی قربانگاہ کے چڑھاوے کی میزان کُل تین سو بتیس ۳۳۲ روپے تھی، اور اس سے بھی طرفہ ماجرا یہ تھا کہ خود خدا کے بیٹے مسیح کی قربان گاہ پر اکتیس ۳۱ روپے کی آمدنی ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کے باپ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہ آیا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے ان ہی بھگوڑوں میں جو دینی زندگی میں گونہ امتیاز کے مدعی تھے اپنے ساتھ کچھ تبرکات بھی یروشلم سے لائے تھے جن میں مسیح کی صلیب کا ایک ٹکڑا مسیح کا خرقہ اور وہ پتھر بھی تھا جس نے مسیح کو دکھ دیا تھا، سب سے دلچسپ وہ کرن تھی جس کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اُس ستارے کی یہ کرن ہے جسے مجوسیوں نے مسیح کا ستارہ ۵

---

۵ قرار دے کر سجدہ کیا تھا۔ ۱۲

کلیسائی نظام شخصی نظام نہ تھا، بلکہ وہ باضابطہ ایک ایسا مستقل نظام تھا کہ ہزار بارہ سو سال تک بقول مسجوک

"شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب "چاند اور سورج" سے دی گئی ہے"

(کتاب ارتقائے نظم حکومت ص ۲۶۴/۱۲)

جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کے عام سلاطین و ملوک ہی نہیں بلکہ شہنشاہی کے اقتدار رکھنے والی ہستیوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی قوت کا نور کلیسائے روم کے پوپ کے نور اقتدار کا عکس ہے، جیسے چاند کا نور آفتاب کے نور کے ساتھ وابستہ ہے۔

مسجوک ہی نے لکھا ہے، کہ:—

"سیاسی حکمرانوں کو کلیسا کے مذہبی حکمران کے ماتحت رکھنے کیلئے
یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اس کا فریضہ نائب عیسیٰ (پوپ) کے ہاتھ میں
ہونا چاہیئے، کیونکہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا"

کہا جاتا تھا کہ پوپ حضرت مسیح کے حواری کا جانشین ہے، اور پطرس حضرت مسیح کا جانشین تھا، بقول مسجوک

"اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران (اور بادشاہ) مقدس پطرس
کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اُسے معزول
کردے، اور اس سے مزید یہ ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار
معزول کر سکتا ہے وہ نصب اور تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے"

یہی ایک ایسی صورت حال ہے جس کی نظیر یورپ کے "دین صلیبی" کے سوا اور کسی دین میں نہیں مل سکتی۔

اگر کلیسا کے اس اقتدار سے کام لینے والے صحیح کام لیتے تو اس میں شک نہیں، جیسا کہ مسجوک نے لکھا ہے، کہ:—

"اس بے لگام خود غرضی (یعنی شاہی اقتدار کے مطلق العنان حکام)
کے لئے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضرور تھا اور اس کا صاف و سہل
علاج یہی معلوم ہوتا تھا کہ قسیسوں (حکام کلیسا) کی طرف سے
زجر و توبیخ ہوتی رہے"

مگر آپ دیکھ چکے کہ "مہ کلیسا" کی آڑ لے کر صلیبی دین کے ان نمائندوں نے کتنی گھنونی قسم کی بے دینیوں سے یورپ کو

بھر دیا۔ جان و مال، عزت و ناموس اس ملک کے ہر باشندے کا مذہب کے ان نمائندوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

سال دو سال نہیں، بلکہ چوتھی صدی عیسوی سے مذہبی غارتگریوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اور ہزار سال سے زیادہ مدت تک دن دونی ترقیوں کے ساتھ اس کے ظلم و تعدی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

فطرت انسانی قدرتاً ان حالات سے جس حد تک بے چین اور مضطرب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی احساسات لے کر پیدا ہوا ہے۔

یورپ کے یہ باشندے جنھوں نے صلیبی دین قبول کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، دیکھتے رہتے تھے تڑپتے تھے، تڑپنا چاہتے تھے، لیکن تڑپنے کی بھی گنجائش ان کے لئے باقی نہ چھوڑی گئی تھی، ایک طرف سلاطین و ملوک کی فوجی قوتوں کا دباؤ ان کو ہلنے نہیں دیتا تھا، جس کی وجہ ظاہر تھی کہ فوج کی قوت ہو، یا پولیس کی قوت، حکمران اقتدار کے منشار کی تعمیل کرتی ہے، اور حکمرانی کے اقتدار رکھنے والی طاقتیں چونکہ پوپ یا کلیسا کے غیر مسئول اقتدار کی چٹان کے نیچے ہر جگہ دبی ہوئی تھیں، اس کا لازمی منطقی نتیجہ تھا کہ کلیسا یا پوپ یا پوپی نظام کے تحت کام کرنے والوں کے متعلق لب ہلانے کی جرأت خود اپنے خون اور اپنی جان کے ساتھ بازی گری بنجاتی تھی۔

ایک طرف کلیسا کے ہاتھ میں اس طریقہ سے ملک کی سیاسی باگ آگئی تھی، اور دوسری طرف "اعتراف جرم" کے قصے کی بدولت ہر پادری انفرادی شخصیتوں کی کمزوریوں، جرائم اور لغزشوں کا محرم اسرار بنا ہوا تھا، کلیسا کے خلاف کچھ بولنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اپنے پوشیدہ جرائم کا راز فاش ہو جائے۔ افراد و اشخاص کی گرفت کا یہ ایک ایسا جال تھا، جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔

پھر رسم و رواج و عادت اس قسم کے عام قوانین کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو، عمومیت میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں ہی کلیسا کو اپنی من مانی کارروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد بلکہ یوں سمجھئے کہ عمر ہوتی ہے، قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب و فراز سے گذارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آرہی ہے، وہی قدرت ہر عمل کے ردعمل کے اسباب و وجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورۂ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردعمل کا اسباب و علل کے کن کن

قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشو و نما ہونے لگا، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور چیرہ دستیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں، رہزنوں اور غارتگروں کی طرف سے نہیں بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا، خود اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی، آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے، اور ان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبّوں میں جب سامنے آئے، اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبّوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ جرم و طغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ جیسے جیسے کلیسا کے بھیس میں شیطان اپنے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا، اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر میں تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لئے کوئی دہانہ نہیں ملتا تھا، سوراخ پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر و استبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

اسی عرصہ میں کروسیڈ وار یعنے مولد مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کیلئے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا، اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستاران صلیب کو عموماً دوچار ہونا پڑا، اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے بعض ایسی مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں، جس نے عوام کے پیمانۂ صبر کو لبریز کر دیا[1]۔ کہتے ہیں کہ ان ہی صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کے تجربہ کرنے کا بالواسطہ یا بلا واسطہ موقع یورپ کے کلیسائی باشندوں کو ملا، اسی کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر یوں تو در غلا در غلا کر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائیوں کو کٹوا ہی رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں اسٹیفن نامی گڈریے کے، ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا دیدار اس کو نصیب ہوا، اور روٹی ملی، اور حکم دیا گیا ہے کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کرکے مولد مسیح کی تطہیر کی کوشش کرے۔ یہ سنہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے ہر ہر علاقہ کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی چنی گئیں، جن کو مردانہ لباس پہنایا گیا، اور جہاد کا اعلان کرکے لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ باور کرایا گیا تھا کہ راستہ میں جو سمندر بھی ملے گا، خود بخود خشک ہو جائے گا۔ بہرحال مارسلیز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لاد دیا، اور بے درد تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز نذر طوفان ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے تھے، مگر ان کی کوئی کچھ نہیں سنتا تھا۔ اور لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہی۔ ۱۲

قوی العزم والارادہ سلاطین سے کلیسا اور پوپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی، اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہونچ گئی، جس نے کلیسائی نظام کے استحکام کو گونہ متاثر کیا۔[1]

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے درپے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گئے کہ اندر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی، اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے، ان کو منھ بنانے کا موقع مل گیا۔

پروٹسٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کرکے صلیبی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے، دراصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے، جن کی راہ سے کلیسا کی مخالفانہ آگ باہر نکلنے لگی۔

ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرأت سے کام لیکر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں، جن میں جرمنی کے مارٹن لوتھر سوئٹزرلینڈ کے زونگ لی، فرانس کے کالون نامی وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسا کی تاریخوں میں کرنا چاہیئے۔

حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ صلیبی دین کی ٹھیکہ داری، یا بائبل (توراۃ و انجیل وغیرہ) کی تشریح کا استحقاق کلیسا نے اپنے ساتھ جو مختص کر رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اور نہ نجات کیلئے کلیسائے روم اس کے پوپ، پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے، یہ ہزارہا ہزار صفحات کی داستان کا خلاصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتدا احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا، پوپ، پوپ کے نمائندوں، اور ان لوگوں کی پیش کردہ صلیبی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی غنیمت تھا، مگر کلیسا کے لئے یہ مغتنم احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابل برداشت کیسے ہو سکتا تھا۔ چاہا گیا کہ "گربہ کے ساتھ کشتنی" کے فعل کو

---

[1] مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک، یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم، اور اسی قسم کے مختلف سلاطین و ملوک کے جن واقعات کا ذکر تاریخوں میں کیا گیا ہے۔ ہنری چہارم کے متعلق لکھا ہے کہ جب ہلڈبرانڈ نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر ہونے کا حکم دیا، تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ "تو بظاہر پوپ ہے لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب۔ الخ" (دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ ص۲۷)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رو نے بانیفس ہشتم نامی پوپ کے اس فرمان کو جلا ڈالا کہ "پوپ جسے چاہے اکھاڑے، اور جس بادشاہ کو چاہے باقی رہنے دے" (ارتقائے نظم حکومت یورپ ص۲۲۱)

پہلے ہی شروع کر دیا جائے، ورنہ "پیل" (ہاتھی) سے بھی اس سیلاب کا روکنا ممکن نہ ہوگا جس کی روانی ابھی صرف میل یعنی سلائی سے روکی جاسکتی ہے۔

کلیسا اور عوام میں کش مکش کی ابتدا ہوگئی، یورپ کی تاریخوں میں عدالتہائے تحقیق مذہبی (INQUISITION) اور "لاشا مبر اردانت" یا "ایوان آتشیں" وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں، درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کش مکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صراحۃً ہی نہیں بلکہ اشارۃً وکنایۃً تحریراً و تقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جُرم ٹھہرایا گیا۔ کلیسا نے فتویٰ صادر کیا، اور سارے سلاطین وامرا جن کی سلطنت وامارت کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم وکرم پر منحصر تھی، انھوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کیلئے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجرموں کو زندہ درآتش کرنے کے لئے مقدس الاؤ جوڑ دیئے گئے۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ کش مکش کی یہ کیفیت رومن کیتھولک یعنی حامیانِ کلیسا اور پروٹسٹنٹ مخالفانِ کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوتِ قلبی، سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی، ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالتہائے مذہبی یا مجلس تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا، ہلکی سی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا، اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ اکثر بار ارتداد کے فتوے کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے، غریب چت لٹا دیا جاتا، چھت میں باڑھ دار ہتھیار لٹکا دیا جاتا، جو آہستہ آہستہ کئی دن میں لیٹے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا، اور یوں اس غریب کی جان نکالی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے، اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں، اس کی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

فرانس کا مشہور ہنگامہ بارتھلمی کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ (۹) دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا۔ لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے کلیسا کی

کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر ان کے پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشہ دیکھتیں۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا[۱]۔

خلاصہ یہ ہے کہ کش مکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے، زندہ جلائے گئے، یا دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا، تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہونچتی ہے۔

اور یہ سب کس لئے ہوا؟ صرف اس لئے کہ خدا کے بیٹے مسیح، اور ان کے حواری پطرس، پطرس کے جانشین پوپ کے ہاتھ میں ان ہی مذہبی ناموں کے وسیلہ سے سیاسی باگ جو آگئی تھی، یہ باگ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی طرف سے جب پوپ اور پوپ کے نمائندوں پر اعتراض کیا جاتا، تو کہنے والے پطرس کا نام لیتے، کہ تم حواری مسیح کے جانشین پر زبان کھولتے ہو۔ جواب میں کہنے والے پطرس ہی پر اعتراض کرتے، بالآخر اسی اعتراض نے تحقیق کی وہ شکل اختیار کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی ثابت کیا گیا کہ پطرس حواری کی قبر یا لاش روم میں ہے، سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط اور بے بنیاد جعلی ہے۔

بہر حال پطرس کے تقدس میں زور پہونچانے والے جب مسیح اور خدا کے بیٹے کے نام سے زور پہونچاتے، تو جو ذرا زیادہ آزاد مزاج تھے انھوں نے خود مسیح کی عظمت و جلالت میں اشتباہ ڈالنا شروع کیا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسیح کے وجود تک کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے "خدا" کا نام لیا جاتا، لیکن جس پوپ، جس کلیسا، جس پطرس، اور جس مسیح کے نام لینے والوں کے خونیں کارناموں سے یورپ کا چپہ چپہ رنگین ہو رہا تھا، اُسی مسیح کے خدا پر بھی زبانیں اگر کھلنے لگی ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟ اور یہی مطلب ہے ہنری مسیوک کے اس فقرے کا، کہ:-

"جس وقت نشاۃ جدیدہ کا (یورپ) میں زور شور تھا جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا۔"

(ارتقائے نظم حکومت یورپ صفحہ ۲۶۶)

اب سوال یہی ہے کہ "مذہبی عقائد کی اس کمزوری" کی بنیاد کیا تھی؟

---

[۱] انگریزی زبان جو نہیں جانتے ہیں وہ علامہ فرید وجدی کی عربی کتاب "کنز العلوم واللغۃ" میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ۱۲

افسوس ہے کہ یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے نہ اس سوال ہی کو زیادہ اہمیت دی، اور نہ سوال کے جواب ہی میں وہ صاف بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کچھ ملی جلی باتیں کرتے ہیں، جن میں کچھ تو وقت، وقت کے سیاسی حکمرانوں کے کارناموں اور حکومت کے متعلق دستوری خیالات کے پیش کرنے والے مصنفین کے نظریات و افکار کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی کچھ سائنس، کچھ فلسفہ، اور ان فنون کی ترقیوں کا اظہار ایسے پیرایۂ بیان میں کیا جاتا ہے، کہ "مذہبی عقائد کی کمزوری" کے صحیح اسباب سامنے آنے نہیں پاتے اور ان کتابوں کے سطحی مطالعہ کرنے والے اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شائد فلسفہ اور سائنس کے چرچوں نے مذہب کی بنیادوں کو یورپ میں سُست کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی ان ہی تاریخوں میں وہ کلیسا اور پوپ، ان کے طرزِ عمل اور اس طرزِ عمل سے عوام کی ذہنیت بہ تدریج جو متاثر ہوتی چلی جاتی تھی بیچ بیچ میں اسکے ذکر سے بھی کلی گریز کی راہ تو اختیار نہیں کرتے۔ اور ایسا وہ کر بھی نہیں کر سکتے تھے، ورنہ ماضی و حال کے تعلقات کے زنجیرے کی کڑیاں پڑھنے والوں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جاتیں۔

لیکن "تاریخ نویسی" میں جس صفائی اور بے لاگ بیان کی ضرورت ہے، اس سے ان کی کتابیں خالی ہیں۔ عموماً وہ باتیں بناتے ہیں، جس مذہب کی طرف ان کا ملک یا ان کی قوم منسوب ہے، چاہتے ہیں کہ کھلے بندوں اس کے پیدا کئے ہوئے نتائج لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔

شائد اسی لئے ممکن ہے کہ جس نظریہ کو اس وقت میں پیش کر رہا ہوں، ان لوگوں کو بھی کچھ اجنبی معلوم ہو، جنھوں نے یورپ کی تاریخ کا کافی اور گہرا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ عموماً اس راہ میں وہ ان ہی راہوں پر پڑ گئے ہیں جن پر یورپ کے شاطر مورخین ان کو چلانا چاہتے ہیں۔ تاہم شکر ہے کہ سلسلہ وار نہ سہی، پراگندہ منتشر حالات میں یہ سارے معلومات یورپ ہی کی عام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش قرآنی لفظ "آثارہم" کی تشریح و تفسیر میں کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کی یہ ساری کمزوریاں جو یورپ میں پیدا ہوئیں۔ براہِ راست نہ سائنس کے جدید انکشافات کی رہینِ منت ہیں، اور نہ سیاسی و دستوری تبدیلیوں سے ان کا براہِ راست تعلق ہے۔ جن سے گزرتے ہوئے یورپ کی تاریخ موجودہ دور تک پہونچی ہے۔

بلکہ مذہب کی ساری کمزوریاں خود اُس مذہب اور مذہب کی تاریخ سے پیدا ہوتی ہیں جسکی طرف اپنے آپ کو اور اپنی دینی زندگی کو یورپ کے یہ باشندے منسوب کرتے رہے ہیں یا اسوقت تک کر رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہی "عقیدۂ ولدیت" جس کی بدولت سمجھایا جاتا تھا کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آگیا، اسی کے ساتھ غیر معمولی شغف اور انہماک و استغراق نے یورپ کو کلیسائے روم اور کلیسائے روم کے پاپاؤں کا غلام بنایا، پھر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی حد سے گذری ہوئی چیرہ دستیوں نے عوام کے قلب میں ردعمل کی کیفیت پیدا کی، جو ترقی کرتے ہوئے شروع شروع میں تو پروٹسٹنٹ فرقہ کے قالب میں نمایاں ہوئی، اور جب ردعمل کی اس نہ رکنے والی تحریک کا مقابلہ آگ اور تلوار کی دھار سے کلیسا اور کلیسا کے رحم و کرم پر جینے والے حکمرانوں نے کرنا چاہا، تو یہی پروٹسٹنٹی تحریک جس کے بانی لوتھر کی کرخت ترین تنقید یہ تھی۔ جیسا کہ جانسن نے اس کے رسالہ "اسیری بابل" نامی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ:۔

"اس نے (مارٹن لوتھر نے) نہ صرف پوپ کے اقتدار سے انکار کر دیا، بلکہ مقدس ادارۂ کہانت و سند روایات پر اور از منہ وسطی کے اصول استحالہ و تبدیل لحم پر حملہ کرنے لگا۔"[1]

(یورپ سولھویں صدی میں ص ۱۹۹)

لیکن جیسا کہ جانسن ہی نے لکھا ہے، کہ:۔

"اس نے (لوتھر نے) گو نہایت بے پروائی کے ساتھ کلیسا کے روایات کو ترک کر دیا۔"

مگر اسی کے ساتھ

"اس کو کامل اور پختہ یقین تھا کہ حصولِ نجات اور تنظیم کلیسا کیلئے جو کچھ درکار ہے وہ انجیل ہی میں مل سکتا ہے۔"

(یورپ سولھویں صدی میں ص ۲۰۰)

بہر حال آخر وقت تک لوتھر خود بھی عیسائی ہی رہا، اور اس کے ماننے والے عیسائی بھی انجیل ہی کو ذریعۂ نجات یقین کرنے والے تھے۔

---

[1] یہ عشاء ربانی کی تقریب کی ایک اصطلاح ہے، جو شراب اور گوشت اس تقریب میں عیسائی استعمال کرتے تھے اس کے متعلق یقین تھا کہ مسیح کا وہ خون اور گوشت ہے۔ ۱۲

لیکن ان پروٹسٹنٹ اور احتجاج کرنے والوں کا پیچھا کلیسا کے حامی عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک فرقہ کیطرف سے حد سے گذرے ہوئے بہیمانہ تشدد کے ساتھ کیا گیا، جس کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا۔ خود سوچئے کہ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا تھا جو ہوا۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں، خود اپنے متعلق سوچتا ہوں کہ مذہب کے نام سے میرے سامنے بھی وحشت و بربریت کے وہی مہیب و دردناک مناظر اگر پیش ہوتے، جو کلیسا اور عیسائیت کے نام سے یورپ میں صدہا سال تک پیش آتے رہے، تو ایسے مذہب کے مقابلہ میں لامذہبیت اور دین کے مقابلہ میں لادینیت کے قبول کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور، اور شاید بے بس پاتا۔

پس سچی بات یہی ہے کہ یورپ کی موجودہ لامذہبیت یا بے دینی خود اُس مذہب اور دین کی پیداوار ہے[1] جسے یورپ نے قبول کیا تھا، اور یہ مذہب یا دین کیا تھا، وہی

"نظریۂ ولدیت"

تھا، جس کی تعبیر قرآن میں

قالوا اتخذ اللہ ولدا　　انھوں نے کہا کہ خدا نے (مسیح) کو بیٹا بنایا۔

سے کی گئی ہے۔

اور اب آیئے اور قرآن میں "آثارہم" کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اُس کا کیا مطلب ہے، اس پر غور کیجئے۔

---

[1] غریب سائنس یا سائنس کی راہ سے پیدا ہونے والے جدید انکشافات مثلاً ٹیلیفون، ریڈیو، فون، انجن، یا اسٹیم، برق، پٹرول وغیرہ کی قوتوں کو بدنام کرنا اور یہ سمجھنا کہ ان جدید انکشافات نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اس قسم کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو نہ مذہب کی اساسی بنیادوں سے صحیح واقفیت رکھتا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ سائنس ہے کس علم کا نام، اور اس کے مباحث کا تعلق کن امور سے ہے۔ قطع نظر اس اصولی مسئلہ کے ایک عامی کو یوں بھی تو سوچنا چاہئے کہ گراموفون جب بجنے لگا تو اب جہنم کا وجود ناممکن ہے، یا ہوائی جہاز پر آدمی جب سفر کرنے لگا تو برزخی عذاب قبر میں مبتلا ہونے کا امکان جاتا رہا، یا ریل جب جاری ہو گئی تو فرشتوں کا وجود اب آدمی کیسے مان سکتا ہے۔ ذرا سوچئے تو دعویٰ و دلیل کی ان شکلوں میں کسی قسم کا کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔ پھر جدید ایجادات و اکتشافات اسی قسم کی چیزیں تو ہیں، ان سے مذہب کے اصول تو اصول میرے نزدیک تو مذہب کے فروع بھی کسی حیثیت سے متاثر نہیں ہوتے۔ ۱۲

والقصۃ بطولہا

جیساکہ ظاہر ہے "آثار" اثر کی جمع ہے منتہی الارب میں جیساکہ عرض کیا جا چکا ہے اس لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے، یعنے:۔

"بقیہ چیزے، و نشان ...... و نشان قدم منہ قطع اللہ

اثرہ، یعنی بہ برد خدائے نشان قدم اورا"

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانوں کو چھوڑ جائے اُن ہی کو اس چیز کا اثر یا آثار عربی میں کہتے ہیں۔

یہ تو "آثار" کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی، آگے "ھم" کی ضمیر سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو "عقیدۂ ولدیت" کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب ان اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لائیے جن سے گذرتے ہوئے "عقیدۂ ولدیت" موجودہ دور تک پہونچا ہے۔

جن لوگوں نے شروع شروع میں خالقِ عالم کے متعلق ولدیت کے اس عقیدہ کو تراشا وہ تو دنیا سے چلے گئے، ان کے بعد کلیسا، اور کلیسا سے پوپ، پوپ سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گذرنا پڑا، جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی، اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہو گئی، بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا، فریق مقابل کی سختیاں اور منہ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں، تا اینکہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا، آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا، اور بالآخر اس کی انتہا العیاذ باللہ اس نتک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لئے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لئے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی، یعنی خود مسیح کے باپ کا یا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں، اور گو عمومیت کی زبان پر خدا بھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی، لیکن اس طویل و عریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

دل کی بات دل ہی تک محدود کب تک رہتی، آخر مشرقِ یورپ میں شیوعی یا بالشوکی نظام نے سر اُٹھایا، جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے، اور اس کے بعد قدرتاً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا

باقی رہنا یا رکھنا ناممکن ہو گیا، جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے، احساس لے کر پیدا ہوتی ہے، اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر وقیمت کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔

مکھیوں کی جتنی تعداد بھی مرجائے، مار ڈالی جائے، جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، آج کلی تصور ان لوگوں کے متعلق یہی ہے جو آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن کا مسجود ملائکہ "عقیدۂ ولدیت" کی چوٹ کھاتے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلت وخواری کے کتنے تاریک ومہیب خندق میں گر پڑا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ "آثارہم" کا مطلب، جس کے لئے چاہیئے تو تھا کہ کئی جلدیں لکھی جائیں، لیکن اس کام کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے "عقیدۂ ولدیت" کے ان جاں گداز روح فرسا، آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو، جس کا کچھ حصہ تو سامنے آچکا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیڑوں اور مکوڑوں، مکھیوں اور پتنگوں کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ولدیت کا یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔

الغرض جو کچھ گذر چکا، یا گذر رہا ہے اور آئندہ گذرنے والا ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر

"انسانیت"

کے سب سے بڑے غم خوار ہی خواہ پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان "آثار" سے بچانے کیلئے وہ اپنا سب کچھ حتی کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کیلئے تیار تھے تو کسی حیثیت سے یہ بات محل تعجب ہو سکتی ہے؟۔

سلہ خاکسار کی تعلیم جیسا کہ معلوم ہے قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی، نیز تاریخ میرا خاص مضمون مطالعہ میں کبھی نہیں رہا، اسی لئے چاہتا ہوں کہ یورپ کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، کاش! میرے اجمالی اشاروں کو تفصیل کا قالب عطا کرتے!!

دعلی اللہ اجرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استحصال

(از مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی)

استحصال (EXPOLOITATION) معاشی زبان کا ایک اصطلاحی لفظ ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کی محنت کی کمائی سے ناجائز طریقہ پر فائدہ حاصل کر کے اسے محروم کردے۔ اسے ظلم کہنے میں کسے تامل ہو سکتا ہو؟ اور یقیناً ظلم بہت بری چیز ہو مگر اس دنیا کے عجائب میں سے ایک اعجوبہ یہ بھی ہو کہ استحصال کو ظلم کہنے اور مظلوموں کی جگر خراش فریاد کے باوجود دنیا کے اغلب و اکثر حصے میں یہ ظلم پورے طور پر مسلط اور حکمراں ہو۔

دنیا میں اس وقت دو قسم کے معاشی نظام رائج ہیں، سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ دنیا کے سرمایہ دار حصوں میں ہر جگہ یہ منظر نظر آتا ہو کہ کروڑوں مزدوروں اور محنت کشوں کا خون چند سرمایہ دار چوس رہے ہیں۔ اور کسی طرح ان کی پیاس نہیں بجھتی ہو، غریب و مظلوم محنت کش کی دلخراش آہیں آسمان و زمین کو رلا دیتی ہیں مگر چاندی سونے کے یہ خونخوار پجاری اپنے سینے میں فولاد کا دل رکھتے ہیں اس لیے ان پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، مزدور اس ظلم کو کیوں برداشت کرتا ہو؟۔ بات یہ ہو کہ زندگی روٹی کی محتاج ہو اور وہ جس نعمت خانہ میں رہتی ہو اس کا قفل چاندی سونے کی کنجی سے کھلتا ہو جس پر پورے طریقہ سے سرمایہ دار قابض ہو، سرمایہ دار سستی محنت ملنے کے انتظار میں مہینوں کارخانہ بند کر کے اطمینان سے بیٹھ سکتا ہو لیکن غریب مزدور کے لیے دو دن بیکار رہنا بھی مشکل ہو اسلیے کہ اس کے نزدیک بیکاری کے معنی فاقہ کشی کے ہیں اسکی اس کمزوری سے سرمایہ دار فائدہ اٹھاتا ہو اور اشیار میں جو قدر زائد (SURPLUS VALUE) مزدوروں کی جانفشانی

محنت سے پیدا ہوتی ہو وہ سب کی سب اپنی جیب میں رکھ لیتا ہو۔

مقابلہ ان بلاکشوں کی مصیبت میں اور اضافہ کر دیتا ہو اگر کوئی مصیبت زدہ فاقہ کشی یا نیم فاقہ کشی کی تلخی کو آئندہ امید کی شیرینی ملا کر گوارا کرنے کی ہمت بھی کرتا ہو تو اسی کا کوئی ہم جنس بیچ میں گھس کر اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہو ایسی حالت میں وہ مقابلہ کی ہمت بھی کرے تو کیونکر کرے؟

موجودہ دور میں بھی جب کہ مزدوروں کی انجمنوں نے زبردست کوششوں اور یادگار زمانہ قربانیوں سے اس غریب طبقہ کے لیے کچھ حقوق حاصل کر لیے ہیں۔ سرمایہ داروں کی دست درازیوں اور چیرہ دستیوں سے دنیا کی اکثریت کو نجات نہیں ملی ہو اور استحصال کا پرچم معاشی دنیا پر بدستور لہرا رہا ہو۔

یہ مصیبت اس وقت اور بھی سخت اور بھیانک ہو جاتی ہو جب یہ "قارون" "فرعون" بھی بن جاتا ہو یعنی جب نظام حکومت بھی اسی سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں آجاتا ہو تو وہ اس سیاسی قوت کو اپنی معاشی برتری اور لوٹ کے لیے استعمال کرتا ہو۔ "زراندوزی" کے لیے جب فولادی آلات سے کام لیا جائے تو وہ بہت خوفناک اور ہلاکت آفریں ہو جاتی ہو۔

مزدور سرمایہ دار کے ظلم سے کس طرح نجات حاصل کرے؟ یہ معاشی لوٹ کیونکر رکے؟

سرمایہ دار امریکہ، برطانیہ وغیرہ تو اس کا جواب ہی کیا دے سکتے ہیں، البتہ روس بڑی بلند آواز سے کہہ رہا ہو کہ ہم نے اس مسئلہ کو ختم کر دیا ہو۔ ہم وہ طریقہ جانتے ہیں جس سے یہ ظلم مٹ سکتا ہو۔

یہ آواز اشتراکیوں کی ہو جس کی تائید اب ہر ملک کے اشتراکیت پسندوں کی طرف سے ہونے لگی ہو۔ یہ لوگ تو جلدی سے اس پر ایمان لے آئے مگر ہمیں یاد ہو کہ مشینی دور کے شروع میں سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندوں نے بھی کچھ اس سے ملتے جلتے دعوے کیے تھے اور کہا تھا کہ مشینوں کا رواج اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت کا اجرا دنیا کو کچھ دنوں کے بعد جنت بنا دے گا۔ مزدور کا معیار زندگی اتنا بلند ہو گا کہ بعض سرمایہ دار اس پر رشک کریں گے، اشیاء کی فراوانی اور ارزانی ہو گی راحت و اطمینان کی نسیم روح پرور فضا کو ہر وقت معطر رکھے گی۔ البتہ اس جنت تک پہونچنے کے لیے کچھ دنوں

پل صراط پر چلنا ہوگا، بس یہ عارضی مصیبت اور اس کے بعد راحت ہی راحت ہے۔

مگر چلتے چلتے برسوں گزر گئے اور اس پل صراط پر سے نہ جانے کتنے کٹ کٹ کر گر بھی پڑے مگر جنت تو کیا اس کی چہار دیواری بھی نظر نہ آئی، بلکہ روز بروز جہنمی باد سموم کے جھونکے تیز تر ہوتے جاتے ہیں اور انسانیت کو بے چین بنا رہے ہیں۔ اس تجربہ کے بعد ہم اشتراکیوں کی موعودہ جنت کا کس طرح یقین کرلیں؟ آئیے احتیاط کے ساتھ عقل و تجربہ کی روشنی میں ان کے دعوے کی جانچ کریں، پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو کہ اشتراکی کن اصول سے کام لے کر استحصال کو دور کرسکتے ہیں؟ آیا وہ اصول اس کے لیے کافی ہیں یا نہیں؟ اشتراکیت اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل اصول کو مفید بتاتی ہو۔

(۱) ایک محدود اور چھوٹے پیمانہ کو مستثنیٰ کرکے سرمایہ اور ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے جس کی تولیت و نگرانی مزدوروں کی نمائندہ حکومت انجام دے اور حکومت کے کل باشندے حسب استعداد و صلاحیت حکومت کے مقرر کردہ کام انجام دیں اور وہ انھیں ان کی محنت کی مناسبت سے معاوضہ ادا کرے۔

(۲) عام پبلک کے ہر فرد کے لیے کام اور ضروریات زندگی مہیا کرنا حکومت کا فرض ہو۔

(۳) ایک بہت محدود اور چھوٹے پیمانے کو چھوڑ کر شخصی تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

ان اصول پر عمل کا اثر یہ ہوگا کہ کوئی شخص سرمایہ دار نہ ہوگا۔ نہ کوئی کسی کی محنت ارزاں اور نامناسب قیمت پر خرید کر اس کی کمائی کو غصب کرسکے گا۔ گویا اس تدبیر سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں رہنے والے دو طبقوں (سرمایہ دار و مزدور) میں منقسم نہیں ہوں گے۔ اور جب ایک ہی طبقہ ہوگا تو نہ کوئی لوٹنے والا ہوگا نہ لٹنے والا۔

اشتراکیت کا دعویٰ ہو کہ یہ وہ قلعہ ہو جس میں لوٹ کھسوٹ سے پناہ ملتی ہو اور غربت و افلاس کا لشکر اس کی دیواروں سے سر پھوڑ کر واپس ہو جاتا ہو۔

بڑی خوشی کی بات ہو اگر انسانیت کو اس قلعہ میں پناہ مل جائے اور مزدور اس کے اندر رہ کر استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے محفوظ ہو جائے۔ مگر دیکھنا یہ ہو کہ خود اس کے اندر تو کہیں سرمایہ داری اور تغلب کا پانچواں کالم موجود نہیں ہو؟۔ اور اس میں کوئی چور دروازہ تو نہیں ہو جس سے

یہ ظالم اس کے اندر پہونچ سکتے تھوں؟

اتنی بات تو ہم یہاں مانے لیتے ہیں کہ اس تدبیر سے شخصی تغلب بالکل ختم ہو جائے گا اگرچہ اس میں بھی بحث کی بہت گنجائش ہو لیکن اس وقت اس سے قطع نظر کر کے اس سے زیادہ واضح بات کہنا چاہتے ہیں جس کا ماحصل یہ سوال ہو کہ ان اصول سے جماعتی استحصال PARTYEXPOLOITATION کس طرح ختم ہو جائے گا؟

سوال کو سمجھنے کے لیے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ استحصال کا حاصل کیا ہو؟ ایک مزدور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اسے دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دینے پر مجبور ہوتا ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کی محنت کا بڑا حصہ بغیر کسی معاوضے کے دوسرے کے قبضہ میں چلا جاتا ہو۔ یہی حاصل ہو استحصال کا۔

اب ایک اشتراکی سماج پر نظر ڈالئے پورا سماج محنت کرنے والوں سے بھرا ہوا ہو مگر ان کی محنتیں بالکل یکساں نہیں ہیں بلکہ ان میں کیفیت اور مقدار اور نوع کے اعتبار سے بلکہ اور بہت سے اعتبارات سے بھی فرق اور اختلاف ہو، منجملہ ان کے ایک یہ ہو کہ ان میں سے بعض کی محنت حکومت اور اس کے نظام کے لیے بہت اہم اور ضروری ہو جس کے مقابلہ میں دوسروں کی محنت بہت کم اہمیت رکھتی ہو اور اس اہمیت کے پیش نظر حکومت کو ان کی احتیاج بہت ہوتی ہو حکومت کی طرف سے طلب کی شدت طبعی طور پر ان کی اجرتوں کے نرخ کو بقدر امکان اونچے سے اونچا لے جاتی ہو اور حکومت ان کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتی ہو خواہ وہ ان کے مطالبات کو حد سے زائد ہونے کی وجہ سے ناجائز ہی سمجھتی ہو۔

مثال کے طور پر محکمۂ ریلوے کو لے لیجیے۔ اگر اس کا عملہ ایک دن کے لیے بھی ہڑتال کر دے تو حکومت کے لیے یہ مصیبت ناقابل برداشت ہو جائے گی، اس لیے وہ اس محکمہ کی ناز برداری پر مجبور ہو۔ قیمتوں کے طبعی قانون طلب زر کو دیکھتے ہوئے بھی یہ چیز قرین قیاس بلکہ یقینی ہو کہ یہ لوگ سرکاری خزانہ سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو یقیناً اس مقدار سے بہت زیادہ ہوگی جو ان کی محنت و خدمت خزانۂ سرکاری میں داخل کرتی ہو۔ یہ اضافہ کہاں سے آئے گا؟ یہ ان غریب مزدوروں کی کمائی ہوگی جن کی محنت حکومت کی نظر میں اسقدر اہم نہیں ہو یا اس کا

بدل بیٹھا ہونے کی وجہ سے حکومت کو اتنی احتیاج نہیں ہو۔ خاکروب، نوربات، کاشت کار، جو حکومت کو اپنے مطالبات کے سامنے اتنی آسانی کے ساتھ جھکا دینے سے قاصر ہوتے ہیں، خزانہ سرکاری سے اتنی بڑی رقم نہیں لے سکتے، نہ اپنا معیار زندگی ریلوے مزدور کے درجہ تک بلند کر سکتے ہیں، ان کی محنت کی کمائی دوسرے لوگ حاصل کرتے ہیں اور یہ بیچارے کچھ نہیں کر سکتے ہیں اسی چیز کا نام جماعتی استحصال (PARTY EXPOLOITATION) ہو۔

ریلوے کا تذکرہ مثال کے طور پر کیا گیا ہو ورنہ اس جرم کے مرتکب متعدد محکمے ہوتے ہیں فوج، پولیس، ڈاک، سب اس فہرست میں درج ہو سکتے ہیں۔

استحصال خواہ شخصی ہو یا جماعتی کمزور مزدور کے لیے نتیجہ کے اعتبار سے یکساں ہو جہاں تک ادنیٰ ضروریات زندگی کا تعلق ہو وہ ایک سرمایہ دار ملک (CAPITALIST COUNTRY) میں بھی مزدور کو میسر آجاتے ہیں، خصوصاً اب تو ان ممالک میں بھی ان کا معیار زندگی خاصا اونچا ہو چکا ہو۔ اشتراکیت (COMMUNISM) کی ضرورت تو اسی لیے درپیش ہوئی تھی کہ وہ استحصال کو ختم کردے۔ مگر جب یہ مقصد اس سے نہیں حاصل ہو سکتا تو اشتراکی انقلاب کی دردسری کیوں گوارا کی جائے؟ اور جاندار انسانوں کو بیجان مشین کے پرزے فرض کرکے انسانی فطرت سے جنگ کیوں مول لی جائے؟

ہمیں تسلیم ہو کہ نظام سرمایہ داری اس مسئلہ کو حل کرنے سے قاصر ہو، بلکہ اس ظلم وستم کا مددگار ہو۔ مگر اشتراکی نظام بھی تو اسے حل نہیں کر سکتا۔ پھر کیا وجہ ہو کہ ہم اشتراکی نظام کو قبول کرلیں؟ ایک بیماری کو دوسری بیماری سے تبدیل کر لینا نہ تندرستی کہلاتی ہو نہ عقلمندی، اور ایک مصیبت کے قائم مقام دوسری مصیبت کو بنا دینا مصیبت کا علاج نہیں کہا جا سکتا۔

یہ تو اصولی گفتگو ہوئی، اب ذرا تجربہ کی روشنی میں بھی مسئلہ پر نظر ڈالیے، روس اشتراکیت کا پہلا عملی نمونہ ہو کیا وہاں استحصال کا انسداد ہو گیا؟۔ آہنی پردے کے پیچھے دیکھنا بہت مشکل ہو تاہم گھر کے بھیدیوں کے ذریعہ سے جو اطلاعات حاصل ہوتی رہتی ہیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا ہو کہ یہ ظلم وہاں بھی پورے شباب پر ہو، ناقابل انکار واقعات میں سے ایک یہ ہو کہ معیار زندگی کے لحاظ سے ارباب حکومت اور عوام میں زمین آسمان کا فرق ہو، اسٹالن مولوٹوف وغیرہ جس عیش وکامرانی میں بسر

کرتے ہیں۔ اس کا ہزارواں حصہ بھی اسٹالن گراڈ کے غریب خاکروب اور مل مزدور کو میسر نہیں ہو۔ ملازمین حکومت حسب مراتب اس دنیاوی جنت میں داد عیش دے رہے ہیں جس کے درختوں کی آبیاری غریب مزدور کے خون و پسینے سے کی جاتی ہو اور جس میں اس کی سخت محنت کی کمائی پانی کی طرح بہائی جاتی ہو حالانکہ وہ غریب اس کی طرف دیکھ کر لذت نظر بھی نہیں حاصل کر سکتا، اشتراکیت کا کوئی بڑے سے بڑا موئد بھی اس واقعہ کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، کون کہہ سکتا ہو کہ اسٹالن اور اسٹالن گراڈ کا مزدور یکساں زندگی بسر کرتے ہیں؟ یا دونوں کے معیار زندگی میں بہت کم فرق ہو یوکرین (واقع روس) کی بغاوت کو ابھی ۳ یا ۴ سال سے زائد نہیں ہوئے ہیں۔ اشتراکی مملکت میں بغاوت ہی اشتراکی نقطۂ نظر سے ایک عجیب چیز ہو مگر اس کا سبب سن کر ممکن ہو کہ ان سادہ لوح لوگوں کو اور بھی زیادہ تعجب ہو جو اشتراکیت ہی کو ہر معاشی مرض کا علاج سمجھتے ہیں۔ سبب یہ تھا کہ یوکرین کے کاشتکاروں کی کمائی یعنی غلہ ان سے چھین کر دوسرے مقامات پر (غالباً سنیدروس)، بھیجا جا رہا تھا حکومت کی جانب سے یہ استحصال خدا جانے کب سے جاری ہوگا۔ جس پر ایک دن غریب کاشتکار کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلکنے لگا۔

یوگوسلاویہ کے ڈکٹیٹر مارشل ٹیٹو خود کمیونسٹ ہیں اور ان کی حکومت ایک اشتراکی حکومت ہو لیکن ان سے اور روس سے ان بن ہو گئی جواب تک باقی ہو اس کی توجیہ میں موصوف نے ابھی حال میں جو بیان اخبارات کو دیا ہو وہ ہندوستان کے اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہو اس بیان میں انھوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہو کہ روس دوسرے ممالک (خواہ وہ کمیونسٹ ہی کیوں نہ ہوں) سے استحصال کرنا چاہتا ہو اور انھیں اپنی آمریت کے ماتحت بالکل غلام بنانا چاہتا ہو۔ اخبار بین طبقہ کو یاد ہوگا کہ قریبی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد چین کی کمیونسٹ حکومت نے حکومت روس سے جو اس کی معاونت کر رہی تھی، چین سے روسی فوجوں کے ہٹانے کا مطالبہ بڑی شدت سے کیا تھا، اپنے مددگاروں کا رہنا کسے برا لگتا ہو؟ مگر جب مددگار استحصال کر کے خونخوار بن جائیں تو بدرجہ مجبوری انسان ان سے عاجز ہو کر پناہ مانگنے لگتا ہو۔

مسئلہ پر ذرا اور گہری نظر ڈالیے، سرمایہ دار کے مقابلہ میں مزدور کیوں کمزور ہو؟ کیا اس لیے کہ اس کی تجوریاں سونے چاندی سے بھری ہوئی ہیں۔ فرض کیجیے ایک شخص کروڑوں روپے کا مالک ہو

مگر کسی وجہ سے اس میں حسب منشا تصرف کرنے سے بالکل عاجز ہو تو کیا ایسا شخص کسی ایسے غریب مزدور کا مقابلہ کر سکے گا جس کے پاس پونجی تو بہت کم ہو مگر اس پونجی میں ہر قسم کے تصرف کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہو؟ جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔ جس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہو کہ لوٹ کھسوٹ کا اصل سبب سرمایہ کی ملکیت نہیں ہو، بلکہ سرمایہ دار کی قوت تصرف کی زیادتی ہو، مزدور اسلئے مار کھاتا ہو کہ سرمایہ دار کے برابر قوت تصرف نہیں رکھتا۔ اور سرمایہ دار اس لیے غالب ہو کہ وہ اس سے زیادہ قوت تصرف رکھتا ہو۔

یہ غیر متوازن قوت تصرف ہی وہ چیز ہو جو غیر متوازن معیشت کی بیماری پیدا کرتی ہو. مگر عجیب بات ہو کہ اشتراکی اسی زہر کو بہت بڑی مقدار میں اس بیماری کو دور کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں [illegible] ہو کہ ایک طرف تو حکومت (جو سرمایہ دار ہوتی ہو) کی قوت تصرف بے قید و بے پناہ اور دوسری طرف مزدور بالکل بے دست و پا۔ غور تو کیجیے کہ اس سے استحصال مٹے گا یا اس کی اور بدتر شکلیں پیدا ہوں گی؟ کیا یہ حکومت فرشتوں کی ہو گی؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں تو اعتقاد خوش اعتقادی کوئی کہاں سے لائے جو اشتراکی حکمراں طبقہ کو ذاتی جذبات سے بالکل بالاتر سمجھے؟۔

استحصال کس طرح دور ہو؟ اور مزدور کو لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم سے کس طرح نجات ہو؟. یہ سوال بدستور باقی ہو، نہ سرمایہ داری اس کو حل کر سکی نہ اشتراکیت۔

مرد مومن کا یقین

حضرت جگر مرادآبادی

یہ لالہ و گل، یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

باطل کی ہو کتنی ہی طاقت، باطل کی اطاعت کیا معنی
ایماں پہ فدا ہو جاتے ہیں جو صاحب ایماں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہو مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں،
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

یہ خون جو ہو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں

جانباز محبت جو ہیں جگر مرنے سے نہیں ڈرتے ہرگز
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

(از ادارہ)

پاکستان کی ہمسایہ نوازی

وزیر اعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خاں نے آسام کے مصیبت زدوں کے لیے پاکستان کی طرف سے دس ہزار ٹن چاول مفت بھیجنے کی پیش کش کرکے شاید اب تک ہند اور پاکستان کے بین الملکتی تعلقات کے سلسلہ میں سب سے بڑی اسلامیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھائے درانحالیکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو، یہ فرمان مسلمان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے لیکن لیاقت علی خاں نے اپنی اس پیش کش سے بتادیا کہ مسلمان انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے پاس خوراک کے ذخیرے موجود ہوں اور اس کا ہمسایہ ملک فاقہ کشی کا شکار ہو کر رہ جائے ــــ بلا لحاظ اس کے کہ وہ ہمسایہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اور اسکے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم ہیں یا ناخوش گوار۔

ایک طرف لادینی جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار امریکا کا یہ طرز عمل ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دو وقت روٹی سے بھی محروم ہونے کے باوجود اس کے یہاں قیمتوں کو مصنوعی طور پر اونچا رکھنے کی خاطر لاکھوں من غلہ ضائع کردیا جاتا ہے، اور دوسری طرف اسلامی جمہوریت کے علمبردار پاکستان کا یہ رویہ کہ وہ ایسی حالت میں کہ چند ہی دن پہلے مسئلہ کشمیر کے متعلق دوبارہ اس کے اور ہند کے درمیان ناخوشگواری پیدا ہو چکی ہے ہندوستان کے مصیبت زدوں کے لیے دس ہزار ٹن چاول مفت بھیجنے کے لیے تیار ہے۔ اور اگر یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ مشرقی بنگال کے پاس خود ضرورت سے زیادہ چاول نہیں ہے تو پاکستان کا درجہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے

بہت اونچا ہو جاتا ہے اور وہ اجتماعی طور پر یوثرون علیٰ انفسہم ولوکان بہم خصاصہ (یعنی تنگدستی کی حالت میں بھی دسلمان، خود تکلیف اٹھاکر دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہیں) کی تفسیر پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے، پاکستان کا یہ طرز عمل بتا رہا ہے کہ وہ اس رحمۃ للعالمین پیغمبر اسلام کی ہدایات کو مشعل راہ بنانا چاہتا ہے جس نے فرمایا ہے کہ الخلق عیال اللہ یعنی انسانی مخلوق اللہ تعالیٰ کے لیے بمنزلہ اولاد ہے۔

افسوس ہے ان کم فہم اور بدقسمت انسانوں پر جو پاکستان کے خالص اسلام کو اپنانے میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اسلام ہی اس جنگ و جدال اور دشمنی اور خود غرضی میں ڈوبی ہوئی دنیا کے لیے واحد پیام امن و فلاح ہے، اور اگر پاکستان واقعی خالص اسلامی نظام اپنے یہاں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا وجود اہل پاکستان ہی کیلئے نہیں بلکہ اس کے ہمسایوں کے لیے بھی مجسم رحمت ہوگا —— ہم پاکستان کو اس کے اس اسلامی طرز عمل پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہاں کے قائدین کو پورے اور خالص اسلام کو قائم کرنے کی توفیق دے۔ آمین —— (الانصاف۔ الہ آباد)

جمہوریت کے دیس میں

امریکی فیڈرل بیورو آف انویسٹیگیشن (محکمۂ تحقیقات) کی ایک رپورٹ کے بعض اعداد و شمار:۔

"۱۹۴۳ء میں ہر ۲۰ سکنڈ کے بعد ایک بڑا جرم ہوا۔ ہر روز اوسطاً ۲۶ آدمی قتل ہوئے اور ۲۵۵ عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا۔ ہر ۲۴ گھنٹہ میں ۳۶۴ موٹریں چرائی گئیں اور ۲،۷۲۶ دوسرے جرائم کیے گئے۔

گرفتاریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف جن مجرموں کے انگوٹھے لیے گئے ان کی تعداد ۷۵۹۶۹۸ ہے۔

۱۹۴۰-۴۱ء کی نسبت جرائم میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا۔ زنا بالجبر کے جرائم ۴۹ فی صدی بڑھ گئے۔ چوریاں ۱۰ فیصدی، قتل ۱۴ فیصدی اور ڈکیتیاں ۹ فیصدی۔

امریکی پریس نے جرائم میں اس زیادتی کا ذمہ دار شراب اور صنفی آوارگی کو ٹھہرایا ہے، مگر یہ

نہ سمجھ بیٹھیے کہ اس تشخیص کے بعد شراب اور آوارگی کے خاتمہ کے لیے امریکی حکومت کوئی قدم اٹھائے گی، اس لیے کہ امریکا میں خالص جمہوری نظام قائم ہو جس میں زہر کو بھی اس وقت تک زہر نہیں تسلیم کیا جا سکتا جب تک کہ عوام کی اکثریت اس کے زہر ہونے پر متفق نہ ہو جائے۔ شراب لاکھ بری سہی مگر جب تک اس کے عشاق کرام اکثریت میں ہیں حکومت اس کی طرف ٹیڑھی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، صنفی آوارگی کتنی ہی خوفناک ہو مگر جب تک اس کی لذت کے شناسا رائے عام پر چھائے ہوئے ہیں کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اسے ملک بدر کرنے کا ارادہ کر سکے ——— اور آزاد خواہشیں اور بیباک تمنائیں شراب اور زنا کی سرپرستی نہ فرمائیں گی تو کیا عفت و ہوش کو ان کی نوازشوں کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔

کتنا عبرتناک منظر ہو۔ انسان جس چیز کو خود اپنی عقل سے بری سمجھتا ہو اس کے پنجہ سے نہیں نکل سکتا۔ یہ ہو جمہوریت کی کرشمہ سازی اور یہ ہیں حریت فکر کے برکات و فیوض۔

کاش دنیا اب بھی الٰہی نظام اور خداوندی قانون کی اہمیت و ضرورت کو تسلیم کرلے کیونکہ یہ قانون عقل سے بھی پہلے انسان کو اشیاء کے منافع و مضرات سے آگاہ کر دیتا ہو اور اپنے اندر ایسی دفعات رکھتا ہو کہ اگر انھیں مان لیا جائے تو گمراہ رائے عامہ معاشرے کو قتل نہیں کر سکتی۔

(الالقان۔ الہ آباد)

مذہب اور مارکسزم

حال ہی میں روس کی تاس ایجنسی نے روس کے ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن کے بعض خطوط شائع کیے ہیں جس میں انھوں نے بعض کمیونسٹوں کے سوالات کا جواب دیا ہو۔ ان میں سے ایک جواب زبان کے مسئلہ پر اسٹالن کے خیالات کے ظاہری تضاد کو رفع کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔ اس کے آخر میں اسٹالن نے یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"مارکسزم ایسے نتائج اور اصولوں کو تسلیم نہیں کرتا جن میں تبدیلی ناممکن ہو اور جن کا ہر زمانہ اور مقام پر ماننا ضروری ہو۔ کیونکہ مارکسزم ہر قسم کے اذعانی عقائد کا دشمن ہو۔"

کیا اسٹالن کے ان الفاظ کے بعد بھی مارکسزم کی مذہب دشمنی کو ثابت کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت ہو، کون نہیں جانتا کہ دنیا کا ہر مذہب کچھ نہ کچھ ایسے اذعانی عقاید پیش کرتا ہو جنھیں وہ ہر مقام پر ہر زمانہ میں تسلیم کرنا لازمی ٹھہراتا ہو۔ خصوصاً اسلام کے پیش کردہ اصول حیات کی

تو سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں، اور قیامت تک ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا (ان کی روشنی میں جزئی اور فروعی قوانین کے استنباط سے انکار نہیں) کیا ایسی صورت میں کوئی شخص بیک وقت کمیونسٹ اور مسلمان ہو سکتا ہے۔

(الانصاف۔ الہ آباد)

ہم کس کی رعایا ہیں؟

کتاب "الشہاب"[1] کی ضبطی کا حکم صادر کرتے ہوئے حکومت پنجاب نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس سے ملک معظم کی رعایا کے مختلف فرقوں میں منافرت پھیلتی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ یہ دعویٰ فی نفسہ غلط ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ہم اب تک ملک معظم ہی کی رعایا ہیں۔ اور ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ کیا محض ایک جھوٹ ہے

ہم جانتے ہیں کہ آئینی حقیقت کے لحاظ سے پاکستان برطانیہ کا محکوم نہیں، ہمارا اس وقت کا تعلق بھی محض رسمی ہے اور ہم صرف اس لیے برطانیہ کے خیر دشر کے حاشیہ بردار ہیں کہ ہمارا حکمراں طبقہ ذہنی اور تہذیبی لحاظ سے برطانیہ کا مرید و جبید ہے۔ لیکن جب سرکاری اعلانات کے ذریعہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم اب تک ملک معظم کی رعایا ہیں، تو ہمارے سینے میں ایک مکا سا لگتا ہے اور ہم پوری اذیت کے ساتھ سوچتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور ملک معظم کی رعایا نہ رہا۔ مگر یہ طوقِ لعنت ہمارے گلے کا ہار ہی رہا۔

مسلمان کی حیثیت سے ہم صرف خدا کی رعایا ہیں، نہ کسی مسلمان سلطان و حاکم کی اور نہ کسی کافر بادشاہ اور ملک کی، پھر ہمیں برطانیہ کے ملک معظم کی رعایا بتا بتا کر کب تک ہماری غیرت اسلامی کو مجروح کیا جائے گا

(کوثر۔ لاہور)

سرخوں سے سبق

شائع ہوا ہے کہ "سرخ چین میں سپاہ آزادی کو مغربی چین میں داخل ہونے سے پہلے جہاں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں، حسب ذیل ہدایات دی جاتی ہیں۔

(۱) مسجدوں اور ملاؤں کی حفاظت کرو۔ مذہبی جگہوں میں داخل مت ہو! اور مسجدوں کی دیواروں پر پوسٹر مت لگاؤ۔

(۲) مسلم گھروں میں سور، گھوڑے یا خچر کا گوشت نہ کھاؤ۔

---

[1] "الشہاب" حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی کتاب ہے [illegible] سال پہلے لکھی ہوا قادیانیت کی رد میں یہ نہایت فاضلانہ رسالہ [illegible] حکومت پاکستان نے ضبط کیا تھا۔

(۳) نوجوان مسلم عورتوں سے نہ ملو اور نہ ان کے گھروں میں داخل ہو۔

(۴) عبادات اور مذہبی رسوم میں خلل نہ ڈالو۔

(۵) مسلمانوں کے حمام کو استعمال نہ کرو۔

(۶) مسلمانوں کے کنوؤں سے پانی لینے سے قبل اپنے ہاتھ دھو ڈالو، کنوئیں سے نکالا ہوا پانی دوبارہ کنوئیں میں نہ انڈیلو۔

(۷) مسلمانوں کے سامنے سور کا نام نہ لو اور نہ ان سے کبھی یہ پوچھو کہ وہ سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے یا ان کی مسجدیں کس غرض کے لیے ہیں

(۸) مسلم گھروں میں شراب یا سگرٹ نہ پیو۔"

بڑے ہی بھولے اور سادہ لوح یہ چین کے سرخے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں اتنی موٹی بات نہ سوجھی کہ ایک "الگ مسلم تہذیب و تمدن" کا وجود تسلیم کر لینا مستقل مسلم شعائر و اطوار کی ہستی کا اقرار کر لینا، مسلم مذہب کے احکام کے احترام کی ہدایت کرنا۔ یہ تو صاف "دو قومی نظریہ" کا مان لینا ہوا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کمیونزم یا اشتمالیت تو جمہوریت و عمومیت تک کے منافی ہے، کمیونسٹ عقائد کے لحاظ سے وہ جیسے بھی ہوں شرافت و رواداری و انسانیت میں تو ہم وطن نو بیوں ہی کے سے ہیں ——— (صدق۔ لکھنؤ)

گردن کشوں کی باجگذاری

واشنگٹن۔ ۲۱ جولائی۔ جاسوسی کی سزا اب تک امریکی قانون میں ۲۰ سال قید کی تھی! اب تازہ مسودہ قانون یہ پیش ہوا ہے کہ یہ سزا بڑھا کر سزائے موت کر دی جائے۔"

(پی۔ٹی۔آئی)

سزاؤں کی سختی کے لیے اب تک تو اسلامی شریعت بدنام تھی اور فرنگی تمدن کا سارا رخ مجرموں کے ساتھ ہمدردی اور سزائے جرم کو ہلکا ہی کرنے کا تھا اور "علوم" و "فنون" سے نئی نئی دلیلیں ہر روز سزاؤں کی تخفیف ہی کی تائید میں گڑھ گڑھ کر پیش کی جاتی تھیں۔ یہ اب کیسی ہوا پلٹی کہ "روشن خیال" امریکا کو بھی ضرورت سزا کی شدت میں اضافہ کی محسوس ہونے لگی؟ ——— دین فطرت سے مقابلہ و معارضہ کی سکت کوئی کہاں تک رکھ سکتا ہے، بڑے سے بڑے گردن کشوں کو آخر اس کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ کسی کو آج، کسی کو کل۔ ——— (صدق۔ لکھنؤ)

قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے

ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے

قصص القرآن :۔ (از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی) پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کے متعلق چار جلدوں کی یہ کتاب اس زمانہ کی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے۔

جلد اول :۔ حضرت آدم سے حضرت موسیٰ تک کے واقعات ۔۔ ۔۔ ۔۔ صہر

جلد دوم :۔ حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ تک کے واقعات ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہیر

جلد سوم (انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان ۔۔۔ صہر

جلد چہارم :۔ حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات ۔۔ ۔۔ ۔۔ صہر

لغات القرآن :۔ اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ ولغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح کی گئی ہے۔ اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے ابھی صرف تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔

جلد اول للعہ، جلد دوم للعہ جلد سوم للعہ

فہم قرآن (از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے) قرآن مجید کے رسالہ ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن وسنت کا باہم کیا تعلق ہے؟ مجلد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہیر

قرآن اور سیرت سازی :۔ (از ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر جامعہ عثمانیہ) یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ قرآن نے تزکیہ نفس کے کیا اصول بتائے ہیں، اور آپ کن طریقوں سے اپنی سیرت کی تعمیر کریں۔ مضامین کی افادیت کے علاوہ طرز بیان کی دلکشی اور تاثیر ایک مستقل جادو ہے۔

مجلد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ہیر

قرآن اور تصوف :۔ از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، جس میں کتاب وسنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو منطقی ترتیب اور وضاحت کے ساتھ ایک خاص اسلوب میں پیش کیا گیا ہے ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ

رہنمائے قرآن :۔ ایک فاضلانہ انگریزی کتاب کا ترجمہ، جدید تعلیم یافتہ حضرات ضرور پڑھیں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۸ر

کائنات روحانی :۔ (از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ، قرآن مجید کے علوم ومعارف پر وجد انگیز کتابچہ۔ ۸ر

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ
احادیث نبوی پر ایک بہترین کتاب

ترجمان السنہ

جلد دوم

"ترجمان السنہ" کی پہلی جلد جن حضرات کے مطالعہ سے گزر چکی ہے وہ یقیناً باقی جلدوں کے بڑی بے چینی سے منتظر ہوں گے اور یہ معلوم کر کے انھیں بڑی خوشی ہوگی کہ اللہ کی مدد و توفیق سے اس کی جلد دوم بھی تیار ہو گئی ہے جو اپنے امتیازات اور محاسن میں جلد اول سے بھی برتر اور بالاتر ہے ـــــ بیشک فضیلت تو اگلوں ہی کے لیے ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ عصر حاضر کی ضروریات اور موجودہ دور کے خاص تقاضوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جیسی یہ کتاب اس دور کے ایک ہندی عالم سے مرتب کرادی ہے ایسی کسی زبان (حتیٰ کہ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے، خود عربی زبان میں بھی) موجود نہیں ہے۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ حضرات علماء کو، خصوصاً حدیث کے اساتذہ کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، درس حدیث کے طرز میں جس تغیر کی ضرورت ہے اس کے متعلق پوری رہنمائی انشاء اللہ اس کتاب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

قیمت جلد اول ۔ ۔ ۔ غیر مجلد دس روپے
" جلد دوم غیر مجلد نو روپے، مجلد ۱۱ روپے

احکام القرآن

تالیف مولنا حاجی نثار اللہ صاحب ایم، ایل، سی

بچوں کو اگر پورا کلام مجید مع معانی ومطالب پڑھانے کی صلاح دی جائے تو اس کے لیے وقت کا عذر کیا جائے گا اس لیے اس کتاب میں صرف احکامات یعنی یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔ زندگی کی ہدایت کے لیے کافی سمجھ کر اختصار کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔

ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے!

۲۴۰ صفحات، بڑا سائز، عمدہ کاغذ اچھی طباعت
قیمت صرف ۔۔۔ دو روپیہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ

هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان

"کلمۂ طیبہ" کی حقیقت

(از افادات مولٰنا محمد منظور نعمانی)

اس رسالہ میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ دلنشیں اور مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر کے مطالعہ سے نورِ یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں توحید و رسالت کے متعلق کوئی اور ایسا محققانہ اور عارفانہ رسالہ موجود نہیں ہے جس سے عقل اور جذبات اور دل و دماغ یکساں طور پر متاثر ہوں۔ پچھلا اڈیشن چھپنے کے چند ہی دنوں کے بعد نایاب ہو گیا تھا۔ اب نظرِ ثانی کے بعد چھوٹے خوبصورت سائز پر تیسرا اڈیشن تیار ہوا ہے۔

قیمت :- (۸/)

اِسلام کیا ہے؟

(تالیف مولٰنا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان لکھنؤ)

مصنف نے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ضرورت، اور خاص وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر توجہ اور محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اسلامی تعلیمات پر ایسی جامع اور مفید کتاب اُردو زبان میں کم از کم ہمارے علم میں نہیں ہے اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کیلئے بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل انشاء اللہ کافی ہے۔ اسلام کی ضروری تعلیمات کو بیس سبقوں کی شکل میں مرتب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر سبق اپنے موضوع پر ایک مستقل مضمون اور مؤثر خطبہ ہے، زبان کو آسان بنانے کی خاص کوشش کی گئی ہے کہ بے پڑھے لوگ اور کم عمر بچے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ خود پڑھ کر ایمان تازہ کیجئے، بیوی بچوں کو پڑھا کر انھیں پکا اور کامل مسلمان بنائیے، مسجدوں اور مجمعوں میں سنا کر تبلیغ کا حق ادا کیجئے، اور مسلمانوں میں ایمانی رُوح اور دینی زندگی پیدا کرنے کا بے انتہا ثواب حاصل کیجئے۔ اور اگر آپ کا کوئی غیر مسلم دوست اسلام کو جاننا اور سمجھنا چاہے تو اُس کے ہاتھ میں بھی بے تکلف یہی کتاب دے دیجئے

کاغذ و طباعت اعلیٰ

قیمت مجلد ۔/۲

"نماز" کی حقیقت

(از افادات مولٰنا محمد منظور نعمانی)

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اُس کی رُوح و حقیقت سے واقف ہونے کیلئے اور اپنی نماز میں رُوحانیت اور نورانیت پیدا کرنے کیلئے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ نماز کے متعلق کتاب و سنت کے لطیف اشارات اور ائمۂ دین و معرفت خصوصاً امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے عارفانہ افادات کا عطر کھینچ کر اس رسالہ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ "کلمۂ طیبہ" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ تازہ اڈیشن، کاغذ اور طباعت اعلیٰ۔

قیمت :- (عہ/)

کتب خانہ "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ

جلد (۱۷) | ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۰ء | نمبر (۱۲)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر "الفرقان" ۳۲ گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

خاتمہ جلد نمبر (۱۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۳۶۹ھ کا یہ آخری شمارہ ہے اور الحمد للہ اس پر "الفرقان" کی سترھویں (۱۷) جلد پوری ہو گئی۔ اس جلد کے مکمل ہو جانے پر خاص طور سے اس لئے قلب کو بڑی مسرت ہے کہ اس سال کے شروع کے چند مہینوں میں ہندوستان و پاکستان کے درمیان تبادلۂ زر بند ہو جانے کی وجہ سے الفرقان کی حالت اس قدر نازک اور ناقابلِ اطمینان رہی تھی کہ کئی بار یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید ہمیں مجبور ہو کر التوائے اشاعت کا اعلان ہی کرنا پڑے گا —— لیکن رب کارساز کی مسلسل مدد اور دستگیری سے آخر کنارہ پکڑ ہی لیا گیا اور الحمد للہ کہ سال کا یہ آخری پرچہ اسوقت آپکے ہاتھ میں ہے۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصلحت۔

پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا یہ بھی عجیب کرشمہ رہا کہ ان سخت ترین مالی مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود الفرقان کا معیار اہلِ علم و نظر کی رائے میں افادیت کے لحاظ سے اور دوسری ظاہری و معنوی حیثیتوں سے بھی کہا جاتا ہے کہ پچھلے تمام سالوں سے اس سال بلند رہا، اور افلاس و بے مائگی کے اس دور دورہ میں "حج نمبر" بھی اس شان کا نکل گیا کہ عام اہلِ علم و اصحابِ ذوق کے علاوہ بعض خاصانِ خدا نے بھی اس سے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار فرمایا۔ اللہ کرے کہ عام و خاص بندگانِ خدا کا یہ قبول و استحسان عند اللہ مقبولیت کا عکس ہو، اور اس کی کریمی سے یہی امید ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے شکر اور اسکی حمد کے ساتھ اس کے اُن بندوں کا شکریہ بھی ہمارے ذمہ ہے جن کا کسی قسم کا تعاون الفرقان کے سلسلہ میں شریک ہے —— اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے اُن سب بندوں کو فضلِ خاص سے نوازے جو مادہ پرستی اور نفس پرستی کی اس تاریک دنیا میں دین کی دعوت و خدمت کے کسی سلسلہ اور کسی کام سے بھی لوجہ اللہ محبت و ہمدردی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مقدر اور مقرر ہو چکا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ اپنے دین کو اس دنیا میں جاری رکھنا چاہتے ہیں اُس وقت تک ہر دور میں کچھ بندوں کو توفیق ملتی رہے گی کہ وہ دین کی دعوت و نصرت کو اپنا مقصدِ زندگی بنائیں، اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے والے بندے بھی تھوڑی بہت تعداد میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ اخیر زمانوں میں دین کی خدمت و دعوت سے وابستہ رہنے والے ان سب بندوں کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بڑی بشارتیں دی ہیں۔ فطوبیٰ لھم ثم طوبیٰ لھم۔ ـــــــــــــ

ابھی اوپر کی سطروں میں اُن مالی مشکلات کا کچھ ذکر ہو چکا ہے جو گذشتہ سال انہی مہینوں میں پاکستانی روپیہ کی وصولی ایک دم بند ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں اور جنکی وجہ سے الفرقان کے غریب کارکن کئی مہینے تک بہت پریشان اور عاجز رہے تھے ـــــ بعد میں یہ صورت الحمدللہ نہیں رہی اور اللہ تعالیٰ نے روپیہ وہاں سے وصول ہو جانے کی ایک نجی راہ ہمارے لئے آسان فرما دی ـــــ اُس ذریعہ سے اگرچہ کُل واجب شدہ رقمیں تو وصول نہیں ہو رہی ہیں لیکن اکثر وصول ہو جاتی ہیں ـــــ دفتر الفرقان سے تعلق و معاملہ رکھنے والے تمام پاکستانی احباب اگر فرض شناسی سے کام لیں اور اس نجی ذریعہ سے دفتر الفرقان کا حساب برابر اور بروقت ادا کرتے رہیں تو الفرقان کے کارکن مالی مسئلہ کی فکروں سے انشاء اللہ نجات پا سکتے ہیں۔ ـــــــــــــ

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا یہ رسالہ سال کا آخری شمارہ ہے اور الفرقان کے خریداروں میں ہر سال بہت بڑی تعداد ایسے حضرات کی ہوتی ہے جن کی خریداری کا حساب اسی آخری مہینہ ذی الحجہ پر ختم ہوا کرتا ہے ـــــ دفتر کے کارکنوں نے مجھے بتلایا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے جن حضرات کی مدت خریداری اس مہینہ ختم ہو رہی ہے ان کی تعداد سات آٹھ سو کے قریب ہے۔ ان سب حضرات سے اُمید یہی ہے کہ انشاء اللہ آئندہ بھی وہ الفرقان کے ساتھ اپنا یہ تعلق اور تعاون اسی طرح جاری رکھیں گے ـــــ اگر بالفرض آپ حضرات میں سے کسی دوست کے حالات خدانخواستہ کسی وجہ سے ایسے ہوں کہ وہ آئندہ الفرقان جاری رکھنے سے معذور ہوں تو اپنی مجبوری سے وہ مطلع ضرور فرما دیں، شاید اللہ تعالیٰ ہمارے لئے ایسا کوئی سامان پیدا فرما دے کہ الفرقان اُن کے مطالعہ کے لئے دفتر سے پھر بھی جاتا رہے ـــــ جی یہ چاہتا ہے کہ دین کے سلسلہ سے ایک دفعہ جو تعلق کسی سے قائم ہو جائے وہ حتی الوسع ٹوٹنے نہ پائے۔ الحاد اور بیدینی کے اس طوفانی دور میں ہر دینی تعلق بڑا قیمتی سرمایہ ہے، جس کی حفاظت ہر دوسری چیز سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ زمانہ کے رُخ اور وقت کے خاص تقاضوں کو سمجھنے کی ہم سب کو توفیق نصیب فرمائے۔

ـــــــــــــ

باسمہٖ سبحانہٗ   حامداً ومصلیاً

نگاہِ اوّلیں!

(از عتیق الرحمٰن سنبھلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انڈین نیشنل کانگرس کے چھپنویں ۵۶ سالانہ اجلاس کا صدر منتخب ہونے کے بعد ٹنڈن جی نے ناسک میں جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا ہے وہ چند جہات سے نہایت اہم اور قابل توجہ ہے۔ آج کی صحبت میں ہم اسی پر اظہار خیال کریں گے۔

اس عہدہ کی ذمہ داری کا بار پڑنے کے بعد ٹنڈن جی کے بعض خیالات میں جو فوری تبدیلیاں خطبہ میں نظر آتی ہیں وہ یقیناً اس ملک کے حق میں نیک فال ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں ٹنڈن جی آج بھی وہیں ہیں جہاں کل تھے، چنانچہ ہندوستان کے وزیر اعظم نے ایک سچے کانگرسی کی حیثیت سے ایک آدھ مسئلہ پر ناسک ہی میں اختلاف رائے کا اظہار بھی کر دیا۔ اسی طرح ہندوستان کے ہر شہری کو اگر اس پر تنقید اور تبصرہ کا حق حاصل ہے، اور یقیناً حاصل ہے تو پھر ایک مسلمان شہری کی حیثیت سے ہم بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) ٹنڈن جی نے ہندوستان کے دستور اساسی کی تائید کے ذیل میں تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ ہندو راج کے خیال پر تنقید فرمائی اور مدلل انداز میں ہندوؤں کو یہ بتلایا کہ ان کی مذہبی کتابیں اپنی ساری اہمیت کے باوجود اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں ملک کے نظام حکومت کی بنیاد قرار دیا جا سکے اور یہ بنیاد اس جمہوری دور میں کسی حکومت کی عمارت کا بوجھ برداشت کر سکے۔" اس حد تک کوئی بات ایسی نہ تھی جو ہمیں اظہار خیال کی دعوت دیتی۔ لیکن اسی ضمن میں جگہ بجگہ پاکستان کا "ذکر خیر" کرتے ہوئے صدر محترم نے بلا ضرورت آخری مذہبی کتاب (قرآن کریم) کو بھی عمومی الفاظ کے ذریعہ دوسری کتابوں کی

صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہو ـــــــ اس لیے ہم ٹنڈن جی سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا انھوں نے قرآن مجید کا مطالعہ فرمایا ہو؟ اور ایسا مطالعہ فرمایا ہو کہ جس کے بعد کسی کو اظہارِ خیال کا حق حاصل ہوتا ہو، وہ ساری شرائط پوری کردی ہیں جو ایک نقّاد کے لیے ضروری ہیں، یعنی بے لاگ غیر جانبداری۔ قرآن کی زبان سے واقفیت، اس زبان کے محاورات اور اسالیب بیان میں مکمل دستگاہ، اس کی نزاکت اور باریک نفسیات کا کماحقہٗ علم اور خود قرآن کی مخصوص اصطلاحات، آیاتِ الٰہی کا پس منظر، پھر اس جانب اجمالی اشارات کا فہم، نیز حاملین قرآن سے تبادلہ خیالات، یہ ہیں وہ شرائط جن کی تکمیل کے لیے آپ کی عمر کا ایک خاصا حصہ درکار تھا! کیا آپ بتلائیں گے کہ کون سا وقت آپ نے اس کے لیے صرف کیا؟ معاف فرمائیے! آپ کی کچھ عمر وکالت کی نذر ہوئی اور بقیہ سیاسیات میں گزر رہی ہو۔

افسوس ہوتا ہو جب ہم دیکھتے ہیں کانگریسیوں کی اخلاقی گراوٹ سے رنجیدہ ہونے والے اور انھیں نئے سرے سے درس اخلاق دینے کا عزم رکھنے والے ایسے ایسے ذمہ دار اور باوقار لیڈر بھی اس سطح پر اتر آتے ہیں جو ان کے مقام سے بہت پست ہو۔ اگر کہیں اس کا سبب یہ ہو کہ آپ کا تصورِ اخلاق صرف ان چیزوں تک محدود ہو جو آپ کو کانگریسیوں میں کھوئی ہوئی نظر آرہی ہیں تو یہ تصور نظرِ ثانی کا طالب ہو۔ اور بلاشبہ مذکورۂ بالا امور کا لحاظ بھی ایک نا قدکی اخلاقی ذمہ داری ہو۔ آپ جن کتابوں کو اپنی مذہبی کتابیں خیال کرتے ہیں ان کے متعلق اظہارِ خیال کا حق ہمارے نزدیک آپ کو حاصل ہو، کیونکہ آپ کے خطبہ سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ نے ان کا گہرا مطالعہ کیا ہو لیکن کسی دوسری سماوی کتاب کے متعلق، اس وقت تک رائے دہی بلکہ اعلانیہ تنقید کرنا جب تک کہ تنقید کے سارے شرائط بہم نہ پہونچا دیے جائیں، قانونِ اخلاق کی صریح خلاف ورزی ہو ـــ مگر افسوس کہ اس قانون کی پشت پر طاقت نہیں ہو۔ ٹنڈن جی کا مسلسل یہ رویہ دیکھنے میں آرہا ہو کہ وہ موجودہ پاکستانی حکومت کی آڑ لے کر اصل قرآنی حکومت کو ہدفِ ملامت بنانے میں مصروف ہیں اور ہر اس خرابی کو جو پاکستانی حکومت میں نظر آتی ہو۔ قرآن اور اسلام کے سر منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں، حالاں کہ اس وقت کی پاکستانی حکومت اور اس کے دستور وقانون کو قرآن اور اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں۔ انھوں نے قرار دادِ مقاصد کے ذریعہ صرف اس ارادہ کا اظہار کیا ہو (وہ بھی ابہام کے ساتھ) کہ ان کے ملک کا دستور قرآن پر مبنی ہوگا، اس کے علاوہ نہ ان کا دعویٰ ہو کہ اس وقت ان کے یہاں قرآنی حکومت ہو اور نہ اس وقت

تک ان کی عملی کارروائیوں میں اس غلط فہمی کی گنجائش ہو۔ ایسے بین شواہد سے چشم پوشی کرتے ہوئے پاکستانی حکومت کو قرآنی حکومت کہے جانا اور پھر پاکستان پر عائد ہونے والے سارے الزامات اسکے سر تھوپنا نہایت گھٹیا درجہ کی بات ہے۔ قرآنی حکومت تو اسوقت زمین کے کسی حصہ پر بھی قائم نہیں ہے، اگر ہے تو صرف تاریخ کے صفحات پر، لیکن ایک نیک دل اور انصاف پسند آدمی کے لیے اس قلمی تصویر میں بھی وہ جاذبیت ہے کہ اپنا کلمہ پڑھوائے بغیر نہیں رہتی۔ آپکے گرو مہاتما گاندھی جیسے کٹر سناتن دھرمی ہندو[1] کو بھی اس پر عقیدت کے پھول چڑھانے پڑے۔ آپ ابھی گاندھی جی کی اس ہدایت کو بھولے نہوں گے جو انھوں نے ۳۷ء کی کانگریس گورنمنٹ کے وزرائے اعظم کو دی تھی کہ "ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نقش قدم پر چلنا" وہ بھی اسلامی اور قرآنی حکومت، اور آج بھی وہی حکومت اسلامی ہو سکتی ہے جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی مکمل پیروی کرے۔ اسکے بغیر صرف اسلامی حکومت نام رکھ دینے سے نہ کسی کو دھوکا کھانا چاہیے اور نہ اس کو بہانہ بنا کر قرآن و اسلام پر نشانہ بازی کی مشق کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی ہم پاکستان کے ارباب حکومت سے بھی کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن اور اسلام کی اس مظلومیت کے سب سے بڑے ذمہ دار اسوقت آپ لوگ بھی ہیں، اگر یوم آخرت کا عقیدہ (خواہ کیسی ہی مضمحل حالت میں ہو) آپکے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں موجود ہے تو ہم اسکے واسطے سے آپسے عرض کرتے ہیں کہ اس دن اللہ کی بے لاگ عدالت میں قرآن اپنی اس مظلومیت کی فریاد لے کر آئے گا۔ اور آپ کو جوابدہی کرنا ہوگی۔ آج آپ اس حقیقت سے ہزار کترائیں مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ آپ کو اللہ نے موقع دیا ہے کہ واقعی معنی میں اسلام اور قرآن کی حکومت قائم کر کے ایکبار اس جدید دنیا کو جتا دیجئے کہ یہ طرز حکومت دنیا بھر کے لیے اور خصوصاً اپنے غیر مسلم باشندوں کے لیے کیسی رحمت ہے۔ اور ان غلط فہمیوں کی کیا حقیقت ہے جو اسکے بارے میں پھیلائی جا رہی ہیں۔

---

(۲) اسی خطبہ میں ٹنڈن جی نے ایک بار پھر اپنے "ایک کلچری" نعرہ کو دہرایا ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جسمیں جواہر لال جی نے اظہار اختلاف کیا ہے۔

کلچر کے معاملہ میں ٹنڈن جی سے بار بار دریافت کیا گیا ہے کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے؟ کن چیزوں کو وہ مسلمانوں سے چھڑانا چاہتے ہیں اور کن باتوں کو ان کی زندگی میں داخل کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن بار بار کے مطالبہ کے باوجود انھوں نے آجتک اپنے اس نعرہ کی وضاحت نہیں فرمائی، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ٹنڈن جی اس سوال کے جواب سے برابر پہلو تہی کرتے رہے تو آخر یہ مسئلہ کس طرح طے ہو سکتا ہے، ہم ایکبار پھر ٹنڈن جی سے عرض کرتے ہیں کہ ان کے

---

[1] یہ خود گاندھی جی کا قول ہے ۱۲

ذہن میں ایک کلچر کا جو تصور ہو اس کا ایک متعین خاکہ پیش کریں تاکہ مسلمان اس کو قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ کریں، اور اس الجھن سے آپ اور ہم دونوں کو یکسوئی حاصل ہو جائے ــــــ البتہ اس خاکہ کو تیار کرتے وقت چند باتیں پیش نظر رہنا ضروری ہیں۔ وہ ہمیں عرض کرنا ہیں۔

(۱) آپ کا دستور کھلے الفاظ میں ہر مذہب کی پوری حفاظت کا یقین دلا چکا ہے۔

(۲) آپ کو کسی مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں مذہب کے اثرات اور اختیارات زندگی میں ان حدود تک محدود ہیں۔ اور ان حدود سے باہر مذہب اور زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا فیصلہ صرف مذہبی تعلیمات کے ذخیرہ اور اس کے سمجھنے والے کریں گے۔

پس ہم اس بارے میں "اسلام" کی حیثیت کو اس کی تعلیمات کی روشنی میں واضح کر کے اسلام اور مسلمان کی زندگی کے باہمی تعلق کی وسعت سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام ایک مکمل اور جامع دین ہے وہ اپنے ماننے والوں کی پوری زندگی کو گرفت میں لیتا ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہتا جس کے لیے مثبت اور منفی احکام (اوامر و نواہی) اسلام نہ دیتا ہو، وہ اس پر قطعاً راضی نہیں ہے کہ بندہ زندگی کے کچھ حصہ کیلئے (خواہ وہ ایک ہی شعبۂ حیات کیوں نہ ہو) اپنا طرز عمل خود آپ متعین کرے، اور اسلام کی اصولی رہنمائی کو قبول نہ کرے، (اس جامعیت کے باوجود دنیا آج سے بہت پہلے یہ مان چکی ہے اور جو نہیں مانتے تھے وہ مان رہے ہیں کہ اسلام جیسا عقل پرور اور فکر نواز مذہب دنیا کا کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے) خیر یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ تھا، مقصود صرف اسکی جامعیت کا اندازہ کرانا ہے۔

لہٰذا مثال کے طور پر انسانوں کے باہمی تعلقات کے شعبہ کو لے لیجیے اسلام کو اس شعبہ سے بھی پوری دلچسپی ہے۔ وہ بتلاتا ہے کہ باپ اور بیٹے کے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ اپنے رشتہ داروں سے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں، پڑوسی اور اہل محلہ کے کیا حقوق ایک مسلمان پر ہیں۔ بین الملی تعلقات کا کیا تقاضہ ہے اور بین الاقوامی تعلقات کی کیا حدود ہیں۔

اسی طرح معاملات میں ایک مسلمان کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے۔ خرید و فروخت میں کون سے اصول ملحوظ رہنے چاہئیں، کونسی بیع و شرا جائز ہے اور کونسی ناجائز، یا لین دین کس طرح ہونا چاہیے۔ ایسے ہی معاشرت کو لیجئے اسلام چند اصول بتلا دیتا ہے اور مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس شعبہ کے چھوٹے بڑے سنکڑوں مسائل کا حل انکی روشنی میں کرے۔ مسئلہ کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کا انتخاب اور دوسرے کا ترک، پسند اور ناپسند کا معیار، اپنی یا کسی دوسرے انسان کی خواہش کو نہ بنائے بلکہ ان اصولی اوامر و نواہی کو جو اسلام نے تعلیم دیے ہیں،

بالفاظ دیگر چند بنیادی اور اصولی احکام کے ذریعہ اسلام اپنے ماننے والوں میں ایک خاص ذہنیت تیار کرتا ہے اور ان کے مزاجی میلان اور عقلی رجحان کا ایک مخصوص رخ بناتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو سچے مسلمان مسئلہ کے دو پہلوؤں میں سے اسی پہلو کو اختیار کرتے ہیں جو اس شعبہ کے اصولی احکام سے میل کھاتا ہے، مثلاً لباس کا مسئلہ ہے اسمیں بھی اسلام کچھ مثبت اور منفی احکام دیتا ہے۔ لیکن صرف وہ ان جزئیات میں نہیں پڑتا کہ پاجامہ پہنو یا دھوتی باندھو، ہیٹ اوڑھو یا ٹوپی، کوٹ پتلون پہنو یا مت پہنو ــــ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ ایسا لباس پہنو جو ساتر ہو متکبرانہ نہ ہو، اور خدا کے باغیوں یا بدچلنوں کے ساتھ مخصوص نہ ہو ــــــ گویا وہ کسی ایک ہی کٹ یا وضع کی غیر فطری پابندی عاید نہیں کرتا بلکہ ہر پہننے والے کو آزادانہ انتخاب کا حق دیتا ہے کہ جو پسند ہو اختیار کرو۔ (اور اسکی بین الاقوامیت خود مقتضی تھی ایسی ہی وسعتوں کی کہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلیں اپنی ہزارہا ترقیوں کے باوجود اور ہر قوم اور ملک اپنی رنگا رنگیوں کے ساتھ اس ابدی مذہب کا دامن اپنے لیے تنگ نہ پائے) اس کا مطالبہ صرف مذکورۂ بالا چند اصولی باتوں کی رعایت کا ہے جو ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم کے لباس کے ساتھ بآسانی ملحوظ رکھی جا سکتی ہے، اور جو بھی اسے اپنا دین بنائے گا اسے ان باتوں کی پابندی ضروری طور پر کرنا ہوگی۔

الحاصل آپ اپنے ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ اسلام کا تعلق مسلمانوں کی زندگی سے بس ایک حد تک ہے جسکے باہر زندگی اور مذہب کا کوئی علاقہ نہیں اور جس کا جی چاہے اس میں دخل دینے لگے بلکہ اسکے برعکس اسلام مسلمانوں کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور زندگی کا تہذیبی اور تمدنی حصہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں وہ یہاں بھی اپنی اصولی ہدایات سے مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان ہی ہدایات کی رعایت ملحوظ رکھنے سے تمدن کے مظاہر میں کچھ خصوصیات اور امتیازات رونما ہوتے ہیں جو ان کے تمدن کی مذہبی جان ہیں۔

لہذا اُس "ایک کلچر" کا کوئی ایسا خاکہ جس میں ان خصوصیات سے تعرض کیا گیا ہو مسلمانوں کے لیے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا اور ایسے ہر نعرہ کی مخالفت کرنے کا ہمیں قانونی حق بھی حاصل ہے جس سے ہمارے مذہب میں مداخلت ہوتی ہو۔ کیونکہ ملک کا دستور ہر مذہب کی آزادی کو تسلیم کر چکا ہے۔

"تصوّف اور اس کے اعمال واشغال"

[گزشتہ اشاعت میں اسی عنوان کے تحت اب سے ۸-۹ برس پہلے کا اپنی سرگذشت کا وہ واقعہ لکھنے کے بعد جس نے مجھے تصوّف اور اس کے اعمال و اشغال کا تجربہ کرنے پر کچھ آمادہ کیا تھا۔۔۔ راقم سطور نے لکھا تھا۔ ـــــــــــ کہ

"تصوّف کے اعمال و اشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا، افسوس ہو کہ اپنی کم ہمتی اور لاابالی پن کی وجہ سے اور کچھ اپنے مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کما حقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جا سکا تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام تعلق اس سلسلہ سے اور اس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا، اور اس کی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو کچھ قرب حاصل رہا اور ان کے احوالِ و ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اُس سے چند یقین حاصل ہوئے ہیں جن میں سے بعض تصوّف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہلِ تصوّف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔"

اس صحبت میں اپنے وہی خیالات یا اذعانات حوالہ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہو جو تھوڑی سی مدت کے اس راہ کے ناتمام تجربہ کا نتیجہ ہیں۔ اللھمّ الھمنی رشدی وقنی شر نفسی]

تصوّف کا مقصد اور اس کی حقیقت

الحمدللہ کہ اب اس باب میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ تصوّف اور اس کے اعمال و اشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا کچھ نہیں ہو جنکو کتاب و سنت ہی میں کمالِ ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہو۔ چونکہ اس بارہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں اسلیے جو کچھ اس سلسلہ میں میں نے سمجھا ہو اسکو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہو کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لیے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ

انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے، مثلاً محبت کے بارے میں سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے:-

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ (بقرہ، ۲۰ع) اور جو ایمان والے ہیں انکو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے

اور حدیث صحیح میں ہے "ثلث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان الحدیث" (یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں، ان میں سے اوّل یہ کہ اللہ و رسول کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو۔ دوسرے یہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو، اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کے لیے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا)

اور سورۂ انفال کے پہلے رکوع میں ہے:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ (الانفال ع ۱)

سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو، اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو، اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اور سورۂ "مومنون" میں اللہ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ خَشْیَۃِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِرَبِّھِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ ۝ (المومنون ع ۴)

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں، اور وہ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ انکو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے (معلوم نہیں کہ یہ عمل وہاں قبول ہی ہو یا نہ ہوں) وہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیزگامی کرتے ہیں، اور

وہی ان کے لیے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔

اور سورۂ زمر میں قرآن مجید کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہو کہ۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۝ (زمر ع ۲)

اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

اور سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہو۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران)

وہ لوگ جن کا یہ حال ہو کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے، بیٹھے، اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

اور سورۂ مزّمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہو۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (مزمّل)

اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کے اسی کی طرف متوجہ رہو۔

ان آیتوں میں جن اوصاف وکیفیات کو اہلِ ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہو اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہو وہ یہ ہیں:-

(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

(۲) ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۳) ان کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے تو ان کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔

(۴) اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

(۵) وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

(۶) اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے ان کے جسم کانپ جاتے ہوں اور ان کا ظاہر و باطن اللہ کی طرف اور اس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

(۸) وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال اور کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰہِ وَ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ

(مشکوٰۃ شریف)

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے (جس سے محبت کرے) اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لیے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا ہی کے لیے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے، اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (بخاری و مسلم)

وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ مَکَانَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ۔ (فتح الباری)

احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو) گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تو تم کو (ہر جگہ اور ہر آن) دیکھتا ہے۔

پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے، اور دوسری حدیث میں "احسان" کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حصول

اور ان میں ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے ــــ اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ وَاَهْلِيْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ.

اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ كُلِّهَا وَخَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَاقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشَّوْقِ اِلٰى لِقَائِكَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْيُنَ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاَقْرِرْ عَيْنِيْ مِنْ عِبَادَتِكَ

اے اللہ ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور ڈرنے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور اپنی ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر دے کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جب تو دنیا والوں کو ان کی چاہتی دنیا دے کے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر اور اپنی عبادت کے ذریعہ میرے دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ اَخْشَاكَ كَاَنِّيْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰى اَلْقَاكَ الخ

اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ اِيْمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِيْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰى اَعْلَمَ اَنَّهُ لَا يُصِيْبُنِيْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِيْ وَرِضًا مِنَ الْمَعِيْشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِيْ

اے اللہ میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقینی اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہو اور آئے گی جو تو نے میرے لیے لکھ دی ہو (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے لیے مقرر و مقدر کر دیا ہو میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ التَّوْفِيْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَيْكَ وَحُسْنَ ظَنٍّ بِكَ

اے اللہ جو اعمال تجھے پسند ہیں اُنکی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ حسنِ ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰى بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ

اے اللہ میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسے تجھ سے اطمینان اور انس حاصل ہو جسے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو جو تیری قضاء و قدر پر راضی ہو اور جو تیری دین پر قانع ہو۔

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ لِذِكْرِكَ

اے اللہ میرے دل کے کان اپنے ذکر کیلیے کھولدے

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ قُلُوْبًا اَوَّاهَةً مُخْبِتَةً مُنِيْبَةً فِیْ سَبِيْلِكَ

اے اللہ میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو نرم اور درد آشنا ہوں ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْيَتَكَ وَذِكْرَكَ وَاجْعَلْ هِمَّتِیْ وَهَوَایَ فِيْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى

اے اللہ میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت ان ہی چیزوں کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہیں اور جن سے تو راضی ہو۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا ..... وَاَعْطِنِیْ نُوْرًا ..... وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا۔

اے اللہ میرے قلب میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرمادے ... ... اور مجھے سراپا نور بنادے۔

یہ سب دعائیں اور اس قسم کی اور بھی بیسیوں دعائیں) کتب حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ آپ خود بھی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔ ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں، مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات فراموش ہو جائیں، عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقینِ صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حسنِ ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا، اور اسکی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا، اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا، اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اسکا خوف، وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا میلانِ صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں، نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہو کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

بس تصوف دراصل اسی قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے۔ اور اسکے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر و فکر) کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں، ایسی تدبیریں جنکی تجربہ تصدیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والوں کے لیے ان کی عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔[1]

یہاں یہ عرض کردینا بھی غالباً ناظرین کے لیے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث اور دعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا ابھی معلوم ہو چکا ہے ان میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز و گداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر ان کے نتائج اور لوازم ہیں اس لیے تصوف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوف کی بنیاد ہے۔ اور جس کی بنا پر اسکو دین کا تکمیلی شعبہ سمجھا جاتا ہے۔
یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لاابالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا اسلیے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جا سکی اور اس راہ کے بعض اکابر کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلہ میں ملتی رہی، اسی سے الحمدللہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کی غرض و غایت اور ان کی حقیقت کے متعلق اُن بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

---

(۲) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے ذریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔
(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف بجائے اسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی روح اور طاقت

---

[1] عقلی توجیہ کے لیے "صراط مستقیم (مرتبہ شاہ اسمعیل شہید رح) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی انشاء اللہ کافی ہوگا ۱۲

پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین، اعتماد، ہمت، عزیمت، صبر، توکل اور ماسوی اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے ذریعہ ان کو پیدا کیا جا سکتا ہے اور ابھارا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت اور اس سے فائدہ اٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ کے ان بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقہ پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کیلئے مصروف جد و جہد ہوں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہوں۔

(۴) تصوف سے دوری اور بے خبری کے دور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیے اور اسکی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئے سانچے میں اسکو ڈھال دینا چاہیے۔ لیکن بعد میں جب تصوف اور اسکے حاملین سے کچھ قرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس صدی میں بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے اپنے تجربہ اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ تجدید و ترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹیفک کر دیا ہے۔ اور اب بھی یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلا شبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے۔ لیکن اس کا اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے غواص ہوں۔ ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے جیسے حضرات نے لے لی جنھوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اس کے ساتھ اس کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح و ترمیم خدانخواستہ اسی قسم کی ہو جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی باز کی مرمت کی تھی۔

(باقی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صالحیت

از ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (جامعہ عثمانیہ)

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ" (پ۔ ۲۰ع ۱۔۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) اصحاب بحث و افکار جنھیں حکماء و عقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحابِ کشف و ابصار جو عرفاء و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہل بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و براہین کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء و متکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے، لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرت مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی حیرت کو "حیرتِ نُظّار" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادم شکوک و تعارض دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحاب کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں جس کو "حیرتِ اولی الابصار" کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدۂ وحدانیت والوہیت کا، آثار و عجائب ربوبیت کا، توالیٔ تجلیات کا، اور یہ حیرتِ محمود ہے۔ "رَبِّ زِدْنِی فِیْکَ تَحَیُّرًا" کی دعا اسی حیرت محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء و متکلمین، فلاسفۂ یونان کے اتباع میں انبیاء علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کُتّوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں، کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! انکی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی "عقلِ ناقص" کے سوا کچھ نہیں۔ فرحوا بما عندھم من العلم۔ ~

مصطفٰے اندر جہاں آنگہ کسے گوید زعقل
آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سُہا!

اہلِ کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیۂ باطن، تخلیہ تحلیہ، کمالِ تبتّل اور دوام توجہ سے منتہائے مقصود کو پہنچتے ہیں " وھو الوصول الی معرفۃ اللہ ولقائہ " انھیں صراطِ مستقیم کے جادہ پیما کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملّتِ حنیفی و دینِ مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہم اجمعین) یہ گروہ مقدس ان ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (یحبھم ویحبّونہ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ) یہ خدائے لم یزل لایزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ کے قائم کئے بغیر کر لیتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں (افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نورٍ من ربّہ) انھیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (افی اللہ شکٌّ فاطر السمٰوات والارض) چنانچہ کسی نے حضرت جنید سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمھاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:- " لقد اغنی الصباح عن المصباح " مجھے دن کی روشنی نے چراغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا۔ ؎

حق را ز حق شناس نہ از حجت و قیاس
خورشید را چہ حاجت شمع است و مشعلہ (جامیؔ)

یہ مقدس ہستیاں درجۂ کمال پر فائض ہوتی ہیں، انھیں مکتب خانۂ " وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا " سے سبق ملتا ہے۔ یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارث۔ اُنکی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے :- ؎

آنہا کہ رہ روِ الست اند | از عہدِ الست باز مستند
در منزلِ درد بستہ پابند | در دادنِ جاں کشادہ دستند
چالاک روندہ بیک گام | از جوئی حدوث باز جستند
فانی زخود و بدوست باقی | ایں طرفہ کہ نیستند و ہستند

ایں طائفہ اند اہلِ توحید باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریائے توحید میں غرق ہوتی ہیں۔ خلق نے جو کچھ حکایۃً سنا ہے وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لئے جو "غیب" ہے، ان کے لئے "شہادت" ہے۔ چنانچہ عارف رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:۔

دفترِ صوفی سوادِ حرف نیست جز دل اسپید ہمچو برف نیست

زادِ دانشمند آثارِ قلم زادِ صوفی چیست اسرارِ قدم

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں پیر اندر خشت بیند بیش ازاں

در دلِ انگور می را دیدہ اند در فنا محض شئی را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویۂ گم نامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذِ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبۂ صالحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صالحین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان، وعملِ صالح۔

ان الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت لندخلنهم فی الصالحین (۲۹-۶-۱)

ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اسکی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہوتی ہے! جس ذاتِ پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اُس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

"وعد اللہ المنافقین والمنافقات والکفار نار جہنم خالدین فیہا"

(پ ۹-۶-۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے جس کا نتیجہ خلودِ نار و حبطِ اعمال ہے۔

ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالہم فی الدنیا والاخرۃ و اولئک اصحاب النار ھم فیہا خالدون۔ (پ ۲-۶-۱)

ارتداد شرک کی طرح دین ومذہب کی نفی ہے۔ بغاوت ہے اور اس لئے ناقابلِ معافی!۔

کفر وشرک، نفاق وارتداد بڑے جرائم ہیں۔ سخت گندگی ونجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے تطہیر آن توبہ اور لا الٰہ الا اللہ کے اقرار وتصدیق ہی سے ہوسکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے کہ:۔

"اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین۔"

ایمان محض تصدیقِ قلب کا نام ہے، اور اعمال جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امور ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں:۔

وما انت بمومنٍ لنا ولو کنا صادقین۔ گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا یقین آنے کا نہیں۔

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعلِ قلب قرار دیتے ہیں:۔

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیہم غضب من اللہ ولہم عذاب عظیم۔

(پ ۱۴-۱۰-۲۰)

جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے (اگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو (اُس سے کچھ مواخذہ نہیں) لیکن جو شخص ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کرنے بھی تو جی کھول کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو ظرف ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا ہے، جو جبر واکراہ کے سبب اعمال ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے۔ اور مورد غضب خدا رندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمال نیک کی جزا اور ثواب کے لئے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

ومن یعمل من الصّٰلحٰت من ذکرٍ او انثیٰ وھو مومنٌ فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا۔ (پ ۵-۶-۱۸)

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور اُن پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

من عمل صالحًا من ذکرٍ او انثیٰ وھو مومن فلنحیینّہٗ حیوۃً طیّبۃً ولنجزینّھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ (پ-۱۴-۶-۱۸)

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اُس شخص کو بالطف زندگی دیں گے، اور اُنکے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

ومن اراد الاٰخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومن فاولٰئک کان سعیھم مشکورًا۔ (پ-۱۵-۶-۲)

جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی سعی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو۔ تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہ گاروں کے لئے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں:-

قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا انہ ھو الغفور الرحیم۔ (پ-۲۴-۶-۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت ذنوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لئے عذاب مخلد کی وعید ہے۔

ان الذین کفروا وصدّوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وھم کفار فلن یغفر اللہ لھم۔ (پ-۲۶-۶-۸)

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

اگر اعمال داخل ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخل کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورت عدم تعمیل، کفر کی علامت عدم مغفرت، اور دوام عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!۔

(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحب تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:۔

وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما، فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٓء الیٰ امر اللہ، فان فآءت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا، ان اللہ یحب المقسطین، انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

(پ ۲۶-۶-۱۳)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کرا دیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ ان میں صُلح کرا دینے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔

ان آیات بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ حق تعالیٰ نے صالح اُسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہے اور عمل صالح بھی کرتا ہے۔ اب عمل صالح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عمل صالح کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب: یعنی عمل کا موافق سنت صحیحہ کے ہونا۔ اخلاص: یعنی شرکت غیر اللہ سے پاک و صاف ہونا۔ نیت صحیحہ۔

وہی عمل صالح ہوگا جو موافق سنتِ صحیحہ ہو اور نیت صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال امر میں، اُن ہی کی رضا و خوشنودی کے لئے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

(۱) نیت کے متعلق جو اصول حضور انور (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے: "انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔ فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (بخاری) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص کے لئے وہی ہے جو

اُس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو ملے گی یا کسی عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کرے گا تو یہ ہجرت اُسی کی طرف ہوئی۔

یہ حدیث اصول دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکان اسلام میں سے ایک مہتم بالشان رکن ہے سارے اعمال کا نیت ہی پر دار و مدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں بھی ہے۔

(ii) اخلاص کے متعلق حضور انورؐ کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:۔

یا ایھا الناس اخلصوا اعمالکم فان اللہ تبارک وتعالیٰ لا یقبل من الاعمال الا ما خلص۔	یعنی اے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ کے لئے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عمل خالص کے سوا کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

(رواہ البزار عن الضحاک بن قیس)

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، تو ارشاد ہوا:۔

اخلص دینک یکفیک العمل القلیل (رواہ الحاکم)	تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت کرے گا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لئے کیا جاتا ہے اور اس سے ان ہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

(iii) صالح ہونے کے لئے عمل کا مطابق کتاب و سنت ہونا ضروری ہے "من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد" (اخرجہ الشیخان) اس پر نص ہے۔ یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز نکالتا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے "من صنع امراً علی غیر امرنا فھو رد" (رواہ ابو داود)۔ ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے "من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد" (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمال صالحہ و افعال حسنہ بے حد و بے شمار ہیں تو ان اعمال ثابتہ کو چھوڑ کر افعال مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو کیا ہے!" بہتر بات تو خدا کی

بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے! سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں، ہر بدعت گمراہی ہے۔" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہ گار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو بُرا جانتا ہے گو منھ سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے اس سے کسی روز توبہ کرلے گا! لیکن صاحب بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن ابی عاصمؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روزانہ کے تجربہ کو عجیب وغریب طریقے سے ظاہر کرتی ہے:۔

"ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کرکے ہلاک کر دیا اور انھوں نے مجھے گناہ سے توبہ کرکے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو ہویٰ و بدعت میں مبتلا کرکے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ حق پر ہیں اسلئے استغفار نہیں کرتے۔ اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں۔"

اسی لئے رسُول اللہ (صلے اللہ وعلیہ وسلم) نے فرمایا تھا، کہ:۔

"کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار!"

ایمان اور عمل صالح کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لامعبود الا اللہ کے شغل میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں:۔

دنیا[1]، خلق[2]، اور ہوائے[3] نفسانی۔

لامعبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سوا میں امورِ[1] دنیا میں سے کسی کا مطیع ومنقاد نہیں، جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق تعالیٰ ہی کی حول وقوت سے اسکی نفی کرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا ہر عمل، میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکام الٰہیہ کے پابند ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا وخوشنودی کے لئے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقہ سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق[2] کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا وسمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطور کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بجائے یہی

میرا معبود بن جاتا ہے، میں لا الٰہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں!۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی[۳] خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خود نمائی، عُجب و کبر، یا کسی لذتِ نفسانی کا گذر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ "ہر چہ در بند آنی بندۂ آنی" اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ:۔

"افرایت من اتخذ الٰھہٗ ھواہٗ"

میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اللہ کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں!۔ مجھے حضور انور (صلے اللہ علیہ وسلم) کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انھوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کیلئے ہوتا ہے۔

تعس عبد الدینار وتعس عبد الدرھم وتعس عبد الخمیصۃ وانتکس واذا

شیک فلا انتقش!

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں رہے) منھ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نہ نکالے (اتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندۂ زر ہے)۔"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اُٹھ جاتی ہے اور سریر دل پر صرف حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامر الٰہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!۔

عارف رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے:۔ ؎

گر تو خواہی حریِ و دل زندگی	بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہرِ بندگی است	زندگی بے بندگی شرمندگی است
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی	کفر باشد پیش او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر	مغز باید تا دہد دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے۔ حریت کیا ہے؟: ھو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوے اللہ تعالیٰ بالکلیہ:۔ یعنی آزادی اُس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراض دنیاوی و خواہشات نفسانی سے

اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایت عبودیت کا نام ہے۔ "آزادگی بے بندگی" نہیں۔ ع

"کہ بستگان کمند تو رستگار انند" (حافظ) ولنعم ما قیل

خواجگی را خواجگی از بندگی ست بندگی کردن کمال خواجگی ست!

من ازاں روز کہ دربند توام آزادم پادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم!

لا الٰہ الا اللہ کے معنیٰ اوّل لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایت تذلّل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثال امر الٰہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی مقصود و محبوب اللہ ہی ہو—!

لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الٰہ الا اللہ کے۔

لا الٰہ الا اللہ بمعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

(۱) بہشت و ما فیہا من الحور والقصور (۲) مقامات کشفی مثلاً کشف قبور، کشف قلوب، یا کشف بلاد وغیرہ (۳) تجلیات قربی۔

مقصودِ حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی[1]۔ اگر جنت کا سوال کیا جاتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ محل دیدار محبوب ہے۔ ع

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست!

"و رضوان من اللہ اکبر" سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمال ایمان کے منافی ہے۔ انبیا علیہم السلام خصوصاً سیّد الانبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ باینہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں اُن میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندۂ مومن کا اصلی اور اوّلی محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔

"والذین اٰمنوا اشدّ حُبًّا للہ" ۱۲م

نہ ہی مقصود وہ مقاماتِ کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشفِ قبور یا کشفِ قلوب یا کشفِ بلاد۔ ؎

دریں منزل بود کشف و کرامات
ولے باید گزشتن زاں مقامات

نہ ہی وہ تجلیاتِ قرب مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ، مقصود صرف ذاتِ حق رہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد۔ ؎

یارب ز تو آنچہ من گدا می طلبم — افزوں ز ہزار پادشاہی طلبم
ہر کس ز در تو حاجتے می خواہد — من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظہ کے لئے بھی ان سے غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے:۔ ؎

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم
در ہر چہ نظر کنم توئی پندارم

یہ مقامِ تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے، لیکن وہ اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضائے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے، جس حال میں رکھیں اُس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں۔ ؎

معشوقہ کہ شد ابجا دہا عاشقِ من — گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائقِ من!
وصل است ز من کام تو آئے ہستی — تو عاشقِ کامِ خویش نے عاشقِ من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے، کوئی اعتراض نہیں کرتے اور:۔ ؎

"ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"

کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں! تو افق بالقضا، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا خلافِ نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم و ارادہ کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے مطمئن و خوش وقت ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس یہی نکلتا ہے کہ:۔ ؎

عاشقم بر رنج خویش و درد خویش!

بہر خوشنودیٔ شاہ فرد خویش! (رومی)

اور عارف رومی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:- ؎

آں کسے راکہ چنیں شاہے کشد سوئے بخت و بہترین جائے کشد

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ در ہمت نیاید آں دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے:- ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

جاں شد مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اب "لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم" کا یہ نفوس قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)۔ یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامر الٰہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا۔ ؎

ایں راہِ طریقت نہ بپائے عقل است خاکِ قدمِ عشق ورائے عقل ست

سرے کہ فرشتہ چوں ازاں بے خبر است اے غافلِ بے عقل چہ جائے عقل ست (لا اعلم)

دجّالی فتنہ کے اور سورۂ کہف

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

(قسط نمبر ۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ ہم نے بنایا (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، زمین کیلئے زیب و زینت، تاکہ ہم جانچیں کہ ان میں (یعنی انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔

۲۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان چاڑ۔

الحمد للہ کہ سورۂ کہف کا پہلا عشرہ کہئے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہونچ گئے ہیں، ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:—

(۱) انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملاً۔

(۲) وانا لجاعلون ما علیھا صعیداً جرزا۔

ان میں پہلی آیت میں اگرچہ بظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے، اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کر لیا ہے یعنی:—

"یہاں جو کچھ ہے سب انسان کیلئے، اور انسان اُسکے لئے جس کا سب کچھ ہے"

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جس موقع و محل پر ہم اس کو پاتے ہیں، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے۔

ظاہر ہے کہ ما علی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں جن سے مٹی اور کیچڑ کے

اس ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے، زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اونچے اونچے پہاڑ، سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہنے والی ندیاں، غراٹے بھرنے والے سمندر، لہلہاتے ہوئے پھول، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، ہرے بھرے باغ، گھنے جنگل، کھلے پُرفضا میدان، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں، ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش و زیبائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں بھی مستور ہے۔ وہ خود بھی زمین کی زینت ہے، اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا جو رکھا گیا ہے کہ معمولی معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابکدستیوں کی مدد سے حسن و جمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے۔ بلاشبہ زمین کی سجاوٹ و بناوٹ و حسن و رعنائی کو انسان کے اس فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے، اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ ماننا چاہیئے کہ ما علی الارض یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے اس پہلو نے جنت سے نکالے ہوئے یا جنت کے وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس کرے کو بنا دیا، گویا یوں سمجھئے کہ گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل میں اس آدمی کے لئے نکل آئی، جو بہشت بریں کا باشندہ و متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو، ما علی الارض یعنے زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہے، مگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہے۔ یہی حاصل ہے "انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا" کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن و کمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ ہے کہ الانسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے، اور اپنے اعمال کے حسن و قبح، بھلائی برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے۔ اور یہی مطلب ہے لنبلوھم ایھم احسن عملا کا، یعنی (تاکہ جانچیں (نمایاں کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں) میں عملاً سب سے اچھا کون ہے)۔

بلکہ اگر غور کیا جائے تو مجموعی طور پر آیت کے ان دونوں ٹکڑوں سے ادھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ الانسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن جمال سے مالا مال کر دیا، اور اسی کی ذات سے پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود و ظہور پر

جلوہ گر ہو رہی ہیں، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ وابستگی، اور ربط، انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے۔ اسی سورۂ کہف کے آخری عشرہ کے خاتمہ میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ بہشتی زندگی سے بازگشت کی خواہش دلوں میں پیدا نہ ہوگی، چونکہ ایک ہی قسم کی زندگی کے تسلسل سے انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ اُکتا جاتی ہے، بورڈنگ کے کھانے کی بدنامی کا راز اس کی یک رنگی اور تسلسل ہی میں تو پوشیدہ ہے اسی سوال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، آگے حق تعالیٰ کے کلمات کی لامحدودیت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں اشارہ اسی بات کا ہے کہ انسان کی لامحدود طلب اور کسی نقطہ پر نہ ٹھہرنے والی پیاس کی تشفی و سیرابی کی صورت ہی اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے کہ کسی غیر محدود کو اپنی طلب و جستجو کا نشانہ بنالے۔

بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم :- ؎

تپش است زندگانی، تپش ست جاودانی

دلِ ما مسافرے کہ خداش یار بادا

شیخ اکبر محی الدین بن العربی نے بھی لکھا ہے کہ دنیا کے نت نئے حوادث و واقعات سے عوام گھبرا اُٹھتے ہیں، حالانکہ اگر حوادث کی تجدید اس عالم میں نہ ہوتی رہے تو انسان کی جدت پسند فطرت کے لئے زندگی بدمزہ ہو کر رہ جائے گی۔ خیر اس کا تفصیلی تذکرہ تو انشاء اللہ سورۂ کہف کے خاتمہ کی تفسیر میں کیا جائے گا، یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا۔ اس وقت تو اس سورہ کے پہلے عشرہ کی دو آیتوں میں سے ایک آیت کے مفہوم کو واضح کرنا چاہتا تھا، میں خیال کرتا ہوں کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں اصل آیت کا مطلب انشاء اللہ جم چکا ہوگا۔

اب آیئے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حُسن و جمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے، اور دوسرا پہلو وہ جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور و بروز کا مسئلہ وابستہ ہے، ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدۂ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی حلقوں میں پیش آیا۔ کش مکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبۂ ضد و عداوت، بغض و نفرت، صرف خدا انکار زنیت ہی تک پہونچ کر نہیں ٹھہرا، بلکہ مذہب اور دین کے نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی اُس نے لوگوں کو یہ واقعہ ہے کہ بالآخر "خدا بےزاری" کے حدود تک ڈھکیل کر

پہونچا دیا۔ آج یورپ و امریکہ والے اپنے "خدا بے زار تمدن" کی توجیہ میں جو باتیں بھی بنائیں، فلسفہ کی پشت پناہی حاصل کریں، غریب سائنس کے سر اس کا الزام تھوپیں یا تھپوائیں، لیکن بصیرت کی آنکھوں سے جنھوں نے ان ممالک کے باشندوں کی تاریخ اور انقلابی قلابازیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت خود اس مذہب اور مذہبیت کے نمائندوں کے طرز عمل نے اس نتیجہ تک ان کو پہونچا دیا جہاں یہ غریب آج کھڑے ہوئے ہیں، یہ صحیح ہو کہ پہنچ جانے کے بعد فلسفیانہ چرب زبانیوں، اور مسائل سائنس کے غلط استعمال سے بھی بعد کو مدد حاصل کی گئی، مگر حقیقی اسباب بے دینی کی اس زندگی کے وہی ہیں جن کی طرف قرآن نے "آتنا ھم" کے دو لفظوں سے اشارہ کیا ہے۔

بہر حال واقعہ ہو چکا ہے اور سب کے سامنے ہے، اپنی اس "خدا بے زاری" کی خصوصیت کو عموماً اب وہ چھپاتے بھی نہیں، بلکہ اس تاریخی قلابازی کی آخری شکل جس کا نام اشتراکیت یا بولشوازم وغیرہ ہے جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں ان کے پرچم کا سب سے نمایاں امتیازی طغراہی یہ ہے کہ:—

"ہم خدا سے بے زار ہیں"

انصاف کی سچی بات یہی ہے کہ آج اشتراکیوں کی طرف خدا بے زاری کے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی منسوب کیا جا رہا ہے، اور بہ ظاہر اسے نئی بات ٹھہرانے کی جتنی کوششیں بھی ہو رہی ہوں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان کا قصور اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان کے بدنام کرنے والوں کے دلوں میں جو کچھ تھا، جرأت سے کام لیکر اپنی زبانوں پر بھی اسے وہ لے آئے ہیں، اور جو "اندر" تھا وہی "باہر" نکل آیا ہے۔

پس دل والے ہوں، یا زبان والے، اندر والے ہوں یا باہر والے، یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی سوسائٹی میں اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ انسانی وجود کے اس پہلو کو سوچیں بھی، جس میں زمین کے حسن و جمال کے فروغ و اضافہ کا نہیں بلکہ براہ راست خود اسی انسانی وجود کے معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے ظہور کا راز پوشیدہ ہے۔ آخر خدا بے زار ذہنیت میں خدا طلبی اور خدا جوئی کا خیال خود ہی بتائیے کہ کس راہ سے آئے، خدا کی مرضی کو انسانی اعمال و افعال کے حسن و قبح کا معیار بنانے کی صورت کیا باقی رہی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ تھانے میں رپٹ لکھوانے کا لطیفہ لطیفہ ہی ہو مگر خدا کا نام لینے والا مہذب و شائستہ مجالس کی شرکت کے استحقاق سے محروم ہو جاتا ہے، کیا اسکی واقعیت کا بھی کوئی انکار کر سکتا ہے؟ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے اور سب کے سامنے ہے، انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج و مردہ ہو کر رہ گیا، لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی ہے وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"دیارِ عرب میں"

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی الحسنی)

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، ہندوستان کے واحد عربی رسالہ "الضیاء" کو جاری ہوئے ایک سال ہو چکا تھا، مولانا مسعود عالم ندوی اُس کے مدیر، مولانا سید سلیمان ندوی مدظلّہ اور ہمارے محترم و محسن اُستاد شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی (صدر شعبۂ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء) اُس کے نگران و سرپرست تھے، راقم سطور اور مولانا محمد ناظم ندوی ہلالی صاحب کی بزم ادب اور "الضیاء" کی محفل ادارت و تحریر کے خاص رکن تھے۔ ہندوستان میں عربی لکھنے والوں کا حلقہ وسیع نہیں، اس لئے "الضیاء" کے مضمون نگار بھی بہت محدود اور معدودے چند تھے، انھیں گنے چنے لوگوں میں جو اُلٹ پھیر کر الضیاء میں لکھتے رہتے تھے، دار العلوم کے فاضل ادیب مولانا عبدالرحمٰن کاشغری اور ہلالی صاحب کے نوجوان شاگرد مولوی شیر محمد صاحب تھے، جو اب مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کے نام سے معروف ہیں۔ رمضان ۱۹۳۲ء کی تعطیل میں ہلالی صاحب حسب معمول بغداد تشریف لے گئے اور اطلاع ملی کہ اب واپسی کا ارادہ نہیں، عربی زبان و ادب سے ہم لوگوں کا جو تعلق تھا اور دین و علم نے اس زبان کے مرکز و ماحول سے جو ارتباط پیدا کر دیا تھا اُس کی بنا پر عرب ہمارا ذہنی وطن اور ہمارے ارمانوں اور حوصلوں کی سرزمین تھی جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے، اس کی کشش اور اس کی سیاحت کا شوق بالکل قدرتی اور طبعی بات تھی، جہاں تک غائبانہ واقفیت کا تعلق تھا، ہم لوگ وہاں کی جزئیات، وہاں کی علمی ادبی دینی و سیاسی تحریکات و رجحانات اور شخصیتوں سے اتنے واقف تھے جتنے کہ شاید ہندوستان کے کسی قریبی صوبہ کے حالات سے، لیکن پھر بھی یہ ایک بڑا خلا تھا کہ ہم نے اس کو بچشم خود نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں جب پہلی مرتبہ لاہور جانا ہوا تو اس کا اندازہ ہوا کہ رسائل و اخبارات کے ذریعہ کسی ملک یا شہر سے واقفیت اور شخصیتوں کے اندازہ اور براہ راست "دید و شنید" میں کتنا بڑا فرق ہے۔

طالب علمانہ دور کا تذکرہ ہے تو اُسی دور کا بے تکلف طرز خطاب زبان پر آتا ہے مسعود صاحب کو عرب ممالک کی سیاحت کا ہم میں سب سے زیادہ ذوق اور ہلالی صاحب کو سب سے زیادہ تعلق تھا، ان دونوں چیزوں نے اُن میں بغداد کے سفر اور وہاں چند ماہ قیام کی تحریک پیدا کی، اور اس کا اتنا عزم پیدا ہوا کہ اُنھوں نے سفر کا اہتمام شروع کر دیا۔

مئی یا جون سنہ ۱۹۳۴ء کا مہینہ تھا، راقم الحروف کا قیام اُس وقت لاہور میں بادشاہی مسجد کے ایک حجرہ میں تھا، الضیاء کے پرچوں اور مسعود صاحب کے خطوط کا انتظار بلا مبالغہ عید کے چاند کی طرح ہوتا تھا، ایک روز مسعود صاحب کا خط آیا کہ:۔

"میرے سفر بغداد کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے ہیں صرف ایک مرحلہ باقی ہے اور اس کا انحصار آپ پر ہے وہ یہ کہ مولانا مسعود علی صاحب ندوی اس شرط پر مجھے اجازت دینے کیلئے تیار ہیں کہ الضیاء کی ذمہ داری آپ سنبھال لیں"

راقم نے اس کا جواب اثبات میں دیا، اور عرض کر دیا کہ:۔

"مجھے تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں"

لیکن خدا کا کرنا کہ مسعود صاحب کا سفر ملتوی ہو گیا، یوپی کی حکومت نے پاسپورٹ کی منظوری نہیں دی مسعود صاحب خلافتی رہ چکے تھے اور سیاسی تحریکات سے دلچسپی رکھتے تھے، صوبہ کی پولیس کی خفیہ رپورٹ اچھی نہیں تھی، اُن کا سفر ملتوی ہو گیا۔ لیکن میرا تعلق اگست سنہ ۳۴ء سے دار العلوم سے باضابطہ قائم ہو گیا اور اب ہم دونوں دار العلوم کے ایک بالائی کمرہ میں اکٹھا رہنے لگے، وہ ادب کے مدرس اور الضیاء کے اڈیٹر تھے، خاکسار مدرس اور الضیاء کا مستقل مضمون نگار تھا، وہ دن بھی ہمیشہ یاد رہیں گے: مقصد اور رُوح کو چھوڑ کر (کہ وہ زمانہ ان دونوں کے تذکرے بہت خالی تھا اور اب یاد آتا ہے کہ شاید کہیں بھی اُن کی کوئی طاقت ور دعوت موجود نہ تھی، اور مدارس تو عرصہ سے اس ذکر و فکر سے خالی ہیں) علم و ادب کی ساری دلچسپیاں موجود تھیں، یوں سمجھئے کہ ایک مسلسل غیر منظوم مشاعرہ تھا جس کی فضا میں ہم لوگ رہتے تھے۔

خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، وعسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم، مسعود صاحب کو سفر کا التوا، بہت ناگوار ہوا ہو گا، لیکن جو کچھ ہوا اچھا ہوا، اگر وہ اُس وقت چلے جاتے تو علمی و ادبی ترقی کے سوا اُس کا کچھ اور فائدہ نہ ہوتا، ان میں اور ہمارے اس دور کے سب اہل بزم میں ادب و انشار کے سوا

کوئی اُور ذوق اور ان کی تکمیل و ترقی کے سوا کوئی اور جذبہ نہ تھا، خوب یاد ہے کہ امیر شکیب ارسلان اس وقت ہماری نظر میں ادب علم و فکر اور اسلامی سیاست میں منتہا تھے، مسعود صاحب کو طلبہ کی انجمن کا معرکۃ الآراء عربی مباحثہ خوب یاد ہوگا، جس کا موضوع تھا من ھو اکبر رجل فی العالم الاسلامی؟[1] اور یہ بھی یاد ہوگا کہ آراء کی اکثریت امیر شکیب کے حق میں تھی جس میں ہم دونوں بھی شامل تھے، خدا کی شان ہے کہ آج مسعود صاحب کے قلم سے ہم یہ پڑھتے ہیں کہ:-

"امیر البیان کی انشا اور زور بیان کے کیا کہنے! مگر دل کچھ اور ڈھونڈتا ہے، اب کہ عمر کا قافلہ چالیس کی سرحد عبور کیا چاہتا ہے اور چھ سات برسوں سے توجہات کا مرکز اقامت دین کی تحریک ہے، ان یکسر مادی چیزوں سے پیاس نہیں بجھتی، علم اگر دینی رُوح سے خالی ہے تو وہ علم کس کام کا" (دیارِ عرب میں" صـ۲۲)

دار العلوم کے یکجائی قیام کی اخیر مدت میں ہمارا ایک نئی چیز سے تعارف ہوا جس کا ذکر ضروری ہے، اور وہ مولانا مودودی کا رسالہ "ترجمان القرآن" ہے جو اس وقت حیدر آباد سے نکلتا تھا، ہمارے حلقہ میں وہ بڑی دلچسپی اور وقعت سے پڑھا جاتا، دین کے اہم مسائل اور عصر حاضر کے پیدا کئے ہوئے مباحث پر انکے فاضلانہ و محققانہ مضامین ہم لوگوں کو بہت اپیل کرتے، ان کا اسلوب تحریر، محکم استدلال، اصولی و بنیادی طریق بحث اور سب سے بڑھ کر ان کی سلامت فکر ہماری اُفتادِ طبع اور ذہنی ساخت کے عین مطابق تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا قلم اپنی خداداد قدرت و قابلیت کے ساتھ ہمارے بے زبان ذہن و ذوق کی ترجمانی کر رہا ہے، ہم ان کے مضامین کو جدید علم کلام کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے، ان کی تحریریں ہمارے مبہم احساس ضرورت کی تکمیل تھیں اور ان سے ہمارے بعض مجہول ذہنی مطالبات کی تشفی ہوتی تھی، مجہول کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ بعض اوقات ہم پہلے سے یہ تعیین نہیں کر سکتے تھے کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کس طرح کا اسلامی ادب درکار ہے لیکن مولانا کے مضامین پڑھ کر ہم یہ کہہ اُٹھتے تھے کہ ہم یہی چاہتے تھے، گویا بقول اُستاد ذوق۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

---

[1] امیر شکیب ارسلان مرحوم نے اپنی اہم کتاب "السید رشید رضا او صداقۃ اربعین سنۃ" میں اس مباحثہ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی تقریروں کا خلاصہ درج کیا ہے۔

اسی زمانہ میں مولانا نے ہندوستان کے سیاسی حالات، اسلامی زندگی و تہذیب پر انکے اثرات اور آئندہ کے خطرات پر ترجمان کے اشارات میں لکھنا شروع کیا۔ وہ وقت کبھی نہیں بھولتا جب ندوہ کے مہمان خانہ کے سامنے جو دارالعلوم کی مسجد کے پہلو میں ہے ہم چند دوستوں نے محرم سنہ ۱۳۵۶ھ کے ترجمان القرآن کے اشارات پڑھے تھے جن میں آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تھی، یہ مولانا کا وہ ولولہ انگیز مضمون تھا جسکی صدائے بازگشت عرصہ تک سنی جاتی رہی۔ ہم سب لوگوں نے مولانا کی فراست، خطرہ کی صحیح نشان دہی، اور مولانا کی قوت تحریر کی دل کھول کر داد دی، اس کے بعد بھی مولانا کے جو مضامین شائع ہوتے رہے ہمارا ذہن و ذوق انکو اچھی طرح ہضم کرتا رہا، درحقیقت اساتذہ کے اثرات، مطالعہ و تنقید، سوچ سمجھ کر بات قبول کرنے کی عادت (جو ہم کو ایک ذہنی ورثہ کے طور پر ملی تھی) تاریخی نظر اور عام واقفیت نے ہمارے ذہن کا ایک خاص سانچہ بنا دیا تھا جو پورے طور پر کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ مسلمانوں کے دور ماضی، ان کی قدیم تاریخ، علم کلام، سیاسی نظام، نصاب تعلیم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق ہمارے کچھ مخصوص خیالات ہیں، جن سے یکسر انقطاع کسی زمانہ اور کسی ماحول میں بھی مشکل ہے، ان کی جڑیں ہماری زندگی میں بڑی گہری ہیں، اور شاید اب ہمارے بھی بس میں نہیں ہے کہ ہم ان سے علیحدگی اختیار کر سکیں، فکر و ذوق کے اس دائرہ میں ہمارے ذہن کے بعض حدود "جماعت اسلامی" کے ذہن سے مل جاتے ہیں، اور ہر ایسی جماعت سے مل جائیں گے جس کا ذہن انھیں موثرات اور تجربات کا نتیجہ ہو جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

بالآخر دو دوست جو ساتھ رہتے تھے، ساتھ کھاتے تھے، ساتھ مطالعہ کرتے تھے، ساتھ چہل قدمی اور سیر و تفریح کرتے تھے، اور جن کے ذہن و ذوق میں اتنا اتحاد و اشتراک تھا جو کمتر دوستوں اور رفیقوں میں ہوتا ہے، مجبوریوں اور حالات نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا۔

دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء میں مسعود صاحب نے دارالعلوم چھوڑا، اس جسمانی مفارقت کے ساتھ ہم دونوں کا ذہنی سفر الگ الگ شروع ہوا، ہمارے ذہن نے اپنا نشو و نما جاری رکھا، اور خدا کا شکر ہے کہ کبھی اس نے تعطل و جمود گوارا نہیں کیا، یہ زمانہ ہندوستان میں دینی شعور کی بیداری کے لئے تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ہمارے علم میں ہندوستان کی پچھلی تاریخ میں مسلمانوں کا دینی شعور کبھی اتنا بیدار، واضح اور مرتب نہیں ہوا تھا، جتنا ان چند برسوں کے اندر نظر آتا ہے۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی جگہ اپنا سفر طے کرنا شروع کیا، ہم اس دینی شعور کے وسیع احاطہ کے اندر قدم بڑھاتے اور راہ قطع کرتے رہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اس حصار سے کبھی باہر

نہیں نکلے۔

معلوم نہیں کہنے والے نے کس نیت سے کہا تھا کہ:- ؎

ما، و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رُسوا شدیم

لیکن شاید بہت سے پڑھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس شعر میں مکتبِ عشق کے دو طالب علموں کے بُعد اور اختلاف کو بیان کیا گیا ہے؛ اور عام طور پر اس کو ایسے ہی مواقع پر پڑھتے ہیں جہاں اتحاد کے بعد اختلاف اور مناسبت کے بعد عدم تناسب کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ راہِ عشق میں ایک کی صحرا نوردی اور ایک کی کوچہ گردی دونوں عشق ہی کی کرشمہ سازی اور مکتبِ اُلفت کی عین وفاداری ہے، چشمِ حقیقت بیں اگر دو شخصوں میں رشتۂ محبت کا اتحاد اور محبوب کی وحدت دیکھتی ہے تو اس کے نزدیک کوچہ و صحرا برابر ہیں، اور کسی کو حق نہیں کہ ان میں تفریق کرے۔

زندگی کی راہ کا تعین، اور کسی ایک طرز کی ترجیح اتنا بسیط مسئلہ نہیں جتنا سطحی نظر لوگ سمجھتے ہیں، یہ اکثر نتیجہ ہوتا ہے ذاتی تجربات و مشاہدات، فطری صلاحیتوں و مناسبتوں، اور بعض اوقات چند شخصیتوں کا جن سے انسان متاثر ہوتا ہے، مزید تحلیل و تجزیہ کے بعد اس کے اندر کچھ اور عوامل و موثرات بھی نکل سکتے ہیں۔ آپ اپنے لئے اگر خدمت کا کوئی راستہ یا دائرۂ عمل تجویز کرتے ہیں تو یہ محض کسی قانونی دفعہ یا کسی ضابطہ کا نتیجہ نہیں ہوگا، بلکہ بہت سے داخلی و خارجی اثرات کا جو آپ کے ذہن و ذوق کی تشکیل کرتے ہیں اور آپ کو ایک طرز یا ایک دائرہ کے انتخاب و ترجیح پر آمادہ اور بعض اوقات مجبور کرتے ہیں۔

مسعود صاحب سے الگ ہونے کے بعد میری زندگی میں جو سب سے بڑا انقلاب انگیز واقعہ پیش آیا، اور جو میری زندگی میں ایک ایسے خط فاصل کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی کو نمایاں طریقہ پر دو علیحدہ دوروں پر تقسیم کر دیتا ہے، وہ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات ہے۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ مولانا سے دہلی میں ملا۔ ملنے کا ایک بڑا محرک مولانا مودودی صاحب کا وہ مضمون تھا جو ایک اہم دینی تحریک کے عنوان سے "ترجمان" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ میں اکثر وہ چیزیں جمع تھیں جو مجھ جیسے آدمیوں کے ذہن و ذوق کے لئے سخت باعثِ وحشت اور حجابِ اکبر تھیں، زبان کی لکنت، ادائے مافی الضمیر پر عدم قدرت، طرزِ کلام کی قدامت، منطقی و فقہی اصطلاحات

کی کثرت، نئے حالات اور نئے تقاضوں سے ناواقفیت، ان سب کا مجموعہ ایک ایسے شخص کے لئے بڑی آزمائش تھی جس کا ذہنی نشو و نما شبلی، اقبال و ابوالکلام کے ادبیات (وسیع معنی میں) کے ماحول میں ہوا، اور جس کا ادبی حاسہ پشتہا پشت کے ادبی و تصنیفی سلسلہ کی وجہ سے بیحد نازک اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی میوات کے ایک جلسہ میں تشریف لے گئے، ایک موقع پر وہ مولانا محمد الیاسؒ کے پاس تھے اور راقم کہیں اور تھا، جب مولٰنا سے ملنا ہوا تو انھوں نے ملتے ہی فرمایا کہ:-

"آج مولانا نے ایسی دُعا کی کہ اگر کوئی ندوی ہوتا (یعنی ایسا ندوی جو اس طرح کے ماحول سے دُور ہو) تو اُس کو سخت وحشت ہوتی"

مولانا کا اشارہ غالباً الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی اور جوش کی وجہ سے کلام کی بے ربطی کی طرف تھا۔ یہ چیز تو وہ تھی جو مجھے مولانا سے متوحش اور بعید کرتی لیکن اس کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اس کے خلاف عمل کیا، ایک تو یہ کہ میں نے اپنے مربّی برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی ہدایت و تاکید سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی صراط مستقیم غور سے پڑھی تھی، اور ان کتابوں کے ذریعہ ان حضرات کے علوم اور ان کے اسلوبِ کلام سے مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے بھائی کی تربیت و احسان کو یاد کر کے قارئین کے صبر و تحمل سے معذرت کرتے ہوئے، اور اپنے محترم بھائی مسعود صاحب سے "عشق" کا لفظ بار بار لانے کی معافی چاہتے ہوئے وہ شعر پڑھ دینے کا جی چاہتا ہے جو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ میں اس احسان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے والد نے مجھے قرآن مجید حفظ کرایا۔ ؎

رُوحِ پدرم شاد کہ فرمود باستاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ!

ان کتابوں کے مطالعہ نے جو اوّل بھائی کی تاکید سے، پھر اپنے ذوق سے پڑھیں، راہ نبوت کے مزاج اور اس کے علوم و مضامین کے طرز سے ایک طرح کی مناسبت پیدا کر دی تھی۔

دوسری چیز یہ تھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و تائید سے ابتداء عمر میں سیرتِ نبوی اور صحابۂ کرامؓ کے حالات کا مطالعہ بڑی شیفتگی کے ساتھ کیا تھا اس سے ایمان و یقین تعلق باللہ کا ذہن پر ایک ایسا نقش قائم ہو گیا کہ میں اس کی تشریح و تفسیر تو شاید آج بھی نہ کر سکوں، لیکن جہاں اسکی جھلک پائی جاتی ہے وہاں

دل یہ کہہ رہا ہو کہ یہ اسی حقیقت کی جھلک ہے۔

ایک صاحب علم و صاحب تصنیف بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے ذکاوت اور حسن تعبیر کا اچھا حصہ عطا فرمایا ہے، جب پہلی مرتبہ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور مولانا کی باتیں سنیں تو مجھ سے فرمانے لگے، کہ:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل گونگا تھا، بتلا نہیں سکتا تھا کہ اس کو کیا چاہئے، اب معلوم ہوا کہ وہ یہی ڈھونڈتا تھا"

یہ بھی فرمایا، کہ:۔

"اس شخص کی دین کی یافت کتنی صحیح ہے"

قارئین "الفرقان" سے پھر معذرت کرتا ہوں، وہ کہتے ہوں گے کہ "دیار عرب" پر تبصرہ کے نام سے یہ کیا داستان چھیڑ دی۔ ملکی تقسیم نے آج ان دو دوستوں کا ایک جگہ جمع ہونا بہت مشکل کر دیا ہے جو برسوں ساتھ رہے ہیں، لیکن کاغذ پر کوئی حد فاصل اور کوئی نہر یا پہاڑ حائل نہیں، اس لئے اجازت دی جائے کہ دو دوست دل کھول کر باتیں کرلیں، کیا عجب ہے کہ پڑھنے والوں کی بھی دلچسپی اور کام کی کوئی بات نکل آئے۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات اور بار بار کی حاضری سے ایک تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دینی قیادت اور انقلاب کے لئے بہت بڑے یقین، بہت بڑے درد و سوز، اعتماد علی اللہ اور عبودیت کے ایک خاص تعلق کی ضرورت ہے، یہ وہ چیز تھی جس کو میری چشم تصور اس سے پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی میں دیکھ چکی تھی، اس لئے مجھے اس کے محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوئی، مولانا کے ساتھ رہ کر مجھے احتساب (ہر چیز کو رضاء الٰہی اور ثواب کے شوق میں کرنے کی مشق) دعا، تواضع اور اکرام مسلم کی اہمیت پہلی مرتبہ محسوس ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک میں عربیت کے باوجود احتساب کے شرعی معنی نہیں سمجھتا تھا اور کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا کہ صحیحین کی ان حدیثوں میں "من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ"۔ "من صام رمضان الخ" میں احتساب کیا مراد ہے، اسی طرح مولانا میں میں نے آخرت کا یقین اور استحضار، اور اللہ و رسول کے وعدوں پر اعتماد جس درجہ دیکھا اور ان کے اخلاق و عادات کو سنت و شریعت کے سانچہ میں جس طرح ڈھلا ہوا اور ان کی طبیعت کو شریعت سے جس طرح مغلوب پایا اس کی مثال میری آنکھوں نے نہیں دیکھی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ اگر یہ سلوک و تزکیہ نفس کا نتیجہ ہے تو ایسا سلوک و تزکیہ نفس

بڑا مبارک ہے جو ایسے نتائج پیدا کرے۔

جہاں تک انکی دعوت کا تعلق ہے مجھے چند دنوں میں محسوس ہوگیا کہ وہ جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھے محض کلمہ خوانی کی تحریک نہیں ہے۔ مولانا نے ایک مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ:-

"یہ ہرگز کلمہ ونماز کی تحریک نہیں ہے"

بلکہ درحقیقت اگر دو لفظوں ہی میں بیان کیا جائے تو وہ تحریک ایمان یا دعوت ایمان ہے، انکی ساری دعوت ان کے اس یقین وتجربہ پر مبنی تھی کہ مسلمانوں کی زندگی میں جو سب سے بڑا تغیر پیش آیا ہے (اور سارے تغیرات اس کا نتیجہ ہیں) وہ ایمان ویقین کا زوال وانحطاط ہے اور مسلمانوں کی زندگی کے لئے یہی سب سے بڑا خطرہ ہے، ان کے نزدیک اس ایمان ویقین کا ابھارنا جو پیغمبر پیدا کرنے آئے اور جس کو آخری طور پر جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیدا کیا، وقت کا سب سے اہم اور مقدم کام ہے۔ اس کے بعد اس ایمان ویقین کے تحت صحیح حرکت وعمل، اور دینی جدوجہد، صحیح اسلامی زندگی پیدا ہونے کا ذریعہ اور وقت کے تمام فتنوں کا علاج ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ ان کی تحریک کا سارا سانچہ محض ان مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ اور ایک انتظامی چیز تھی۔

ان کے سامنے دین کے تمام ارکان اور مقاصد تھے، یہاں تک کہ اگر یہ راز ہے تو میں اس کو فاش کرتا ہوں کہ لیظھرہ علی الدین کلہ" کی منزل بھی انکے پیش نظر تھی، مگر انکے نزدیک صحیح اور ضروری ترتیب یہی تھی کہ پہلے اُمت میں ایمان ویقین، آخرت طلبی، اور پھر اس کے تقاضہ سے ہر قسم کی قربانی وایثار کی طاقت پیدا ہو جائے۔

مولانا کی خدمت میں آمد ورفت کے ساتھ ساتھ میری وابستگی اُنکی دعوت اور اُنکے اصول، اور طرز کار سے بڑھتی رہی، لیکن یہ وابستگی اس کام کے طرز اور اس کے نقشہ سے زیادہ ان کے اصول اور ان کے کام کی فکری بنیادوں سے تھی، یہی حال ہمارے رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا ہے، کہ ہم دونوں کو مولانا کے اصول اور کام کی بنیاد سے پورا اتفاق ہے، مگر ہم اس خاکہ میں وسعت وترقی کی بڑی گنجائش اور اس میں کافی لچک سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا ذہن میرے ساتھ رہا، مجھے یاد نہیں کہ میرے ذہن نے کبھی مجھے چھوڑا ہو، اپنے سابق ماحول ومطالعہ کے اثرات محفوظ تھے، اور وہ افکار وعقائد زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ تھے، نئے ذہن اور اس کے تقاضوں ومطالبوں سے واقفیت تھی، کبھی بھی کسی ایسے جزیرہ میں زندگی گذارنے کی نوبت نہیں آئی

جہاں سے دنیا کا مطالعہ مشکل ہو اور زندگی سے کامل بے خبری پیدا ہو جائے، اس کا نتیجہ تھا کہ بعض حالات میں اور بعض اشخاص و طبقات کے لئے ایمان اور دین کی وقعت پیدا کرنے کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ کی کتابیں اور جماعتِ اسلامی کے اُس لٹریچر کو جو جماعتی تنظیم سے متعلق نہیں اب بھی بہت مفید سمجھتا ہوں، اور اس کا مشورہ دیتا ہوں، اور یہ سمجھتا ہوں کہ اگر مولانا اس سلسلہ کو جاری رکھتے اور اگر صرف یہی ایک شعبہ پوری قوت سے کام کرتا تو شاید ہندوستان میں ایک بڑا اسلامی فکری انقلاب ہو جاتا، اور غیر مسلم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، میرا عقیدہ ہے کہ ایمانی اور فکری تربیت دونوں کے بغیر اُمت میں متوازن انقلاب نہیں ہو سکتا اس لئے دونوں کاموں کو ضروری سمجھتا ہوں، اور اپنی محدود و ناقص صلاحیت کے مطابق دونوں کاموں سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں۔

یہ میری داستان ہوئی، دوسری طرف مسعود صاحب کے تجربات و مشاہدات، انکی فطری صلاحیتوں و مناسبتوں، اُن کے فکر و مطالعہ اور اُنکے احساس و جذبات نے ان کو جماعتِ اسلامی سے قریب تر کر دیا، یہاں تک کہ ان کی وابستگی اور صلاحیتوں نے ان کو اس کی قیادت کی صف میں پہونچا دیا۔ خیالات کا تنوع، ذہن کے نمو اور زندگی کی علامت ہے، اور زندہ اور ترقی پذیر انسانوں کے افکار، زاویۂ نظر اور ذوق میں ضرور اختلاف ہوگا، اور ہونا چاہئے۔ ہم دونوں رفیق بحمداللہ زندہ ہیں اور ہمارا ذہن نمو و ارتقاء سے محروم نہیں ہوا ہے، اس لئے ہمارے خیالات و رجحانات کا تنوع بالکل قدرتی ہے۔

مسعود صاحب کی جماعتِ اسلامی سے وابستگی جماعت کی بڑی خوش قسمتی تھی، وہ ہندوستان میں عربی کے سب سے بڑے انشاء پرداز اور کہنہ مشق صحافی ہیں، الضیاء مرحوم ادبائے مصر و شام سے صحت زبان اور فصاحت کی سند لے چکا ہے۔ امین ناصر الدین لبنانی اور انستاس کرملی بغدادی جو اپنی لغوی تحقیق و احتیاط میں خاص طور پر مشہور تھے، الضیاء کی زبان کی پختگی اور بلندی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ شیخ تقی الدین الہلالی جو زبان و قواعد میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، مسعود صاحب کو مصر کے بہت سے اخبار نویسوں پر ترجیح دیتے تھے، جماعتِ اسلامی کے پاس اُردو کے بڑے اچھے نثار، طنز نگار اور افسانہ نویس تھے، لیکن کوئی ایسا عربی کا ادیب اور صاحبِ قلم نہ تھا جو اس کی دعوت کو ممالک عربیہ میں پہونچانے کی صلاحیت رکھتا، مسعود صاحب کی ذات میں اُس کو عربی میں دعوت کا ایک کامیاب ترجمان اور ممالک عربیہ کیلئے ایک فاضل سفیر مل گیا۔

ممالک عربیہ مغربی افکار و خیالات اور مغربی نظامِ زندگی سے اس سے زیادہ متاثر ہیں جتنا ہمارا ملک

انگریزوں کی براہ راست وطویل غلامی کے باوجود ـــ مغربی و اسلامی تہذیب کے تصادم اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب خیال کے علماء اور چند جامع اور وسیع الفکر اہل قلم اور اہل علم کی کوششوں نے یہاں ایک ایسا فکری اعتدال اور توازن پیدا کر دیا جو عربی ممالک میں نظر نہیں آتا۔ وہاں یا تو علماء کا وہ طبقہ ہے جسکی نمائندگی ازہر کرتا ہے، یا آفندیوں (اپ ٹو ڈیٹ) اشخاص کا وہ طبقہ جس کی نمائندگی جامعہ مصریہ کے ہاتھ میں ہے، اور جس کا بلند ترین نمونہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین بے موجودہ وزیر تعلیم ہیں، لیکن اس ازہر و جامعہ کے دو آخری سروں کے درمیان نہ تو دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد کا کوئی ادارہ ہے، نہ جماعت اسلامی کی ذہنی وعلمی صلاحیتوں کی کوئی جماعت، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان مغربی اثرات کا بُری طرح شکار ہیں، ان کے دست و بازو شل، ان کا ذہن مفلوج، ان کا قلب ایمان کی حرارت اور عشق کی جرأت سے محروم ہوتا جاتا ہے دیکھنے والا بڑی حسرت کے ساتھ اس حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے ـ ؎

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی

عرب جو کبھی دنیا کے امام تھے، اور آج بھی ان کی دینی بیداری اور دعوت کا عزم یورپ کے ہاتھ سے زمام اقتدار چھین سکتا اور دنیا کو آنے والی تباہی سے بچا سکتا ہے، آج دنیا کا کارواں سالار بننے کے بجائے یورپ کے قافلۂ علم و تہذیب کی گرد راہ بننے کو اپنی سب سے بڑی ترقی سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو ان کو دینی امامت کا مقام حاصل ہے اور نہ سیاسی سربلندی و معاشی خوش حالی، مسعود صاحب نے بالکل صحیح اور بہت خوب لکھا ہے کہ :ـ

"اللہ اللہ جن کے آباء و اجداد نے اونٹ کا دودھ پیتے پیتے ایک اُمی کے طفیل کسریٰ و قیصر کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، آج وہ پھر اُسی جہالت اور فقر و بیکسی کی زندگی گزار رہے ہیں، عربوں نے اللہ کے دین کو چھوڑا تو اللہ کی نعمتوں نے بھی ان سے منھ پھیر لیا اور اس سے زیادہ بدنصیبی کا مقام یہ ہے کہ جن خوش بختوں کو اللہ کی رحمت سنبھلنے کا بار بار موقع دے رہی ہے وہ اسراف و تبذیر میں بُری طرح پھنسے ہیں، انھیں اپنی مفلوک الحال اور جاہل رعایا کی مطلق فکر نہیں ۔" (دیارِ عرب میں صـ۲۲)

اس سے بڑا افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ اب اسلام کے اس قلعۂ اولیں میں کچھ رخنہ انداز ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو عرب نوجوانوں اور حکومتوں میں بہت دور دین سے بے اعتمادی، دین کی بنیادوں سے انکار اور مغربی مادہ پرستی

اور لادینیت کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں، مسعود صاحب عبداللہ بن علی القصیمی کی رسوائے عالم تصنیف "ھذی ھی الاغلال" (یہ ہیں بیڑیاں!) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"قصیمی کی (ھذی ھی الاغلال) کے چند ابواب پڑھے، یہ کتاب مشرقی کے تذکرہ سے بھی زیادہ گمراہ کن معلوم ہوتی ہے، اور سب وشتم کا لہجہ بھی مبتذل اور سوقیانہ ہے قصیمی کے نزدیک تین صورتیں ممکن ہیں۔ (۱) یورپ کا کفر والحاد۔ (۲) صحیح دین یعنی جس میں خدا کے وجود کے علاوہ انسان کو سب کچھ یعنی خالق تقدیر تک تسلیم کیا جائے، اخلاق اور صفاتِ حمیدہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا جائے، اور ہر وہ چیز جس میں مادی نفع ہو اُسے اختیار کیا جائے، خواہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہی کرنا پڑے۔ (۳) موجودہ دینِ اسلام جو ہزار برس سے بالکل مسخ ہو چکا ہے۔ ان تین صورتوں میں دوسری صورت کہیں موجود نہیں اس لئے تیسری صورت سے پہلی صورت ہزار درجہ بہتر ہے"

(دیارِ عرب میں ص۶۶)

یہ کتاب عرب نوجوانوں میں جس طرح مقبول ہوئی اُس سے ان کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔

عربوں میں کام کے دو حصے ہیں ایک تو یہ کہ عرب عوام اور جمہور میں دین کا جذبہ اور شعور بیدار کیا جائے، اور اپنی دینی جد وجہد اور ایمان وعمل سے اُن کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے، اور ایمان کی اُن چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے جو اُن کی خاکستر میں ابھی دبی ہوئی ہیں، کہ واقعہ یہ ہے کہ

"بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں"

اس کے لئے چند برس سے نظام الدین (دھلی) کے مرکز تبلیغ کی طرف سے دین کے داعی جا رہے ہیں۔ ان کا اخلاص، جذبہ، ان تھک محنت، سادہ زندگی، جفاکشی، دعوت کا جوش وانہماک، عبادت کا ذوق، دُعا کی کیفیات، تواضع وخدمت کا جذبہ دیکھ کر عربوں کو یاد آتا ہے کہ کبھی ان کے بھی ایسے ہی دن گذرے ہیں، اور وہی ان کا سب سے اچھا اور ترقی کا زمانہ تھا۔ یہ سادہ اور خاموش تبلیغ کبھی نہ کبھی انشاء اللہ عربوں کے دل میں گھر کرے گی، اور اُنکی دینی حمیت بیدار ہوگی، اور شاید کہنے والے کا کہنا سچ نکلے گا۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کا تختہ اُلٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ان تعلیم یافتہ نوجوانوں، کالجوں کے طالب علموں، حکومت کے عہدہ داروں اور ان سب لوگوں کے دل میں جو زندگی پر حاوی ہیں یا ہونے والے ہیں، اسلام کی وقعت وعظمت، اس کو زندگی بنانے کا جذبہ اور ساری دنیا کو اس زندگی کی دعوت دینے کا ولولہ پیدا کیا جائے، اور ان کو ذہنی وقلبی طور پر اسلام کا حلقہ بگوش، اس کے نظام زندگی کی صحت وفوقیت، اور اس کے تمام عالم اسلامی کے لئے واحد ذریعۂ نجات ہونے کا قائل اور معتقد اور پھر اس کا پرجوش داعی بنانے کی کوشش کی جائے، اور ابھی اسکی پوری گنجائش موجود ہے۔ مسعود صاحب نے صحیح لکھا ہے :-

"عرب نوجوان حیرت کے عالم میں ہیں۔ وطنیت واشتراکیت کوئی چیز انھیں نجات نہیں دلا سکتی، اُن کا علاج صرف اسلام ہی کے پاس ہے"

(دیارِ عرب میں ص۱۸۸)

نوجوانوں اور طالب علموں کا یہ عنصر ہر ملک کی طرح اس ملک میں بھی سب سے زیادہ قبولِ حق کی صلاحیت اور عمل کی قوت رکھتا ہے، اور اس میں سب سے زیادہ زندگی کے آثار ہیں۔ مسعود صاحب نے جابجا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، عراق کے نوجوانوں کے متعلق لکھتے ہیں :-

"پاکستان وہندوستان کی طرح یہاں بھی دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے یہی کالج کے نوجوان ہیں"

(دیارِ عرب میں ص۶)

"نوجوانوں کی یہی جماعت صحیح کام کر سکتی ہے، اس وقت یہ لوگ معلومات کے بھوکے ہیں، ہر اچھی چیز کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شوق سے پڑھتے ہیں"

(دیارِ عرب میں ص۵)

"یہ نوجوان بغداد کے مختلف کالجوں کے طالب علم ہیں، اور اپنے اندر عمل کا بڑا عزم رکھتے ہیں"

(دیارِ عرب میں ص۱۴۹)

"شام کو جمعیۃ الآداب الاسلامیہ کے دفتر میں نوجوانوں سے ملاقات ہوئی، عراق میں یہی نوجوان ہماری اُمیدوں کا مرکز ہیں، عام بیدینی اور اخلاقی انارکزم کے ماحول میں ان مٹھی بھر نوجوانوں کا دین کی طرف واپس آنا اور دوسروں کو دین کی دعوت دیتے رہنا بڑی ہمت کا کام ہے"

(دیارِ عرب میں ص۱۶۴)

لیکن اس طبقہ میں کام کرنے کے لئے خاص صلاحیتیں درکار ہیں، عمیق علم، راسخ ایمان، اور صالح عمل کے ساتھ وسیع نظر، عصر حاضر سے واقفیت نوجوانوں کے ذہن و نفسیات اور ان کی مشکلات کا علم، موقع شناسی اور حکمت بھی ضروری ہے، ورنہ بعض اوقات نفع سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہمیں مسعود صاحب کی اس رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے، کہ:۔

"جذبات کی بنیاد پر فکری رجحانات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

(دیارِ عرب میں ص۱۷)

ان کی یہ رائے بھی بالکل صحیح ہے کہ ان نوجوانوں میں ابھی اصولی و بنیادی دعوت کی ضرورت ہے، جزئیات و فروعی مسائل اور خصوصاً اختلافی مباحث کا قطعاً موقع نہیں، انھوں نے صحیح لکھا ہے، کہ:۔

"جو لوگ نماز ہی نہیں پڑھتے جس ماحول میں مسجد کا رُخ کرنا رجعت پسندی اور گنوار پن کی علامت شمار کی جاتی ہے وہاں آمین بالجہر اور رفع یدین پر اصرار کرنا نفس دعوت پر ظلم کرنا ہے"۔

(دیارِ عرب میں ص۱۳۵)

اسی طرح اس طبقہ میں دین کی دعوت اور اسلام کی تفہیم نئی زبان، نیا طرز ادا، اور نیا علم کلام چاہتی ہے۔ بغداد کے نوجوان عالم اسمٰعیل راشد نے صحیح کہا، کہ:۔

"اب اس زمانہ میں احیاء العلوم اور تفسیر بیضاوی سے خیالات کی اصلاح نہیں ہو سکتی"۔

(دیارِ عرب میں ص۶۱)

نجدی عالم شیخ حمد الجاسر نے علماء نجد کی اس کمزوری کی صحیح گرفت کی ہے کہ دنیا سے ناواقفیت نے ان کو زندگی سے معزول، اور اس حکومت کے اندر بھی ان کو ہر طرح کے اقتدار سے محروم کر دیا ہے جو محض انکی دعوت اور انکی جد وجہد سے قائم ہوئی تھی۔ انھوں نے صحیح کہا، کہ:۔

"علماء نجد دعوت کا بہت تنگ اور محدود مفہوم سمجھ سکے ہیں، اور دنیا سے خلا ملا نہ ہونے کے باعث اس ارضی سمندر میں اپنی حیثیت کا انھیں علم بھی نہیں، اور یہی چیز ان کی نگاہ کی وسعت اور علمی ترقی میں حائل ہے، اور اسی وجہ سے ارباب حکومت پر ان کا اثر ڈھیلا ہوتا جا رہا ہے"۔

(دیارِ عرب میں ص۹۵)

ان حالات اور اس ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نہایت موزوں و برمحل بات تھی کہ مسعود صاحب نے عراق، نجد،

اور حجاز کا سفر کیا، اور وہاں معتد بہ قیام کر کے اسلامی دعوت کے امکانات و مواقع، مختلف طبقات کی صلاحیتوں اور دعوت کی ضرورتوں کا مطالعہ کیا۔

وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ سے روزنامچہ نویسی کے عادی تھے، انھوں نے "دیارِ عرب میں" اس کا اہتمام رکھا کہ روزانہ کے واقعات و تاثرات قلبند کر لیا کریں۔

لوگ عموماً سفروں سے واپس آکر اپنے سفرنامے اور روداد یں مرتب کرتے ہیں لیکن عموماً ان میں یہ نقص رہ جاتا ہے کہ صرف اہم واقعات و تاثرات، خلاصے و نتائج اور دماغ کے اہم نقوش کاغذ پر آنے پاتے ہیں، ان میں ان ملکوں کی روزانہ زندگی کی جھلک، وہاں کی معاشرت کی بے تکلف تصویر، اور مسافر کے بے ساختہ تاثرات نہیں آنے پاتے، روزنامچہ میں بہت سادہ مواد بھی آجاتا ہے جس سے ایک پڑھنے والا مصنف کے تاثرات سے مختلف یا مخالف نتائج بھی اخذ کر سکتا ہے۔

مسعود صاحب کا یہ روزنامچہ "دیارِ عرب میں چند ماہ" کے نام سے باریک حروف میں ۲۰×۲۲/۱۶ سائز کے ۲۹۰ صفحات پر شائع ہوا ہے[۵]۔ کتاب اوّل سے آخر تک نہایت دلچسپ شگفتہ بے تکلف انداز میں لکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں روزنامچہ کے عام انداز بیان سے زیادہ ادبیت پیدا ہوگئی ہے جو مصنف کا مخصوص طرز ہے اور ان کی تمام تصنیفات کی خصوصیت۔ جماعت اہلِ حدیث کو قلم کی شوخی اور طنز و تعریض کی تھوڑی سی آمیزش کی بھی شکایت ہے، اور راقم کا بھی خیال ہے کہ مسعود صاحب جیسا کہنہ مشق ادیب اور وسیع القلب عالم طنز و تعریض سے بچتے ہوئے بھی اصلاح و تنقید کا فرض انجام دے سکتا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے نوجوان ادیبوں سے بھی کہنے کا جی چاہتا ہے کہ اصلاحی ادب کو حتی الامکان طنز و تعریض اور تحقیر کے عنصر سے پاک ہونا چاہئے، طنز و تحقیر مخاطب کو حمیت جاہلیت اور اپنے نفس کی طرف سے دفاع پر آمادہ کر دیتا ہے اور حق سے بعد پیدا کرتا ہے، اسی لئے میرا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا ادب طنز و تعریض (تھکم) سے خالی ہے۔ بات کتنی سخت ہو صاف ہو، اور ظرافت و حقارت سے خالی ہو۔

یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اور اخلاص و شدتِ تاثر کے سوا روزنامچہ میں اس کا کوئی محرک بھی نہیں، کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نہایت پُر از معلومات ہے اور حشو و زوائد سے بالکل پاک، نہ بغداد کی تاریخ ہے

---

[۵] ملنے کا پتہ:- مکتبۂ چراغ راہ۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔ (قیمت مجلّد للعہ)۔

نہ "رہنمائے مسافراں" قسم کی کوئی کتاب، نہ اپنی شان میں قصیدہ گوئی۔ اول سے آخر تک ایک اپنے داعی کے سفر کی روداد ہے جو چشم بینا، گوش شنوا، اور قلب بیدار رکھتا ہے، دن بھر جو دیکھتا ہے جو کچھ سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے سونے سے پہلے کاغذ کے حوالہ کر دیتا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسے حصے ہیں جو قلب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے، عالم اسلامی بالخصوص ممالکِ عربیہ کی زبوں حالی ایک حساس دردمند مسلمان کو ضرور متاثر کرتی ہے۔ مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ کی حاضری کے موقع پر مصنف بے اختیار ہو جاتا ہے، اور اس کا ایمان اور قلبی احساس اس کے قلم اور اندازِ تحریر کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ بعض جگہ تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ معاذ اللہ کہیں وہ "عشق" تو نہیں جس کی "تہمت" بھی مسعود صاحب کو گوارا نہیں، اور جس کی ان کو اپنے نیاز مند قدیم سے شکایت ہے:-

"رات کو مولانا محمد منظور نعمانی بعض ندوی عزیزوں کے ساتھ عیادت کو تشریف لائے، جماعتِ اسلامی پاکستان اور تصوف پر گفتگو رہی۔ راقم نے علی میاں کے سفرنامۂ حج کا ذکر اور ان کے عاشقانہ اندازِ بیان اور بعض بدعات پر تساہل کے متعلق دبی زبان سے اظہارِ خیال کیا نفس تصوف پر تو مولانا نے کسی پرسکون صحبت میں گفتگو کا وعدہ کیا، باقی ذوق و شوق عشق میں وہ علی میاں سے کسی طرح کم نہیں۔" (دیارِ عرب میں صـ ۲۸۴)

جس اندازِ بیان سے مسعود صاحب کو شکایت ہے، پہلے اُس کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

"نظر اُٹھا کر دیکھئے، یہ دونوں طرف پہاڑوں کی قطاریں ہیں، کیا عجب ہے کہ ناقۂ نبوی اسی راستہ سے گذرا ہو، یہ فضا کی دلکشی، یہ ہوا کی دل آویزی اسی وجہ سے ہے! ۔ ؎

الا ان وادی الجزع اضحی ترابہ — من المسک کافوراً واعوادہ رنداً

وما ذاک الا ان ھنداً عشیۃ — تمشت وجرت فی جوانبہ بردا

لیجئے مسجد آگئی، اب بیر علی (ذوالحلیفہ) کی باری ہے۔ ؎

منزلِ دوست چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفورِ شوق سے اُمنڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے، کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں

شعر پڑھتا ہے۔

بھینی بھینی ہوا ہے، اور ہلکی ہلکی چاندنی۔ جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے، ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی، اور ٹھنڈک بڑھتی جا رہی ہے، سنئے کوئی کہہ رہا ہے:- ؎

بادِ صبا جو آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رُخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

وہ ایک بار ادھر سے گئے مگر ابتک
ہوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

(اپنے گھر سے بیت اللہ تک۔ الفرقان حج نمبر ۱۳۶۹ھ)"

اب ذرا اُس شخص کی عبارت پڑھئے جو اپنے کو "عشق" کا منکر، اور ذوق و شوق سے خالی بتلاتا ہے:—

"صبح ہوئی، قافلہ روانہ ہوا، اور مدینۂ منورہ کی قربت طبیعت کو اکسانے لگی، ابھی تین چار گھنٹے کی مسافت باقی ہے، لیکن دل ابھی سے لرزنے لگا ہے۔ مدتیں گذریں، زمانہ بیت گیا، مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا، بارہا فرطِ شوق میں آسی غازی پوری کا یہ پُرکیف مطلع پڑھتا رہا ہوں۔ ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ کیا ساعت ہوگی، جب یہ گنہگار روبرو حضرتِ عالی میں سلام عرض کرے گا، جب کبھی یہ خیال آتا، آنکھیں پرنم ہو جاتیں، درود پڑھتا، اور عربی اُردو کے مناسب حال شعر زبان پر جاری ہو جاتے۔

مسیجید سے بھی قافلہ آگے کو روانہ ہوا، اب یہ گنہگار ہمہ تن شوق ہے، وہابیت کی خشکی کے باوجود دل پیچ رہا ہے۔ جانے ان راستوں سے حضورِ انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کبھی گذر ہوا ہو، موٹر نہ ہوتی تو گردِ راہ سے پوچھتا، شاید نقشِ پا کے کھوئے ہوئے آثرات کا سُراغ لگتا۔ شاعر کی زبان میں محبوب کے گذرنے سے تمام وادیٔ نعمان معطر ہو گئی تھی۔ ؎

تضوع مسکا بلو نعمان اذ مشت

بہا زینب فی نسوۃ عطرات

تو کیا سرورِ عالم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کی گذرگاہ میں ہوائیں مشک آفریں اور عنبر بیز پسینے کی خوشبو سے خالی ہوں گی۔" (دیارِ عرب میں ص ۳۰۵)

اگر پہلی عبارت عاشقانہ اندازِ بیان میں لکھی گئی ہے اور اس کا لکھنے والا "جرمِ عشق" کا مرتکب ہے تو وہ گنہگار اس دوسری کیف آور عاشقانہ انداز میں ڈوبی ہوئی عبارت کے لکھنے والے سے با ادب کہنا چاہتا ہے کہ ؏

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

باقی مسعود صاحب کی اس خادم سے بدعات پر تساہل کی شکایت، تو وہ بھی بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے میرے خاندانی احساس و اہمیت کو تکلیف پہونچی۔ مجھے اپنی تمام تقصیرات کے باوجود شرک و بدعات کے باب میں تساہل کبھی گوارا نہیں، اور یہ ذوق کے بالکل خلاف ہے۔ اگر مسعود صاحب ان مقامات کو متعین فرما دیتے جہاں ان کو تساہل کی بو آئی تو مجھے رجوع و توبہ کا موقع حاصل ہوتا، جو ایک طالبِ حق کیلئے بڑی سعادت ہے۔ تلاش اور قیاس کرنے سے دو مقامات ایسے نظر آتے ہیں جن کے متعلق ایک ذکی الحس آدمی کو شبہ ہو سکتا ہے، ایک طویل سلام جو مضمون میں نقل کیا گیا ہے، سو اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ:

"درود شریف طویل بھی ہیں اور مختصر بھی، جس میں جی لگے اور ذوق پیدا ہو اس کو اختیار کیجئے، مگر اتنا خیال رکھئے کہ توحید کے حدود سے قدم باہر نہ جائے۔"

("الفرقان حج نمبر ۱۳۶۶ھ" ص ۳۲)

دوسرے جہاں لوگوں کے غلافِ کعبہ سے چمٹنے اور پردہ میں منھ ڈال کر دعا کرنے کا ذکر ہے تو وہ محض برسبیلِ حکایتِ حال ہے، البتہ یہ تنقید درست ہے کہ اس پر تنقید نہیں کی گئی، اگر مسعود صاحب کا اشارہ اس نقص کی طرف ہے تو اس غلطی کا اقرار ہے۔[1]

تبصرہ بہت طویل ہو گیا، قارئین الفرقان سے آخر میں پھر معذرت کرنا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب پر تبصرہ سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا لیکن، گھماں ان کو دوستوں کی کہانی سننی پڑی، اور بہت سی غیر متعلق باتیں لیکن لکھنے والا مجبور تھا، کہ:- ؏ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

---

[1] صحیح بخاری میں ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ حجرِ اسود اور رکن یمانی کے علاوہ رکن عراقی اور رکن شامی کے بھی استلام کے قائل تھے، اور اس پر حضرت ابن عباسؓ کے اس ارشاد سے "لیس شیئ من البیت مھجوراً" سے استدلال کرتے تھے اس کو پیش نظر رکھا جائے تو معاملہ اور بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ نعمانی عفی عنہ

_____ بقیہ (دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف) _____

اوراس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کا نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر انکے حُسن میں حُسن کا قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اسکی فطرت میں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔ انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن[1] ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو، لیکن انسانی محاسن وکمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کرکے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا، خواہ زمینی حُسن وزیبائش اور سج دھج میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

عقیدۂ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ مٹی بڑھ رہی ہے بڑھتی چلی جارہی ہے، چمک رہی ہے چمکتی چلی جارہی ہے، اس کے حُسن وجمال میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جارہا ہے، بجھ رہا ہے بجھتا چلا جارہا ہے۔ اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان، یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس "خدابےزار تمدن" کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں، آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی "جنت نما" زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہونچا دیا۔

لیکن یہ تو وہ ہے جو ہوچکا ہے یا ہو رہا ہے، مگر آئندہ یہی صورت حال کس عجیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مذکورۂ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالقِ کائنات سے قطعی بے تعلق وبے گانہ ہوکر اپنی خدابےزار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہوچکے ہیں ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ، صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھر دیا گیا تھا، خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیتہً زمین ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رُخ مڑ گیا،

---

[1] بیسویں صدی کا سب سے بڑا امریکی موجد برقی روشنی، گراموفون اور اسی قسم کی بے شمار ایجادوں کا سہرا اسی کے سر ہے۔ ۱۲

ایک طرف اس یکسوئی یک رخا پن کا نتیجہ یہ نمودار ہو رہا ہے کہ ارضی بناؤ سنگار آرائش و زیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری اور بھرتی چلی جا رہی ہے، انسانیت کی تاریخ میں یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے، ہر نیا دن نئے انکشافات جدید مصنوعات و ایجادات کو اپنے جلوہ میں لا رہا ہے، ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوتِ نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں، لیکن زمین کی زیب و زینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات و اختراعات کی ان ہی راہوں سے زیب و زینت کے ساز و سامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرۂ ظہور و وجود میں جو لا رہا ہے دنیا کی آنکھوں سے کیا وہ اوجھل ہیں، دیکھئے وہ آٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں، ادھر یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔ یہ ان آتش بداماں ایجادات و اختراعات کے سوا ہیں جن کا دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے، دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں:۔

وانا لجاعلون ما علیہا صعیدا جرزا۔ — اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ۔

خود سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ پٹ کر رہ گیا۔ اور اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے، اپنے خیال میں ختم ہو جائے جو خالق کے لئے تھا، وہ "گردن خر" کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست و مسرور ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اُسے نہیں چونکا سکا تھا کہ نسل کا تسلسل تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا، لیکن

"ہم بنا دینے والے (ان سب چیزوں کو) جو زمین پر ہیں میدان اُجاڑ"۔

کیا طفل تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دے گا، پس۔ ؎ "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما" انشاء اللہ تعالیٰ اسی چیست کا جواب آئندہ اشاعتوں میں آپ کے سامنے قرآنی روشنی میں رکھا جائے گا اور اصحاب کہف کا قصہ اور اس کے نتائج اسی وقت آپ کے سامنے آئیں گے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

مکتوب علی (۱)

"رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی روانگی حجاز کی اطلاع ناظرین کرام کو الفرقان کی گذشتہ اشاعت سے مل چکی ہو۔ عدن سے ۱۲ ستمبر کا لکھا ہوا مولانا کا پہلا مکتوب جو ۱۶ ستمبر کو ملا تھا ہدیہ ناظرین کرام ہو ـــــ یہ مکتوب ناچیز مدیر الفرقان اور مولانا عبد السلام صاحب ندوی مدیر تعمیر دونوں کے نام ہو۔ مکتوب کے بعض حصے جو نجی حیثیت رکھتے تھے حذف کر دیے گئے ہیں" ـــــ مدیر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۸ ستمبر دوشنبہ کو اسلامی جہاز سے مبئی سے روانگی ہوئی، سمندر میں جوش اور تلاطم تھا اکثر رفقا کی طبیعت خراب ہی اور میں تو پچھلی مرتبہ کی طرح پھر امتلا اور فقدان اشتہا کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ طبیعت بڑی بے کیف، اور سخت بدمزہ رہی، جہاز پر چڑھتے ہی جماعتوں اور اذان کا نظم اور ریڈیو کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کر لیا تھا، روزانہ صبح "اسلام کیا ہو" سے ایک درس ... اور بعد ظہر مولانا مودودی کا رسالہ "حقیقت حج" پڑھکر سنایا جاتا ہو۔ حج نمبر جا بجا دیکھا گیا اور زائد نسخوں کی طلب ہو، کل سے نماز ظہر کے بعد "حج نمبر" کا مضمون "آپ کس طرح حج کریں" سنایا جائے گا، حضرت مولانا عبد القادر صاحب کو حج نمبر کے مطالعہ کا اہتمام ہو، بار بار رفقا کو پڑھنے کی تاکید فرماتے رہتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میرا ایسا سنگدل بھی عازم حج کے نام مکتوب پڑھکر اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکا، تہجد کے وقت بھی میں نے حضرت کو پڑھتے دیکھا، مولانا مناظر احسن صاحب کے مضمون سے بھی اپنا تاثر ظاہر فرمایا، اور مولوی اویس صاحب کے مضمون اور مولانا مدنی کے مکتوب کے متعلق بھی بلند کلمات فرمائے۔

پرسوں اتوار کو ہمارا جہاز مکلا ٹھہرا معلوم ہوا کہ راستہ میں بحری اطلاع ملی کہ وہاں کئی سو حجاج ہیں۔ ۲۴ گھنٹے جہاز لنگر انداز رہا، شہر سامنے تھا، عمارتیں صاف نظر آ رہی تھیں، خواہش و کوشش کے باوجود شہر جانے کی اجازت نہیں ملی، ایک حضرمی سپاہی سے پوچھا کہ یہاں بڑے بڑے عالم اور اساتذہ کون ہیں، اس نے تین عالموں کا نام بتلایا، ان تینوں کے نام عربی رسائل[۱] ہدیہ کیے اور سپاہی سے درخواست کی کہ یہ امانت پہونچا دی جائے، خیال تھا کہ ہم نے ہوا میں تیر چلایا ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مگر یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک

[۱] [illegible]

حضرمی عالم جو حکومت مُکلا کے ناظر اوقاف اور قاضی ہیں ملنے تشریف لائے اور ان تینوں علماء کی طرف سے ایک ٹائپ شدہ دستخطوں کے ساتھ شکریہ کا خط لائے، کچھ دیر بیٹھکر تشریف لے گئے، ان سے کچھ مفید حالات معلوم ہوئے معلوم ہوا کہ ۸۰۰ مدرسے ہیں، اساتذہ تربیت کیلئے مصر بھیجے جارہے ہیں غربت بہت ہے، استعداد و صلاحیت موجود ہے لیکن کام لینے والے مفقود، فقراء کو "قوت مالا یموت" کے حصول سے اور امراء کو دولت و ترقی سے فرصت نہیں، دن کو ہم نے عرب ملاحوں کو پیسوں کے لیے مسابقت کرتے اور ان کے بچوں کو پیسہ پیسہ کیلئے غوطہ لگاتے دیکھا اور سوار ہونے والے حجاج کے لباس اور حال کو دیکھ کر اس ملک کی غربت کا مشاہدہ کیا پھر اسی شہر کو رات میں بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے بھی دیکھا، اسوقت کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ ان غریب ملاحوں کا شہر ہے جو پیسہ پیسہ پر ٹوٹتے اور لقمہ لقمہ کو ترستے تھے، غربت و امارت کا یہی اجتماع ہے جو اشتراکیت کو دعوت دیتا ہے بلکہ بلائے جاتا ہے اور خوشامد کرکے لاتا ہے، مگر کس سے کہا جائے اور کسطرح کہا جائے مصر کے تربیت یافتہ اساتذہ جب آئینگے تو وہ اس غریب پست قوم کیلئے جو کم سے کم فطرت اسلام پر ہے کتنے مفید یا مضر ہونگے اسکو آپ خوب جانتے ہیں:

جہاز پر خاصا دینی ماحول پیدا ہوگیا ہے، یہاں تک لکھا تھا کہ حضرمی اجتماع میں کافی تعداد میں لوگ آگئے اور مجھے تقریر شروع کرنی پڑی انکو دیکھکر قلب پر جو تاثرات ہوئے تھے اسکو تفصیل سے بیان کیا اور انکو بتلایا کہ آپ کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہونچ گئے، آپکی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہے؟ میری تقریر کے بعد ایک حضرمی عالم نے بڑے موزوں الفاظ میں تقریر کا جواب دیا. اور بتلایا کہ ہمارے بزرگ اس ملک میں کسطرح آئے اور انکے کیا اخلاق تھے انمیں کس قدر دعوت کی روح تھی پھر ہم کسطرح اس پستی میں پہونچ گئے، جلسہ خاصا کامیاب اور موثر رہا، اللہ تعالیٰ اسکو مثمر اور نتیجہ خیز بنائے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جہاز پر خاصا ماحول ہے، ہمارے کیبن کے ساتھ حاجی نثار احمد صاحب ایم، ایل، سی (گورکھپور) کا کیبن ہے انکے بعد ہمارے لکھنؤ کے خان بہادر احمد حسین صاحب رضوی کا کیبن ہے، دوسری طرف بھوپال کے کرنل اقبال محمد خاں اور کرنل عبدالجبار صاحب ہیں، اور بھی بعض باذوق اصحاب ہیں، کل لائبریری میں (جسکو ہم نے مسجد بنا رکھا ہے) نعت کا ایک مشاعرہ ہوا اکثر شعراء گجرات و دکن کے تھے، آخر میں آزاد صاحب نے جب محوی صاحب فتحپوری کی دو فارسی نعتیں پڑھیں جنمیں سے ایک وہ تھی جو الفرقان میں شائع ہوئی ہے تو ایک رنگ جم گیا اور سماں بندھ گیا، آخر میں ایڈیٹر پروفیسر شمس الدین صاحب (ڈیپٹی کالج) نے اپنی ایک بڑی موثر و دلآویز نظم پڑھی جو انھوں نے اس سفر کا ارادہ کرنیکے بعد لکھی تھی، لائبریری کیا ہے [illegible] کا کیبن ہے جو ایک سیٹ کا ہے اور گویا ایک بنا بنایا حجرہ یا "خلوہ" ہے اسکی کھڑکی ہال ہی میں کھلتی ہے، اکثر عصر کی نماز کے بعد مجلس رہتی ہے۔ فقط

از ـــــــــــــــــ ادارہ

ٹنڈن جی کے خطبہ کی اچھی باتیں

انسان کی زندگی کی کامیابی خواہشات کے بڑھنے میں نہیں بلکہ خواہشات پر قابو پانے میں ہو۔ قومی دولت کو ترقی دینے کے لیے پہلے ضروریات بڑھانا اور اس کے بعد ضروریات پوری کرنے کا کام شروع کرنا الٹی معاشیات ہو۔ معاشیات جب زندگی کو نفس کا غلام بنانے کا بہانہ بن جائے تو وہ اپنا فرض ادا نہیں کر رہی ہو۔ دولت کی افزائش خود کسی کی زندگی کا نصب العین نہیں بن سکتی۔ اس میں کسی شخص کو ہر حال میں خوش رکھنے کی طاقت بھی نہیں ہو۔ یہ اسی حد تک کارآمد ہو جہاں تک وہ سماجی زندگی کو صحیح کرنے کے کام آئے۔

"فنونِ لطیفہ" کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہو کہ وہ ہمارے اندر زندگی کے نصب العین کو پورا کرنے کا جذبہ کہاں تک ابھارتا ہو، جو فن صرف بیرونی مسرت میں اضافہ کرتا ہو وہ بیکار ہو۔ اور اس سے دامن بچانا چاہیے۔"

اس لیے سماج کے رہنماؤں کا فرض ہو کہ وہ اپنے ذہن میں دولت اور فنونِ لطیفہ کے صحیح استعمال کے طریقہ کو محفوظ رکھیں۔ آج کل ہمارے یہاں جو فلمی تصویریں دکھائی جاتی ہیں ان میں دولت کا فن کا غلط استعمال نظر آتا ہو۔"

"میں اس موضوع کے تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا میرا مقصد یہ ہے کہ حکومت کو یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ عیش و عشرت کا رجحان ہمارے سماج کی سطح کو نیچا نہ کرنے پائے۔"

"حکومت کے کاموں کی فہرست میں سماج کا اخلاق، نظم و ضبط درست رکھنا ایک بہت اہم کام ہو۔ ہمارے سماج کی سطح اس وقت بلند ہو گی جب اس میں کافی تعداد ایسے آدمیوں کی پیدا

ہو جائے گی جو دولت کو صرف اپنے خواہشات کے پورا کرنے ہی پر صرف نہ کریں گے بلکہ مفاد عامہ پر صرف کریں گے، اور جنھیں دوسروں ہی کو خوش دیکھ کر خوشی ہوگی تب ہمارے سماج میں بے روزگار ایسے آدمی نہ ہوں گے جن کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو، سماج سب کو بارو زگار رکھنے کا اہل ہوگا، اپاہج اور مریض و فقیر سڑکوں پر پڑے ہوئے رو رو کر بھیک نہ مانگیں گے اور ہمارے رحم و کرم پر تکیہ نہ رکھیں گے۔

(خطبۂ صدارت ٹنڈن جی، از "قومی آواز" لکھنؤ)

بزدلوں کی جمہوریت

گاندھی نگر (ناسک) ۲۱ ستمبر۔ "میں جمہوریت پسند نہیں ہوں، اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہو کہ میں کسی ہجوم کی رائے کے سامنے جھکوں" آج صبح پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگرس کے کھلے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے کہا "میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جس کے غلط ہونے کا مجھے یقین ہو، اور عوام (ہجوم) چاہتے ہوں کہ اس غلط بات کو میں مانوں، ایسی صورت میں یہ ممکن ہو کہ اگر کانگرس چاہے تو میں کانگرس سے باہر نکل کر انفرادی طریقہ پر اپنے خیالات کے لیے لڑوں:

"کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہو۔ دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہو۔ اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے سامنے جھکنا ہو تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہیے، اس قسم کی ذہنیت جہاں بھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا، ہاں جمہوریت مجھ سے وزارت چھوڑنے کو کہہ سکتی ہو۔ میں اس کا حکم مانوں گا، اگر کانگرسی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں چند ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے اصول و نظریات چھوڑ بیٹھیں تو کانگرس مردہ ہو جائے گی۔ مجھے ایسی لاش کی ضرورت نہیں ہو۔"

(قومی آواز۔ لکھنؤ)

تجویزوں سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے

کانگرس کے اجلاس ناسک میں فرقہ وارانہ دشمن قرارداد پر بحث کے دوران میں مسز سوبھدرا جوشی نے کہا۔ "گو ہمارے لیڈر پکار پکار کر ہندوستان کے ایک غیر مذہبی اور جمہوری حکومت ہونے کا اعلان کرتے ہیں لیکن اس پر عمل ہوتے کہیں دکھائی نہیں دیتا، تجویزوں سے بڑھ کر ہمیں عمل کی ضرورت ہو۔"

(قومی آواز۔ لکھنؤ)

امریکہ کی ازدواجی زندگی

ایک اطلاع ہے کہ امریکہ کے جو سپاہی محاذ کوریا پر جا رہے ہیں ان میں سے جن کی بیویوں نے طلاق کی درخواستیں دی تھیں انھوں نے عام طور پر یہ درخواستیں واپس لے لی ہیں۔ اور ان کے اس اقدام کا سبب یہ ہے کہ انھیں ان شوہروں کی وجہ سے حکومت سے کافی رقم بطور الاؤنس ملتی ہے جس سے انھیں ہر طرح کی رنگ رلیاں منانے کا اختیار حاصل ہے، لیکن اگر وہ طلاق حاصل کرلیں تو پھر ان کے یہ سارے خوش آئند امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

غور فرمائیے۔ امریکہ میں عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق کتنی نیچی سطح تک گر چکا ہے، وہاں ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہنے یا طلاق حاصل کرنے کا فیصلہ حالات کی مجبوری یا باہمی محبت کے تقاضوں کے زیر اثر نہیں کرتی، بلکہ ہر حال میں اس کا بنیادی محرک ابن الوقتی اور عیش پرستی ہوتا ہے۔ ہمارے ہم قوم یا ہم وطن جو حضرات اپنی عائلی زندگی کے لیے امریکی اصول و نظریات کو اختیار کر چکے ہیں انھیں چاہیے کہ ایک دفعہ اس راہ کی آخری منزل کو بھی چشم تصور سے دیکھ لیں۔

(الانصاف ــــ الہ آباد)

- حضرت مولانا محمد الیاس اور انکی دینی دعوت (عہ ر)
- اسلام کیا ہے؟ مجلد عہ ر
- ملفوظات مولانا محمد الیاس رح مجلد عا ر
- مسلمان قوم کی حالت اور حاملان دین کا فریضہ ۶ر
- دعوت اصلاح و تبلیغ ۶ر
- اسلام اور موجودہ مسلمان قوم ۴ر
- مسلمانان عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب ۶ر
- کلمہ طیبہ کی حقیقت ۸ر
- نماز کی حقیقت عہ ر
- تصوف و صوفیہ عہ ر
- تذکرۂ امام ربانی عہ ر
- میری زندگی کے تجربے ۶ر
- اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ عہ ر
- امام ولی اللہ دہلوی از مولانا سندھی قیمت عہ ر
- منصب تجدید کی حقیقت ۸ر
- تدوین اصول فقہ عہ ر
- اسلام کا نظریہ سیاسی ۳ر
- اسلام اور نظام سرمایہ داری ۸ر
- جدید تعلیم اور علماء کا جرم عظیم ۴ر
- نماز اور خطبہ کی زبان ۳ر
- بوارق الغیب حصہ اول کاغذ ششم دوم عہ ر
- بوارق الغیب حصہ دوم کاغذ اعلیٰ عہ ر کاغذ دنی ۱۲ر
- فتح بریلی کاغذ عمدہ ۸ر
- ہدایت ربانی روداد مناظرہ گیا ۸ر
- مناظرۂ علم غیب کاغذ عمدہ ۸ر
- حضرت مجدد الف ثانی اور زمانہ حال کے اہل بدعت ۴ر
- میلہ خدا شناسی ۳ر
- شارع حقیقی ۳ر
- فتنۂ رفض و تفضیلیت کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی کا جہاد ۴ر
- مباحثہ سماج بریلی ۳ر
- ہندستانی مسلمانوں کے لیے دو راستے ۲ر
- اسلام اور نظریۂ وحدت ادیان قیمت ۲ر

کم از کم ایک کتاب کے پانچ یا اس سے زائد نسخے خریدنے والوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

منیجر

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ

قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے

ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے

قصص القرآن :۔ از مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی۔ پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں ان کے متعلق چار جلدوں کی یہ کتاب اس زمانہ کی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے

جلد اول :۔ حضرت آدم سے لیکر حضرت موسیٰ تک کے واقعات۔ عہ،

جلد دوم :۔ حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ تک کے واقعات۔ عہ،

جلد سوم :۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی تمام قصص قرآن کا بیان ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ،

جلد چہارم حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات عہ،

لغات القرآن :۔ اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل و مبسوط تشریح کی گئی ہے۔ اپنے موضوع میں بے نظیر اور محققانہ کتاب ہے۔ ابھی صرف تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔ جلد اول للعہ، جلد دوم للعہ، جلد سوم للعہ

فہم قرآن :۔ از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے، قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں اور قرآن و سنت کا باہم کیا تعلق ہے؟ مجلد عہ،

رہنمائے قرآن :۔ ایک فاضلانہ انگریزی کتاب کا ترجمہ، جدید تعلیم یافتہ حضرات ضرور پڑھیں۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ،

کائنات روحانی :۔ از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ، قرآن مجید کے علوم و معارف پر وجد انگیز کتابچہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۸،

احکام القرآن :۔ تالیف مولانا حاجی ثناء اللہ صاحب ایم ایل سی بچوں کو اگر پورا کلام مجید مع معانی و مطالب پڑھانے کی صلاح دیجائے تو اسکے لیے وقت کا عذر کیا جائیگا اسلیے اس کتاب میں صرف احکامات یعنی یہ کام کرو اور یہ مت کرو، زندگی کی ہدایت کیلیے کافی سمجھ کر اختصار کے ساتھ پیش کر دیئے گئے ہیں ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے! ۲۴۰ صفحات، بڑا سائز، عمدہ کاغذ، اچھی طباعت، قیمت صرف دو روپیہ (عہ،)

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

احادیث نبوی پر ایک بہترین کتاب

ترجمان السنہ جلد دوم

"ترجمان السنہ" کی پہلی جلد جن حضرات کے مطالعہ سے گزر چکی ہے وہ یقیناً باقی جلدوں کے بڑی بے چینی سے منتظر ہوں گے، اور یہ معلوم کرکے انھیں بڑی خوشی ہوگی کہ اللہ کی مدد و توفیق سے اس کی جلد دوم بھی تیار ہوگئی ہے جو اپنے امتیازات اور محاسن میں جلد اول سے بھی برتر اور بالاتر ہے ۔۔۔ بیشک فضیلت تو اگلوں ہی کے لیے ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ عصر حاضر کی ضروریات اور موجودہ دور کے خاص تقاضوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جیسی یہ کتاب اس دور کے ایک ہندی عالم سے مرتب کرا دی ہے ایسی کسی زبان (حتیٰ کہ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے خود عربی زبان میں بھی) موجود نہیں ہے۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ حضرات علماء کو، خصوصاً حدیث کے اساتذہ کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے درس حدیث کے طرز میں جس تغیر کی ضرورت ہے اس کے متعلق پوری رہنمائی انشاء اللہ اس کتاب سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

قیمت جلد اول غیر مجلد دس روپے (عــہ) " دوم " نو روپے، مجلد گیارہ روپے

قرآن اور تصوف :۔ از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب جس میں کتاب و سنت کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کو منطقی ترتیب اور وضاحت کے ساتھ ایک خاص اسلوب میں

ملنے کا پتہ

کتبخانہ الفرقان، گوئن روڈ لکھنؤ

سیرت

نبی عربی

(از قاضی سجاد میرٹھی)

سلسلہ تاریخ ملت کا حصہ اول متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لیے سیرت سرور کائنات کے تمام واقعات۔ جدید اڈیشن جس میں مستقل ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے ... ... عہر

خلافت راشدہ

(از قاضی صاحب موصوف) تاریخ ملت کا دوسرا حصہ عہد خلفاء راشدین کے اہم اور مستند واقعات، قدیم جدید عربی تواریخ کی بنیاد پر جدید اڈیشن (صفحات ۳۷۶ قیمت عہر)

خلافت بنو امیہ

(از قاضی صاحب)

تاریخ ملت کا تیسرا حصہ خلفاء بنی امیہ کے حالات و واقعات کتاب کی ترتیب تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کی گئی ہے

صفحات ۳۲۶

قیمت .. .. عمر

خلافت ہسپانیہ

از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی

جس میں خلفائے بنو امیہ "اسپین" کے حالات اور اسپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان قدیم و جدید تواریخ کی بنیاد پر نہایت کاوش سے جمع کی گئی ہے "سلاطین اندلس" کے دور حکومت اور انکے محاسن علمی و تمدنی کا نمونہ بہتر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے عکر

رحمت عالم

سیرت نگار نبوی علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کی مختصر مگر جامع تصنیف جو نہایت آسان مگر دلچسپ زبان میں لکھی گئی ہے۔ کاغذ کلیز طباعت عمدہ، چھوٹی تقطیع

قیمت عا

صحابہ کرام رض اور بزرگان دین

آسان اردو میں سیرت کی کتابیں!

رسول اکرم ۲؍ حضرت ابوبکرؓ ۱۰؍ حضرت عمرؓ ۱۰؍ حضرت خالد بن ولید ۱۰؍ حضرت بلالؓ ۴؍ حضرت طلحہؓ ۴؍ حضرت ابوذر غفاریؓ ۴؍ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ ۴؍ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ۴؍ حضرت ابوعبیدہ ۴؍ حضرت سلمان فارسی ۵؍ حضرت زبیرؓ ۴؍ ۵؍ حضرت زید بن حارثہ ۴؍ حضرت اسامہؓ ۴؍ حضرت ابن مسعود ۵؍ حضرت ابوہریرہ ۵؍ حضرت ابن عباس ۴؍ حضرت ابن عمر ۵؍ حضرت مصعب بن عمیر ۴؍ حضرت انس بن مالک ۴؍ حضرت ابوایوب انصاری ۴؍ حضرت جعفر طیار ۲؍

حضرت حمزہ ۴؍ حضرت سعد بن عبادہ ۴؍ حضرت خدیجہ ۲؍ نیک بیٹیاں (حضورؐ کی صاحبزادیوں کے حالات) ۶؍

بزرگان دین

حضرت امام بخاری ۴؍ حضرت امام غزالی ۳؍ مولانا روم ۳؍ حضرت مجدد الف ثانی ۴؍ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ۴؍ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۲؍ خواجہ نظام الدین ۴؍ شیخ فریدالدین عطار ۳؍ جمال الدین افغانی ۲؍

رسول اللہ

(از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) سلیس و عام فہم اردو زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر متوسط درجہ کی تصنیف ہے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کیلئے بہترین علمی اور دینی تحفہ ہے۔ قیمت عہر

پہلی تقریر بر سیرت

(از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی) دلی کی شگفتہ زبان میں سیرت نبوی پر ایک عجیب و غریب تقریر ہے جسکے مطالعہ سے یقین ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آج بھی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر رہی ہے قیمت مجلد عکر

دوسری تقریر بر سیرت

(از مولانا موصوف) سیرت نبوی ہی کے موضوع پر یہ دوسری تقریر ہے علاوہ دیگر مضامین کے آنحضرت کی تبلیغی مشکلات اور مخالفین کے زہرگداز مظالم اور آپ کے صبر و تحمل کا بیان بڑا اثر انگیز ہے (مجلد عکر)

عہد رسالت کے دو بچے

(از اعجاز الحق قدوسی) پیغمبر رسالت کے آغوش میں پرورش پاتا ہے پھر وہ اپنے آغوش میں دنیا کو پالتا ہے لیکن ایک قسم خصوصی بھی ہے جسے آپ سب جانتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباس کی پرورش کیسے ہوتی ہے (ملاحظہ فرمائیے)

قیمت .. .. عہ

تاریخ اور سوانح

غدر کے چند علماء

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا کارنامہ جس قدر شاندار ہو اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی مگر افسوس! کہ ان لوگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی ملک کی آزادی کے بعد جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بڑی خوبی سے یہ چھوٹا سا تذکرہ مرتب فرمایا ہو۔ قیمت مجلد مع حسین گردپوش ۱۲؍

علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں

(از مفتی صاحب موصوف)

حضرات صحابہؓ سے لیکر ہندوستان کے علماء متاخرین تک کی حق گوئی اور صداقت پروری کی صفت اور جرأت و بیباکی کے کارناموں کو یاد کرنے کے لیے اور اپنے اندر ان اوصاف کو زندہ کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گردپوش ۱۲؍

ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء

(از مفتی صاحب موصوف)

مغلیہ حکومت کے کمزور ہوتے ہی ملک کا شیرازہ کس طرح بکھر گیا۔ اور ہندوستان جنگ کا اکھاڑہ [illegible] کمپنی نے

کیسی کیسی تدبیروں سے ہندوستان پر تسلط کیا؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے اس خوشنما کتاب کا مطالعہ کیجیے
قیمت دو روپیہ ۲؍

تیرھویں صدی کے مجدد و مجاہد

حضرت سید احمد شہید کی سوانح حیات (از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) جو عرصہ سے نایاب تھی، اور کسی

تاریخ اسلام کامل

یہ نئی کتاب تین جلدوں میں مکمل ہوئی ہے

جلد اوّل میں

حضرت آدمؑ سے لے کر آغاز اسلام تک کی تاریخ کسی قدر اختصار کے ساتھ لکھنے کے بعد بعثت محمدی سے خلافت بنوامیہ تک کے واقعات لکھے گئے ہیں اس ضمن میں اسلام اور اسلامی نظام کے مذہب حق اور دین فطرت ہونے پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہو۔

جلد دوم میں

خلافت عباسیہ، ترکیہ، اندلس وغیرہ اسلامی حکومتوں کا تذکرہ اور ان پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے

جلد سوم میں

ہندوستان میں اسلامی حکومت و اقتدار کی تاریخ اور ہندوستان پر پڑنے والے اسکے اثرات کو بیان کیا گیا ہو اور عالم اسلام کے احوال و کوائف پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہو زبان عام فہم ہو کاغذ اور طباعت معمولی۔ قیمت ہر سہ جلد مکمل سات روپے ۷؍

اسیر مالٹا

(از مولانا حسین احمد صاحب مدنی) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور ان کے رفقاء سفر کے قید کے حالات
(جدید اڈیشن)
چھوٹا سائز مجلد مع خوبصورت گردپوش قیمت ۲؍

قیمت پر بھی شائقین کو دستیاب نہیں ہو سکتی تھی، تقریباً دونے اضافہ کے ساتھ پھر سے چھپ رہی ہو۔ پہلی جلد تیار ہو چکی ہو جس میں سید صاحب کے حج تک کی سوانح و واقعات اور آپ کی اصلاحی و تبلیغی کوششوں کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں جس سے اس زمانہ میں دینی اصلاح کا کام کرنیوالوں کو روشنی حاصل ہو سکتی ہے
قیمت للعہ مجلد للعہ؍

تاریخ ہندی قرون وسطیٰ

مرتبہ مولوی قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے علیگ

ہندوستان میں اسلامی عہد حکومت کی یہ پہلی مستند اور محققانہ تاریخ ہو ملک کے مشاہیر اہل علم اور نقاد اہل قلم نے اس کے فاضل مصنف کو بڑی فراخدلی سے خراج تحسین ادا کیا ہے، بلاشبہ ہر علم دوست اور تحقیق پسند پر اس کا حق ہو کہ وہ ضرور اس کا مطالعہ کرے اس کے مصنف تاریخ کے فن سے خاص دلچسپی اور تحقیقی مذاق رکھنے والے ایک علیگ فاضل ہیں جو انگریزی اور عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتے ہیں کتاب کے مطالعہ ہی سے اندازہ ہوگا کہ یہ کام در اصل ایسے ہی شخص کے کرنے کا تھا۔ ابھی صرف جلد دوم شائع ہوئی ہے جو سلطان محمد غوری سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی تک کے زمانے سے متعلق ہو۔
کتاب کی مقبولیت سے بہت جلد اس اس اڈیشن کے ختم ہو جانے کی امید ہے
قیمت فی جلد چھ روپے آٹھ آنے (۶؍۸)

اسلام اور اسلامی نظام سے متعلق

مسلمانوں کا نظم مملکت

ایک مصری فاضل کی جدید کتاب کا اردو ترجمہ جس نے مختلف زبانوں کی کم و بیش ایک سو اہم کتابوں کی مدد سے اپنی اس کتاب کو مرتب کیا ہو۔ اور مسلمانوں کے نظم مملکت سے متعلق ہر گوشہ پر مبسوطانہ نظر ڈالی ہو۔ بڑی تقطیع ۴۸۰ صفحے

قیمت للعہ مجلد صہ

اسلام کا نظام حکومت

(از حامد الانصاری غازی) اس ضخیم کتاب میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہو۔ صفحات ۶۰۸ بڑی تقطیع غیر مجلد ہے

موت سے ہمکنار دنیا کے لیے

اسلامی نظام

(از مولنا محمد اسحق سندیلوی) رائج الوقت نظاموں کے تلخ تجربات اور ہولناک نتائج سے تنگ آ کر دنیا ایک صحیح اور صالح نظام کی ضرورت محسوس کر رہی ہو، اور آئندہ زیادہ محسوس کرے گی۔ وہ نظام کیا ہو؟ ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت صرف عہ

اسلامی معاشرت

قرآن و حدیث سے ناواقفی اور کچھ غلط بیرونی اثرات کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی عام طور سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ ہماری روز مرہ کی زندگی اور رہن سہن کے طریقوں کے لیے دوسرے مذاہب کی طرح دین اسلام میں بھی کچھ ہدایات اور پابندیاں نہیں ہیں اس مختصر سی کتاب کے مطالعہ سے اس خیال کی غلطی معلوم ہو جاتی ہو مصنف نے آیات اور احادیث کو جمع کر کے اسلامی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہو (۵۰ صفحات)

قیمت مجلد عہ

مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کا نقصان؟

جب تک مسلمان اسلام پر قائم رہے معزز رہے لیکن جب سے انھوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اور دین سے دور ہو گئے تو خود بھی ذلیل ہوئے اور دنیا کو بھی نقصان پہنچایا۔ یہ کس طرح ہ؟ سید ابوالحسن علی ندوی نے اسی بات کو اس کتاب میں تفصیل سے بتایا ہو

قیمت (مے)

دین و دانش

(تصنیف پروفیسر محمود علی صاحب) اسلامی اصول و احکام کے مطابق فطرت اور مطابق عقل سلیم ہونے کے ثبوت میں یہ ایک بے نظیر کتاب ہو۔ قیمت صہ

معرکۂ اسلام و جاہلیت

(مولنا صدر الدین اصلاحی) جب اسلام کا دور شروع ہوا تو ابتدا ہی میں اس نے اپنے کو اجنبی محسوس کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ پھر اجنبی سمجھا جانے لگے گا۔

کیوں ــــ ؟

یہ کتاب دیکھ کر آپ خود اندازہ کر لیں گے۔

قیمت ایک روپیہ عہ

ارکان اسلام

اس میں اسلام کے بنیادی عقائد (توحید رسالت، وحی، ملائکہ، قیامت، حشر نشر تقدیر وغیرہ) کو عام فہم اور دلنشیں انداز میں سمجھانے کے بعد عملی فرائض و ارکان یعنی نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج کے محاسن فضائل اور ضروری احکام و مسائل بڑے آسان پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں، دینی تعلیم کے سلسلہ کی اچھی کتاب ہو. قیمت مجلد ــــــ عہ

شاہراہ ترقی

اس میں بڑے مؤثر انداز میں بتلایا گیا ہو کہ انسان کے لیے ترقی اور کمال کی شاہراہ صرف وہی ہو جو انبیاء علیہم السلام نے اور خاص کر خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کی یعنی سچے عقائد، خدائے واحد کی بزرگی، عبادت، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے احکام کی کامل اطاعت اور انبیاء علیہم السلام کی مکمل پیروی قیمت ۸ر

آداب معیشت

اس دنیا کی زندگی میں جو کام ہمیں روزانہ کرنے پڑتے ہیں مثلاً کھانا پینا پہننا وغیرہ ان کے متعلق اسلام اور پیغمبر اسلام نے جو بہترین احکام دیے ہیں اس مختصر رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں، قیمت ۸ر

اصلاح انقلاب

جس قوم نے اسی زمین کے اوپر اور اسی آسمان کے نیچے ہزار سال شان و شوکت سے حکومت کی، اب کیوں مصیبتوں کا شکار ہو؟ یہ جس غلط انقلاب کا نتیجہ ہو اسی کی اصلاح اس چھوٹے سے رسالہ میں آپ کو ملے گی ۴ر

اکابر امّت کی تصنیفات

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ

بہشتی زیور اختری	؎ /
حیات المسلمین مجلد	عہ/
تعلیم الدین 〃	عہ/
اصلاح الرسوم 〃	عہ/
الاکسیر فی اثبات التقدیر	عہ/
قصد السبیل	۵/
شوق وطن	۴/
حفظ الایمان	۲/
صفائی معاملات	۴/
آداب معاشرت	۴/
افادات اشرفیہ	۸/
اتمام النفال	۲/

المصالح العقلیہ از حکیم الامۃؒ دینی تعلیمات اور شرعی احکام کی حکمتوں اور عقلی مصلحتوں کے بیان میں بے نظیر کتاب ہے۔ قیمت (سے/)

شہادۃ الاقوام مختلف قوموں کے اکابر اور فضلاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو شہادتیں ادا کی ہیں اس کتاب میں ان کو جمع کر دیا گیا ہے۔

قیمت (عہ/)

التصویر تصویر اور فوٹو وغیرہ کے مباحث پر نہایت محققانہ رسالہ از مولنا محمد شفیع صاحب دیوبندی قیمت (عہ/)

الحیلۃ الناجزہ خاوند کے بیکار یا لاپتہ یا سخت ظالم ہونے کی وجہ سے جب عورت مجبور ہو تو اس کے نکاح سے آزادی حاصل کرنے اور دوسری جگہ نکاح کر سکنے کا شرعی

تدبیریں اس کتاب میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ از مولنا محمد شفیع صاحب دیوبندی

قیمت (عہ/)

"قطرات" تصوف میں "ہمعات" حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اہم تصنیف ہے، جو نایاب ہے۔ ماضی قریب کے ایک صاحب علم اور صاحب دل بزرگ اور عارف نے "قطرات" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کام کسی ایسے ہی صاحب علم اور صاحب حال بزرگ کے کرنے کا تھا اس کے چند نسخے کتبخانہ الفرقان میں آ گئے ہیں۔ مضامین بہت اعلیٰ ہیں، لہٰذا کم تعلیم یافتہ حضرات نہ طلب فرمائیں۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ۔ قیمت (چودہ آنے ۱۴/)

القول الجمیل از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (عربی) عہ/

شفاء العلیل یعنی القول الجمیل مع ترجمہ و تشریح (اردو) قیمت عہ/

افادات ابن تیمیہ (اردو) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور آپ کے تلمیذ رشید حافظ ابن القیمؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں، اسلام کو شرک و بدعت کی آمیزش سے محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے جو مجددانہ کام کیا تھا اہل علم اس سے خوب واقف ہیں، اس کتاب میں انکے اس سلسلہ کے نہایت اہم اور ہدایت افروز مقالات کو اردو میں منتقل کر کے جمع کر دیا گیا ہے

قیمت (عہ/)

انتصار الاسلام محشی و معنون (از حضرت مولانا قاسمؒ) قیمت ۸/

الابواب و التراجم صحیح بخاری کے ابواب و تراجم کی تشریح میں شیخ الہند حضرت مولنا محمود حسن صاحب کا نہایت نفیس رسالہ چند نسخے موجود ہیں۔ قیمت ۸/

الجواب المتین اذان اور اقامت سے متعلق مباحث اور مسائل پر جامع رسالہ ہے، از جناب مولنا اصغر حسین صاحب دیوبندی۔ قیمت ۸/

آب حیات حیات النبی کے موضوع پر حضرت مولنا محمد قاسم صاحب کی بے نظیر فلسفیانہ اور عارفانہ تصنیف صرف اہل علم ہی طلب فرمائیں۔

(قیمت عہ/)

التصدیقات بعض فرقوں کی طرف سے علماء دیوبند پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں اس کتاب میں ان کی پوری تردید کر کے علمائے دیوبند کے اصل عقائد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کی تصدیق و توثیق حرمین و غیرہ کے علماء نے بھی کی ہے۔

قیمت (۱۲/)

"الاسلام"

حضرت مولنا شبیر احمد عثمانیؒ کی ایک معرکۃ الآراء تقریر جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ عقل و فطرت کے مطابق اور نجات دلانے والا مذہب صرف اسلام ہے۔

قیمت ( )

جماعت اسلامی کا لٹریچر اور مولنا مودودی کی تصنیفات

رسالہ دینیات .. .. عہ/
مسئلہ قومیت .. .. عہ/
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر .. عہ/
تفہیمات .. .. ہے/
دین حق ۶/
شہادت حق ۶/
جہاد فی سبیل اللہ ۶/
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۶/
نیا نظام تعلیم ۶/
لباس کا مسئلہ اجتماعی اور شرعی نقطۂ نظر سے ۳/
تصور علم و عقل کی روشنی میں .. ۶/
اسلام کا نظریہ سیاسی ۶/
شہادت حق ۶/
اسلام اور ضبط ولادت ۱۲/
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات .. ۴/
راہ عمل ۶/
مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع ۲/
خدا کی اطاعت کس لیے؟ ۲/
اسلام اور جاہلیت ۶/
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں .. ۶/
عبادت ۲/
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا حل ۶/

تقریریں

اسلام کا اخلاقی نظام ۲/
" " معاشی نظام ۲/
" " معاشرتی نظام ۲/

اسلام کا سیاسی نظام ۲/
" " روحانی نظام ۲/
سلامتی کا راستہ ۶/
زندگی بعد موت ۲/
نشان راہ ۶/
مذہب کا انقلابی تصور ــــ از منظر الدین صدیقی ۶/
مقاصد قرآن ــــ از مولنا سید صبغۃ اللہ بختیاری .. ۱۲/
اسلام کا استغاثہ نام کے مسلمانوں کے لیے ــــ از نعیم صدیقی ۴/
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات مولانا مودودی، مولنا امین احسن اصلاحی، میاں طفیل محمد کی مرتب کردہ ایک انتہائی جامع کتاب مجلد .. .. عہ/

علماء اور اسلام ــــ از منظر الدین صدیقی بی۔ اے .. ۱۴/
معرکۂ اسلام و جاہلیت .. .. عہ/

کتب سماوی پر ایک نظر

مولنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت ایک عرصہ تک ایک مضمون نکلا تھا، وہی اب کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہو، تورات و انجیل و غیرہ کتب قدیمہ اور قرآن مجید پر یہ ایک عجیب و غریب فاضلانہ کتاب ہے جس کے مطالعہ کی سفارش کی جا سکتی ہے۔ قیمت .. .. عہ/ ۱۲/

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

از مولنا مسعود عالم ندوی

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک تجدید و جہاد کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہو کہ مشہد بالاکوٹ پر اس کا خاتمہ ہو گیا تھا حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ اس کے بعد قریباً چالیس برس تک اللہ کے کچھ صادق بندے اس علم کو بلند کیے رہے اور اعلاء کلمۃ الحق کی راہ میں جان کی بازی لگاتے رہے۔ اس کتاب میں اس کی پوری تفصیل آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ قیمت (ے/)

ایک مظلوم اور بدنام مصلح
محمد ابن عبدالوہاب

مولنا مسعود عالم ندوی نے بتلایا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد ابن عبدالوہاب نجدی کی سیرت، اور دعوت کیا تھی ــــ؟ ان کے متعلق جو کچھ غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں تھیں ان کی تردید کی ہے ــــ، اور ــــ مشرق و مغرب کے تمام ماخذ کو کھنگال کر ان پر بے لاگ تنقید کی ہو، کتاب ہر طرح مطالعہ کے لائق ہے۔ .. .. قیمت .. .. عہ/

اردو میں احادیث نبویؐ

خدا کی باتیں:۔ حدیث کے ذخیرے میں جس قدر احادیث قدسیہ ملتی ہیں ان سب کو عام فہم اردو زبان میں جمع کر دیا گیا ہو، مختلف مضامین کی قریباً آٹھ سو حدیثوں کا مجموعہ ہو قیمت مجلد (عہ؍)

رسولؐ کی باتیں: اسلام کے ضروری عقائد توحید، رسالت، قیامت، عالم برزخ، عذاب قبر، تقدیر، کتب آسمانی، ملائکہ وغیرہ ان تمام ایمانی حقیقتوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع مختصر تشریح۔ قیمت ہر حصہ مجلد سوا دو روپے (عہ؍)

جنت کی کنجی: اسمیں ۲۲۵ ایسی حدیثوں کا سلیس اور عام فہم ترجمہ کیا گیا ہو جنمیں خاص خاص اعمال پر جنت کی بشارت دیگئی ہو، گویا ترغیبی حدیثوں کا مکمل مجموعہ ہو — مجلد (ہے)

دوزخ کا کھٹکا۔ اسمیں ۲۰۰ ایسی حدیثوں کا ترجمہ کیا گیا ہو جنمیں برے اعمال پر دوزخ سے ڈرایا گیا ہو قیمت مجلد (عہ)

یہ دونوں کتابیں (جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا) امام منذری کی ترغیب ترہیب کا گویا انتخاب ہے

شیخ الحدیث مولانا زکریا مدظلہ کی
دینی تالیفات

حضرت ممدوح کی تالیفات سے امت کو جو بیش از بیش دینی اور ایمانی نفع ہوا ہو وہ اب محتاج بیان نہیں، ان کتابوں نے اللہ کے ہزاروں بندوں کی زندگیاں بدل دی ہیں ذیل میں کتابوں کے صرف نام اور قیمتیں درج کی جارہی ہیں۔

حکایات صحابہ ... ... عار

فضائل نماز ۱۲ر

فضائل قرآن ۸ر

فضائل رمضان ۱۰ر

فضائل تبلیغ ۵ر

فضائل ذکر ... ... ہے

الاعتدال فی مراتب الرجال ... ہے

فضائل صدقات

یہ حضرت شیخ مدظلہ کی تازہ تصنیف ہے، جس میں زکوٰۃ و صدقات کے متعلق قرآن و حدیث کی ترغیبات و تاکیدات کو استیعاب کے ساتھ جمع فرما دیا گیا ہو سرمایہ ملکیت کے متعلق بعض مباحث خاص طور سے قابل دید ہیں

قیمت ... ... ہے

حدیث کی نہایت مستند کتاب "زاد سفر"

اخلاق و اعمال و تہذیب و معاشرت، بلکہ زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کیلیے یہ کتاب کافی ہے، یہ درحقیقت مشہور محدث امام نووی متوفی ۶۷۶ھ کی مستند کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ ہو حسب ضرورت حواشی میں مطالب کی مزید توضیح بھی کر دی گئی ہے۔ ریاض الصالحین مسلّم طور پر احادیث نبویہ کا بہترین اور نہایت جامع انتخاب ہے، اور افادہ کے لحاظ سے یہ ترجمہ اصل کے قائم مقام ہو۔ اور ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک ذی علم دینی بہن کے قلم سے ہے۔ شروع میں حضرت مولنا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقدمہ ہو۔

جلد اول ... ... قیمت (للعہ)

رجسٹرڈ نمبر
آپ جانتے ھیں؟ —— کہ
ٹوتھ برش اکثر جانوروں کے بال سے بنائے جاتے ہیں، لیکن
مسواک ٹوتھ برش؟
خالص ریشے سے بنتا ھے!
USE
MISWAK
Tooth Brush
Nylon is neither bristle nor animal hair
MISWAK
NYLON TUFTED MIRACLE TOOTH BRUSH
دانتوں کو صاف کرتا ہے!
سستا اور پائیدار ہوتا ہے!
خالص ریشے سے بنتا ہے!
مسواک
اسلئے :- مذہبی نقطۂ نظر سے بھی مسواک پاکیزہ ٹوتھ برش ہے
ھر جگہ ملتا ھے!
مشتہر :- محمد احمد برادرس ۲۲۰ کٹلیری بازار، بمبئی ۳
(Printed at Nami Press Lucknow.)